Jahdi Musalsal

Amanullah Khan,

امان اللہ خان

کی

خود نوشت سوانح عمری

نام کتاب۔ جہدِ مسلسل

مصنف۔ امان اللہ خان

سال اشاعت۔ فروری 1992ء

تعداد۔ 2 ہزار

طباعت۔ ایس ایس ایس کمبائنڈ

DK - 748 - D ڈھوک کشمیریاں راولپنڈی 423530

قیمت۔ Rs 300/=

انتساب

وطن عزیز ریاست جموں کشمیر کے ان عظیم فرزندوں اور بیٹیوں

کے نام

جنہوں نے اپنے محکوم، جبری طور پر منقسم اور روندے گئے مادر وطن کی

آزادی کے لئے

اپنی عزیز جانوں کا نذرانہ پیش کیا ● اپنی عصمتیں لٹائیں
● اپنے سہاگ لٹائے ● اپنے لخت جگر قربان کئے ● اپنے گھر جلوائے
ذرائع آمدنی (تجارت، ملازمتیں) قربان کئے ● گھر بار، والدین، تعلیم، کاروبار اور ملازمتیں چھوڑ کر جدوجہدِ آزادی میں شمولیت کی ● بھارتی درندوں کی طرف سے ہونے والا انسانیت سوز ذہنی، جسمانی تشدّد برداشت کیا ● طویل قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں ● تحریکِ آزادی کی بھرپور مالی اور عملی مدد کی
● اور اُن خواتین و حضرات کے نام بھی جو حصول آزادی تک ان میں سے کسی قسم کی بھی قربانی دیں گے ○○○○○○○

اغلاط نامہ

صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط	درست
8	1	کمپنی	کمیٹی
77	سرخی	(پہلے پیراگراف کے اوپر)	جموں کشمیر محاذ رائے شماری
192 کے بعد	فوٹو سیکشن صفحہ 1	1985	1958
192 ""	صفحہ 2	..... سردار محمد	..... سردار محمد ابراہیم خان کے ساتھ
192 ""	صفحہ نمبر 4	(اوپر دیئے گئے پانچ فوٹوں کے درمیان)	این ایل ایف کے بانی
221	14	لیٹا ہوا تھا کی	لیٹا ہوا تھا کہ
223	15	عوامی اتحاد کو ختم دیا	...... ختم کر دیا
225	1	یہ بات کہہ کر دونوں آفسر	...... آفیسر
230	6	اسلام کے نقطہ نظریہ ' واحدانیت	اسلام کے نظریۂ وحدانیت
272	نظم کا دوسرا شعر	اپنا جرم ہے کہ	اپنا جرم کہ ......
311	9	One must knows	One must know
312	2	خاصی حد تک نظر انداز	خاصی حد تک اثر انداز

ترتیب

حِصّہ سوئم (میری اسیریاں)

حصّہ چہارم (متفرقات)

حصّہ پنجم (کامیابی کی کسوٹی)

حصّہ ششم (ریاست سے متعلق کچھ اہم موضوعات)

حصّہ ہفتم (دستاویزات)

دیباچہ

ایک مغربی مصنف کے مطابق کتابیں لکھنے کے سلسلے میں موضوعات کے لحاظ سے سب سے مشکل کام اپنی سوانح عمری لکھنا ہے۔ کیونکہ خودنوشت سوانح عمری (Autobiography) پر سب سے زیادہ تنقید ہوتی ہے۔ بے شمار لوگ جن کا سوانح نگار سے کسی نہ کسی طرح کا واسطہ رہا ہو اس سے اس لئے ناراض ہوتے ہیں کہ کتاب میں ان کا ذکر نہیں یا انہیں مناسب اہمیت نہیں دی گئی۔ کچھ لوگ اپنے اوپر ہونے والی تنقید پر سیخ پا ہوتے ہیں۔ کچھ کتاب کو سوانح نگار کی خودستائی قرار دیتے ہیں اور کچھ تنقید برائے تنقید کرتے ہیں۔

اگرچہ میں نے کوشش کی ہے کہ کتاب میں ان تمام حضرات کا ذکر ہو جو میری زندگی کے سب سے اہم مشن یعنی تحریکِ آزادیٔ کشمیر یا میرے ذاتی معاملات کے سلسلے میں میرے مددگار ثابت ہوئے ہیں اور اس بات کا بھی خاص خیال رکھا ہے کہ مجھ سے متعلق وہ واقعات بھی قلمبند ہوں جو تحریکِ آزادی کے حوالے سے کسی اہمیت کے حامل ہوں۔ اس کے باوجود قارئین کرام کو چاہئے کہ وہ اس حقیقت کو نظرانداز نہ کریں کہ یہ کتاب کشمیر، تحریکِ آزادیٔ کشمیر یا ان تنظیموں کی تاریخ نہیں جن سے میں منسلک رہا ہوں بلکہ یہ میری ذاتی سوانح عمری ہے۔ اس کے باوجود اگر کتاب میں کسی قابلِ ذکر واقعے یا کسی مستحق شخص کا ذکر نہ ہوا ہو یا مناسب تفصیل سے نہ ہوا ہو تو میں متعلقہ اصحاب سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اگر مجھ سے ایسی کوئی غلطی ہوئی ہے تو یقین کریں یہ سہواً ہوئی ہے قصداً نہیں۔

میں نے کوشش کی ہے کہ کتاب میری ذات یا میری زندگی سے متعلق معلومات تک محدود نہ رہے بلکہ کتاب کا قاری ریاست جموں کشمیر، تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور ان تنظیموں سے متعلق اہم حقائق و واقعات سے بھی آگاہ ہو جائے جن سے میں وابستہ رہا ہوں۔ ان حقائق و واقعات میں سے کچھ ایسے ہیں جو پہلی بار منظرعام پر آ رہے ہیں۔

میں نے کتاب میں انسانی زندگی اور اس کی کامیابی اور ناکامی کے اسباب سے متعلق (ذاتی تجربے کی روشنی میں) کچھ تلخ اور شیریں حقائق کی نشاندہی اور وضاحت کی ہے۔ امید ہے قارئین کرام خاص کر نوجوان اس سے مناسب استفادہ کریں گے۔

سوانح عمری کا عنوان عام طور پر مصنف کے نام کے تعلق سے رکھا جاتا ہے لیکن میں نے اس سلسلے میں اس روائت سے ہٹ کر اپنی سوانح عمری کا عنوان "جہدِ مسلسل" رکھا ہے۔ امید ہے اسے پڑھنے کے بعد قارئین کرام اس عنوان کی موزونیت سے اتفاق کریں گے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگرچہ میں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کا سربراہ ہوں لیکن یہ کتاب میری ذاتی ہے - یہ نہ تو لبریشن فرنٹ کی طرف سے شائع ہوئی ہے نہ ہی اس کی اشاعت کے اخراجات لبریشن فرنٹ نے برداشت کئے ہیں - چنانچہ کتاب کے آخر میں شامل دستاویزات سمیت کتاب کے جملہ مندرجات کی ذمہ داری میری ذات پر ہے لبریشن فرنٹ پر نہیں۔

کراچی جون 1988 امان اللہ خان

House of Lords

Foreword

By Lord Avebury

Chairman, Parliamentary Human Rights Group

Amanullah Khan tells us that he measures success in this life by the service he can offer to mankind, and of course to his own people in particular. There can be no more noble goal, and though one can never eliminate human suffering, the task itself is its own reward.

The people of the state of Jammu and Kashmir are going through the most fearsome ordeal of their history, and it is this great problem which preoccupies Amanullah Khan day and night. He devotes his energies single-mindedly to the cause of self-determination, which has been attained by nearly all other peoples living under colonial and alien domination, but is still denied to the Kashmiris. And this right of self-determination, he sees as the essential precondition for the enjoyment of all other human rights and freedoms - the right to life, to freedom from arbitrary arrest and imprisonment, freedom from torture, and freedom of speech and assembly.

The tragedy of Kashmir has been that although half the state is under the jackboot of Indian imperialism, with 350,000 troops and paramilitaries committing frightful atrocities against the inhabitants, including women and children, the outside world has been almost deaf to their cries for help. The statesmen of the big powers saw the problem as being a bilateral territorial dispute between India and Pakistan, and none of anybody else's business. The question dropped off the agenda of the United Nations, and is ignored by the Commonwealth.

Today, however, that is beginning to change. The international community is listening to the voice of the 12 million people of Kashmir, who are the only legitimate arbiters of their own political destiny. Representatives of the people are turning up at United Nations forums, at meetings of Islamic leaders, and at great rallies and seminars in the capitals of the world. In Kashmir itself, the intifada continues unabated, and now gets some of the moral backing accorded to the Palestinians or South Africans. If the legitimate freedom struggle of the Kashmiris prevails, as it must do one day, Amanullah Khan will be remembered as the leader who articulated their demands, persuaded them to make the great sacrifices that gained their freedom, and led them to victory.

ہاوس آف لارڈز (برطانیہ)
پیش لفظ
از
لارڈ ایوبری۔ چیئرمین پارلیمانی گروپ برائے انسانی حقوق

امان اللہ خان ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ کسی شخص کی زندگی کی کامیابی کو ان خدمات کے ناپ سے ناپتے ہیں جو وہ بنی نوع انسان خاص کر اس کے اپنے عوام کی بہبود کے لئے سرانجام دیتا ہے۔ اس سے زیادہ عظیم اور کوئی مقصد نہیں ہو سکتا اور اگرچہ کوئی شخص انسانی مصائب کا مکمل خاتمہ کبھی نہیں کر سکتا لیکن یہ کام (خدمت خلق) آپ اپنا انعام ہے۔

ریاست جموں کشمیر کے عوام اپنی تاریخ کے انتہائی دردناک مصائب سے گذر رہے ہیں اور امان اللہ خان اسی اہم مسئلے کے بارے میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔ وہ کشمیریوں کے اس حق خودارادیت کے حصول کے لئے پوری یکسوئی کے ساتھ مصروف جدو جہد رہتے ہیں جو ان تمام قوموں کو حاصل ہو گیا ہے جو نو آبادیاتی نظام میں یا غیر ملکی تسلط میں تھیں اور جس سے ابھی تک کشمیریوں کو محروم رکھا گیا ہے۔ اور ان (امان اللہ خان) کی نظر میں حق خودارادیت کا حصول ہی انسان کے دوسرے حقوق اور آزادیوں یعنی زندہ رہنے کے حق۔ من مانی گرفتاریوں اور قیدوبند سے بچے رہنے کے حق۔ جسمانی تشدد سے محفوظ رہنے کے حق اور تقریر اور اجتماع کی آزادی کے حصول کے لئے پیشگی شرط ہے۔

کشمیر کا المیہ یہ رہا ہے کہ اگرچہ ریاست کا نصف حصہ بھارتی سامراج کے تسلط میں ہے جہاں ساڑھے تین لاکھ بھارتی فوج اور نیم فوجی خواتین اور بچوں سمیت مقامی آبادی پر انسانیت سوز مظالم ڈھا رہے ہیں ' بیرونی دنیا مدد کے لئے ان کی چیخ و پکار کے سلسلے میں بہری بنی ہوئی ہے۔ بڑی طاقتوں کے سیاستدان اس مسئلے کو بھارت اور پاکستان کے مابین ایک ایسا علاقائی تنازعہ گردانتے ہیں جس میں مداخلت کرنا باہر کے کسی شخص کا کام نہیں۔ یہ مسئلہ اقوام متحدہ کے ایجنڈے سے گر گیا اور دولت مشترکہ نے اسے نظرانداز کیا۔

بہرحال اب یہ صورت حال بدلنا شروع ہو گئی ہے۔ عالمی برداری اب بارہ ملین کشمیریوں جو اپنی سیاسی منزل کے تعین کے واحد مختار ہیں کی آواز سننے لگی ہے۔ کشمیریوں کے نمائندے اب اقوام متحدہ کے پلیٹ فارموں۔ مسلمان رہنماؤں کے اجلاسوں اور دنیا کے دارالحکومتوں میں ہونے والے جلسوں اور سیمیناروں میں پہنچنے لگے ہیں۔ اندرون کشمیر انتفادہ کمزور پڑے بغیر جاری ہے اور اسے بھی اسی طرح کی کچھ حمایت حاصل ہو رہی ہے جو فلسطینیوں اور جنوبی افریقہ والوں کو حاصل ہے۔ اگر کشمیریوں کی یہ جائز جدوجہد آزادی کامیاب ہو گئی اور ایک دن یہ ضرور ہو جائیگی تو امان اللہ خان کو کشمیریوں کے اُس رہنما کی حیثیت سے یاد کیا جاتا رہے گا جس نے ان کے مطالبات کو مربوط طریقے سے پیش کر کے انہیں منوایا اور انہیں (کشمیریوں کو) ایسی عظیم قربانیاں دینے پر آمادہ کیا جن کے نتیجے میں انہیں آزادی اور فتح حاصل ہوئی۔

ضروری نوٹ

یہ کتاب میری پیدائش سے لے کر 1986 کے اختتام تک کے 52 سالوں کے دوران میری زندگی کے اہم واقعات کے علاوہ تاریخ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر سے متعلق ان امور پر محیط ہے جن کا میری ذات سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رہا ہے۔ علاوہ ازیں میں نے کتاب میں بہت سے ایسے واقعات و حقائق بھی شامل کئے ہیں جو گو میری ذات سے براہ راست وابستہ نہیں لیکن کشمیر کی تاریخ و جغرافیہ اور تحریک آزادیٔ کشمیر میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مد ثابت ہو سکتے ہیں۔ سوانح عمری کے اواخر میں انسانی زندگی سے متعلق کچھ تلخ و شیریں حقائق کی بھی نشاندہی "کامیابی کی کسوٹی" کے عنوان سے کی ہے۔

میں نے "کامیابی کی کسوٹی" کے باب کے سوا کتاب کا مسودہ 1988ء کے اوائل میں مکمل کر لیا تھا لیکن 31 جولائی 1988ء کو مقبوضہ کشمیر میں مسلح جدوجہدِ آزادی کی ابتدا (جو ہماری تنظیم کی طرف سے ڈیڑھ سال کی رازدارانہ تیاری کے بعد ہوئی تھی) کے بعد میں تحریکِ آزادی سے متعلق معاملات میں اتنا مصروف ہو گیا کہ کتاب کی اشاعت سے متعلق امور کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ مالی مشکلات اس کے علاوہ تھیں۔

گزشتہ پانچ سال یعنی 1986ء کے اواخر سے 1992ء کے اوائل تک کے دوران تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے حوالے سے بڑے انقلاب آئے ہیں۔ اس دوران بھارتی مقبوضہ کشمیر میں مسلح جدوجہدِ آزادی شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نیم مردہ مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر پوری طرح زندہ ہو گئے۔ وادی کشمیر میں بچوں' بوڑھوں' مردوں اور خواتین کی طرف سے لگنے والے آزادی کے نعرے چار سو اور مسلسل گونجنے لگے۔ کشمیری نوجوانوں نے جذبۂ قربانی اور شجاعت کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ دوسری طرف بھارتی فوج اور حکام نے بربریت ' سفاکی اور اخلاقی دیوالیہ پن کے ریکارڈ توڑ دیئے۔ کچھ مجاہدین نے بھی ایسے کام کئے جو جذبۂ جہاد اور حریت پسندی کے شایان شان نہیں تھے۔ وادی کشمیر سے آزاد کشمیر آ کر عسکری تربیت حاصل کرنے والے ہزاروں نوجوانوں سے میری ملاقاتیں ہوئیں جن میں سے کچھ نے میرے ذہن پر اپنی حب الوطنی' جذبۂ قربانی' شجاعت ' وسعت قلبی اور قائدانہ صلاحیتوں کے گہرے نقوش چھوڑے اور کچھ نے انتہائی مایوس کیا جبکہ کچھ کے کردار کے بارے میں میں ابھی کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا ہوں۔ کچھ سیاسی

پارٹیوں' گروپوں اور شخصیتوں کے بارے میں مجھے اپنی سابقہ رائے تبدیل کرنی پڑی۔ اس دوران بھارتی مقبوضہ کشمیر کی روایتی لیڈر شپ مکمل طور پر پس منظر میں چلی گئی جبکہ آزاد کشمیر کی روایتی لیڈر شپ نے تحریکِ آزادی سے اپنی دلچسپی اور وابستگی کو صرف اخباری بیانات' جہاد کانفرنسوں' انٹرنیشنل کانفرنسوں اور کشمیری ریلیز (Kashmir Rallies) تک محدود رکھا۔

1989ء میں آزاد کشمیر کی گیارہ سیاسی پارٹیوں پر مشتمل کشمیر لبریشن الائنس قائم ہوا اور مجھے اس کا پہلا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ یہ الائنس سال بھر تک متحرک رہا اور اس کے ایک وفد نے جس میں میں بھی شامل تھا امریکہ اور یورپ کا دورہ بھی کیا لیکن ایک سال بعد یہ الائنس انجماد کا شکار ہو گیا۔ 13 دسمبر 1991ء کو پوری ریاست جموں کشمیر کی مکمل خودمختاری کی داعی چھ تنظیموں نے میرے مرتب کئے ہوئے اعلان لاہور پر دستخط کئے۔

گذشتہ پانچ سال کے دوران حکومت پاکستان نے تحریکِ آزادیٔ کشمیر خاص کر کشمیر میں مسلح جدوجہدِ آزادی شروع کرنے والی اور ریاست کی مکمل خودمختاری کی داعی تنظیم جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور پاکستان کی تواریخ کا ایک انتہائی تکلیف دہ باب ہے۔ 1990ء میں میرے دورۂ امریکہ کے دوران امریکی حکومت نے میرا ویزا منسوخ کیا اور بھارت نے انٹرپول پر دباؤ ڈال کر میرے خلاف بین الاقوامی وارنٹ جاری کروائے۔

18 جون 1990 کو میں نے "عارضی حکومت خودمختار ریاست جموں کشمیر" کے قیام کا اعلان کیا اور ظاہراً اسی کے نتیجے میں لبریشن فرنٹ کے کچھ ممبر ہم سے الگ ہو گئے اور انہوں نے متوازی لبریشن فرنٹ قائم کیا لیکن میرے خلاف انتہائی زہریلے بے بنیاد پروپیگنڈے کے باوجود تنظیم کے ممبروں کی بھاری اکثریت نے میرا ساتھ دیا۔

گذشتہ پانچ سال کے دوران آزاد کشمیر پاکستان مشرق وسطیٰ یورپ اور امریکہ میں لبریشن فرنٹ کی شاخیں خاصی متحرک رہی ہیں خاص کر برطانیہ اور مشرق وسطیٰ کی شاخوں کی کارکردگی قابل تحسین رہی ہے۔ مسئلہ کشمیر کی تاریخ میں پہلی بار کسی کشمیری نے ایک کشمیری تنظیم کے نمائندے کی حیثیت سے اقوام متحدہ کے کسی شعبے کے سالانہ اجلاس کے دوران دنیا بھر کی حکومتوں کے نمائندوں سے خطاب کیا اور یہ اعزاز بھی لبریشن فرنٹ کو ملا جس کے نمائندے راجہ ظفر خان نے 13 اگست 1991ء کو جنیوا میں انسانی حقوق کے عالمی کمیشن کے ایک شعبے کے سالانہ اجلاس سے خطاب کیا۔ ان پانچ سالوں کے دوران آزاد کشمیر' مقبوضہ کشمیر' پاکستان' مشرق وسطیٰ' یورپ اور امریکہ میں لبریشن فرنٹ کے ممبروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا اور ان نئے اور پرانے ممبروں میں سے اکثر انتہائی سرگرم ہیں اور اعلیٰ کردار اور جذبۂ حب الوطنی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

اس دوران میں نے مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر نصف درجن بھر کتابچے لکھے۔

علاوہ ازیں بھارتی مقبوضہ کشمیر کے وہ عناصر جن میں سے کچھ نے ابتداء میں ہماری مسلح جدوجہدِ آزادی کو دہشت گردی قرار دیا تھا اور کچھ نے عسکری تربیت لبریشن فرنٹ کے زیرِ اہتمام حاصل کی تھی اور لبریشن فرنٹ اور اس کے نظریات سے وابستہ رہنے کا حلف اٹھایا تھا، آج لبریشن فرنٹ پر مختلف سمتوں سے وار کر کے مسلح جدوجہدِ آزادی کے چیمپئن ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔

گزشتہ پانچ سال کے متذکرہ بالا حالات، واقعات اور حقائق کے اپنے اپنے پس منظر ہیں جنہیں تفصیلاً" تاریخِ تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے سپرد کرنا انتہائی ضروری ہے تاکہ ہماری آئندہ نسلیں ان حقائق اور ان کے پس منظر سے آگاہ رہیں۔ لیکن مجھے اتنی فرصت نہیں کہ ان معاملات کو تفصیلاً" قلمبند کر کے اس کتاب میں شامل کروں۔ علاوہ ازیں بہت سے معاملات کے بارے میں اصل حقائق ابھی واضح طور پر سامنے نہیں آئے اور سب سے اہم بات یہ کہ گزشتہ پانچ سالہ دور کے کچھ واقعات اور حقائق ایسے ہیں جن کی اِس وقت تشہیر تحریکِ آزادی کے لئے ناقابل تلافی نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ زندگی رہی اور حالات نے اجازت دی تو ان معاملات اور مستقبل قریب کے واقعات کو کتاب کی دوسری جلد کی صورت میں شائع کیا جائے گا۔

راولپنڈی جنوری 1992ء

امان اللہ خان

اظہارِ تشکّر

ایک مصنف کتاب کے لئے مواد جمع کرنے اور اسے ترتیب دینے سے لے کر اس کی اشاعت اور تقسیم تک کے مرحلوں کے دوران احباب کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب لکھنے اور اسے شائع کرنے کے دوران کچھ احباب نے میری مدد کی۔ اس مدد کے بغیر اس کتاب کی اشاعت اور وہ بھی انتہائی عجلت میں تقریباً ناممکن تھی۔

کتاب کا مسودہ تیار کرنے کے ابتدائی مرحلے میں ضروری اور غیر ضروری مواد کی چھانٹی اور مسودے کے ادبی معیار کو بہتر بنانے کے سلسلے میں میری اہلیہ نے میری بڑی مدد کی۔ اس کے بعد بونجی گلگت کے قاری زید اللہ صاحب نے مختلف معاملات میں میری مدد کی اور اب دسمبر 1991ء میں پروف ریڈنگ (Proof Reading) وغیرہ کے سلسلے میں مقبوضہ کشمیر کے مجاہدین محمد اقبال میر، حیدر حجازی، الطاف اندرابی اور منظور خان نے میری بڑی مدد کی۔ ایس ایس ایس کمبائنڈ (پرنٹنگ) کے شیخ شجاع الحق صاحب نے کتاب کی کم سے کم وقت میں اشاعت کے سلسلے میں پوری دلچسپی اور محنت سے کام کیا۔ باغ آزاد کشمیر کے محمد حمید خان جو آج کل ملازمت کے سلسلے میں ابو ظہبی میں مقیم ہیں اور طالب علمی کے زمانے میں کراچی میں میرے پاس تھے نے کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں میری مالی مدد کی۔ علاوہ ازیں ڈڈیال میرپور آزاد کشمیر کے محمد حنیف صاحب حال ہڈرز فیلڈ برطانیہ نے بھی کچھ رقم مجھے جبراً تھما دی۔ میں ان سب حضرات کا انتہائی ممنون ہوں جنہوں نے اس انتہائی مختصر وقت میں کتاب کی اشاعت ممکن بنا دی۔

میں برطانوی پارلیمنٹ میں انسانی حقوق کی کمیٹی کے چیئرمین اور برطانیہ ہی میں قائم "فرینڈز آف کشمیر" کے سربراہ لارڈ ایرک ایوبری کا بھی انتہائی مشکور ہوں کہ انہوں نے کتاب کا پیش لفظ لکھا۔

معذرت

جیسا کہ میں نے "ضروری نوٹ" کے عنوان کے تحت واضح کیا ہے، میں نے کتاب کا مسودہ 1988ء کے اوائل میں تیار کیا تھا لیکن جولائی 1988ء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں مسلح جدوجہدِ آزادی شروع ہونے کے بعد میں اس جدوجہد سے متعلق امور میں اتنا مصروف ہو گیا کہ مسودے کی خامیاں دور کر کے اسے بہتر بنانے اور سوانح عمری کا آخری باب یعنی "کامیابی کی کسوٹی" جو کتاب کی روح ہے لکھنے کے لئے وقت ہی نہیں ملا۔ اودھر 11 دسمبر 1991ء کو ہم نے اعلان کیا کہ ہم 11 فروری 1992ء کو جنگ بندی لائن عبور کریں گے۔ اس اعلان کے کچھ دن بعد مجھے خیال آیا کہ کتاب 11 فروری 1992ء سے پہلے پہلے شائع ہو جانی چاہئے کیونکہ 11 فروری کو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان امکانات میں میرا جنگ بندی لائن عبور کرتے ہوئے بھارتی گولیوں کا نشانہ بننا، جنگ بندی لائن عبور کر کے بھارتیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر مدت تک پس دیوار زنداں رہنا اور تختۂ دار پر چڑھنا بھی شامل ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی امکانات ہیں۔ چنانچہ میں نے کتاب کا مسودہ دوبارہ اچھی طرح پڑھے بغیر ہی اشاعت کے لئے بھیج دیا کیونکہ 11 فروری کی تیاریوں کی وجہ سے میرے پاس اس کے لئے وقت ہی نہیں تھا --- یہی نہیں بلکہ مجھے کتاب کا اہم ترین باب یعنی "کامیابی کی کسوٹی" بھی انتہائی جلدی میں لکھنا پڑا۔ اس قسم کے عنوانات پر لکھنا انتہائی پرسکون ماحول اور مکمل تخلیئے کا متقاضی ہوتا ہے جو ان دنوں مجھے میسر نہیں کیونکہ 11 فروری کے پروگرام کے سلسلے میں دوڑ دھوپ کے علاوہ دفتر میں بھی لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ چنانچہ کتاب کا یہ اہم ترین باب نظر کی گہرائی - حقائق کے مناسب الفاظ میں اظہار۔ ذیلی عنوانات کی اہمیت کے لحاظ سے ان کی ترتیب - حقائق کی مناسب وضاحت اور زبان کے ادبی معیار کے لحاظ سے اس معیار کا نہیں جس کا یہ باب مستحق اور متقاضی تھا اور جو میں چاہتا تھا۔

عجلت کی وجہ سے کتاب کی پروف ریڈنگ (Proof Reading) بھی صحیح طریقے سے نہ ہو سکی جس کی وجہ سے کمپیوٹر کمپوزنگ (Computer Composing) کی بہت سے غلطیوں کی تصحیح نہ ہو سکی۔ علاوہ ازیں بہت سی دستاویزات اور تصویریں جو تحریک کے تعلق سے خاصی اہمیت

کی حامل تھیں بوجوہ کتاب میں شامل نہ ہو سکیں۔ چنانچہ کتاب کی ان جملہ خامیوں کا مجھے ازحد افسوس ہے - زندگی رہی - حالات نے اجازت دی اور کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی ضرورت محسوس ہوئی تو انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

میں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ میں اپنے ان ساتھیوں کا انتہائی ممنون ہوں جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں میرا ساتھ دیا - اپنے ان عظیم ساتھیوں کے اس پر خلوص تعاون کے بغیر میری ذات کی کوئی حیثیت نہ ہوتی نہ ہی تحریکِ آزادی کے سلسلے میں بھی میں وہ کردار ادا کر سکتا تھا جو میں نے اب تک کیا ہے - اسی طرح کشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی - کشمیر کمیٹی برائے افریشیائی عوامی اتحاد - محاذ رائے شماری اور (سابقہ) این ایل ایف میں بھی اپنے بہت سے ساتھیوں کا مشکور ہوں - بہر حال مجھے انتہائی افسوس ہے کہ میں کتاب کی اس جلد میں لبریشن فرنٹ کے ان ساتھیوں کا ذکر نہیں کر سکا ہوں جو اس میں 1986ء کے بعد شامل ہوئے یا جن سے میری شناسائی اس کے بعد ہوئی - 1987ء سے اب تک کے حالات و واقعات اور اس دوران ان ساتھیوں کا کردار میرے ذہن میں بھی محفوظ ہے اور اس بارے میں تحریری اور شائع شدہ مواد بھی جمع کر رہا ہوں - زندگی رہی اور حالات نے اجازت دی تو انشاء اللہ موجودہ تحریکِ آزادی کے اپنی منزل تک پہنچنے کے بعد 1987ء سے تب تک کے حالات و واقعات اور تحریک میں اہم حصہ لینے والوں سے متعلق تفصیلات کتاب کی دوسری جلد میں شامل کروں گا - فی الحال میں ان سب حضرات سے معذرت ہی کر سکتا ہوں -

1987ء کی ابتدا سے آج تک کی مدت کے دوران مجھے آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے بہت سے سیاسی رہنماؤں ' سیاسی کارکنوں اور سب سے اہم افراد یعنی مسلح جدوجہد آزادی میں مصروف سینکڑوں حریت پسندوں سے قریبی تعلق رہا - ان میں سے بہت سے اصحاب نے میرے ذہن پر اپنے مختلف نوعیت کے نقش مرتب کئے ہیں - اس کے علاوہ کچھ اہم معاملات کے بارے میں کچھ غیر سیاسی لوگوں سے بھی واسطہ پڑا - انشاء اللہ کتاب کی دوسری جلد ان سب کا احاطہ کرے گی -

راولپنڈی ۔ جنوری 1992ء

امان اللہ خان

حِصّہ اوّل

میری نجی زندگی

جہدِ مسلسل

پہلا باب

میرے آباء و اجداد اور عزیز

اس صدی کے اوائل تک میرا آبائی علاقہ (استور ۔گلگت) ایک انتہائی پسماندہ علاقہ تھا جس کی وجہ سے میرے آباو اجداد کا کوئی مستند اور ضبط تحریر میں لایا گیا شجرہ نصب موجود نہیں کیونکہ اس زمانے میں وہاں نہ تو اس کا رواج تھا نہ ہی لوگ اتنے باشعور اور لکھے پڑھے تھے کہ مختلف خاندانوں کے شجرہ ہائے نسب تیار کئے جاتے۔ البتہ میرے ماموں حاجی عبدالرحیم خان مرحوم اور میرے سسر عبدالحمید خان خاور مرحوم (جنہوں نے گلگت کے اکثر خاندانوں کے شجرہ ہائے نسب کے بارے میں گہری تحقیق کی ہے) کے مطابق میرے آباو اجداد گلگت کے جنوب مغرب میں واقع علاقہ یاغستان سے تعلق رکھتے تھے۔ غالباً اٹھارہویں صدی کے اوائل میں انہوں نے یاغستان سے ہجرت کی۔ ان میں سے کچھ لوگ چلاس (گلگت) کے علاقہ تھور میں آباد ہوئے ان کی اولاد آج بھی تھور میں آباد ہے اور منو کے کہلاتی ہے۔ یاغستان سے ہجرت کرنے والے دوسرے افراد جا کر وادی کشمیر کے علاوہ پانپور میں آباد ہوئے۔ جو زعفران کی کاشت کے لئے مشہور ہے اور سری نگر سے دس بارہ کلو میٹر دور جنوب مشرق میں واقع ہے۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں پانپور میں آباد ہونے والوں کی اولاد میں سے تین بھائی دائم یوسف اور قائم وہاں سے ہجرت کر کے گریز پہنچے۔ دائم گریز کے علاقہ بگتور میں آباد ہوا اور اس کی اولاد وہاں پھلی پھولی یہاں تک کہ انہوں نے علاقے کی ذیلداری بھی حاصل کی جو 1950ء تک ان کے پاس تھی۔ دائم کی اولاد میں سے کچھ افراد ہجرت کر کے آزاد کشمیر کے ضلع مظفرآباد کے شمالی حصے تاوبٹ وغیرہ میں آباد ہوئے ہیں۔ ان میں اہم ترین شخصیت قمرالدین مرحوم تھے جو علاقے کی یونین کونسل کے چیئرمین بھی رہے۔ یوسف اور قائم استور چلے گئے ایک استور کے علاقہ درلہ میں آباد ہوا۔ اس کی اولاد آج بھی وہیں ہے۔ اس کے پوتے نمبردار عبدالکریم علاقے کی معزز شخصیت تھے۔ ان کے تین بیٹے ہیں جن میں سے محمد شریف آج کل درلہ پائین میں مقیم ہے۔ اس کا شمار بھی علاقے کے معزز افراد میں ہوتا ہے۔

دوسرے بھائی (میرے پردادا) استور کے علاقہ گوریکوٹ میں آباد ہوئے اور وہاں بارہ

سال تک وزیری کے فرائض انجام دیئے۔ اس زمانے میں مقامی راجوں کے مشیر وزیر کہلاتے تھے۔ گوریکوٹ میں ایک طویل مدت تک قیام کرنے کے بعد وہ استور خاص (پتی پورہ) منتقل ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نور خان (میرے دادا) اور ستار علاقہ پری شنگ منتقل ہو گئے جہاں وہ پہلے موضع شیپہ میں اور بعد میں موضع کھنگرول میں آباد ہوئے اور اس کے بعد یعنی گذشتہ تقریباً ایک سو سال سے ان کی اولاد یعنی ہمارا خاندان کھنگرول میں ہی آباد ہے گو ہماری اراضی (زمینیں) پری شنگ کے دیگر دیہات میں بھی ہے۔میری پیدائش بھی کھنگرول میں ہی ہوئی۔

علاقہ استور بلکہ پورے علاقہ گلگت میں ہر خاندان کا اپنا ایک نام ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے خاندان والے مقامی طور پر ہنچے کہلاتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ معلوم نہ ہو سکی۔ وادیٔ کشمیر میں قیام کے دوران ہمارے آباؤ اجداد میر (اور ایک روایت کے مطابق ہڑے) کہلاتے تھے۔

میرے دادا نور خان کے بھائی ستار کا ایک ہی بیٹا روزی خان تھا۔ روزی خان کا بھی ایک ہی بیٹا غنی تھا اور غنی کا بھی ایک ہی بیٹا جلیل ہے۔

میرے دادا نور خان کے چار بیٹے فقیر محمد، نعمت خان، جمعہ خان اور اکبر خان اور تین بیٹیاں تھیں۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں ایک بیوی سے اور نعمت خان اور ایک بیٹی دوسری بیوی سے تھے۔ فقیر محمد لاولد فوت ہو گئے۔ نعمت خان کا ایک بیٹا افضل خان تھا اور اس کے تین بیٹے محمد صغیر، دلاور خان اور عبداللہ خان اور دو بیٹیاں ہیں۔

میرے والد جمعہ خان کا ایک بیٹا (میں) اور آٹھ بیٹیاں تھیں۔ میری ایک ہی بیٹی اسما ہے جبکہ میری چھ بہنوں (دو بہنیں بے اولاد فوت ہوئیں) کی کافی اولاد ہے۔ میرے سب سے بڑے بہنوئی کھوکھر خان میرے والد صاحب کے گھر داماد تھے اور شادی کے بعد تقریباً چالیس سال تک ہمارے ہاں ہی رہے۔ میری ہمشیرہ کے بطن سے ان کے تین بیٹے مولوی محمد صدیق، غلام رسول اور ڈاکٹر محبوب عالم اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ مولوی محمد صدیق ہمارے ہاں ہی پیدا ہوئے تھے چنانچہ والد صاحب اس سے نواسے کی بجائے اپنے بیٹے کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ میرے دوسرے بہنوئی گرداور نعمت خان کے (میری ہمشیرہ کے بطن سے) ایک بیٹی اور تین بیٹے شجاعت خان (ملازم محکمہ مال) محمد اشرف خان منیجنگ ڈائریکٹر پاکستان چائنا ٹریڈ سنڈیکیٹ گلگت اور ماسٹر محمد مشروف خان ہیں۔ میرے تیسرے بہنوئی نور محمد کا ایک بیٹا عبدالمنان اور ایک بیٹی ہے۔ چوتھے بہنوئی ماسٹر ہاشم علی خان کے (میری بہن کے بطن سے) دو بیٹے الطاف علی خان اور محمد نظیم خان ہیں۔ پانچویں بہنوئی منشی نعمت خان کے چار بیٹے محمد شیر، انجینئر محمد نواز مرحوم ماسٹر شوکت علی اور سیف اللہ خان مینجر زرعی بنک اور چار بیٹیاں ہیں اور چھٹے بہنوئی ماسٹر فرض خان کے آٹھ بیٹے ثناء اللہ خان

محبوب علی خان (سابق ممبر گلگت بلتستان کونسل) انجینئر خورشید عالم، فرید اللہ خان، عبدالوحید خان، فیض اللہ خان، عبدالمحیط اور منور علی خان اور ایک بہن ہیں۔

چچا اکبر خان کے چار بیٹے عنایت خان، صاحب خان، محمد جمیل شہید اور ڈاکٹر نور جلیل کے علاوہ چار بیٹیاں تھیں۔ عنایت خان کی شادی میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد میری والدہ سے ہوئی تھی جن کے بطن سے ان کے چار بیٹے علی اللہ خان (ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر) اسکواڈرن لیڈر ڈاکٹر نیاز محمد، عبدالمناف اور عبداللطیف اور ایک بیٹی ہیں۔ (اس طرح یہ چاروں میرے ماں ایک بھائی بھی ہیں) اور دوسری بیوی کے بطن سے تین بیٹے اورنگزیب حفیظ اللہ اور منظور احمد اور دو بیٹیاں ہیں۔ علی اللہ خان کے چار بیٹے اسد اللہ خان۔ سعید اللہ خان الطاف علی اور کلیم اللہ خان اور تین بیٹیاں ہیں۔ نیاز محمد کے دو بیٹے محمد زبیر اور بلال احمد ہیں۔ عبدالمناف کے سات بیٹے احسان اللہ، طفیل محمد، مقبول احمد، فیض احمد، معراج احمد اور حشمت اللہ اور تین بیٹیاں ہیں جبکہ عبداللطیف کی ایک ہی بیٹی ہے۔

میرے دوسرے چچا زاد بھائی حاجی صاحب خان کے چھ بیٹے انجینئر قدم خان، محمد سلیم ڈی ایس پی (اے ایس ایف) ظفر اللہ خان، محمد ایوب خان، نیک عالم اور محمد بشارت اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ میرے تیسرے چچا زاد بھائی محمد جمیل 1947ء کی جنگ آزادی کے دوران گریز کے محاذ پر شہید ہوئے۔ شہادت کے وقت وہ غیر شادی شدہ تھے۔ ان کا نام گلگت شہر میں قائم مینارِ شہدا پر کندہ ہے۔ میرے چوتھے چچا زاد بھائی ڈاکٹر نور جلیل کے چار بیٹے محمد فاروق، ضیاء الحق، ریاض الحق اور نوید الحق اور سات بیٹیاں ہیں۔

میرے سب سے بڑے چچا زاد بہنوئی حاجی عبدالغنی مرحوم سابق رینج آفیسر جنگلات کے چار بیٹے جمشید علی خان انجینئر، عبدالرحمٰن افسر محکمہ معدنیات، عبدالقیوم ڈی ایف او اور مشتاق احمد ایڈووکیٹ اور دو بیٹیاں تھیں۔ دوسرے چچازاد بہنوئی رحیم خان کے چار بیٹے میں محمد نظیم۔ محمد عیسٰی، محمد حنیف اور عبدالرؤف اور دو بیٹیاں ہیں۔ تیسرے چچا زاد بہنوئی بہادر خان کے چار بیٹے مسیح اللہ، ثناء اللہ، حبیب اللہ اور اکرام اللہ اور ایک بیٹی ہیں۔ چوتھے چچا زاد بہنوئی سجاور خان کے میری چچا زاد بہن کے بطن سے چار بیٹے محمد ابراہیم، سنگ علی، شیر عالم اور نور عالم اور دو بیٹیاں اور میری بھانجی کے بطن سے میر عالم، سید عالم، شفیع عالم ہیں۔

میری تین پھوپھیاں تھیں۔ ایک پھوپھی کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دوسری پھوپھی (پھوپھا کا نام بہادر خان تھا) کے چار بیٹے رحمت اللہ، محمد رمضان، محمد عبداللہ اور عبدالخالق اور چار بیٹیاں تھیں۔ رحمت اللہ لاولد فوت ہو گئے۔ محمد رمضان کا ایک بیٹا محمد حسین ہے۔ محمد عبداللہ کے چار بیٹے عبدالکریم، محمد یوسف، نواب خان اور اسلم عبداللہ ہیں اور عبدالخالق کے دو بیٹے محمد طیب اور عبداللطیف ہیں۔ دوسری پھوپھی کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا روزی خان تھے۔

روزی خان لاولد رہا۔

میرے دو سگے ماموں اور ایک سگی خالہ ہے۔ بڑے ماموں محمد یعقوب کے دو بیٹے فقیر محمد مرحوم اور ڈاکٹر محمد قاسم اور چار بیٹیاں ہیں۔ ڈاکٹر قاسم کی والدہ میری بھانجی اور رجاعی بہن بھی ہے۔ دوسرے ماموں عبدالعزیز کے تین بیٹے کھوکھر دین ، عبدالحیط اور عبدالقیوم اور تین بیٹیاں ہیں۔ میری خالہ جو میرے بھانجے غلام رسول کے نکاح میں ہے کے تین بیٹے غلام رضا ۔ غلام نور اور جمال ناصر اور ایک بیٹی ہے۔

میری بڑی والدہ (والد صاحب کی پہلی اہلیہ) کے تین بھائی حاجی عبدالرحیم خان ، عبدالغفور اور عبدالخالق اور ایک بہن تھی۔ حاجی عبدالرحیم خان کے تین بیٹے حاجی عبدالغنی سابق رینج آفیسر محمد حنیف سابق روڈ انسپکٹر اور محمد اسماعیل خان سابق ڈپٹی کمشنر اور چار بیٹیاں تھیں۔ دوسرے بھائی عبدالغفور کے چار بیٹے صوبیدار امان اللہ خان ، نصر اللہ خان ، نصرالدین اور ثناء اللہ خان اور چھ بیٹیاں ہیں اور تیسرے بھائی عبدالخالق کی پانچ بیٹیاں ہیں۔ حاجی عبدالغنی میرے چچا زاد بہنوئی بھی تھے جن کی اولاد کا ذکر اوپر آ چکا ہے محمد حنیف کے تین بیٹے محمد عباس ، محمد فیاض اور محمد اسرار اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ محمد اسماعیل خان کے سات بیٹے ماسٹر محمد سلیم ۔ کیپٹن اقبال اسماعیل ، آفتاب اسماعیل ، اشفاق اسماعیل ، اسحاق اسماعیل اور ابرار اسماعیل اور چھ بیٹیاں ہیں۔ صوبیدار امان اللہ کے تین بیٹے انعام اللہ ، عرفان اللہ اور ظفراللہ اور دو بیٹیاں نصر اللہ کے دو بیٹے نظام اللہ اور ضیاء اللہ اور پانچ بیٹیاں ۔ نصیرالدین کے پانچ بیٹے صلاح الدین معراج الدین، حفاظ الدین ، اعجاز الدین اور وجاہت علی اور چار بیٹیاں اور ثناء اللہ کے تین بیٹے عدنان اللہ ، رضوان اللہ اور محمد عادل اور دو بیٹیاں ہیں۔

میری بڑی والدہ کی ہمشیرہ کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی شادی سے دو بیٹے محمد یوسف اور عبدالحمید اور دو بیٹیاں تھیں اور دوسرے شوہر مولانا محمد دوست سے چار بیٹے مولوی محمد رضا، محمد عیسیٰ، مولوی عبدالمنان اور ماسٹر محمد اشرف اور تین بیٹیاں تھیں۔ محمد یوسف کا ایک بیٹا فضل الرحمٰن اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ عبدالحمید کے تین بیٹے عبدالصبور ، مجیب الرحمٰن اور نقیب الرحمٰن اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ مولوی محمد رضا کے پانچ بیٹے ڈاکٹر عبدالمنان، عطاء الرحمٰن، حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر محمد عثمان اور رشید احمد (انجینئر) اور چھ بیٹیاں ہیں۔ محمد عیسیٰ کے سات بیٹے محمد اسلم ، عبیداللہ، فرید اللہ، زاہد اللہ، ظفر اللہ، وقار اللہ اور عاطف اللہ اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ مولوی عبدالمنان کے چار بیٹے عبدالنصیر، عبدالبصیر، جاراللہ اور عمر فاروق اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ ماسٹر محمد اشرف کے چار بیٹے حفیظ الرحمٰن، ضیاء الرحمٰن، فہیم الرحمٰن اور شمس الرحمٰن اور چھ بیٹیاں ہیں۔

میری شادی ستمبر 1973ء میں گلگت کے ریٹائرڈ اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس اور سابق ممبر

گلگت بلتستان کونسل عبدالحمید خان خاور مرحوم کی بیٹی زاہدہ پروین سے ہوئی۔ الجزائر اور فلسطین کے حریت پسندوں کے حالات زندگی پڑھنے کے بعد میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ شادی کے بعد انسان کی ذاتی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں اور توجہ بھی بٹ جاتی ہے جس سے تحریک آزادی میں اس کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے لیکن میری والدہ، بہنوں اور دوسرے بزرگوں کا دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ میں شادی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ جولائی 74ء میں میری بیٹی اسما پیدا ہوئی جو میری واحد اولاد ہے۔

میری ساس کا تعلق گوریکوٹ استور کے دڑم خیل وزیر خاندان سے تھا۔ ان کے والد وزیر محمد خان کشمیر اسمبلی کے ممبر بھی رہے تھے۔ میرے سسر کے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد تکین کے تین بیٹے ڈاکٹر محمد تنظیم، محمد ندیم اور عزیز الرحیم اور تین بیٹیاں ہیں۔ ایک اور بھائی محمد نواز کے بیٹے عبدالعزیز تھے جن کا ایک بیٹا طارق عزیز اور دو بیٹیاں ہیں۔ میرے سسر کے چار بیٹے انجینئر عبدالوحید۔ شوکت رشید ڈی ایس پی، ڈاکٹر احمد سعید اور شاہد حمید اور چار بیٹیاں ہیں۔ عبدالوحید کے دو بیٹے عابد مجید اور منصور شہید اور تین بیٹیاں ہیں۔ شوکت رشید کے تین بیٹے عمر فاروق عثمان حیدر اور وقاص علی اور تین بیٹیاں ہیں اور احمد سعید کا ایک بیٹا ولید خاور ہے۔ میرے سسر نے اپنے سوتیلے بیٹے ڈاکٹر محمد لطیف کو بھی پالا اور پڑھایا ہے۔ ڈاکٹر لطیف کے دو بیٹے خالد لطیف اور راحت لطیف اور تین بیٹیاں ہیں۔ میرے بڑے ہمزلف بریگیڈیئر برکت علی خان کے دو بیٹے شفقت علی خان اور رفعت علی خان اور تین بیٹیاں ہیں جبکہ دوسرے ہمزلف علی احمد جان مرحوم کے چار بیٹے وجاہت علی خان شجاعت علی خان فیصل عثمان اور محمد یاسر اور ایک بیٹی ہے۔

میرے خاندان کے دوسرے قابل ذکر افراد میں سے میرے بھانجے شجاعت خان کا بیٹا ڈاکٹر رشید احمد اور دوسرے بھانجے محمد اشرف خان کی بیٹی ڈاکٹر پروین اشرف ہے جو ہمارے خاندان کی پہلی لیڈی ڈاکٹر ہے۔ اس کا بھائی طارق اشرف بھی ایم بی بی ایس کر رہا ہے۔

یہ تھی میرے اپنے بزرگوں اور عزیزوں اور میرے سسرال سے تعلق رکھنے والے بزرگوں اور عزیزوں کی فہرست۔ مجھے خوشی ہے کہ آج میرے (ماں ایک) بھائیوں، بھتیجوں اور بھانجوں پر مشتمل جو نصف درجن بھر ڈاکٹر۔ اتنے ہی انجینئر اور اچھے عہدوں پر فائض درجن بھر دوسرے عزیز ہیں ان میں سے ایک بڑی تعداد کے تعلیمی اخراجات میں نے برداشت کئے ہیں۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ میرے عزیزوں میں سے اکثر میرے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے بھائیوں، بھتیجوں اور بھانجوں کے تعلیمی اخراجات برداشت کر رہے ہیں۔

دوسرا باب

میرا بچپن اور میری تعلیم

میرے والد صاحب گرداور جمعہ خان کی پہلی شادی استور (گلگت) کے موضع ڈوئیاں کے نمبردار حاجی عبدالرحیم خان کی بہن سے ہوئی تھی جن کے بطن سے آٹھ بیٹیاں ہوئیں۔ دو بیٹے بھی ہوئے تھے لیکن وہ بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ چنانچہ میرے والد صاحب پر ان کی اہلیہ نے دباؤ ڈالا کہ وہ دوسری شادی کریں تاکہ ان کی بیٹیوں کے لئے بھائی کی شکل میں کوئی سہارا پیدا ہو۔ والد صاحب نے اپنے ہی گاؤں کے ایک معزز باشندے حمزہ خان کی نوجوان بیٹی سے شادی کی جس کے بطن سے 24 اگست 1934ء کو میں پیدا ہوا۔

میرے والد صاحب علاقہ استور کے گنے چنے پڑھے لکھے افراد میں سے ایک تھے کچھ مدت تک وہ قائم مقام نائب تحصیلدار بھی رہے تھے جو اس زمانے میں علاقے میں سب سے بڑا سرکاری عہدہ ہوتا تھا۔ وہ اپنی شرافت، دیانت، فرض شناسی اور اصول پرستی کی وجہ سے سارے علاقے میں مشہور و مقبول تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی بالغ زندگی کے دوران ایک وقت کی نماز بھی نہیں چھوڑی تھی۔ ریاستی حکومت بھی ان کا احترام کرتی تھی چنانچہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہیں پری شنگ کے سات دیہات کا نمبردار بنایا گیا۔ اس زمانے میں نمبردار (اور وہ بھی سات دیہات کے) کو انتہائی عزت و احترام حاصل ہوتا تھا۔ پری شنگ کے سابق نمبردار صمد خان انتہائی سخت طبیعت کے انسان تھے جس کی وجہ سے عوام ان سے نالاں تھے۔ علاوہ ازیں انہوں نے علاقے میں قحط پڑنے کی وجہ سے حکومت کی طرف سے معاف کیا گیا مالیہ بھی عوام سے وصول کر کے خود ہضم کیا تھا جس کی وجہ سے حکومت بھی ان کے خلاف تھی چنانچہ حکومت نے نمبرداری ان سے لے کر میرے والد کو دی تھی جس کی وجہ سے صمد خان کا انتہائی طاقتور خاندان میرے والد صاحب کا جانی دشمن بن گیا تھا۔ انہوں نے والد صاحب کو قتل کرنے کی بھی کئی ناکام کوششیں کیں۔ بہرحال میرے والد صاحب میری پیدائش کے تقریباً ڈھائی سال بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔

نمبرداری عام طور پر موروثی ہوتی ہے اس لئے والد صاحب کی وفات کے بعد یہ مجھے منتقل ہو گئی لیکن میں اس وقت صرف ڈھائی سال کا بچہ تھا چنانچہ میرے چچا اکبر خان کو سربراہ نمبردار بنایا گیا۔ وہ ایک انتہائی سادہ انسان تھے۔ چنانچہ صمد خان کا خاندان ان پر پے در پے حملے کرتا رہا۔ ایک بار ان پر سنگ باری بھی کی گئی۔ ادھر کچھ مدت بعد صمد خان کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کا بیٹا سعادت خان بڑے دبدبے اور اثرو رسوخ والا انسان تھا چنانچہ اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے میرے چچا سے سربراہ نمبردار کا عہدہ چھین لیا لیکن میرے بڑے ماموں حاجی عبدالرحیم خان اور بہنوئی گرداور نعمت خان کی کوششوں سے چھ ماہ بعد ہی سربراہی پھر ہمارے خاندان کو منتقل ہو گئی اور میرے تایازاد بھائی محمد افضل خان سے جو پولیس میں ملازم تھے، ملازمت چھڑا کر اسے سربراہ نمبردار بنایا گیا۔ میری والدہ جوان تھیں چنانچہ خاندان کے بزرگوں نے باہمی مشورے سے ان کی شادی میرے چچا زاد بھائی عنایت خان سے کر دی۔

میں والد صاحب کی زندگی میں انتہائی ناز سے پلا تھا لیکن ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی میری زندگی یکسر بدل گئی۔ اُدھر صمد خان کے خاندان والے میری جان کے درپے تھے اور مجھے جان سے مار دینا چاہتے تھے تاکہ نمبرداری دوبارہ ان کے خاندان کو منتقل ہو جائے۔ انہوں نے مجھے زہر دے کر مار ڈالنے کی بھی کوشش کی لیکن ناکام رہے چنانچہ میری سخت نگرانی کی جاتی تھی اور میری حیثیت ڈھائی سال کی عمر سے ہی عملاً ایک قیدی کی سی ہو گئی تھی۔

میرے ایک بہنوئی ماسٹر ہاشم علی خان تھے۔ ان کا تعلق وادیٔ کشمیر کے علاقہ ہائی ہامہ (ضلع کپوارہ) کے ایک پٹھان جاگیردار خاندان سے تھا۔ وہ استور میں سولہ سال تک سکول ماسٹر رہے تھے اور اسی دوران انہوں نے میری بہن سے شادی کی تھی۔ والد صاحب نے انہیں رہائش کے لئے اپنے وسیع مکان کا ایک حصہ دیا تھا چنانچہ وہ اور میری ہمشیرہ بھی میری نگرانی اور پرورش کے سلسلے میں میری دو ماؤں کی مدد کرتے تھے۔ یہ سلسلہ 1939ء تک جاری رہا۔ 1939ء میں میں کبھی کبھی اپنے بہنوئی کے ساتھ سکول بھی جاتا تھا۔ اسی سال ان کا تبادلہ ہائی ہامہ ہو گیا اور وہ اپنے عیال (میری ہمشیرہ اور دو بچوں الطاف علی خان اور محمد عظیم خان) کو استور میں ہی چھوڑ کر ہائی ہامہ چلے گئے۔

1940ء یا 41ء میں ماسٹر ہاشم علی خان صاحب اپنے بچوں کو ہائی ہامہ لے جانے کے لئے استور آئے۔ ان کی استور سے غیر حاضری کے دوران میں اپنے چھوٹے بہنوئی ماسٹر فرض خان کے ساتھ اپنے گاؤں سے تیس کلومیٹر دور ایک گاؤں تری شنگ میں پڑھتا رہا۔ ماسٹر ہاشم علی خان کے استور آنے پر اہل خاندان کے باہمی مشورے کے بعد فیصلہ ہوا کہ ماسٹر صاحب مجھے بھی اپنے بچوں کے ساتھ ہائی ہامہ لے جائیں۔ اس فیصلے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ماسٹر صاحب میرے والد صاحب سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کرنا چاہتے تھے۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے میرے ذاتی محسن کا

باب) دوسری وجہ یہ تھی کہ اس طرح میں پری شنگ میں موجود خاندانی دشمنوں کی دسترس سے دور ہو جاتا اور تیسری یہ کہ میں پری شنگ کی نسبت ہائی ہامہ میں بہتر تعلیم حاصل کر سکتا تھا۔ چنانچہ ماسٹر صاحب مجھے اپنے ساتھ ہائی ہامہ لے گئے۔ میری بڑی والدہ میری جدائی برداشت نہ کر سکیں اور میرے ہائی ہامہ جانے کے چند ماہ بعد ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

میں نے پانچویں جماعت تک تعلیم ہائی ہامہ ہی میں پڑھی۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد ذہین مسلمان طلباء کے لئے وظیفہ (مسلم سکالر شپ) دینے کے لئے حکومت کی طرف سے لئے گئے خصوصی امتحان میں میں پوری تحصیل ہندواڑہ میں اول آیا اور وظیفہ (دو روپے ماہوار) حاصل کر لیا۔ نزدیک ترین مڈل سکول ہائی ہامہ سے نو کلومیٹر کے فاصلے پر موضع کاری ہامہ میں تھا۔ چنانچہ میں نے اس میں داخلہ لیا۔ دو سال تک ہائی ہامہ سے کاری ہامہ روز پیدل جاتا رہا یعنی روزانہ 18 کلومیٹر چلتا رہا۔ تیسرے سال کچھ مدت تک کاری ہامہ سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع موضع گوشی میں اور بعد میں کاری ہامہ ہی کے ایک دوکاندار حبیب خان صاحب کے ہاں (Paying Guest) کے طور پر رہا۔ چھٹی جماعت سے آٹھویں تک ایک ہندو لڑکے ارجن داس کے ساتھ میرا خوب مقابلہ رہا۔ ایک امتحان میں میں کلاس میں اول آتا تو دوسرے میں وہ، ہم دونوں کی اس ٹکر کے نتیجے میں ہمارے اساتذہ بھی دو گروپوں میں بٹ گئے تھے۔ ارجن داس سے اس مقابلے کے بارے میں میں اتنا سنجیدہ ہو گیا تھا کہ ایک بار امتحان کے دوران طغیانی والے دریائے کہمل کو عبور کرتے ہوئے ڈوبنے سے بال بال بچ گیا۔ آٹھویں کلاس کے امتحان میں میں نے ضلع بھر میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ ارجن امتحان سے پہلے ہی سری نگر کے کسی سکول میں داخل ہو گیا تھا۔

آٹھویں پاس کرنے کے بعد میں نے ہائی سکول ہندوارہ میں داخلہ لیا۔ میری رہائش کا انتظام کاری ہامہ کے حبیب خان صاحب نے ہندوارہ سے کوئی ڈیڑھ کلو میٹر دور موضع براری پورہ میں اپنے بہنوئی صمد وانی نمبردار کے ہاں کیا۔ میں نے میٹرک کا امتحان کشمیر یونیورسٹی سے 1950ء میں امتیازی حیثیت میں پاس کیا اور یونیورسٹی بھر میں مسلمان طلباء میں اول آیا۔ ویسے میری پوزیشن سولہویں یا سترہویں تھی۔ یونیورسٹی کی میرٹ لسٹ (پہلی بیس پوزیشنز حاصل کرنے والوں) میں میں واحد مسلمان تھا۔ باقی سب غیر مسلم تھے۔

میٹرک کے بعد میں نے نیشنل کانفرنس کے سیکرٹری جنرل مولانا محمد سعید مسعودی صاحب کی مدد سے ایس پی کالج سری نگر میں داخلہ لیا۔ کالج میں میرا غالباً دوسرا دن تھا کہ ایک پروفیسر (پروفیسر سیف الدین مرحوم) مجھے بلا کر سٹاف روم میں لے گئے اور وہاں موجود دوسرے مسلمان پروفیسروں (پروفیسر یوسف، پروفیسر نصر اللہ، پروفیسر جان محمد وغیرہ) سے کہنے لگے کہ یہ ہے وہ نوجوان جس نے ہماری ناک رکھی یعنی میرٹ لسٹ پر آنے والا واحد مسلمان۔ انہیں جب یہ

معلوم ہوا کہ میرا تعلق استور گلگت سے ہے تو انہوں نے مجھے اور بھی شاباش دی اور مشورہ دیا کہ میں آرٹس کی بجائے سائنس کے مضامین لے لوں، چنانچہ ان ہی کی کوشش سے مجھے پری میڈیکل Pre-Medical کلاس میں داخلہ ملا جسے کچھ دنوں کے بعد پری انجینئرنگ Pre-Engineering میں تبدیل کرا دیا۔ چونکہ میٹرک تک میں نے سائنس نہیں پڑھی تھی (بلکہ فارسی اور اردو ادب کے مضامین پڑھے تھے) اس لئے سائنس کے مضامین خاص کر کیمسٹری کو سمجھنے میں بڑی مشکل پیش آتی رہی چنانچہ میں سال اول میں بڑی مشکل سے پاس ہوا۔ اس کے بعد حالات نے پلٹہ کھایا اور مجھے اپنی بھارت مخالف سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے پاکستان کی طرف بھاگنا پڑا۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے "طالب علم کی حیثیت سے میری سیاسی سرگرمیاں" کا باب)

میں 2 جنوری 1952ء کو براستہ جموں، سیالکوٹ پاکستان آیا۔ راولپنڈی میں میری ملاقات اپنے ماموں زاد بھائی محمد اسماعیل خان سے ہوئی جنھوں نے گارڈن کالج راولپنڈی میں میرا داخلہ کرانے کی کوشش کی لیکن کالج والوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس نے کشمیر یونیورسٹی سے میٹرک کیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی کشمیر یونیورسٹی کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے بعد برادرم اسماعیل خان نے خان عبدالحمید خان (سابق صدر آزاد کشمیر جنہیں وہ سری نگر سے جانتے تھے) کے ذریعہ پشاور یونیورسٹی سے صوبہ سرحد کے کسی کالج میں داخلے کی منظوری لے لی اور میں ایڈورڈز کالج پشاور میں داخل ہو گیا۔ اسی دوران میں نے پاکستان ایئر فورس میں جی ڈی پائلٹ کے لئے کمیشن کا امتحان دیا اور تحریری اور زبانی امتحان میں اپنے گروپ میں اول آیا لیکن میڈیکل میں ان فٹ قرار دیا گیا۔ کچھ مدت بعد مجھے دوبارہ بلایا گیا لیکن اس دوران گلگت میں ایک ہوائی حادثہ ہوا تھا جس سے متاثر ہو کر میرے ماموں، ماں، بہنوں اور بہنوئیوں نے مجھے ایئر فورس میں جانے سے سختی سے منع کیا۔ اس طرح میرا ہوائی جہاز کا پائلٹ بننے کا شوق پورا نہ ہو سکا۔

ایڈورڈز کالج پشاور کا وائس پرنسپل ایک مقامی عیسائی تھا۔ وہ غیر ضروری طور پر سخت گیر تھا اور اکثر شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا۔ میری شروع ہی سے اس سے نہیں بنتی تھی۔ دراصل وہ اپنے کسی دوست کے بیٹے کو کالج میں داخل کرانا چاہتا تھا۔ سیٹ ایک ہی تھی جس کے لئے ہم دونوں کا ٹیسٹ ہوا جس میں میں نے کہیں زیادہ نمبر لئے چنانچہ سیٹ مجھے مل گئی۔ وائس پرنسپل شروع ہی سے مجھ سے انتہائی سختی سے پیش آتا تھا۔ بات بات پر اور بلا کسی جواز کے مجھے ڈانٹنا اس کا معمول بن گیا تھا اور میں اس کے اس طرزِ عمل سے بہت تنگ آ گیا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور بلا کسی جائز جواز کے بری طرح ڈانٹ دیا۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے بھی اسے خوب سنائیں۔ اس پر اس نے مجھے ایک زور دار تھپڑ مارا تو میں نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ وہ کسی بہانے کی تلاش میں تھا جو اسے مل گیا اور اس نے مجھے

"وائس پرنسپل پر حملہ کرنے" کے جرم میں کالج سے نکلوا دیا۔ میں نے آسٹریلین پرنسپل کو حقائق بتائے لیکن اس نے بھی ایک نہ سنی چنانچہ مجھے کالج سے نکال دیا گیا۔ میں نے یونیورسٹی کے رجسٹرار ہاشم خان صاحب کو جنہوں نے خصوصی طور پر میرے داخلے کی منظوری دی تھی ساری کہانی سنائی۔ انہوں نے ایڈورڈز کالج فون کیا لیکن پرنسپل نے مجھے واپس لینے سے صاف انکار کیا۔ اس پر ہاشم خان صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ میں مردان میں نئے قائم ہوئے کالج میں داخلہ لے لوں کیونکہ اسلامیہ کالج پشاور میں نئے داخلے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے مجھے ایک خط دے کر مردان بھیج دیا' لیکن وہاں کالج میں سیکنڈ ائر میں کوئی اور طالب علم نہیں تھا۔ سٹاف کا بھی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ ادھر میری مالی پریشانیاں بھی بڑھ رہی تھیں اس لئے میں اوائل نومبر 1952ء میں مردان سے کراچی چلا آیا۔ کراچی کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ خود کفیل طلباء کے لئے ماں باپ کا کردار ادا کرتی ہے اور یہ حقیقت بھی تھی۔

میرے کراچی آنے پر میرے بزرگ خاص کر برادرم محمد اسماعیل خان مجھ سے ناراض ہو گئے تھے چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں ان لوگوں سے کوئی مالی مدد نہیں لوں گا۔ چاہتا تو اپنی موروثی جائیداد (زمین وغیرہ) بیچ کر اپنے تعلیمی اخراجات پورے کر سکتا تھا لیکن ضمیر نے اس کی اجازت نہیں دی اس لئے کراچی میں ابتدائی کچھ عرصہ بڑی مالی مشکلات میں گزارا۔ یہاں تک کہ اس اثنا میں چھ ماہ تک فٹ پاتھ پر بھی سویا۔ اس کے بعد محکمہ مردم شماری میں ملازم ہو گیا پھر اگست 1953ءمیں سندھ مسلم سائنس کالج میں داخلہ لے لیا لیکن 1954ء کے امتحان میں فیل ہو گیا اور 1955ء میں ایف ایس سی پاس کیا۔ خدا خدا کر کے سائنس سے جان چھوٹی اور میں نے اسی کالج میں آرٹس سیکشن میں بی اے میں داخلہ لیا اور 1957ء میں بی اے اچھے نمبروں سے پاس کیا اس کے بعد میں نے سندھ مسلم لاء کالج میں ایل ایل بی اور آئی پی بی اے میں ماسٹر آف پبلک ایڈمنسٹریشن (ایم پی اے) میں داخلہ لیا۔ایم پی اے میں داخلہ مجھے مقابلے کے ٹیسٹ میں کراچی کے تقریباً چار سو امیدواروں میں تیسری پوزیشن حاصل کرنے پر ملا تھا۔ ادھر ان دنوں میں نے اپنے نائٹ سکول کے ساتھ ساتھ ڈے سکول بھی کھولا تھا اور ایک پرائیویٹ سکول میں ملازمت بھی کرتا تھا۔ اس لئے نہ تو ایم پی اے کی کلاس میں باقاعدگی سے حاضر رہ سکتا تھا نہ ہی اس کی طرف سے ملنے والے بھاری ہوم ورک کے لئے وقت ملتا تھا چنانچہ چند ماہ بعد مجھے ایم پی اے کی کلاس کو خیرباد کہنا پڑا۔ لاء کالج بھی باقاعدگی سے نہیں جا سکتا تھا۔ بہر حال 1961ء میں میں نے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر لی۔

ادھر 1960ء میں میں نے بذریعہ خط و کتابت لنکنز ان (Lincolns Inn) لندن میں داخلہ لیا تھا اور بین الاقوامی پاسپورٹ بھی حاصل کیا تھا لیکن بعد میں کچھ تو بزرگوں خاص کر ماموں صاحب حاجی عبدالرحیم خان کے منع کرنے پر اور کچھ یہ سوچ کر کہ میرے کراچی سے چلے

جانے کے بعد میرے زیرِ کفالت اور زیرِ تعلیم نصف درجن بھر میرے عزیزوں کا مستقبل تباہ ہوجائے گا میں نے لندن جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس طرح میں بیرسٹری نہ کر سکا۔

1963ء میں میں نے کراچی یونیورسٹی میں خارجی طالب علم کی حیثیت سے بین الاقوامی امور میں ایم اے کی کلاس میں داخلہ لیا۔ سال اول کا امتحان 1964ء میں ہونا تھا لیکن امتحان کے دوران شیخ محمد عبداللہ کی پاکستان آمد کے سلسلے میں راولپنڈی میں تھا اس لئے امتحان نہ دے سکا۔ دوسرے سال امتحان مئی (1965) میں تھا لیکن امتحان شروع ہونے سے چند دن پہلے دہلی میں شیخ محمد عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کی گرفتاری کے خلاف مظاہرہ کرنے کی وجہ سے گرفتار ہو کر جیل چلا گیا اور امتحان نہ دے سکا۔ 1966ء میں بغیر مناسب تیاری کے سال اول کا امتحان دیا اور چار مضامین پاس کئے اس کے بعد شدید ذاتی اور سیاسی مصروفیات کی وجہ سے ایم اے فائنل کا امتحان نہ دے سکا چنانچہ شدید خواہش کے باوجود بین الاقوامی امور میں جو میرا پسندیدہ مضمون تھا، ایم اے نہ کر سکا۔

یہ تھی مختصر ترین الفاظ میں میرے بچپن اور میری تعلیم کی کہانی۔

تیسرا باب

میری ملازمتیں

ساتویں کلاس کی طالب علمی تک میں صرف طالب علم تھا اور میرے سارے اخراجات میرے بہنوئی ماسٹر ہاشم علی خان صاحب برداشت کرتے تھے۔ دو روپے ماہوار وظیفہ بھی مڈل سکول کی تعلیم کے دوران ملتا رہا۔ جب میں آٹھویں جماعت میں پہنچا اور کاری ہامہ میں حبیب خان کے ہاں رہنے لگا تو کبھی سکول کے وقفے کے دوران اور کبھی چھٹی کے بعد حبیب خان کی دکان سنبھالتا جو دکان کے علاوہ سکول کی کینٹین بھی تھی۔ ہائی سکول ہندواڑہ میں طالب علمی کے دوران میں نے اپنے میزبان صمد وانی نمبردار کی وفات کے بعد عملاً گاؤں کی نمبرداری سنبھالی کیونکہ صمدوانی کے بھائی اور جانشین محمد دانی صاحب ان پڑھ تھے۔ صمدوانی مرحوم کے دوسرے بھائی اسد وانی پٹواری تھے چنانچہ میں ان کا بھی ہاتھ بٹایا کرتا تھا بلکہ کئی بار ان کے ساتھ حلقے کے دورے پر بھی گیا اور خوب مرغے کھائے کیونکہ اس زمانے میں پٹواری کی ہر جگہ بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ سری نگر میں قیام کے دوران چند ماہ در جن میں تین روپے ماہوار فیس پر ٹیوشن پڑھائی۔ پاکستان آنے کے بعد کراچی میں سب سے پہلی ملازمت محکمہ مردم شماری میں کی۔ یہ ملازمت میں نے مقابلے میں تقریباً پچاس امیدواروں (جن میں سے اکثر گریجویٹ اور چند ایک ایم اے تھے) سے زیادہ نمبر لے کر حاصل کی تھی جس کی وجہ حساب میں میری مہارت تھی۔ چھ ماہ تک وہاں ملازمت کرنے کے بعد میں اگست 1953ء میں سٹی نائٹ سکول بولٹن مارکیٹ میں (ابتدائی طور پر تیس روپے ماہوار تنخواہ پر) بحیثیت ٹیچر ملازم ہوا۔ یہ ملازمت اگست 1956ء میں اچانک اختتام کو پہنچی۔ اس دوران چھ ماہ تک اورینٹ ایئرویز (جو بعد میں پی آئی اے بن گئی) میں ملازمت کی۔ اس کے بعد جرمن ماڈل سکول میں بحیثیت ٹیچر ملازم ہوا۔ سکول انگلش میڈیم تھا چنانچہ وہاں پڑھاتے ہوئے مجھے انگریزی بولنے پر عبور حاصل ہو گیا جس نے بعد میں مجھے اپنے قیام برطانیہ کے دوران بڑی مدد دی۔ یہ ملازمت میں نے چار سال تک جاری رکھی۔ اسی دوران کچھ مدت تک ریڈیو پاکستان کے کشمیری سیکشن میں مترجم (انگریزی سے کشمیری زبان میں) کے طور پر کام کرتا رہا۔ چند ماہ ڈاک خانے کی ملازمت بھی کی۔ اورینٹ ائرویز، ریڈیو پاکستان اور ڈاک خانے

کی ملازمتیں چھٹی پر گئے افراد کی جگہ تھیں اس لئے عارضی تھیں۔ کچھ مدت تک سٹی سکول میں بھی کام کیا۔ 1957ء سے 1961ء کے درمیان مجموعی طور پر کوئی دو سال کے عرصے کے دوران (اپنے قائم کردہ سکولوں کا خسارہ پورا کرنے کے لئے) بیک وقت دو دو ملازمتیں اور تین تین ٹیوشن بھی کرتا رہا اس طرح روزانہ تقریباً اٹھارہ گھنٹے کام کرتا تھا۔ اپنے سکولوں کی نگرانی اس کے علاوہ تھی۔

برطانیہ میں دس سالہ قیام کے ابتدائی سالوں میں میری رسمی حیثیت تو ماہنامہ وائس آف کشمیر انٹرنیشنل کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ایک تنخواہ دار ملازم کی تھی لیکن عملاً میں نے کوئی تنخواہ نہیں لی۔ میرے کچھ اخراجات تنظیم برداشت کرتی تھی اور کچھ کراچی (میرے سکولوں) سے آتے تھے۔ 1980ء میں میں نے کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کمپنی کی ایجنسی لی اور سال بھر میں کمیشن کے تقریباً چار ہزار پونڈ (تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار روپے) کمائے جس میں سے ڈھائی ہزار پونڈ (تقریباً اسی ہزار روپے) تنظیم (جموں کشمیر لبریشن فرنٹ) کو دیئے اور باقی اپنے ذاتی اخراجات کے لئے رکھے۔

یہ تھی میری ملازمتوں کی سرسری داستان۔

چوتھا باب

میرے تعلیمی ادارے

میری زندگی میں درجنوں ایسے واقعات پیش آئے ہیں جو میری زندگی کا رخ ہی موڑتے رہے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ اگست 1956ء میں پیش آیا جس کے نتیجے میں میں نے کراچی کے علاقے لی مارکیٹ میں اپنا نائٹ سکول قائم کیا جس نے میری زندگی کا رخ ہی موڑ دیا۔متذکرہ بالا واقعے کی تفصیلات "واقعات جنہوں نے میری زندگی کے رخ موڑ دیئے" کے عنوان کے تحت درج ہیں۔

اپنا سکول قائم کرتے وقت میرے پاس کل سرمایہ صرف پندرہ روپے تھا جن سے میں نے چھ پرانے بنچ خرید کر ان کی مرمت کرائی اور لی مارکیٹ میں اپنی رہائشی کوٹھڑی میں کشمیر نائٹ سکول کے نام سے اپنا سکول کھولا۔ بلیک بورڈ خریدنے کے لیے پیسے نہیں بچے اس لئے ساتھ والی دوکان سے تھوڑا سا سیمنٹ اور چونا لے کر ہاتھ سے ہی دیوار پر بورڈ بنانے لگا تو چونے سے ہاتھ جل گیا۔ بہرحال سکول شروع ہوا اور پہلے ہی دن دس لڑکے داخل ہوئے۔ جو سب دسویں کلاس کے تھے۔ میں دن اور رات کو کمرے کو اپنی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کرتا اور شام چھ بجے سے نو بجے تک اپنا بستر اور صندوق جو میری کل جائیداد تھی کمرے کی چھت پر رکھ دیتا اور کمرے میں بنچ ڈال کر اسے کلاس روم میں تبدیل کر دیتا۔ دو ماہ بعد ساتھ والا کمرہ بھی کرایہ پر لیا اور کچھ مدت بعد تیسرا کمرہ بھی ۔ ہمارا پہلے سال کا میٹرک کا نتیجہ سو فیصد رہا تو طلبا کی تعداد اور بھی تیزی سے بڑھنے لگی لیکن اس عمارت کا اور کوئی کمرہ ہمیں کرائے پر نہ مل سکا چنانچہ میں نے دوسری جگہ کی تلاش شروع کی۔ اسی دوران عید آئی اور میں عید کی نماز پڑھنے اپنے محلے سے ذرا دور واقع مسجد میں گیا تو وہاں دیکھا کہ مسجد کے ساتھ ہی ایک سکول نما عمارت بن رہی ہے۔ پتہ چلا کہ اس علاقہ میں بسنے والے افغان نژاد لوگوں کی تنظیم حبیبیہ ایجوکیشنل سوسائٹی اپنا سکول کھولنے کے لئے یہ عمارت تعمیر کر رہی ہے۔ میں سوسائٹی کے سربراہ نوران شاہ صاحب سے ملا جن سے معلوم ہوا کہ ان کا اپنا سکول عمارت میں صرف صبح کے وقت ہو گا چنانچہ وہ عمارت کی تکمیل پر عمارت ہمیں دو سو روپے ماہوار کرائے اور ایک سال کے کرائے کی پیشگی ادائیگی پر شام

کے چار گھنٹوں کے لئے کرایہ پر دینے پر آمادہ ہو گئے۔ میرے پاس ایڈوانس دینے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ ان دنوں میں دن کو جرمن ماڈل سکول میں پڑھاتا تھا جہاں کراچی کے مشہور صنعتکار یوسف دادا کے بچے بھی پڑھتے تھے جو مجھ سے بہت مانوس تھے۔ یوسف دادا بچوں کو سکول چھوڑنے اور سکول سے لے جانے کے لئے خود آتے تھے اور اسی دوران ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ انہوں نے کئی بار مجھ سے کہا تھا کہ اگر کبھی مجھے ان کی طرف سے کسی مدد کی ضرورت پڑے تو میں بلا تامل ان سے کہوں۔ چنانچہ جب میں نے ان سے اپنی ضرورت کا ذکر کیا تو انہوں نے فوراً مجھے دو ہزار روپے دیئے اور میں نے باقی رقم اپنی طرف سے ملا کر ایک سال کا کرایہ حاجی نوران شاہ صاحب کو ادا کیا اور ہمارے مابین کرایہ داری کا تحریری معاہدہ ہونے کے بعد میں نے جولائی 1957ء میں اپنا سکول اس عمارت میں منتقل کر دیا۔ حبیبیہ ایجوکیشنل سوسائٹی والوں کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ میں اپنے سکول کا نام بدل کر حبیبیہ نائٹ سکول رکھوں چنانچہ مجھے مجبوراً ایسا ہی کرنا پڑا کیونکہ اس کے بغیر وہ مجھے عمارت کرائے پر دینے کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔

نائٹ سکول نئی عمارت میں منتقل کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں دوپہر کو انگلش میڈیم سکول قائم کروں۔ سکول کی عمارت ایک بجے سے چھ بجے تک خالی رہتی تھی اور پورے علاقے میں کوئی انگلش میڈیم سکول نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے حاجی نوران شاہ صاحب سے بات کر کے عمارت ایک بجے سے چھ بجے تک کے لئے بھی دو سو روپیہ ماہوار کرائے پر لے لی اور چھوٹے بچوں کا انگلش میڈیم سکول مری ڈیل انگلش سکول Merry Dale English School کے نام سے قائم کیا۔ فیس آٹھ روپے ماہوار رکھی اور ایک ٹیچر مسز مارٹن کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ پر ملازم رکھا چھ ماہ تک سکول میں صرف دو بچے رہے جو بہن بھائی تھے اس لئے کل فیس ماہوار صرف بارہ روپے آتی تھی جبکہ اخراجات اوسطاً" ساڑھے چار سو روپے ماہوار سے زیادہ تھے۔ بہرحال میں نے ہمت نہیں ہاری اور دو سکولوں میں ملازمت کرنے کے علاوہ ٹیوشن بھی پڑھا کر سکول کا خسارہ پورا کرتا رہا۔ ابتدا میں کچھ قرضہ بھی لینا پڑا۔ کوئی ڈیڑھ سال بعد دن والا سکول بھی خود کفیل ہوگیا 1960ء تک دونوں سکول خاصا منافع دینے لگے جس سے میں نے قرضے بھی چکائے اور اپنے عزیزوں کے تعلیمی اخراجات بھی برداشت کرتا رہا۔ تھوڑا سا سرمایہ جمع ہوا تو وائس آف کشمیر کے نام سے ایک انگریزی ماہنامہ بھی جاری کیا۔

1961ء تک میرے دونوں سکول خاصی شہرت حاصل کرنے کے علاوہ خاصے منافع بخش بھی ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے دونوں سکولوں میں داخلے بند کرنے پڑے اس صورت حال کو دیکھ کر حبیبیہ ایجوکیشنل سوسائٹی والوں کے سکول کے ہیڈماسٹر (جو ایک مفتن اور سازشی قسم کا مولوی تھا) نے سوسائٹی کے سربراہ حاجی نوران شاہ کو مشورہ دیا کہ وہ مجھے سکولوں سے بے دخل

کر کے میرے سکولوں پر قبضہ کر لیں تاکہ میرے سکولوں کی آمدنی بھی ان کو ملے۔ حاجی صاحب مولوی کی باتوں میں آگئے اور مجھے سے مطالبہ کرنے لگے کہ میں ان کی عمارت خالی کر دوں۔ اس سلسلے میں انہوں نے سوسائٹی کے سنجیدہ اور انصاف پسند ممبروں کی بھی ایک نہ سنی۔

ایک دن میں دوپہر ایک بجے سکول پہنچا تو دیکھا کہ سکول کے دفتر کے دروازہ پر تالا لگا ہوا ہے اور ساتھ ہی حبیبیہ سوسائٹی کی طرف سے بے دخلی کا نوٹس بھی۔ نوٹس اور تالا دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر اس وقت میں نے کسی قسم کی کمزوری دکھائی تو کئی سال تک خون پسینہ ایک کر کے قائم کئے ہوئے اپنے سکولوں سے محروم ہو جاؤں گا۔ چنانچہ میں ساتھ والی دکان سے ہتھوڑی لے کر تالا توڑنے لگا۔ مفتن مولوی ساتھ ہی مسجد میں چھپ کر بیٹھا نوٹس کے بارے میں میرا ردعمل دیکھ رہا تھا۔ مجھے تالا توڑتے دیکھتے ہی وہ انتہائی غلیظ قسم کی گالیاں بکتا ہوا اوپر چلا آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ مولوی صاحب اپنی زبان کو لگام دیں اور مجھ سے دور رہیں لیکن وہ چپ ہونے کے بجائے فحش گالیاں بکتے ہوئے مجھ پر حملہ آور ہونے لگا تو ساتھ کھڑے میرے بھائی علی اللہ خان نے اسے گریبان سے پکڑ کر دو تین مکے اور لاتیں رسید کیں جن کے نتیجے میں مولوی صاحب سیڑھیوں سے لڑھک کر نیچے سڑک پر آ رہے اور سوسائٹی کے دفتر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے جہاں پہلے ہی سے کئے گئے انتظام کے تحت پولیس منتظر تھی جو فوراً حاجی نوران شاہ اور ہیڈ ماسٹر کے ساتھ سکول پہنچ گئی۔ اس اثنا میں میں دفتر کا تالا توڑ کر اندر داخل ہو چکا تھا۔ پولیس نے غالباً" حاجی صاحب سے خوب رشوت لی تھی چنانچہ ان کا رویہ میرے ساتھ انتہائی ترش تھا لیکن میری طرف سے ساری کہانی سننے کے بعد وہ لاجواب ہو گئے کیونکہ مقامی قانون اور میرے اور سوسائٹی کے مابین ہونے والے معاہدے کے تحت سوسائٹی والوں کو مجھے اس طرح بے دخل کرنے کی کوشش کرنے اور دروازے پر تالا لگانے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ میرے ٹھوس دلائل سننے کے بعد پولیس نے پینترہ بدلا اور مجھ سے کہنے لگے جو ہو گیا سو ہو گیا آئندہ دفتر اور سکول کی ایک ایک چابی آپ دونوں کے پاس رہے گی لیکن آپ کسی صورت میں بھی آئندہ تالا نہیں توڑیں گے۔ اس سلسلے میں انہوں نے طرفین سے ایک تحریر پر بھی دستخط کرائے' لیکن دستاویز پر دستخط ہونے کے بعد حاجی نوران شاہ نے مجھے تالے کی چابی دینے سے انکار کیا اور پولیس والوں نے کہا کہ چابی کا مسئلہ آپ دونوں کا مسئلہ ہے اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں لیکن اگر آپ نے دوبارہ تالا توڑا تو ہم آپ کو فوراً گرفتار کریں گے۔ یہ کہہ کر پولیس چلی گئی۔

دوسرے دن میں سکول پہنچا تو دروازے پر ایک نیا اور بڑا تالا لگا ہوا تھا۔ ساتھ ہی پولیس اور سوسائٹی کی طرف سے یہ نوٹس بھی دروازے پر چسپاں تھا کہ تالا توڑنے والے کو فوراً گرفتار کیا جائے گا۔ میں نے کافی سوچ بچار کے بعد پھر تالا توڑا اور دفتر میں داخل ہو گیا تھوڑی دیر بعد

پولیس آ گئی اور مجھے گرفتار کر کے بغدادی تھانے لے گئی۔ رسمی طور پر حاجی نوران شاہ اور ان کے ہیڈ ماسٹر کو بھی میرے ساتھ پولیس سٹیشن لے جایا گیا لیکن ان کے ساتھ پولیس کا رویہ میرے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک سے یکسر مختلف تھا۔

میرا شروع سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ انسان ہر کام خلوص نیت سے کرے تو یہ خلوص برے وقتوں میں اس کا سب سے بڑا سہارا بن جاتا ہے۔ میں نے زندگی میں پوری کوشش کی ہے کہ ہر کام خلوص سے کروں چنانچہ زندگی میں سینکڑوں بار میرا خلوص میرا نجات دہندہ ثابت ہوا ہے اور یہی کچھ اب کے بھی ہوا۔

کراچی کے سب سے مشہور بدمعاش جو کالا ناگ کے نام سے مشہور تھا کے دو بیٹے تھے کالا ناگ نے انہیں کئی سکولوں میں داخل کرایا لیکن وہ کہیں نہیں ٹکے تھے۔ غالباً 1959ء کے وسط میں ایک دن میں سکول کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ کالا ناگ اپنے دو بچوں سمیت اندر داخل ہوا۔ میں پہلے تو اس کی خوفناک صورت دیکھتے ہی ڈر گیا بچے اس سے زیادہ مختلف نہیں تھے لیکن کالا ناگ کی باتیں اس کی شکل و صورت سے بالکل مختلف تھیں۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے انتہائی عاجزانہ انداز میں کہنا شروع کیا' ماسٹر صاحب میں ایک انتہائی گنہگار اور بدنام انسان ہوں۔ میرے یہ دو بچے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے ایک مہذب اور شریفانہ زندگی بسر کریں لیکن یہ پڑھتے نہیں۔ میں نے کئی سکول بدلے لیکن یہ نہیں پڑھتے۔ کچھ سکول والوں نے تو میری اور بچوں کی شکل دیکھتے ہی داخلہ دینے سے انکار کیا خدا کے لئے آپ کچھ کریں۔ انہیں اپنے سکول میں داخل کریں۔ اگر انہوں نے کچھ تعلیم حاصل کی تو میں زندگی میں سب سے بڑے ذہنی عذاب سے نجات حاصل کروں گا اور عمر بھر آپ کو دعائیں دوں گا' میں نے پہلے سوچا مجھے ان بچوں کو اپنے سکول میں داخل کر کے خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کل کلاں بچے باپ سے کوئی شکایت کریں تو بعید نہیں کہ یہ شخص مجھے یا کسی استانی کو قتل ہی کر ڈالے کیونکہ میری معلومات کے مطابق کالا ناگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی لوگوں کو قتل کرتا تھا اور کراچی پولیس بھی اس سے خوفزدہ تھی لیکن جلد ہی میرا ضمیر میرے خدشے پر غالب آ گیا جس میں کالا ناگ کے عاجزانہ طرز تکلم کا بھی بڑا ہاتھ تھا اور میں نے یہ سوچ کر کہ ممکن ہے بچے پڑھیں ان کی زندگی سدھر جائے اور کالا ناگ کی نیک تمنا پوری ہونے کے علاوہ وہ اس ذہنی عذاب سے بھی نجات پائے' میں نے دونوں بچوں کو سکول میں داخل کیا اور استانیوں کو ہدایت کی کہ وہ ان بچوں کا خاص خیال رکھیں۔ میں خود بھی کبھی کبھی کلاس میں جا کر ان کی حوصلہ افزائی کرتا۔ خدا کا کرنا کہ ابتدائی ضد اور کچھ غیر اخلاقی حرکتوں کے بعد بچے چل پڑے۔ کچھ مدت کے بعد ایک دن کالا ناگ میرے پاس آیا اور انتہائی خوشی سے کہنے لگا' ماسٹر صاحب معلوم نہیں آپ نے میرے بچوں پر کیا جادو کیا ہے۔ جو بچے سکول جانا موت سمجھتے تھے وہ آج کل صبح دس بجے سے ہی سکول آنے کی تیاری

شروع کر دیتے ہیں حالانکہ سکول ایک بجے شروع ہوتا ہے۔ دونوں بچے رات کو بھی دیر تک پڑھتے ہیں۔مجھے اب یقین ہو چلا ہے میرے بچوں کی زندگی سدھر جائے گی جس کے لئے میں آپ کا انتہائی ممنون ہوں" جاتے جاتے اس نے ایک خاص قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر کبھی کسی نے آپ کو تنگ کیا تو مجھے بتا دیں۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ مہینے دو مہینے بعد سکول آتا اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنی پیش کش دھراتا۔

مجھے جب سکول کے دفتر کا تالا توڑنے کے جرم میں پولیس گرفتار کر کے تھانے لے گئی تو اس کی اطلاع غالباً اس کے بچوں کے ذریعہ کالاناگ تک پہنچ گئی اور اس نے فوراً ہی کراچی پولیس کے سربراہ کو فون کیا کہ اگر امان اللہ خان کو فوراً رہا نہ کیا گیا اور اسے سکول سے بے دخل کرنے کی کوشش ترک نہ کی گئی تو کل آپ کو بغدادی تھانے کے سربراہ کی لاش کسی گندے نالے میں ملے گی۔

مجھے بغدادی تھانے میں بیٹھے دو ڈھائی گھنٹے ہوئے تھے کہ ایک ڈی ایس پی صاحب تشریف لائے اور مجھ سے انتہائی مہذب لہجے میں بات کرتے ہوئے کہنے لگے امان اللہ صاحب! آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے جس کا ہمیں بہت افسوس ہے آپ میرے ساتھ چلیں۔ وہ مجھے اور حاجی نوران شاہ صاحب وغیرہ کو اپنی جیپ میں میرے سکول لائے اور وہاں حاجی صاحب کو تنبیہہ کی کہ وہ آئندہ مجھے سکول سے بے دخل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس طرح میں کالاناگ کی وجہ سے سکولوں سے بے دخل ہونے سے بچ گیا۔ کئی سال بعد جب میں نے سنا کہ کالاناگ ایک کشمیری ریاسی کے محمد سرور کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو مجھے انتہائی افسوس ہوا۔

سکولوں کے اس بحران کے دوران جموں کشمیر لبریشن لیگ کراچی کے صدر خواجہ غلام حسن پنجابی نے بھی میری بڑی مدد کی۔ اس کے علاوہ حبیبیہ ایجوکیشنل سوسائٹی کے اہم ممبروں محمد صدیق صاحب (سابق چیئرمین) اور میاں غلام رسول نے بھی میرا ساتھ دیا گو وہ حاجی صاحب کو میرے خلاف متذکرہ بالا اقدامات کرنے سے روک نہ سکے۔

اگرچہ میں وقتی طور پر سکولوں سے متعلق بحران پر قابو پا چکا تھا لیکن حبیبیہ سوسائٹی کے سکول کے ہیڈ ماسٹر کی حرکتیں بتا رہی تھیں کہ وہ لوگ آئندہ کسی اور طریقے سے مجھ پر وار کرنے کی کوشش کریں گے۔ اب انہوں نے کہنا شروع کیا تھا کہ سوسائٹی عمارت میں دوپہر اور شام کو اپنے سکول قائم کرنا چاہتی ہے اس لئے میں اپنے سکولوں کو کہیں اور منتقل کر دوں۔ یہ مجھے سکولوں سے بے دخل کرنے کا ایک اور طریقہ تھا کیونکہ انہیں یقین تھا کہ مجھے سکولوں کے لئے اس علاقے میں کوئی اور عمارت نہیں ملے گی چنانچہ میرے سکولوں کے بچے وہیں رہیں گے صرف میں بے دخل ہو جاؤں گا۔ اس صورت حال کے پیش نظر میں نے مناسب جگہ کی تلاش شروع کر دی۔

پاکستان کی 58ء کی مارشل لاء حکومت کے مرکزی وزیر بحالیات جنرل محمد اعظم خان نے لی مارکیٹ کی گندی سبزی منڈی پر ایک عالی شان عمارت تعمیر کروائی تھی اس کی پہلی منزل پر دفتروں کے لئے تقریباً پچاس کمرے بنے تھے۔ ان میں سے اس کے مشرقی حصے کے تقریباً بیس کمرے خالی تھے۔ میں نے کئی ماہ کی تگ و دو کے بعد ان میں سے دس کمرے کرایہ پر حاصل کر لئے اور جولائی 1962ء میں اپنے سکول یہاں منتقل کر دیئے۔ کچھ مدت کے بعد مزید آٹھ کمرے بھی حاصل کر لئے اور دوپہر اور شام کے علاوہ صبح کی شفٹ بھی شروع کی۔ 1965ء میں شام کی شفٹ میں انٹرمیڈیٹ کلاسیں بھی شروع کیں جنہیں چند ناگزیر حالات کی بناء پر 1970ء میں بند کرنا پڑا۔

1963ء میں میں نے درجن بھر ٹائپ رائٹر قسطوں پر خرید کر ایک ٹائپنگ سکول بھی عمارت کے ایک بڑے کمرے میں کھولا تھا اور مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے ایک طالب علم کو اس کا انچارج بنایا تھا لیکن 1966ء میں جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ (این ایل ایف) کی ایک فوری مالی ضرورت پوری کرنے کے لئے مجھے یہ ادارہ مشینوں کی کل قیمت کے نصف پر فروخت کرنا پڑا۔ 1972ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران پرائیویٹ سکولوں کو قومیائے جانے کے نتیجے میں میری صبح اور دوپہر کی شفٹیں حکومت کی تحویل میں چلی گئیں۔ یہی نہیں بلکہ ہمارا بنایا ہوا فرنیچر اور سکول کی دیگر املاک کو بھی حکومت نے ہمیں کوئی معاوضہ دیئے بغیر اپنی تحویل میں لے لیا۔ چند ماہ تک میں ہی سرکاری تحویل میں لئے گئے اپنے سکولوں کا سربراہ رہا لیکن چونکہ یہ سرکاری ملازمت تھی اور میں تحریک آزادی کشمیر (سیاست) سے منسلک تھا اس لئے مجھے دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑا تھا۔ ادھر ان دنوں بھارتی ہوائی جہاز گنگا کے اغوا کے سلسلے میں لاہور میں میرے سیاسی اور ذاتی دوستوں پر مقدمہ چل رہا تھا چنانچہ میں فوراً ہی تحریک کو اپنی ملازمت پر ترجیح دیکر سکول سے الگ ہو گیا اس طرح پندرہ سال کے دوران انتہائی محنت سے قائم کئے ہوئے سکول سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

میرا دن والا سکول ہی قومیایا گیا تھا شام والا بچ گیا تھا کیونکہ اس کی حیثیت ایک کوچنگ سینٹر کی تھی۔ چنانچہ میں نے تگ و دو کر کے اسی عمارت میں کل کرائے کے تیسرے حصے کی ادائیگی پر شام کی کلاسیں جاری رکھنے کی اجازت حاصل کر لی۔ علاوہ ازیں فنی رکاوٹ کی وجہ سے بعد میں حاصل کئے گئے آٹھ کمرے اور ہمارا ٹیلیفون (جو میرے ذاتی نام پر تھا) نیشنلائز ہونے سے بچ گئے تھے۔ ادھر ہماری کے جی کلاس بھی نیشنلائز نہیں ہوئی تھیں جسے ہم نے جاری رکھا اور کچھ مدت بعد صبح اور دوپہر کی شفٹوں میں پرائمری کلاسیں چلانے کی بھی اجازت حاصل کی چونکہ نیشنلائزڈ سکولوں کا معیار تیزی سے گرتا رہا اس لئے ہمارے سکول کے بچوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی گئی۔

میں جون 1976ء میں تحریک آزادئ کشمیر کے سلسلے میں برطانیہ چلا گیا جہاں ساڑھے دس سال کے قیام کے بعد دسمبر 1986ء میں برطانیہ بدر ہو کر واپس کراچی آیا۔ میری غیر حاضری میں بھی سکول بخوبی چلتے رہے بلکہ برطانیہ میں میرے اکثر ذاتی اخراجات بھی برداشت کرتے رہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کی بنیاد انتہائی مضبوط اور شہرت خاصی وسیع اور ٹھوس تھی اور دوسری وجہ یہ کہ میری غیر حاضری میں میرے شرکاء کار (اساتذہ اور میرے عزیزوں خاص کر ڈاکٹر محبوب عالم، عطاء الرحمٰن، اسلم عبداللہ، مشتاق احمد وغیرہ) نے ان کی طرف پوری توجہ دی تھی۔

میرے ان تعلیمی اداروں نے کئی طرح کی اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں۔ اولاً لیاری جیسے پسماندہ علاقے کے غریب اور خود کفیل طلباء نے ان سے خاص کر نائٹ سکول سے پورا استفادہ کیا۔ علاوہ ازیں چونکہ میں خود انتہائی غربت کے حالات سے گزر کر یہاں پہنچا تھا۔ اس لئے میں نے غریب یتیم اور ذہین طلباء کو فیس میں رعایت کے سلسلے میں بڑی فراخدلی سے کام لیا اور یہ سلسلہ 1976ء میں میری برطانیہ روانگی تک جاری رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی میں مجھے جو ذہنی سکون حاصل ہے اس میں ان غریبوں اور بیواؤں کی دعاؤں اور میرے لئے ان کے نیک جذبات کا بھی بڑا ہاتھ ہے جن کے بچے میرے ہاں بغیر فیس کے یا آدھی فیس پر تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ہمارے نائٹ سکول میں اکثریت ایسے طلباء کی ہوتی تھی اور اب بھی ہے جو دن کو محنت مزدوری کر کے شام کو پڑھتے تھے۔ ان میں سے بہت سے اب اعلیٰ عہدوں پر ہیں اسی طرح دن کے سکول کے بہت سے بچوں نے بھی معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے میرے سکولوں کے بچے آج دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے مجھے امریکہ، برطانیہ اور مشرق وسطیٰ میں ملتے رہے۔

میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ میرے سکولوں سے مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے طلباء بھی زیادہ سے زیادہ مستفید ہوں۔ چنانچہ ان علاقوں کے بہت سے وہ طلباء جو دن کو کالجوں یا یونیورسٹیوں میں پڑھتے تھے شام کو میرے سکول میں پڑھاتے اور جو نائٹ کالجوں میں پڑھتے تھے میرے دن کے سکول میں پڑھا کر یا انتظامی فرائض انجام دے کر اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرتے رہے۔ اس کے علاوہ میں ریاست کے ان حصوں سے تعلق رکھنے والے اکثر دوسرے طلباء کی بھی مالی اور اخلاقی مدد کرتا رہا۔ میرے سکولوں میں زیر تعلیم ریاستی بچوں کی بھاری اکثریت بغیر فیس کے پڑھتی رہی۔ ان جملہ حقائق کی گواہی ان علاقوں کے وہ لوگ دے سکتے ہیں جو 1957ء سے 1976ء تک کراچی میں زیر تعلیم رہے۔

جن لوگوں نے میرے سکولوں کی ابتدائی ترقی میں میری مدد کی ان میں اول نمبر پر میرے بھائی علی اللہ خان ہیں جو ابتدا میں گیارہ سال تک میرے معاون کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ ابتدائی دور میں بچوں کو سکول لانے لے جانے والے عبدالحکیم خان اور موسیٰ بلوچ

کی مخلصانہ خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ گذشتہ تین عشروں کے دوران سکولوں میں انتظامی اور دفتری فرائض انجام دینے والوں میں محمد اشرف خان ' کریم خان' میاں گل' شوکت رشید' اشفاق احمد' عطا الرحمان' مشتاق احمد' اسلم عبداللہ' کفایت دین' حامد علی خان' محمد اسلم' مس ناہید افروز اور صلاح الدین شامل ہیں ۔ میری طویل غیر حاضری کے دوران سکولوں کے نگران اعلیٰ کی حیثیت سے ڈاکٹر محبوب عالم نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

دن کے سکول کے تدریسی عملے میں سکول کے لئے اہم ترین اور بنیادی حیثیت سکول کی اولین ٹیچر مسز مارٹن کو حاصل ہے ۔ یہ خاتون ایک انسان اور ایک استانی کی حیثیت سے انتہائی اعلیٰ خوبیوں کی مالک ہے۔ وہ پندرہ سال تک میری شریک کار رہیں اور اب اپنے بچوں کے ساتھ امریکہ میں ہیں ۔ گذشتہ تیس سال کے دوران دن کے سکول میں جن دوسری استانیوں اور اساتذہ نے نمایاں خدمات انجام دیں ان میں مس فرنتڈس دوسری مس فرننڈس ' مسز پیچ ' مسز ہنری ' مسز ڈی سوزا ' لیوکوریا' روزڈ سوزا' ڈولی عزیز ' مس نسیم' مسی بیٹی' صغرا ملک ' مس ارشاد خان' عذرا پروین' مسز ہیلن پریرا ' مس شمیم' مس نرگس ' مس عذرا ' مس کلثوم ' مس نادرہ' نادرہ قریشی' مسٹر منہاس ' مس شہناز کھتری ' مس شاہدہ ' محمد نادر خان' محبوب علی خان ' محمد ولی شاہ ' ظفر حسنین' سلیم خان ' عبدالغفار ' سردار مشتاق خان ' عبدالحکیم ' لوئس ڈسوزا ' مس علوا' مس زلیخہ ' مس رضوانہ ' مس ناہید شیخ' مسز نور عباس' مسز نفیسہ خاتون' مس فرحت ' مس عابدہ' مس ریحانہ اور مس نجمہ ہیں۔ میں ان تمام خواتین و حضرات کا مشکور و ممنون ہوں۔

دونوں سکولوں کے غیر تدریسی سٹاف (چپراسی' چوکیدار' بچوں کو لانے لے جانے والوں وغیرہ) میں سے عبدالحکیم ' موسیٰ بلوچ مرحوم' اللہ بخش ' چاچا آفریدی چوکیدار ' شاکر علی' اکبر جان' ماسی عائشہ ' ماسی خدیجہ' نبی بخش بلوچ' غلام قادر بلوچ' فیض محمد بلوچ ' قادر بخش بلوچ' ماسی ماتون بلوچ اور خاکروب ہاکو اور زینہ شامل ہیں۔ سکولوں کی ترقی میں ان تمام کا بھی اہم کردار رہا ہے۔

ہمارے شام والے ادارے میں گذشتہ تیس سال کے دوران تدریسی خدمات انجام دینے والے اصحاب میں محمد محفوظ ' رئیس احمد ' بشیر منہاس' شیخ ابرار احمد' منیر احمد ' شاہ صاحب ' محمد زمان خان ' عبدالصمد ' مس احمد ' محمد حیات اعوان' حفیظ صدیقی ' خادم حسین کیانی' محمد شاہ خان ' محمد اشرف ' محمد اصغر بٹ ' میراں بخش' خادم حسین' محبوب عالم' نیاز محمد ' شاہ محمد بھٹی' ناصر حسین' محمد نسیم ' اسلم خان ' ثنا اللہ خان' مسٹر والٹر' مسٹر جوزف ' محبوب علی خان ' اختر سعید ' مسٹر خٹک ' محمد شکیل ' ظفر الحسنین' احسان صاحب ' محمد سلیم ' محمد سرفراز ' شیر ولی خان ' محمد ارشد محمود احمد' امید علی' محمد اشرف ' محمد یوسف ' ولایت علی' اورنگ زیب ' مسٹر جعفری' آدم کھتری' عبدالناصر' عبدالباقی ' محمد ولی شاہ' اسلم عبداللہ ' ناصر علی ' محمد امیر' رضا علی' محمد اسماعیل '

شیر علی ' عبدالمجید ' ثناء اللہ انصاری ' ظہور احمد ' محمد ابراہیم ' راشد عظیم ' احسان اللہ ' محمد حنیف ' الطاف احمد ' عبدالرشید ' اصغر علی ' فیض اللہ اور فقیر محمد شامل ہیں۔ ان میں حیات محمد اعوان خادم حسین کیانی ' ثناء اللہ خان ' اسلم عبداللہ ' اصغر بٹ اور محمد امیر صاحب ایک ایک عشرے سے زیادہ مدت تک ہمارے ساتھ رہے ۔ محمد اشرف ' مسٹر جعفری ' محمد سلیم ' خادم حسین کیانی ' غلام محمد ' ولایت علی ' اشرف اعوان اور محمد یوسف جنہوں نے ہمارے ہاں اپنی ملازمت کے اواخر میں کسی اچھے کردار کا مظاہرہ نہیں کیا کے سوا تمام اساتذہ نے اپنے فرائض انتہائی خلوص اور محنت سے انجام دیئے یا دے رہے ہیں جس کے لئے میں ان تمام حضرات کا مشکور ہوں۔

تحریک آزادی میں میرے سکولوں کا کردار

میرے تعلیمی اداروں نے تحریک آزادی کشمیر کے لئے بھی بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر بے بہا خدمات انجام دی ہیں ۔ ان ہی اداروں کی وجہ سے میں مالی مسائل سے آزاد ہو کر تحریک آزادی کشمیر کی طرف مناسب توجہ دے سکا اور ان ہی کی وجہ سے میں تحریک کے سلسلے میں بھاری مالی بوجھ برداشت کرنے کے قابل ہوا ۔ میرے سکولوں کا ٹیلیفون ' دفتر ' ٹائپ رائٹر وغیرہ بھی تحریک کے لئے استعمال ہوتے رہے اور میرے سٹاف ممبر بھی تحریک کے سلسلے میں میری مدد کرتے رہے ۔ محاذ رائے شماری ' این ایل ایف ' کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن ' گلگت بلتستان سٹوڈنٹس سنٹرل آرگنائزیشن کے اجتماعات ' اجلاس اور انتخابات بھی میرے سکول کی عمارت میں ہوتے رہے۔ سماجی اجتماعات اور عید ملن پارٹیاں بھی یہیں ہوتی رہیں اور ماہنامہ وائس آف کشمیر (کراچی) کا کام بھی یہیں ہوتا رہا ۔

الغرض میں نے ان سکولوں کے قیام اور ترقی کے لئے کئی سال تک جو انتھک محنت کی تھی ' سکولوں نے مجھے اس کا پورا صلہ میری مالی مدد ' مجھے ملازمتوں سے بچانے ' مجھے دوسرے کی کفالت اور مدد کرنے کے قابل بنانے ' مجھے بالواسطہ طور پر ذہنی سکون بخشنے اور میری زندگی کے اہم ترین مشن یعنی تحریک آزادی کشمیر کی بالواسطہ اور بلاواسطہ مدد کرنے کی شکل میں دیا اور دے رہے ہیں۔

پانچواں باب

میری گھریلو زندگی

میں مختلف وجوہات کی بناء پر ایک پرسکون اور قابل رشک گھریلو زندگی سے محروم رہا ہوں گو مجموعی طور پر مجھے خاصا سکون قلب حاصل ہے۔

پیدا ہونے کے چند سال بعد ہی میرے سر سے انتہائی شفیق والد کا سایہ اٹھ گیا اور کچھ مدت بعد والدہ کا عقد ثانی ہو گیا۔ اس کے بعد خاندانی دشمنوں کی طرف سے میری جان کو درپیش خطرے کی وجہ سے چند سال تک میری کڑی نگرانی ہوتی رہی جس کے نتیجے میں میری حیثیت ایک ننھے سے قیدی کی سی ہو گئی۔ بعد ازاں مجھے گھر سے بہت دور ہائی ہامہ بھیجا گیا۔ جہاں چند سال تک میں ہمشیرہ اور بہنوئی کی سرپرستی میں رہا۔ لیکن اس کے بعد تعلیم کے سلسلے میں اپنے رشتہ داروں سے دور کاری ہامہ' ہندواڑہ اور سرینگر میں رہا اور نو سال تک اپنی والدہ اور استور والی بہنوں سے ملاقات نہ ہو سکی۔ پاکستان آنے کے بعد 21 سال تک گھریلو زندگی میسر نہیں آئی گو اس اثناء میں ہر تین چار سال بعد والدہ اور دوسرے بزرگوں سے ملنے ہفتہ عشرہ کے لئے اپنے آبائی علاقے کی طرف جاتا رہا۔ لیکن وادی کشمیر والی ہمشیرہ سے 1951ء کے بعد 1982ء میں ملاقات ہوئی۔

مارچ 1984ء کے اواخر میں میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ زندگی کے آخری لمحے تک مجھ سے ملاقات کے لئے تڑپتی رہیں لیکن میں برطانیہ میں بھارتی سفارت کار کے اغواء کے سلسلے میں زیر حراست اپنے سیاسی ساتھیوں کے معاملات کے سلسلے میں بہت مصروف تھا اس لئے والدہ سے ملاقات کے لئے نہ آ سکا۔ میری والدہ ناخواندہ ہونے کے باوجود ایک انتہائی مدبر خاتون تھیں۔ ان کے دوسرے شوہر مرحوم عنایت خان پری شنگ میں میرے سربراہ نمبردار تھے۔ اپنی سخت طبیعت کی وجہ سے علاقے میں زیادہ مقبول نہیں تھے۔ لیکن میری والدہ کے لئے ہر ایک کے دل میں عزت و احترام تھا چنانچہ علاقے کے اکثر جھگڑے ان کی ہی وجہ سے رفع ہو جاتے۔ اگرچہ میں نے اپنی والدہ کے تین بیٹوں کی تعلیمی کفالت کی اور اپنی پوری خاندانی جائیداد بھی ان ہی کی تحویل میں رکھی لیکن میں ان کی ذاتی طور پر مناسب خدمت نہ کر سکا جس کا مجھے بے حد افسوس

ہے۔

1973ء میں اپنی شادی سے لے کر آج تک کے تقریباً تیرہ سال کے دوران میں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پانچ سال رہا ہوں گا۔ 1976ء میں میں تحریک آزادی کے سلسلے میں برطانیہ چلا گیا تو وہ یہاں ہی رہیں۔ 1978ء کے اواخر میں ان کے برطانیہ آنے کے بعد میں زیادہ تر امریکہ، یورپ، مشرق وسطیٰ اور پاکستان کے تنظیمی دوروں پر رہا۔ سوا سال جیل میں رہنے کے بعد برطانیہ بدر ہوا تو وہ دونوں برطانیہ میں رہ گئیں۔ ان کے آنے کے بعد بھی میں آزاد کشمیر و پاکستان کے طویل تنظیمی دوروں پر رہتا رہا۔ کراچی میں قیام کے دوران بھی صبح آٹھ بجے گھر سے نکل کر رات دس بجے واپس پہنچتا ہوں۔ چنانچہ میری گھریلو زندگی نہ ہونے کے برابر ہے جس کا سب سے زیادہ اثر میری اکلوتی اولاد یعنی بیٹی کی تعلیم اور ذہنی نشوونما پر پڑا ہے۔ یہ انتہائی ذہین بچی (جس کی ذہانت کو برطانیہ میں اس کی انگریز استانیاں اور استاد بھی مثالی قرار دیتے تھے) میری طرف سے مناسب توجہ نہ ملنے کی وجہ سے اپنی غیر معمولی ذہانت سے مناسب استفادہ نہ کر سکی ہے۔ البتہ میری اہلیہ نے تحریک آزادی سے میری گہری وابستگی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے گھریلو مسائل کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جس کی وجہ سے میں گھریلو معاملات سے بے فکر ہو کر تحریک سے متعلق معاملات پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر سکا۔ میری اہلیہ کا یہ کردار تحریک سے اس کی عملی وابستگی کے مترادف ہے گو وہ تحریک سے براہ راست وابستہ نہیں رہی۔

بہر حال تحریک آزادی وطن عزیز جیسے مقدس مشن سے منسلک افراد کے لئے اس قسم کے مسائل ناگزیر لیکن تحریک آزادی سے متعلق مسائل کے مقابلے میں ثانوی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

چھٹا باب

دو عُمرے

میں ذاتی طور پر نہ تو کوئی روایتی مولوی ہوں نہ مذہب سے یکسر بے گانہ یا اس کی اہمیت سے منکر۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور قدروں پر میرا ایمان پختہ ہے۔ البتہ میں سمجھتا ہوں کہ "درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو۔ ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرو بیاں" ممکن ہے مجھ پر کچھ حلقوں کی طرف سے حکم کفر صادر ہو لیکن میں اپنے اس طرز فکر سے انکار نہیں کر سکتا کہ میں حقوق العباد کے سلسلے میں فرائض (خدمت خلق) کی ادائیگی کو حقوق اللہ (اللہ کی عبادت) کے سلسلے کے فرائض کی ادائیگی سے زیادہ اہم اور ضروری سمجھتا ہوں۔ بایں ہمہ میرے دل میں خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کی زیارت کا شوق مدت سے تھا۔ چنانچہ میں نے 1982ء میں پاکستان سے برطانیہ واپسی کے دوران عمرہ ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ کراچی سے وہران ہوتے ہوئے جدہ پہنچا اور دوسرے ہی دن عمرہ ادا کرنے گیا۔ احرام باندھنے کے سلسلے میں سعودی پولیس کی بے جا ضد کی وجہ سے مجھے تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر کا اضافی سفر کرنا پڑا۔ بہرحال احرام باندھنے کے بعد سعودی عرب میں برسر روزگار اپنے ساتھیوں افضل طاہر، محمد بابر خان مرحوم اور راجہ پرویز کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

احرام باندھنے کے لئے غسل کرنے اور احرام باندھنے کے ساتھ ہی ذہن پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ مکہ مکرمہ کی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے ذہن میں خانہ کعبہ کے حوالے سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے متعلق تاریخی حقائق گشت کرتے رہے اور جونہی خانہ کعبہ کے مینار نظر آنے لگے فرط جذبات سے میرے آنسو نکل گئے اور ہچکی بندھ گئی۔ طواف، حجر اسود کو بوسہ دینے اور نماز کی ادائیگی کے دوران بھی دل دماغ کی ایک عجیب سی کیفیت رہی۔ حجر اسود کے ساتھ ہی کعبہ کی دیوار سے ماتھا لگائے جب میں آزادی کشمیر کے لئے دعا مانگ رہا تھا۔ اس وقت بھی دل و دماغ ایک عجیب سے اور ناقابل بیان کیفیت میں تھے اور آنکھیں اشک بار تھیں۔

طواف نماز اور دعا وغیرہ سے فارغ ہونے اور دل و دماغ کے معمول پر آنے کے بعد

جب میں نے مسجد الحرام کی پر جلال عمارت کو اندر اور باہر سے اچھی طرح دیکھا تو میرا سر فخر سے بلند ہو گیا کہ مسلمان بھی ایسے عظیم ورثے کے مالک ہیں ۔ یہ عمارت اپنے جمال اور جلال دونوں حیثیتوں سے یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے گرجاگروں سے کہیں ارفع ہے ۔

دوسرے دن مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں نماز کی ادائیگی کے دوران بھی دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت رہی اور جب میں روضہ مبارک کے پاس سے گزرا تو اس کیفیت میں اور بھی شدت آگئی ۔

غالباً 1978ء میں امریکہ میں دنیا بھر کے اہم مذاہب اور نظریات کے عالم و فاضل پیروکاروں کا ایک اجتماع ہوا تھا اور ان عالم و فاضل لوگوں نے ہمارے نبی کریم حضرت محمد مصطفےٰ صلعم سمیت انسانی تاریخ کی ایک سو عظیم ہستیوں کاانتخاب کر کے عظمت کے لحاظ سے ان کی درجہ بندی کرنے کے مقصد سے ان میں سے ہر ایک کی شخصیت کی تفصیلات (یعنی اس نے بنی نوع انسان کی کتنی خدمت کی ۔ اس کی تعلیمات اس کے اپنے پیروکاروں میں کتنی دیرپا ثابت ہوئیں۔ دنیا پر اس کی تعلیمات کی چھاپ کتنی گہری اور کتنی دیرپا ثابت ہوئی ۔ اس کی تعلیمات نے بنی نوع انسان کو کتنا فائدہ پہنچایا ۔ دنیا میں اسکے پیروکاروں کی تعداد کتنی ہے ۔ اس کے ذاتی طرز عمل ذاتی طرز زندگی اور ذاتی طرز فکر نے دنیا کو کتنا اور کتنی مدت تک متاثر کیا۔ اس کے قول و فعل اور ظاہر و باطن میں کتنی ہم آہنگی تھی وغیرہ) پر تفصیلی بحث و مباحثے کے بعد اور تاریخی حقائق کی روشنی میں ان میں سے ہر ایک کے بارے میں اس کی شخصیت کے ہر پہلو سے متعلق اپنے متفقہ فیصلے کو عددی شکل دے کر کمپیوٹر میں ڈال دیا تو کمپیوٹر کا نتیجے کا بٹن کئی بار دبانے پر بار بار سر فہرست ہمارے نبی کریمؐ کا نام آیا تھا ۔ دوسرے الفاظ میں دنیا کے ہر مذہب اور ہر نظریئے کے عالم و فاضل پیروکاروں کے بحث و مباحثے اور تاریخی حقائق کی تحقیق کے نتیجے میں ثابت ہوا تھا کہ ہمارے نبی کریم صلعم انسانی تاریخ کی عظیم ترین ہستی تھے ۔

جب میں متذکرہ بالا واقعے کو ذہن میں لئے روضہ مبارک کے پاس سے گزرا تو یہ سوچ کر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا کہ میں اس شخص کا پیروکار ہوں جسے اپنوں نے ہی نہیں پرائیوں نے بھی ٹھوس اور ناقابل تردید حقائق کی روشنی میں انسانی تاریخ کی عظیم ترین ہستی تسلیم کیا ہے ۔ میں نے یہ بات بھی واضح طور پر محسوس کی کہ جہاں خانہ کعبہ میں قہاری وجباری واضح طور پر عیاں تھی وہاں مسجد نبوی اور روضہ مبارک سے ایک عجیب سی اپنائیت ٹپکتی تھی ۔

مسجد نبوی اور روضہ مبارک کی زیارت اور ان سے متعلق لوازمات کے بعد جب ہم اس علاقے میں گئے جہاں خلفائے راشدین سے منسوب مسجدیں ہیں تو وہاں بھی میرے ذہن میں ان کی عظمت سے متعلق تاریخی حقائق کی فلم چلتی رہی ۔ وہ مسجد (عید گاہ) جہاں نبی کریمؐ نے آخری خطبہ دیا تھا بھی زبان حال سے اپنے ماضی کی کہانی اور اپنی تاریخی اہمیت بیان کر رہی تھی

میں نے عیدالفطر کی نماز خانہ کعبہ کے باہر سڑک پر ادا کی لیکن بد نظمی کی وجہ سے اس سے میں وہ روحانی تسکین حاصل نہ کر سکا جس کی توقع کرتا تھا۔

دوسری بار میں نے 1984ء میں عمرہ ادا کیا لیکن اب کے پہلی بار کی سی ذہنی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔ احباب سے اس کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ ایسا ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے غالبًا یہ انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ بہرحال خانہ کعبہ، مسجد نبوی اور روضہ مبارک پر پہلی حاضری کے دوران میں جس ذہنی کیفیت میں رہا۔ اس کی لذت اب بھی میرے دل و دماغ میں موجود ہے اور شاید زندگی بھر رہے۔

ساتواں باب

میرے محسن دوست اور قریبی واقف کار

سوشیالوجی کی زبان میں انسان سماجی جانور (Social Animal) کہلاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہوتے ہیں۔ یہ محتاجی انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی۔ دور جدید میں تو افراد، خاندانوں، تنظیموں اور اداروں کے علاوہ معاشرے، قومیں، یہاں تک کہ براعظم بھی ایک دوسرے کے محتاج ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ جہاں میں اور میرے ذاتی اور سیاسی متعلقین دوسروں کی کسی نہ کسی طرح مدد کرتے رہے ہیں وہاں ہمیں بھی دوسروں کی طرف سے مدد ملتی رہی ہے۔ علاوہ ازیں مجھے اپنی ذاتی اور سیاسی زندگی میں اپنے قریبی سرپرستوں اور محسنوں کے علاوہ دوسرے بہت سے لوگوں کی بھی کسی نہ کسی طرح کی رفاقت اور مدد حاصل رہی ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں ان کا بھی تذکرہ کر رہا ہوں گو ان تمام حضرات کے ناموں کی شمولیت کے نتیجے میں یہ فہرست ظاہراً غیر ضروری طور پر طویل دکھائی دیتی ہے اس کے باوجود میں اپنی سوانح عمری میں ان تمام حضرات کا تذکرہ اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے کسی نہ کسی مرحلے پر میرے ذاتی معاملات یا تحریک آزادی کے سلسلے میں میری مدد کی ہے۔ گو ان میں بہت سے ایسے اصحاب بھی شامل ہیں جنہوں نے میری مدد کرنے سے کہیں زیادہ میری بے جا مخالفت کی ہے۔

میں ان حضرات سے دل کی گہرائیوں سے معافی کا خواستگار ہوں جنہوں نے میری کسی نہ کسی طرح مدد کی ہو لیکن میں ان کا نام اس فہرست میں شامل کرنے میں ناکام رہا ہوں۔

ا۔ میرے خاندان کے محسن

میرے والد صاحب کی وفات پر سارے خاندان کا شیرازہ ہی بکھر گیا تھا۔ چچا اکبر خان ایک انتہائی سادہ طبیعت کے انسان تھے میں چند سال کا بچہ تھا اور میرے چچا زاد بھائی بھی اس عمر کے نہیں تھے۔ کہ خاندان اور اس کے مفادات کی مناسب حفاظت کر سکیں۔ جبکہ خاندان کے

اردگرد انتہائی طاقتور حریفوں کا گھیرا تھا۔ اس انتہائی نازک دور میں میرے ماموں حاجی عبدالرحیم خان اور میرے بہنوئی گرداور نعمت خان، کھوکھر خان، حاجی عبدالغنی، مولوی غلام نبی، ماسٹر ہاشم علی خان اور منشی نعمت خان، میرے نانا حمزہ خان، پھوپھی زاد بھائی محمد عبداللہ، شیپہ کے عبدالرحیم، ہپک کے ماموں محمد عیسیٰ اور میرے والد کے دو ذاتی مددگار تھینگہ کے جان محمد اور منگہ کے خوش ملک ہمارے خاندانی مفادات کے حق میں سینہ سپر ہو گئے۔

ب۔ میرے ذاتی محسن دوست اور قریبی واقف کار

میرے ذاتی محسنوں میں سرفہرست میرے بہنوئی ماسٹر ہاشم علی خان مرحوم اور ان کی دو شرکاء حیات (میری ہمشیرہ اور ماسٹر صاحب کی پہلی اہلیہ) ہیں۔

میرے والد صاحب نے اپنی زندگی کے آخری لحات میں میرا ہاتھ ماسٹر ہاشم علی خان صاحب کے ہاتھ میں دے کر رندھی ہوئی آواز میں ان سے کہا تھا "میرا آخری وقت آگیا ہے۔ اپنے اکلوتے بیٹے کے بارے میں میری تمنا اور میرے ارمان پورے نہیں ہوئے۔ اب یہ بدقسمت بچہ خدا کے بعد آپ کے حوالے" میرے بہنوئی نے والد صاحب سے وعدہ کیا کہ وہ میرا پورا خیال رکھیں گے۔ اور اس عظیم انسان نے اپنا یہ وعدہ پوری طرح نبھایا۔

ماسٹر ہاشم علی خان وادی کشمیر کے ضلع کپوارہ کے علاقہ ہائی ہامہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی پہلی شادی ہائی ہامہ میں ہی اپنے خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کی بڑی اہلیہ ایک انتہائی عظیم خاتون تھیں اور علاقے کے لوگ انہیں عزت و احترام سے دئیدہ (معزز اور بڑی بہن) کے نام سے پکارتے تھے۔ ماسٹر صاحب 41-1940ء میں مجھے اپنے ساتھ ہائی ہامہ لے گئے اور مجھے پالا اور پڑھایا۔ ان کا تو کچھ فرض بھی تھا اور انہوں نے میرے والد صاحب سے وعدہ بھی کیا تھا لیکن جو مادرانہ پیار مجھے ان کی بڑی اہلیہ کی طرف سے ملا اسے میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ ماسٹر صاحب مجھے پیار سے سونے بابا کے نام سے پکارتے تھے۔ میری اپنی بہن نے بھی میری ماں اور بہن دونوں کا کردار ادا کیا۔ الغرض مقبوضہ کشمیر میں میرے گیارہ سالہ قیام کے دوران ان تینوں فرشتہ صفت انسانوں نے میرے سگے والدین کا کردار پوری طرح نبھایا۔ ماسٹر صاحب 1971ء میں فوت ہوئے اور دئیدہ 1983ء میں۔ میں اپنی ہمشیرہ سے اکتیس سال کے بعد 1982ء میں ملا جب وہ پاسپورٹ پر پاکستان آئی تھیں اور میں ان سے ملنے کے لئے برطانیہ سے پاکستان آیا۔

مجھے زندگی میں سب سے بڑا افسوس یہ ہے کہ میں اپنے ان عظیم محسنوں کی کوئی خدمت یا مدد نہیں کر سکا ہوں۔ بلکہ تحریک آزادی کشمیر میں میرے سرگرم کردار کی وجہ سے میرے بھانجوں اور ان کی بہنوں کو مصائب و مسائل کا ہی سامنا کرنا پڑا ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں میرے طویل قیام کے دوران ہائی ہامہ کی خیبری قبیلے کے جملہ افراد خاص کر دیئدہ کے بھائیوں عبدالعزیز خان ، عبدالاحد خان اور حکیم خان اور ان کی اولاد ان کی بہنوں وغیرہ کی طرف سے مجھے بھرپور شفقت محبت اور پیار ملا جس کے لئے میں پورے قبیلے کے جملہ افراد کا مشکور ہوں۔ کاری ہامہ میں طالب علمی کے زمانے میں حبیب خان کے ہاں قیام کے دوران مجھے ان سے پیار ملا۔ سکول کے اساتذہ خاص کر ماسٹر منیر صاحب اور ماسٹر جیلانی صاحب نے میری بڑی رہنمائی کی۔ ہندواڑہ میں براری پورہ کے مرحوم صمد وانی' اسد وانی ، محمد وانی اور ان کے اہل خانہ گرواور مختار وانی دوکاندار مختار وانی ، صمد وانی کا بھانجا محمد وانی ، ہندواڑہ کے تاجر وتالی صاحب ہائی سکول ہندواڑہ کے اساتذہ خاص کر قاضی صاحب ، غلام احمد گنائی صاحب اور پنڈت کاش لال کا انتہائی مشکور ہوں کہ مجھے دو سال تک ان کی رہنمائی حاصل رہی۔ میں مولانا محمد سعید مسعودی صاحب کا بھی مشکور ہوں۔ جنہوں نے مجھے کالج میں داخلہ ولایا اور میری حوصلہ افزائی کی۔

سری نگر میں کالج کے اساتذہ میں سے پروفیسر سیف الدین ، پروفیسر شرما ، پروفیسر محمد یوسف ، پروفیسر جان محمد اور پروفیسر نصراللہ کا مشکور ہوں جنہوں نے ہر وقت میری حوصلہ افزائی کی۔ خاص کر پروفیسر شرما کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے مجھے انگریزی زبان پر خاصا عبور حاصل ہو گیا۔ سرینگر میں قیام کے دوران مجھے چوہدری محمد شفیع صاحب (ان کا تعلق میرپور آزاد کشمیر سے تھا) کی بھی شفقت حاصل رہی۔

دسمبر 1951ء اور جنوری 1952ء کے دوران سرینگر سے پاکستان کی طرف سفر کے دوران اسکردو کے مولوی عبدالخالق صاحب اور ان کی اہلیہ جن کا تعلق استور کے علاقہ گوریکوٹ کے وزیر خاندان سے تھا' نے میرا بڑا خیال رکھا۔ پاکستان آنے کے بعد اپنے رشتہ داروں میں سب سے پہلے میری ملاقات اپنے ماموں زاد بھائی محمد اسماعیل خان سے ہوئی۔ انہوں نے میرا کالج میں داخلہ کرایا اور تقریباً نو ماہ تک میرے تمام اخراجات برداشت کئے۔ برادرم موصوف نے 1980ء میں اپنی وفات تک میرا بہت خیال رکھا۔ پشاور میں تقریباً چھ ماہ تک میرا قیام ہائی ہامہ کے سیف اللہ خان مرحوم (میجر امان اللہ کے والد) کے ہاں رہا۔ ان لوگوں نے بھی میرا بڑا خیال رکھا۔

کراچی میں میرے پہلے 24 سال کے قیام کے دوران میرے سب سے بڑے محسن بلتستان سے تعلق رکھنے والے محمد اسحاق صاحب (سابق ممبر آزاد کشمیر سٹیٹ کونسل) رہے ہیں۔ انہوں نے ہر وقت میری مدد اور حوصلہ افزائی کی۔ سکول کی عمارت بھی مجھے ان ہی کی کوششوں سے ملی جس کی وجہ سے میری ذاتی اور سیاسی زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ کراچی میں اپنے قیام کے ابتدائی سالوں میں جن لوگوں نے میری مدد کی ان میں سری نگر کے عبدالاحد (احدو) غلام محمد چینا ، ماما کشمیری ہوٹل لی مارکیٹ کے مالک حاجی صاحب اور ان کے بھائی محمد

رمضان سرفہرست ہیں۔ علاوہ ازیں محمد عبداللہ شیخ اور عبداللہ خان نے بھی میری بڑی مدد کی۔ یہ سب حضرات اب اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ لیکن میں ان کے احسانات نہیں بھول سکتا۔ ان لوگوں کے علاوہ کراچی میں مقیم جن کشمیریوں کے ساتھ میرے قریبی تعلقات رہے ہیں اور جنہوں نے کسی نہ کسی طریقے سے میری مدد کی ہے۔ ان میں جی ایم لون مرحوم' میر عبدالقیوم ، میر عبدالمنان' خواجہ غلام محی الدین بانگا' خواجہ غلام حسن پنجابی' خواجہ عطا اللہ' محمد شفیع مرحوم' ملک عبدالرشید' غلام محمد پہلوان' رشید شاہ ، میر عبدالغنی ، ڈاکٹر عبدالغنی ، راجہ حاکم منہاس ، ملک غلام حسن ، محمد صدیق بابا ، محمد صدیق مرحوم ، غلام رسول شاہ ، حاجی غلام محی الدین مرحوم ، میر اسلم مرحوم ، ماسٹر اصغر علی مرحوم ، چوہدری محمد فاضل ، عباس احمد آزاد ، منظور قادر ، سید حسن صاحب مرحوم بلتستانی ، سلطان مہدی مرحوم ، کا غلام ، غلام رضا ، محمد رضا ، رضا انصاری ، محمد علی صاحب مرحوم ، کرنل آغا عابد حسین ، خان شریں خان ، بشیر خان نسیم چنگیزی ، سردار ابراہیم مرحوم ، رضا حسرت نکوباری علی محمد مرحوم شامل ہیں۔

کراچی کے جن پاکستانیوں نے کسی نہ کسی طرح میری مدد کی ہے ان میں کراچی کے مشہور صنعت کار یوسف داد اور حبیب ٹیکسٹائل ملز کے مالک حاجی صاحب اور ان کے بیٹے عبدالغفار وغیرہ ڈاکٹر سعید الدین صالح مرحوم اور مسز صالح ، اے ڈی نجمی - چیئرمین محمد صدیق ، میاں رسول شاہ - ایس پی سید ہمایوں ، محمود شاہ ، بہادر خان ، دوست محمد ، حسن کھتری ، کالاناگ ، حاجی نوران شاہ ، ملک لطیف ، محمد رمضان ، عبدالعزیز خلجی اور ڈاکٹر بدر صدیقی شامل ہیں۔

لاہور میں جن کشمیریوں سے میرے خاصے قریبی ذاتی اور سیاسی تعلقات رہے ہیں ان میں کے ایچ خورشید سابق صدر آزاد کشمیر ، غلام نبی لون ، ڈاکٹر عبدالباسط ، نصیر محمود وانی ، غلام احمد بٹ ، عارف کمال بٹ ، سعید شاہ ناز کی ، حسین شمیم ، حمید دیوانی ، خلیفہ عبدالمنان ، غلام رسول بٹ مرحوم' جان محمد ، پروفیسر میر عبداللطیف شامل ہیں۔

سیالکوٹ صوبہ جموں سے تعلق رکھنے والے ہمارے ہموطنوں کا مرکز ہے۔ ان لوگوں سے جن کے ساتھ میرے قریبی ذاتی یا سیاسی تعلقات رہے ہیں ان میں مجید امجد بٹ ایڈیٹر ولر' میر عبدالرشید ایڈیٹر فری کشمیر ، مرزا محمد امین مرحوم ، قاضی خورشید عالم مرحوم ، ڈاکٹر غلام احمد جراح' منشی معراج الدین ایڈیٹر پاسبان ، خواجہ صفدر علی ، میر محمد دین ، چوہدری سلطان علی' چوہدری فرمان علی ، محمد اقبال بٹ ، وحید بخاری ، ملک فیض محمد ، محمد سلیم بٹ ، ملک محمد منظور وغیرہ شامل ہیں۔

راولپنڈی میں میرے قریب ترین دوست اور ساتھی ڈاکٹر فاروق حیدر ہیں ڈاکٹر صاحب ایک انتہائی شریف النفس ، مخلص ، مہمان نواز ، محب وطن اور جذبہ ایثار و قربانی کے حامل انسان ہیں۔ ان کی اہلیہ جنہیں ہم سب عزت و احترام سے باجی کہتے ہیں وسیع القلب ، مہمان نواز

خاتون ہیں۔ ان کے بچے بھی بڑے ملنسار ہیں۔ راولپنڈی میں جلا وطنی کی زندگی گزارنے والے خانیار سری نگر کے میر مقبول گیلانی مرحوم سے بھی میرے گہرے ذاتی' سیاسی اور خاندانی تعلقات تھے۔ گیلانی صاحب ایک مقناطیسی شخصیت کے مالک اور انتہائی مہمان نواز تھے۔ ان کی اہلیہ - بیٹی اور داماد محمد شفیع قادری گیلانی صاحب مرحوم کی مہمان نوازی کی روائت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ہفت روزہ انصاف کے ایڈیٹر میر عبدالعزیز کے ساتھ میرے سیاسی تعلقات میں نشیب و فراز آتے رہے کئی سال تک وہ مجھے اپنے ہفت روزہ کے کالموں کے ذریعہ اپنے تیر و نشتر کا نشانہ بناتے رہے اس کے باوجود میں انہیں اپنا ایک ہمدرد دوست شمار کرتا ہوں۔ تحریک آزادی کے لئے ان کے قلم کی خدمات بے بہا ہیں۔ راولپنڈی کے دوسرے کشمیری صحافیوں مولانا عبدالباری' خواجہ عبدالصمد وانی' فیاض عباسی صاحب ' راجہ اصغر اور حمید مفتی اور ریڈیو کے سعید نقشبندی' مظفر فاضلی' نذیر مرحوم' عبدالاحد ' صلاح الدین ' عبدالعلی سے بھی خاصے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ آزاد کشمیر کے بانی صدر خواجہ غلام نبی گلکار مرحوم' سابق وزراء خواجہ غلام دین وانی - سید نذیر حسین شاہ مرحوم کے علاوہ خواجہ عبدالغفار ڈار ' منظور الحق ڈار ' غلام رسول بٹ ' عنایت اللہ خان ' صلاح الدین ' اکرام اللہ جسوال ' نعیم اللہ قریشی ' ستار ماگرے مرحوم ' غلام حسن ' شیر باز میر' ڈاکٹر محمد یوسف' پروفیسر بشیر' شیخ محمود مرحوم' شیخ محی الدین' اطہر علی صاحب اور احمد شمیم مرحوم سے بھی خاصے مراسم تھے۔ آزاد کشمیر کے سابق ڈائرکٹر انفارمیشن لداخ کے محمد اقبال صاحب سے بہت قریبی تعلقات ہیں۔ میرواعظ محمد یوسف شاہ مرحوم اور مولانا نور الدین صاحب سے بھی مراسم رہے ہیں مری کے غلام مصطفیٰ شاہ مرحوم ' فاروق شاہ ' غازی بشیر' شعبان ڈار اور اسد اللہ' محمد یوسف' سجاد احمد کے ساتھ خاصے مراسم رہے ہیں پشاور میں میرے اہم ترین ذاتی اور سیاسی دوست شہید مقبول بٹ تھے۔ مانسہرہ میں مقیم ہائی ہامہ کے شیراز خان ' یاسین خان اور محمد بشیر بھی میرے مہربانوں میں سے ہیں۔ شیراز خان نے تو برے وقتوں میں میری بڑی مدد کی ہے۔ پشاور میں میرے دوسرے احباب میں صحبت خان' گل نور خان مرحوم ' مدنور خان مرحوم اور عبدالغنی سالار شامل ہیں۔

مظفر آباد آزاد کشمیر میں میرے جن احباب سے قریبی ' ذاتی اور سیاسی تعلقات رہے ہیں ان میں میر ہدایت اللہ مرحوم ' جی ڈی عشائی مرحوم ' پیرزادہ غلام مصطفیٰ علوی' عبدالاحد کٹھ ' میر غلام رسول ' حبیب اللہ میر۔ غلام احمد پنڈت ' راجہ محمد مظفر ' خواجہ سیف الدین ' جی ایم مفتی' محمد یوسف زرگر ' ایم اے رشید ' ارشاد بچھ ' ایم اے فاروق ' مجاہد عبدالستار ' غلام نبی زرگر مرحوم ' غلام محمد لالہ مرحوم ' سردار رحمت اللہ مرحوم' آذر عسکری مرحوم ' خواجہ فاروق ' راجہ ممتاز حسین راٹھور ' مقصود کیانی ' خواجہ عبدالرشید ' عبدالحمید لون ' غلام دین لالہ ' میر عبدالحمید مرحوم شامل ہیں۔ راجہ مظفر سے گہرے گھریلو تعلقات ہیں ان کی اہلیہ ایک عظیم اور

محب وطن خاتون ہیں اور بچے بھی بڑے پیارے ، چکار کے غفار ریشی اور مقبول نائیک میرے قریبی عملی ساتھی رہے ہیں۔ غفار ریشی ایک عظیم مجاہد ہے۔

ضلع پونچھ اور باغ سے جن اصحاب کے ساتھ میرے قریبی تعلقات رہے ہیں ان میں سردار رشید حسرت کے علاوہ سردار علی محمد مرحوم ، قاری نثار ، سردار زرین خان شامل ہیں۔ سردار رؤف کشمیری سے گزشتہ سال سے گہرے تعلقات ہیں حافظ ممتاز ایک اچھا قومی کارکن ہے۔ آزاد کشمیر کے سابق صدور سردار محمد ابراہیم خان اور موجودہ صدر سردار محمد عبدالقیوم خان سے شدید نظریاتی اور سیاسی اختلافات کے باوجود ذاتی تعلقات خاصے خوشگوار رہے ہیں۔ باغ کے سید حسن شاہ گردیزی سے بھی میرے ذاتی تعلقات ہیں ، بن جونسہ کے خادم حسین صاحب - پانیوالہ کے منظور کیانی صاحب سے ان کے قیام جدہ سے خاصے تعلقات رہے ہیں۔

میرپور آزاد کشمیر میں جن لوگوں کے ساتھ میرے قریبی ذاتی اور /یا سیاسی تعلقات رہے ہیں۔ ان میں سے عبدالخالق انصاری صاحب ، ملک عبدالمجید جج سپریم کورٹ آزاد کشمیر ، کرنل علی احمد شاہ سابق صدر آزاد کشمیر ، جی ایم میر ، صوفی محمد زمان مرحوم ، ماسٹر عبدالرحمٰن مرحوم ، بشیر تبسم ، چوہدری شہباز ، چوہدری محمد صادق ، صابر انصاری ، بشارت احمد شیخ ایدوکیٹ ، ممتاز ہاشمی ایڈووکیٹ ، یونس سرکھوی ایڈووکیٹ ، چوہدری سلمان ایڈووکیٹ ، چاچا علی محمد ایڈووکیٹ ، عبدالغفور قریشی ایڈووکیٹ ، چوہدری عبدالمجید ایڈووکیٹ ، خواجہ نذیر ، ریاض انقلابی ایڈووکیٹ ، فاروق سہیل ، نذیر تبسم ، نذیر انجم ، شوکت مجید ، محمد صدیق ہکتو مرحوم ، غلام نبی پنڈت ، کامریڈ جوشی ، عبداللطیف دت ایڈووکیٹ ، عظیم دت ایڈووکیٹ ، میر غلام رسول ، صوفی لطیف صاحب ، حاجی وہاب الدین مرحوم ، حاجی عبدالغنی ، کامریڈ محمد حسین مرحوم ، غلام نبی انصاری صاحب ، خواجہ شفیع ایڈووکیٹ کے علاوہ آزاد مسلم کانفرنس کے سابق صدر اور موجودہ سربراہوں یعنی چوہدری نور حسین صاحب اور بیرسٹر سلطان محمود ، لبریشن لیگ کے سربراہ چوہدری شریف طارق سے ذاتی اور سیاسی مراسم رہے ہیں۔ کوٹلی کے ملک اصغر ایڈووکیٹ ، عزیز کوثر ، عمر فاروق وغیرہ سے تعلقات رہے ہیں - گلگت کے جن اصحاب سے میرے قریبی ذاتی اور سیاسی تعلقات رہے ہیں ان میں کرنل حسن خان مرحوم ، محمد بابر خان مرحوم (ان دونوں اصحاب نے گلگت کی آزادی میں کلیدی کردار ادا کیا تھا) حبیب اللہ میر ، عبدالسلام میر ، فضل احمد ٹھیکیدار ، فضل الرحمٰن پونیالی ، ملک محمد مسکین ، عبدالقدوس ، صوبیدار میجر جیدر - وکلاء میں سے محمد عیسیٰ ، شیرولی پونیالی ، شیرولی جنگلوٹی ، الطاف حسین ، سابق اور موجودہ سرکاری افسروں میں سے محمد عالم خان ، فرمان ولی خان ، سعید احمد ، ملک محمد شریف ، عبدالواحد ، محمد اکرم خان ، ہدایت علی خان ، ہمایوں بیگ ، کرنل شگری ، حسین ولی خان ، وزیر مظفر ، مظفر علی خان ، غازی جوہر ، محمد خورشید ، میر افضل ، کرنل یعقوب ، وزیر سجاد علی ، امیر حمزہ شامل ہیں۔ پونچھ میں جن احباب سے قریبی تعلقات رہے ہیں ان میں ڈاکٹر محمد شریف ،

ظل اللہ خان ، عبدالمجید ، فقیر محمد ٹھیکدار اور میرو مرحوم شامل ہیں۔ ہرچو استور کے ٹھیکیدار مراد خان صاحب میرے بڑے خیر خواہ ہیں۔ خاص استور میں حاجی محمد خان صاحب - ہمارے خاندانی محسنوں میں سے ہیں۔ نگورہ کے وزیر علی رضا رٹو کے عنایت خان ،گودائی کے صوبیدار دلاور خان اور ان کے اہل خاندان میرے خیر خواہوں میں سے ہیں - بلتستان کے وزیر زمان علی - شیخ غلام محمد - شمیم بلتستانی اور وزیر غلام مہدی علیگ سے قریبی تعلقات رہے ہیں۔

برطانیہ میں دس سالہ قیام کے دوران جن اصحاب (کشمیریوں) کے ساتھ میرے قریبی ' ذاتی یا سیاسی تعلقات رہے ہیں ان میں برمنگھم کے مرزا محمد صدیق صاحب' محمد محمود نظامی صاحب حاجی بشیر صاحب ، بشیر انصاری صاحب ، حاجی آفتاب صاحب حاجی گلزار مرحوم ، حاجی عنایت صاحب ، خادم حسین صاحب ، صادق انصاری صاحب ، سلیم انصاری ، محمد یاسین ، خواجہ محمد صدیق صاحب' چوہدری عبدالمجید ، چوہدری عبدالغفور' خواجہ رشید صاحب ، حاجی عبدالرحمٰن صاحب ،چوہدری سلطان محمود صاحب ، محمد عارف صاحب ، محمد نذیر صاحب' مولانا محمود احمد میرپوری ' پروفیسر محمود ہاشمی ، راجہ حبیب خان ، مولانا مشہدی ، عبدالغفور بھٹی ، راجہ محمد ایوب ، اسلم مرزا ، معصوم انصاری ، صدیق بھٹی ، احسان الحق ، زبیرالحق انصاری ، جہانگیر مرزا ، نعیم انصاری ، ڈاکٹر صدیق ، عزیز بھٹی ، جمعہ بھٹی ، نذیر نازش ، محمد اعظم ، محمد ناظم ، ماسٹر منگا خان ، چوہدری رشید ' عبدالغفور غوری ، عظیم چوہدری ، چوہدری صادق ، صوفی غلام محمد' محمد فاضل و محمد فاروق انصاری وغیرہ - اولڈھم کے محمد افضل جاتکوی ، چوہدری نادر حسین ، خواجہ عبدالرشید ، پروفیسر رشید ، حاکم علی ، محبوب حسین ، شبیر حسین کاشمیری ، محمد اسلم ، خواجہ یاسین ، مسعود احمد ، مشتاق حسین ، محمد مالک ، خادم حسین ، ہیلی فیکس سے شبیر چوہدری' عبدالرحمٰن چوہدری ، سلطان زمرد ، عبدالسلام ' ارشد محمود ، محمد یونس۔ راچڈیل کے قربان علی۔ بریڈ فورڈ کے محمد عجیب صاحب (سابق لارڈ میئر) حاجی ایوب صاحب ، پیر معروف حسین شاہ صاحب ، بلال انصاری ، عبدالخالق بھٹی ، کامریڈ مقبول ' ناٹنگھم سے لالہ عبدالرحمٰن ، عظمت خان' محمد اسلم جے پی' راجہ فرزند علی۔ ڈربی سے محمد صابر ' تصدق حسین ، محمد اعظم - بلیک برن سے چوہدری صدیق ، ایکرنگٹن سے چوہدری محمد یونس ' چوہدری سرور ، قاضی صدیق ، حاجی نذیر عالم اور منیر اقبال - مانچسٹر سے چوہدری صابر ، اقبال بٹ صاحب ، برنلے سے نذیر اسلم ، جہانگیر اقبال ، منظور زخمی - گلاسگو سے بابو عبدالرحیم صاحب' بشیر تبسم' راجہ حنیف۔ ایلزبری سے محمد نجیب ، چوہدری رشید ، محمد حنیف ، راجہ فضل کریم۔ لیوٹن سے ملک محمد شفیع صاحب ، حاجی غلام سرور صاحب ، ملک لطیف صاحب' حاجی منظور صاحب ' راجہ ظفر خان ، ملک اعجاز احمد ، راجہ فضل کریم صاحب ، چوہدری گل زمان ، مسرت اقبال ، افتخار احمد خان ، تصدق حسین ، ملک شاہنواز' ملک لیاقت ، چوہدری ارشاد ، بشیر بیزام' چوہدری پرویز' ملک اظہر محمود' چوہدری رفیق ، محمد ایوب خان' ظفر خان' مشتاق احمد' محمد اقبال' راجہ کمان افسر۔

مظفر بیگ، چوہدری بشیر، چوہدری اکرم، چوہدری سلیمان، شریف راٹھور، راجہ اکبر داد، مولانا عبدالعزیز خطیب جامع مسجد، حاجی سائیں خان۔ سٹوک آن ٹرنٹ کے محمد سکندر، محمد جہانگیر، غلام ربانی، سلو سے راجہ گل نواز، عبدالعزیز، جاوید سلیم، محمد محفوظ۔ لندن سے عبدالجبار بٹ، ایم اے حسین، سلطان علی شاہ، حاجی عبدالغنی، علی کیانی، چوہدری خان ولی، ماسٹر فیض عالم، ایس آر بنگش، الطاف عباسی، ڈاکٹر محمد ایوب صاحب اور بیڈ فورڈ کے محمد خان، محمد اقبال اور چوہدری ولایت شامل ہیں۔

ہالینڈ میں جن اصحاب کے ساتھ میرے سیاسی کے علاوہ قریبی ذاتی تعلقات بھی رہے۔ ان میں سردار محمد اشرف خان، ندیم عمریز، کیانی برادران، صوفی نسیم، راجہ نذیر، راجہ گل بہار، راجہ حبیب اور برادران، خلیل قیصر، بشیر بھٹی، راجہ شاہد، ارشاد بخاری، لیاقت شفیق، فیروز خان، اور شبیر بٹ سر فہرست ہیں۔ وہاں مقیم پاکستانی صحافی وہاب صدیقی کے علاوہ وقاص بٹ وغیرہ سے بھی قریبی تعلقات رہے۔

ڈنمارک میں میرے قریب ترین ساتھی حاجی غلام رسول صاحب، راسب کاشمیری، چوہدری اعظم، بشیر بھٹی وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ راجہ اکبر، عبدالقیوم، ماسٹر کرداد سے بھی خاصے مراسم تھے۔ مغربی جرمنی میں میرے قریب ترین ساتھی سردار مشتاق، عبدالقیوم منصب دار، راجہ قیوم، عبدالکریم بٹ وغیرہ تھے۔ فرانس میں ارشاد بخاری، ملک مشتاق، سہراب خان، راٹھور برادران اور خواجہ محمد سرور تھے۔ نیویارک میں جن لوگوں سے میرے انتہائی قریبی تعلقات رہے ان کا ذکر اقوام متحدہ میں میری سرگرمیاں والے باب میں ہے۔

مشرق وسطیٰ میں برسرروز گار کشمیریوں میں سے جدہ میں سردار خادم حسین، راجہ پرویز، عبدالقیوم، راجہ آزاد، محمد بابر مرحوم، راجہ محمد نواز، نسیم گلشن، سردار سلیم، خواجہ رشید، عبدالقیوم وغیرہ سے قریبی ذاتی اور سیاسی تعلقات رہے۔ ابو ظہبی میں جن لوگوں کے ساتھ سیاسی کے علاوہ قریبی ذاتی تعلقات بھی رہے ان میں افضل کیانی، حاجی نذیر صاحب، محمد حمید، محمد بشارت، انور خان، خورشید خان، محمد خورشید، سردار مقصود، سردار الطاف، جاوید مرحوم، محمد نقی خان، نذر حسین، جنت حسین، نور محمد خان، محمد ارشاد خان، محمد شفیق خان، شارجہ میں محمد آزاد اور عبدالرزاق اور راس الخیمہ میں عبدالجبار صاحب اور لیاقت علی شامل ہیں۔ دہران میں جن لوگوں کے ساتھ قریبی تعلق رہا ان میں افضل طاہر، مشتاق خان، شاہ میر خان، ریشم خان، راجہ حنیف، راجہ صغیر، غزن محفوظ، محمد اکرم، غلام رسول، محمد حسین، مسٹر محمود، مسٹر رحمانی اور ریاض میں اشرف گلشن، محمد یاسین، محمد اعتبار وغیرہ شامل ہیں۔

کویت میں سردار محمد یوسف صاحب اور پسران، مفتی صاحب اور ان کے فرزند عبدالصمد صاحب کے علاوہ غلام جیلانی سے سیاسی اور ذاتی تعلقات رہے۔

میرے ان سیاسی اور ذاتی دوستوں میں سے اکثر نے مختلف اوقات میں میری سیاسی یا ذاتی مدد کی ہے جس کے لئے میں ان کا مشکور ہوں۔ ان میں سے بھاری اکثریت ان لوگوں کی ہے جو محاذ رائے شماری' این ایل ایف یا لبریشن فرنٹ میں میرے ساتھ رہے ہیں۔

آٹھواں باب

عزیز و اقارب جنہوں نے میری خدمت کی

میں اپنے آبائی گھر سے تقریباً چھ سال کی عمر میں نکلا۔ ہائی ہامہ میں قیام کے دوران مجھے اپنے بہنوئی اور بہنوں کی شفقت حاصل رہی لیکن پرائمری پاس کرنے کے بعد سے لے کر کراچی میں اپنے سکولوں کے قیام تک کے بارہ سال کے دوران میں ایک خود کفیل طالب علم کی حیثیت سے دوسروں کا دست نگر رہا اور کل وقتی اور جز وقتی ملازمتیں کرتا رہا۔ رہائش کبھی کسی کے گھر (Paying Guest) کی حیثیت سے رہی، کہیں ہوسٹل میں تو کہیں دوستوں کے ساتھ۔ اس طرح مجھے مدت تک گھریلو ماحول میسر نہیں آیا۔ 1956ء میں میرے برادر اصغر علی اللہ خان تعلیم کے سلسلے میں کراچی آئے اور اس کے بعد حصول تعلیم ہی کے سلسلے میں آنے والے میرے عزیزوں کا تانتا بندھ گیا۔ ان میں سے اکثر میرے زیر کفالت تعلیم حاصل کرنے آئے تھے اور میرے ساتھ ہی قیام پذیر رہے - چنانچہ 1956ء سے 1976ء تک ان عزیزوں نے جن میں علی اللہ خان کے علاوہ نیاز محمد، محمد نواز مرحوم، محبوب عالم، محبوب علی، عبدالحکیم، جمشید علی، کریم خان، عبدالرحمان، محمد سلیم، قدم خان، عبداللطیف، شوکت رشید، شوکت علی، محمد سلیم، اسلم عبداللہ، شوکت علی، خورشید عالم، شاہد حمید، مشتاق احمد، محمد طیب اور برکت اللہ وغیرہ شامل تھے نے میرے ہاں قیام کے دوران میری بڑی خدمت کی۔ باغ آزاد کشمیر کے محمد حمید خان اور اس کے دو بھائی محمد آزاد اور محمد رزاق اور چچا زاد بھائی محمد افتبار کئی سال تک میرے ساتھ رہے۔ انہوں نے بھی میری بہت خدمت کی۔ چاروں اب متحدہ عرب امارات میں قیام پذیر ہیں۔

1967ء سے 1973ء تک میرے بہنوئی ہاشم علی خان مرحوم کی بڑی بیٹی اور اس کی بیٹی (جس کی شادی 1971ء میں میرے بھانجے ڈاکٹر محبوب عالم سے ہوئی تھی) میرے ساتھ رہیں اور اس دوران دونوں ماں بیٹی نے میری بڑی دیکھ بھال کی۔ میر ملک استور کے عبدالبشیر خان نے بھی میرے ہاں قیام کے دوران میری بڑی خدمت کی۔ 1973ء میں میری شادی کے بعد برادرم ڈاکٹر نور جلیل کی بڑی بیٹی میرے ساتھ کراچی آئی اور ہماری برطانیہ سے واپسی کے بعد سے چھوٹی بیٹی ہمارے ساتھ ہے۔ ان دونوں بہنوں نے میری خدمت کے سلسلے میں سگی بیٹیوں کا سا

کردار ادا کیا۔ ہمارے قیام برطانیہ کے دوران میری اہلیہ کے تایا زاد بھائی عبدالعزیز مرحوم کی چھوٹی بیٹی چند سال تک ہمارے ساتھ رہی اس نے بھی ہماری بڑی خدمت کی میری شادی سے پہلے میرے گھریلو ملازموں چترال کے رحمت علی' پونیال کے جہانگیر اور نگر کے شفا علی نے بھی ہماری بہت خدمت کی۔ ہماری برطانیہ سے واپسی کے بعد سے وجاہت علی اور مقبول احمد ہمارے ساتھ ہیں۔ کچھ مدت تک نسیم اللہ بھی ہمارے ساتھ رہا۔ میرے بھتیجے قدم خان اور محمد ایوب ' بھانجے شیر عالم اور نور عالم ' بھانجیوں کے بیٹے نعیم جان اور معراج عالم اکثر ہمارے گھر آ کر گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ بونجی کا احسان اللہ خان میری غیر حاضری میں گھر کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ میرے برادر نسبتی کیپٹن احمد سعید آج کل میرے گھریلو معاملات کے انچارج ہیں۔ اگر ڈاکٹر سعید میرے گھریلو معاملات کو نہ سنبھالتے تو میں شاید تحریک آزادی کو اتنا وقت نہ دے سکتا۔ اس طرح ڈاکٹر سعید بالواسطہ طور پر تحریک آزادی میں عملی کردار ادا کر رہے ہیں۔ بارہ سال تک اولاد نہ ہونے کے بعد ڈاکٹر محبوب عالم نے میری ایک بھانجی کی بیٹی سے دوسری شادی کی جس کے بطن سے دو بیٹے آفاق عالم اور سعد عالم ہیں۔

الغرض گزشتہ تین عشروں کے دوران میرے عزیزوں اور گھریلو ملازموں نے میری بڑی خدمت کرنے کے علاوہ بھرپور فرمانبرداری بھی کی ہے جس کے لئے میں ان سب کا مشکور ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے ان عزیزوں میں سے اکثر نے اب معاشرے میں اہم مقام حاصل کیا ہے۔

میرے آبائی مکانات۔ عقب میں پہاڑی کے نیچے سے دریا بہتا ہے

میرے چچا زاد بھائی حاجی صاحب خان ' محمد افضل ' عنایت خان اور ڈاکٹر نور جلیل

میرے بہنوئی گرداور نعمت خان مرحوم

اپنے آبائی گاؤں میں کچھ عزیزوں کے ساتھ

میرے بہنوئی ہاشم علی خان اپنی شرکائے حیات کے ساتھ

میرے ماموں زاد بھائی محمد اسماعیل خان مرحوم

میرے سسر عبدالحمید خان خاور مرحوم

اسما اپنے خالہ زاد وجاہت علی کے ساتھ

میری بیٹی اسما قیام برطانیہ کے دوران

برطانیہ میں زیرِ تعلیم اسماء خان میری امیری پر انٹرویو دیتے ہوئے

شادی کے چند ماہ بعد اپنی اہلیہ کے ساتھ

افریشیائی کمیٹی کی کشمیر کانفرنس میں قرار دادیں پیش کرتے ہوئے (سٹیج پر کے ایچ خورشید اور بیرسٹر ثمین خان)

افریشیائی کشمیر کانفرنس کے شرکاء

میرے نائٹ سکول کا سٹاف اور دسویں کلاس کے طلباء (1961ء)

میرے ڈے سکول کے بچے شوکت رشید کے ساتھ

موسیٰ بلوچ مرحوم
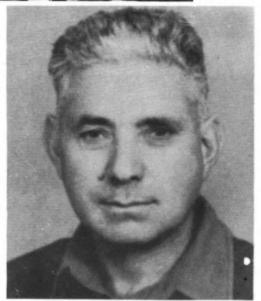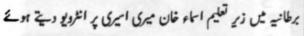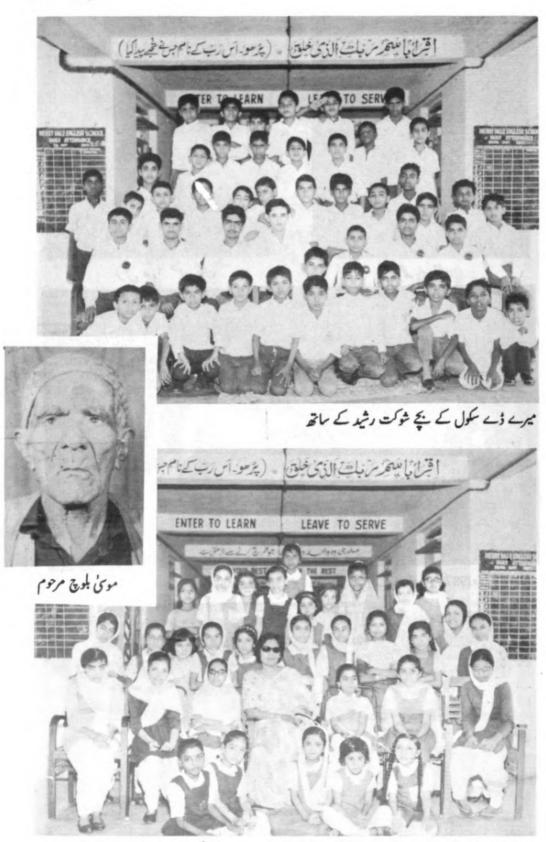
میرے ڈے سکول کی طالبات ، مسز مارٹن کے ساتھ

جہدِ مسلسل

محمد بابر خان

کرنل مرزا حسن خان

1971ء میں گلگت میں گرفتار ہونے والوں میں سے کچھ افراد کے ساتھ (فوٹو 1987ء)

گلگت جیل سے رہائی کے بعد کراچی پہنچنے پر 1972ء

کراچی میں زیرِ تعلیم گلگتی طلباء کے ساتھ

کراچی میں گلگتی طلباء لوک ناچ پیش کرتے ہوئے

گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے لئے ایک مظاہرے کی قیادت کرتے ہوئے

چنار باغ گلگت میں 1947ء کے شہدا کی یادگار

گلگت اور مظفر آباد کے طلباء کا آزاد کشمیر اسمبلی کے سامنے مظاہرہ

حِصّہ دُوم
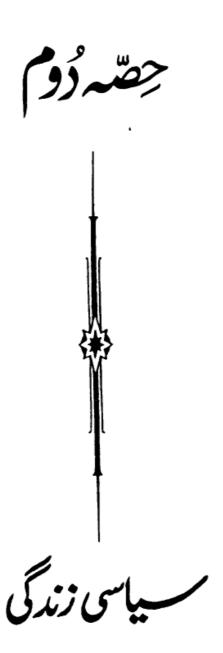
سیاسی زندگی

میری سیاسی زندگی

تحریک آزادی کشمیر، ریاست کے مختلف حصوں کے عوامی حقوق، طلباء کے حقوق اور دیگر متعلقہ معاملات کے بارے میں میرے کردار جسے میری سیاسی زندگی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے، کو درجن بھر مختلف حصوں اور میدانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے ان سے متعلق اپنی سرگرمیوں کو اتنے ہی ابواب میں تقسیم کر کے بیان کیا ہے تاکہ قاری کے سامنے ان کے بارے میں ایک واضح تصویر ابھر آئے۔

پہلا باب

طالب علم کی حیثیت سے میری سیاسی سرگرمیاں

طالب علم کی حیثیت سے میری سیاسی زندگی کا آغاز 1948ء میں مقبوضہ کشمیر کے ہندواڑہ ہائی سکول میں اس وقت ہوا جب ہائی سکول کے طلباء نے مجھے (مسلمان اساتذہ کی کوششوں کے نتیجے میں) میری مرضی کے خلاف اور غیر متوقعہ طور پر سکول کی طلبا یونین کا جنرل سیکرٹری منتخب کیا۔ میں ایک خود کفیل طالب علم کی حیثیت سے غیر تدریسی سرگرمیوں کا متحمل نہیں تھا۔ لیکن اچانک طلبہ یونین کے معاملات کا بوجھ میرے سر آن پڑا تو انہیں نبھانا میرے فرائض میں شامل ہو گیا۔ میں انہیں نبھانے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگا۔ پاکستان نیا نیا بنا تھا اور مسئلہ کشمیر وقت کا اہم ترین مسئلہ تھا۔ ہمارے کچھ مسلمان اساتذہ کشمیر کے پاکستان سے الحاق کے سلسلے میں زیر زمین سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ان مسلمان اساتذہ سے میرے قریبی ذاتی تعلقات تھے۔ جن کی وجہ سے میں بھی ان کی ان سرگرمیوں میں شریک ہو گیا گو میرا کردار پیغامات پہنچانے اور دستاویزات اور پاکستان سے آئے ہوئے اخبارات کے تراشوں کی کاربن کاپیاں بنانے اور انہیں دوسروں تک پہنچانے تک محدود تھا۔ کچھ مدت بعد میرے مذکورہ اساتذہ گرفتار ہو گئے اور مجھے بھی ایک رات پولیس اسٹیشن میں گزارنی پڑی۔ اس کے بعد اساتذہ کی رہنمائی سے محروم ہو کر ان سرگرمیوں سے بھی الگ ہو گیا۔ 1949ء کا سال ذاتی مسائل میں گزرا۔ 1950ء میں ایس پی کالج سری نگر میں داخل ہوا تو وہاں کے ماحول پر سیاست یعنی تحریک آزادی سے متعلق معاملات غالب تھے۔ چنانچہ کچھ مدت بعد میں بھی پاکستان نواز طلباء کے ایک زیر زمین گروپ میں شامل ہو گیا۔ لیکن ہم تحریک کے سلسلے میں زبانی جمع خرچ اور خفیہ اجلاسوں کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ البتہ اکتوبر 1951ء میں پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے قتل کے بعد سری نگر میں ہونے والے طلباء کے مظاہروں کے پیچھے ہمارے اس گروپ کا بھی خاصا ہاتھ تھا۔ جس کے نتیجے میں حکومت میرے سمیت طلباء کی ایک بڑی تعداد کے پیچھے پڑ گئی۔ چنانچہ کچھ مدت کے بعد میں براستہ جموں سیالکوٹ پاکستان آ گیا۔

پاکستان پہنچنے کے کچھ مدت بعد میرا داخلہ ایڈورڈز کالج پشاور میں ہوا تو میں نے پشاور کے کالجوں اور سکولوں میں زیر تعلیم گلگت کے طلباء سے مل کر گلگت سٹوڈنٹس فیڈریشن بنائی۔ جس کا

مجھے جنرل سیکرٹری چنا گیا۔ یہ تنظیم گلگت کے طلباء کی پہلی تنظیم تھی۔ اس تنظیم نے گلگت کے طلباء کے لئے پیشہ وارانہ تعلیم کے اداروں میں نشستوں کے حصول اور مستحق طلباء کے لئے وظائف کے حصول کے لئے خاصی تگ و دو کی۔ لیکن پشاور میں سات آٹھ ماہ کے قیام کے بعد حالات نے مجھے کراچی منتقل ہونے پر مجبور کیا۔

کراچی میں ابتدائی دو ڈھائی سال تک میں ذاتی معاملات میں بری طرح مصروف رہا۔ 1954-55ء میں میں نے کراچی میں زیر تعلیم ریاستی طلباء سے مل کر کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی۔ مجھے اس کا جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا اور انجینئرنگ کالج کے مرزا انور بیگ اس کے صدر منتخب ہو گئے۔ دوسری ٹرم (Term) کے لئے مجھے صدر منتخب کیا گیا اور ڈاکٹر شیخ ابرار احمد (ابرار سرجری پشاور روڈ راولپنڈی والے) جنرل سیکرٹری منتخب ہو گئے۔ ہم نے کشمیری طلباء کے لئے پیشہ وارانہ اداروں میں نشستوں اور مستحق طلباء کے لئے وظائف کے حصول کے لئے بھی تگ و دو کی لیکن زیادہ تر توجہ تحریک آزادی کشمیر پر دی۔ ہم نے کراچی میں کئی مظاہرے بھی کئے۔ اس زمانے میں مسئلہ کشمیر سے متعلق اقوام متحدہ کے نمائندے اکثر کراچی (جو اس وقت پاکستان کا دارالحکومت تھا) آتے تھے۔ چنانچہ ان کی کراچی آمد پر ہم کبھی مظاہرہ کرتے اور کبھی انہیں یاداشتیں پیش کرتے۔

کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن میری طالب علمی کے زمانے کے بعد بھی خاصی سرگرم تھی اور میں ہی عملاً اس کا سرپرست اعلیٰ تھا اس کے اجلاس اور انتخابات بھی میرے سکول میں ہی ہوتے تھے۔ لیکن 1976ء میں میرے برطانیہ جانے کے بعد یہ تنظیم منتشر ہو گئی اور آج کراچی میں نصف درجن بھر کشمیری طلباء تنظیموں کے علاوہ گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والے طلباء کی بھی متعدد تنظیمیں ہیں۔

کشمیری طلباء کی تنظیم جموں کشمیر نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام کے سلسلے میں بھی میں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا آئین مرتب کرنے اور اس کا یہ نام رکھنے میں میرا حصہ کلیدی تھا۔ اس تنظیم نے آزاد کشمیر کے حقوق کے تحفظ اور نظریہ خود مختار کشمیر کی تشہیرو تبلیغ کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ لیکن 1980ء کے بعد اس کے نظریات میں تبدیلی اور اندرونی انتشار کی وجہ سے دونوں میدانوں میں اس کی افادیت میں خاصی کمی آ گئی ہے۔

یہ تھی طالب علم کی حیثیت سے میری سیاسی سرگرمیوں اور مختلف طلباء تنظیموں کے سلسلے میں میرے کردار کی انتہائی مختصر سی روداد۔

دوسرا باب

گلگت بلتستان سے متعلق معاملات

گلگت بلتستان کے عوامی حقوق و مفادات کے بارے میں میری جدوجہد کی تفصیلات میں جانے سے پہلے ضروری ہے کہ ان علاقوں کے جغرافیہ اور حالیہ تاریخ اور اس سے متعلق اہم حقائق پر ایک نظر ڈالی جائے کیونکہ لوگوں کو ان امور کے حقیقی پہلوؤں کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضروری ہے کہ ان علاقوں کے عوامی حقوق کے بارے میں میری جدوجہد کے علاوہ دوسرے افراد اور تنظیموں کی جدوجہد کا بھی کچھ احاطہ کیا جائے کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ حقائق نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں اور وہ افراد اور تنظیمیں جنہوں نے گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے سلسلے میں کوئی مثبت کردار ادا کیا ہے اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے اس کردار کو تاریخ کے حوالے کیا جائے۔

(نوٹ:۔ گلگت کے 1971ء کے واقعات کی تفصیل "میری اسیریاں" کے باب میں ہے)

غیرت مند، بہادر، سادہ مزاج اور مذہب پرست لیکن سیاسی شعور کے لحاظ سے مجموعی طور پر خاصے پسماندہ اور ڈیڑھ عشرے قبل تک انتہائی افلاس اور غربت کی چکی میں پسے رہنے والے تقریباً نو لاکھ انسانوں کا علاقہ گلگت بلتستان ساٹھ ہزار مربع کلو میٹر سے زائد رقبے پر پھیلا ہوا ہے جس میں دنیا کی چار بلند ترین چوٹیوں میں سے دو یعنی کے ٹو اور نگا پربت، انتہائی حسین مناظر والے علاقے ہنزہ، پونیال، گوپس، گلگت، استور، اسکردو، شگر، کچورہ اور خپلو وغیرہ، ہزاروں سال پرانی تہذیبوں کے نشانات، انتہائی لذیذ میوے، صحت بخش آب و ہوا، مختلف کلچر اور متعدد نسلی قبیلے اور مذہبی فرقے سمائے ہوئے ہیں اور جس کی سرحدیں پاکستان کے علاوہ چین اور افغانستان سے ملی ہوئی ہیں۔ روس کی جنوبی سرحد اور گلگت کی شمالی سرحد کے درمیان چین اور افغانستان کی تقریباً بیس کلو میٹر چوڑی پٹیاں ہیں۔ مشرق میں ان علاقوں کو حد متارکہ جنگ نے ریاست جموں کشمیر کے بھارتی مقبوضہ علاقے سے علیحدہ کیا ہے جبکہ استور کا جنوب مشرقی علاقہ آزاد کشمیر کے ضلع مظفر آباد سے ملحق ہے۔

گلگت بلتستان کے علاقے اپنی تاریخ کے ایک بڑے حصے کے دوران کشمیر کا حصہ رہے

ہیں کہا جاتا ہے کہ آزاد و خود مختار کشمیر کا آخری حکمران خاندان (چک خاندان) ان ہی علاقوں سے جا کر وادی کشمیر میں آباد ہوا تھا۔ البتہ وقفے وقفے سے یہ علاقے خود مختار یا نیم خود مختار مقامی حکمرانوں کے تحت بھی رہے ہیں یہاں تک کہ گلگت کے سب سے مشہور حکمران گوہر امان نے سکھوں ' ڈوگروں اور انگریزوں کی طاقت کو تین بار شکست فاش دے کر ان علاقوں سے بھگایا۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد ڈوگروں نے نگر نژاد مقامی راجہ کریم خان کے بیٹے کی مدد سے گلگت پر قبضہ کر لیا اور انیسویں صدی کے آخری عشرے تک سارے علاقے پر قابض ہو گئے۔

1935ء تک گلگت بلتستان کے موجودہ علاقے اور لداخ مل کر ریاست جموں کشمیر کے سرحدی اضلاع کہلاتے تھے۔ 1935ء میں برصغیر کے انگریز حکمرانوں نے موجودہ ضلع گلگت اور ضلع دیا میر کے کچھ علاقے ریاستی حکومت سے ساٹھ سال کے پٹے پر لے لئے تاکہ روس میں قائم ہونے والی کیمونسٹ حکومت پر نظر رکھی جا سکے۔ یہ علاقے 1947ء تک انگریزوں کی عملداری میں رہے۔ یہاں اس حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ 1935ء سے 1947ء تک کے ان بارہ سال کے دوران بھی سارا بلتستان اور استور حسب سابقہ ریاستی حکومت کی عملداری میں رہا۔ جولائی 1947ء کے اواخر میں انگریزوں نے پٹے پر لیا ہوا علاقہ بھی ریاستی حکومت کو واپس کر دیا اور ریاستی حکومت نے فوراً ہی ان علاقوں اور بلتستان استور لداخ پر مشتمل ریاست کا تیسرا صوبہ بنا دیا (باقی دو صوبے وادی کشمیر اور صوبہ جموں تھے) گلگت شہر کو نئے صوبہ کا دارالحکومت بنایا گیا اور یکم اگست 1947ء کو بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ نے اس کے گورنر کا چارج لیا۔ اس موقع پر گلگت کے علاوہ سری نگر اور جموں میں بھی چراغاں کیا گیا۔

14 اگست 1947ء کو برصغیر انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہوا۔ جس کے نتیجے میں بھارت اور پاکستان کی دو خود مختار مملکتیں وجود میں آئیں ' قانون آزادی ہند کے تحت ریاست جموں کشمیر سمیت برصغیر کی نیم آزاد شخصی ریاستوں کو حق دیا گیا تھا کہ وہ ان دو مملکتوں میں سے کسی ایک سے الحاق کریں یا مکمل خود مختاری کا اعلان کریں۔ لیکن اپنے فیصلے کو ریاستی رائے عامہ' ریاست کی جغرافیائی حیثیت اور اقتصادی مفادات کے تابع رکھیں۔ ان شرائط کے تحت ریاست جموں کشمیر کے سامنے صرف دو راستے تھے یعنی مکمل خود مختاری یا پاکستان سے الحاق - لیکن جب بھارت کے توسیع پسند لیڈروں نے اندرونی سازشوں کے ذریعہ ریاست کو بھارت کے ساتھ ملانے کی کوششیں شروع کیں تو پونچھ کے جنگجو لوگوں نے ریاستی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ 4 اکتوبر 1947ء کو کچھ انقلابی کشمیریوں نے ریاست کی ایک عارضی باغی حکومت قائم کی اور 24 اکتوبر کو اس کی تنظیم نو کی۔ ادھر 22 اکتوبر کو ہی پاکستان کے قبائل بھی ریاست میں داخل ہو گئے تو مہاراجہ کشمیر سری نگر سے بھاگ کر جموں پہنچا جہاں بھارتی حکومت نے اس سے ریاست کے بھارت سے الحاق کی دستاویز پر دستخط لئے اور 27 اکتوبر کو اپنی فوجیں ہوائی جہاز کے ذریعے

سری نگر میں اتار دیں۔

اس صورت حال کو دیکھ کر بونجی (گلگت) میں متعین ریاستی فوج کے اکثر مسلمان افسروں اور جوانوں، گلگت سکاؤٹس کے جوانوں اور جونیئر کمیشنڈ افسروں اور گلگت بلتستان کے عوام نے بھی ریاستی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور یکم نومبر 1947ء کو گورنر گھنسارا سنگھ کو گرفتار کر کے 2 نومبر کو وہاں گلگت کے راجہ شاہ رئیس خان کی سرکردگی میں ایک عارضی آزاد حکومت قائم کی۔ اس آزاد حکومت کے قیام کے دو ہفتے بعد حکومت پاکستان نے اپنا ایک نمائندہ گلگت بھیجا جس نے گلگت کے پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا۔

ادھر ریاستی فوج کے مسلمان افسروں اور جوانوں، گلگت سکاؤٹس (جو ایک نیم فوجی تنظیم تھی) اور گلگت بلتستان کی سول آبادی کی طرف سے جنگ آزادی جاری رہی۔ فوجیوں اور اسکاؤٹس میں سے کچھ استور کے راستے وادی کشمیر کی طرف اور کچھ بلتستان کی طرف سے لداخ کی طرف روانہ ہو گئے ۔ بلتستان کی طرف سے جانے والوں کی مدد چترال کے حکمران کے باڈی گارڈز نے بھی کی۔ استور میں محمد اسماعیل خان (میرے ماموں زاد بھائی) نے سول ایڈمنسٹریٹر کے فرائض سنبھالے چنانچہ انہوں نے مقامی آبادی کے مکمل تعاون سے مجاہدین کے خوراک اور بار برداری کا پورا انتظام کیا۔ علاوہ ازیں استور کے نوجوانوں نے جنگ آزادی میں بھی بھرپور حصہ لیا اور اسی جنگ کے دوران میرے چچا زاد بھائی عبدالجمیل شہید ہو گئے ۔ گلگت بلتستان کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں خاص کر ریاستی فوج اور گلگت سکاؤٹس کے افسروں کا کہنا ہے کہ اگر استور اور بلتستان کے لوگ اس اعلیٰ جذبہ حب الوطنی اور ایثار و قربانی کا مظاہرہ نہ کرتے تو شاید گلگت بلتستان کا سارا علاقہ آج بھارت کے قبضے میں ہوتا ۔

گلگت بلتستان کے ان حریت پسندوں نے اپریل 1948ء تک صوبے کے بیشتر حصے یعنی تقریباً ایک لاکھ مربع کلو میٹر (پینتالیس ہزار مربع میل) علاقے کو آزاد کر لیا تھا۔ استور کی طرف سے وہ گریز کو آزاد کرانے کے بعد وادی کشمیر کے دروازے بانڈی پورہ پر اور بلتستان کی طرف سے کرگل پر قبضہ کرنے کے بعد لداخ کے ہیڈ کوارٹر لیہہ کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ اسی دوران پاکستان کے کچھ فوجی افسروں کو ان محاذوں پر تعینات کیا گیا اور تھوڑی ہی مدت کے بعد ان کی مرزا حسن خان (جو بانڈی پورہ محاذ پر حریت پسندوں کی قیادت کر رہے تھے) سے ان بن ہو گئی اور ان پاکستانی افسروں کی شکایت پر حسن خان کو حکومت پاکستان نے گلگت واپس بلایا جہاں سے انہیں صوبہ سرحد بھیجا گیا۔ اس واقعے کے کچھ مدت بعد وادی گریز کا وسیع علاقہ حریت پسندوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ادھر لداخ سیکٹر پر بھی ایسے ہی کچھ حالات کی وجہ سے لیہہ اور کرگل کے وسیع علاقے ہاتھ سے نکل گئے چنانچہ یکم جنوری 1949ء کو اقوام متحدہ کی طرف سے ریاست میں رائے شماری کرانے کے وعدہ پر ہونے والی جنگ بندی کے وقت گلگت بلتستان کا

آزاد شدہ علاقہ گھٹ کر 60 ہزار مربع کلو میٹر رہ گیا تھا۔
یکم جنوری 1949ء کی جنگ بندی اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاکستان (UNCIP) کی 13اگست 1948ء کی اس قرار داد کے تحت ہوئی تھی۔ جسے بھارت اور پاکستان نے بھی تسلیم کیا تھا اور جس کے بعد گلگت بلتستان سمیت پوری ریاست جموں کشمیر میں ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے رائے شماری ہونی تھی۔ لیکن مختلف وجوہات خاص کر بھارت کی ہٹ دھرمی کی بنا پر یہ رائے شماری آج تک نہ ہو سکی۔
گلگت بلتستان کی جنگ آزادی میں ریاست جموں کشمیر کی فوج متعینہ بونجی اور اسکردو کے مسلمان افسروں اور جوانوں - گلگت اسکاؤٹس کے جے سی اوز اور جوانوں اور گلگت بلتستان کے عوام نے بھرپور حصہ لیا لیکن جن لوگوں نے دوسروں سے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے ان میں ریاست جموں کشمیر کے مختلف حصوں یعنی وادی کشمیر جموں، پونچھ، میرپور، مظفر آباد وغیرہ سے تعلق رکھنے والے جوانوں اور افسروں خاص کر گلگت کے مرزا حسن خان اور احسان علی۔ راجوری کے محمد خان، سری نگر کے غلام حیدر۔ جموں کے سعید درانی - پونچھ کے محمد دین اور میرپور کے نیک عالم اور محی الدین۔ گلگت سکاؤٹس کے جوانوں اور جونیئر کمیشنڈ افسروں خاص کر راجہ محمد بابر خان، شاہ خان، جان عالم، شیر علی، غلام مرتضیٰ، صفی اللہ بیگ، شاہ خان، فدا علی، اکبر حسین، شاہ زمان، محمد فردوس، سلطان فیروز صوفی، محمد اعظم رستم اور محمد اسماعیل، مہتر چترال کے باڈی گارڈز اور ان کے افسروں خاص کر متاع الملک اور برہان الدین شامل تھے۔ بلتستان کے صوبیدار محمد علی اور اس کی پارٹی نے دشمن کے محاصرے میں آنے کے باوجود جنگ بندی کے کئی ماہ بعد تک اپنی جنگ آزادی جاری رکھی۔ عوام میں سے حراموش گلگت کے بختاور شاہ نے اکیلے ہی ڈوگرہ فوج کے 24 غیر مسلم سپاہیوں کو گرفتار کر کے اور ان سے اسلحہ چھین کر انہیں آزاد فورسز کے حوالہ کیا۔ ایسی ہی ایک داستان لوس استور کے ماسٹر فرض خان اور ساتھیوں کی ہے۔ جنہوں نے ایک درجن سے زیادہ مسلح ڈوگروں کو گرفتار کر کے مقامی حکام کے حوالہ کر دیا۔
عوامی سطح پر گلگت کی انجمن سرفروشان جن کے سرگرم ممبروں میں محمد علی بربری، منشی فدا علی، امیر جہانداد خاں، غلام عباس، زوار محمد ولی، غلام علی، شکور محمد بونجی سے محمد ظل اللہ، ڈموٹ سے ڈاکٹر محمد نگیں، چلاس سے مولوی راجی الرحمت اور قدم خان، بسین سے عبدالمجید شمشیر خان گلگت سے زوار محمد حنیف، غلام نبی، عبدالمجید، عیسیٰ خان، جوہر علی، قابل ذکر بتائے جاتے ہیں، نے جدوجہد آزادی میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے - ماسٹر دولت شاہ مرحوم نوجوانوں میں حب الوطنی کے جذبات ابھارنے میں پیش پیش تھے۔
الغرض گلگت بلتستان کی جنگ آزادی کی کہانی اپنے اندر دلیری، شجاعت حب الوطنی اور جذبہ ایثار و قربانی کی ایسی بے شمار مثالی اور حیران کن داستانیں لئے ہوئے ہے جن سے اسلام

کے ابتدائی دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اپریل - 1949ء میں آزاد کشمیر کے صدر سردار محمد ابراہیم خان - آزاد کشمیر کی حکمراں پارٹی آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے سربراہ چوہدری غلام عباس اور پاکستان کے وزیر بے محکمہ نواب مشتاق احمد گورمانی کے دستخطوں سے حکومت آزاد کشمیر اور حکومت پاکستان کے مابین ریاست کے آزاد شدہ علاقوں کے بارے میں دونوں حکومتوں کے فرائض و اختیارات سے متعلق ایک معاہدہ ہوا جس کی شق نمبر آٹھ اے (Viii A) کے تحت گلگت (بمعنی گلگت بلتستان) کے انتظامی امور عارضی طور پر حکومت پاکستان کی تحویل میں دیئے گئے - بعد میں یہ طے پایا کہ گلگت بلتستان پاکستان کی وزارت امور کشمیر کے تحت ہی رہیں اور وزارت امور کشمیر کے جوائنٹ سیکرٹری آزاد حکومت کے مشیر اعلیٰ اور گلگت بلتستان کے ریذیڈنٹ بھی ہوں گے اور یہ سلسلہ پچیس سال تک چلتا رہا۔

گلگت بلتستان کے عوام سیاسی شعور کے لحاظ سے انتہائی پسماندہ تھے چنانچہ وزارت امور کشمیر کی افسر شاہی خاص کر گلگت بلتستان میں مختلف عہدوں پر متعین حکام ان پر اپنی مرضی کے مطابق حکم چلاتے رہے اور آہستہ آہستہ یہ علاقے پاکستان کی افسر شاہی کے لئے ایک جاگیر بن گئے - ان علاقوں کی جغرافیائی اور دفاعی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ حکومت پاکستان نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ان علاقوں کے عوام کو آزاد کشمیر کے معاملات سے بالکل الگ تھلگ کرنا شروع کیا اور اس کی ابتداء چوہدری غلام عباس صاحب کی طرف سے ان علاقوں میں قائم کی گئی مسلم کانفرنس کی شاخوں کے خاتمے سے کی گئی - نئے تعلیمی نصاب کے ذریعے ان علاقوں کی نئی نسل کو یہ تاثر دیا جاتا رہا کہ یہ علاقے ریاست جموں کشمیر کے نہیں بلکہ پاکستان کے آئینی حصے ہیں - گلگت بلتستان کو "شمالی علاقے" کا نام دیا گیا کچھ مدت بعد وزارت امور کشمیر کا نام بدل کر وزارت امور کشمیر و شمالی علاقہ جات رکھا گیا تاکہ یہ تاثر اور بھی گہرا ہو جائے کہ کشمیر اور شمالی علاقے دو مختلف آئینی خطے ہیں - گلگت بلتستان میں پاکستان کے ناظم اعلیٰ کو ابتداء میں پولیٹیکل ریذیڈنٹ کہا جاتا تھا - پھر ریذیڈنٹ کمشنر کہا جانے لگا اس کے بعد کمشنر اور اب ایڈمنسٹریٹر کہا جاتا ہے یہی نہیں بلکہ 1977ء میں پاکستان میں لگنے والے مارشل لاء کا اطلاق ان علاقوں پر بھی کیا گیا حالانکہ 1958ء اور 1969ء میں ایسا نہیں کیا گیا تھا - کشمیری سیاست اور تحریک آزادی کشمیر کے لئے یہ علاقے عملاً ممنوعہ قرار دیئے گئے ان تمام اقدامات کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ یہ حقیقت نظروں سے اور بھی اوجھل ہو جائے کہ گلگت بلتستان پاکستان کا نہیں ریاست جموں کشمیر کا آئینی حصہ ہیں -

1935ء سے 1947ء تک گلگت کے پٹے پر لئے ہوئے علاقوں پر انگریزوں نے ایف سی آر نام کا ایک کالا قانون نافذ کیا تھا جس کے تحت انتظامیہ کو آمرانہ اختیارات حاصل تھے اور وہ

حکومت حتیٰ کہ مقامی انتظامیہ پر تنقید کرنے والوں کو بھی وجہ بتائے بغیر گرفتار کرکے غیر معینہ مدت تک قید رکھ سکتی تھی اور ان سے متعلق کیس کی سماعت باقاعدہ عدالت کی بجائے ایک جرگہ کرتا تھا جس کے ممبر انتظامیہ کے اشاروں پر ناچتے تھے - حکومت پاکستان نے اس کالے قانون کو ان علاقوں سے ہٹانے کی بجائے بلتستان اور استور پر بھی نافذ کر دیا جو 1935ء سے 1947ء تک کے دوران بھی ریاستی حکومت کی عملداری میں تھے - ان علاقوں کو کشمیر اسمبلی میں نمائندگی حاصل تھی - ہنزہ - نگر - پونیال، گوپس، اشکومن، اور یاسین کے عوام پاکستان کی انتظامیہ کے علاوہ مقامی حکمرانوں ہنزہ نگر کے میروں اور پونیال، اشکومن اور یاسین کے گورنروں کے بھی غلام تھے سیاسی آزادی اور سیاسی حقوق نام کی کسی چیز کا یہاں وجود ہی نہیں تھا - انتخابات کا لفظ ان علاقوں کی لغت سے ہی خارج تھا اور یہ ساری صورت حال قیام پاکستان کے بعد پچیس سال تک قائم رہی البتہ کچھ اصلاحات 1970ء میں ہوئیں کچھ 73 - 1974ء میں اور کچھ بعد میں ہوئی ہیں لیکن ان علاقوں کے عوام آج بھی مہذب دنیا کو حاصل آئینی سیاسی اور قانونی حقوق سے محروم ہیں۔

یہ تھا گلگت بلتستان کی آج تک کی صورت حال کا سرسری جائزہ - آیئے اب ان افراد تنظیموں اور اداروں کی کارکردگی کا جائزہ لیں جنھوں نے گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے لئے کسی نہ کسی طرح سے جدوجہد کی۔

گلگت لیگ

گلگت بلتستان میں مقامی سطح پر بننے والی یہ پہلی تنظیم تھی جو 1957ء میں مرزا حسن خان مرحوم نے قائم کی تھی (اس سے قبل 1951ء میں چوہدری غلام عباس مرحوم نے آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کی شاخیں گلگت استور اور بلتستان میں قائم کی تھیں لیکن افسر شاہی نے انہیں آہستہ آہستہ ختم کر دیا) گلگت لیگ نے گلگت کے عوامی حقوق کے حق میں آواز اٹھائی لیکن 1958ء میں پاکستان میں مارشل لاء لگنے کے بعد ہی یہ تنظیم ختم ہو گئی اور مرزا حسن خان نے آزاد کشمیر منتقل ہو کر وہاں سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔

گلگت بلتستان جمہوری محاذ

یہ تنظیم غالباً 1960ء کے عشرے کے وسط میں پونیال کے فضل الرحمٰن کی سرکردگی میں بنی۔ اس تنظیم نے پاکستان اور آزاد کشمیر میں اخباری بیانات، پریس کانفرنسوں، لٹریچر، مظاہروں،

ملاقاتوں اور یادداشتوں کے ذریعہ گلگت بلتستان کے عوام کے سیاسی اور آئینی حقوق کے لئے بھرپور آواز اٹھائی - اس تنظیم کا مطالبہ تھا کہ گلگت بلتستان کو آزاد کشمیر کے ساتھ ملایا جائے اور آزاد حکومت کے ہر شعبے میں اسے مناسب نمائندگی دی جائے اس تنظیم کے دو ممبروں خلیل الرحمٰن اور متولی خان کی تگ ودو کے نتیجے میں 1972ء میں آزاد کشمیر اسمبلی نے ایک متفقہ قرار داد کے ذریعہ گلگت بلتستان کو آزاد کشمیر کے ساتھ ملانے کا مطالبہ کیا تھا - اس ٹیم کے اہم ممبروں میں پونیال کے شیر ولی اور خلیل الرحمٰن ، گلگت کے متولی خان اور گلباز چاچا ، استور کے امیر حمزہ فقیر محمد اور حشمت اللہ داریل تنگر کے ملک مسکین شامل تھے ۔ فضل الرحمٰن ، شیر ولی اور امیر حمزہ کو (خاص کر موخرالذکر دو افراد کو) اس تنظیم کے تحت سرگرمیوں کے سلسلے میں کئی بار جیل بھی بھیجا گیا ۔ علاوہ ازیں مقامی انتظامیہ نے انہیں بھاری مالی نقصانات بھی پہنچائے ۔ بہرحال یہ تنظیم جس نے تقریباً ایک عشرے تک گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے لئے بڑی جدوجہد کی تھی، 1973ء کے بعد غیر متحرک ہو گئی - آج کل کراچی میں اسی نام سے ایک تنظیم ہے لیکن اس کا فضل الرحمٰن والے جمہوری محاذ کے ساتھ کوئی آئینی یا نظریاتی تعلق نہیں ہے۔

گلگت بلتستان سٹوڈنٹس سنٹرل آرگنائزیشن

1963ء میں کراچی میں زیر تعلیم گلگت بلتستان کے طلباء نے گلگت بلتستان سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے ایک تنظیم قائم کی - اس تنظیم کو بلتستان کے محمد اسحاق صاحب سعید حسن صاحب اور سلطان مہدی صاحب کی اور میری سرپرستی حاصل تھی - اس کا مرکز بھی میرا سکول تھا۔ اس تنظیم نے ابتداء میں اپنی سرگرمیاں طلباء کے مسائل تک محدود رکھیں لیکن بعد میں گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے بارے میں بھی آواز اٹھانے لگی اور اس سلسلے میں کراچی میں کچھ مظاہرے بھی کئے - تنظیم کے قیام اور اسے آگے بڑھانے میں جن طلباء نے سرگرم حصہ لیا ان میں بلتستان کے افضل علی شگری (حال ڈی آئی جی پولیس کراچی) غلام حسین ، محمد سکندر ، محمد حسین ، کریم خان ، آغا محمد ، شمشاد حسین اور دوسرے طلباء گلگت کے الطاف حسین ، شیر ولی ، شوکت علی ، محبوب علی ، غلام مصطفٰے، شوکت رشید ، شفا علی ، محمد اسماعیل ، قربان علی ، محمد داؤد ، محمد بشیر ، نعمت خان وغیرہ چلاس کے ممتاز خان ، محمد کرامت ، محمد جمیشد ، فیض الحق ، جمعہ خان ، محمد سردار ، اجمل خان وغیرہ اور استور کے یوسف علی ، محمد علی ، علی اللہ خان ، عظمت خان ، محمد غیاث ، محمد خورشید ، علی محمد ، غلام مصطفٰے ، صفت خان ، محبوب عالم ، نیاز محمد ، عیسٰی خان ، فقیر ولی ، محمد نواز ، نادر خان ، محمد اشرف ، محمد ایوب ، محمد اکرم ، میاں گل ، حبیب اللہ ، جمشید علی ، کریم خان، عبدالرحمان ، محمد اسماعیل ، محبوب علی خان ، شفا علی ، محمد فیاض ، گلباز خان ، شوکت علی ، خورشید

عالم، شوکت علی، قدم خان، عبداللطیف، محمد حلیم، علی محمد، صفدر علی، محمد بشیر، محمد اشرف وغیرہ شامل ہیں۔

کراچی میں اس تنظیم کے قیام کے بعد مظفر آباد (آزاد کشمیر) ایبٹ آباد، پشاور، راولپنڈی اور لاہور میں بھی ایسی ہی تنظیمیں بن گئیں چنانچہ میں نے کوشش کی کہ ان سب کی ایک مرکزی تنظیم بھی ہو لیکن کچھ کوتاہ نظر اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے حامل طلباء نے یہ سوچ کر کہ ممکن ہے اس طرح میں گلگت بلتستان کی نئی پود کا لیڈر بن جاؤں اس میں روڑے اٹکائے حالانکہ یہ بات میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی میں تو صرف طلباء کو منظم دیکھنا چاہتا تھا تاکہ ان کی آواز میں طاقت پیدا ہو۔ اس سلسلے میں تعجب کی بات یہ تھی کہ یہ مخالفت کرنے والوں میں سے کچھ کی میں نے بھرپور مدد کی تھی اور اس وقت بھی کر رہا تھا۔ متعلقہ لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ گلگت بلتستان کے طلباء کے مسائل کے سلسلے میں میں نے فرقہ واریت کو کبھی اپنے نزدیک آنے نہیں دیا۔ دراصل گلگت، بلتستان میں فرقہ وارانہ سوچ ایک انتہائی سخت ذہنی بیماری رہی ہے جس نے پورے علاقے کو بار بار نقصان پہنچایا ہے۔ بہر حال ہم نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور آخر فروری 1968ء میں راولپنڈی میں کچھ سنجیدہ اور وسیع النظر طلبہ کا اجلاس ہوا جس میں اس بات پر اتفاق رائے ہوا کہ گلگت بلتستان کے طلبہ کی ایک مرکزی تنظیم ہو چنانچہ 24 مارچ 1968ء کو پریس کلب راولپنڈی کے لان میں پاکستان اور آزاد کشمیر میں زیر تعلیم طلباء کا کنونشن ہوا جس میں طلباء کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور مجوزہ مرکزی تنظیم کا آئین منظور ہونے کے بعد گلگت بلتستان سٹوڈنٹس سنٹرل آرگنائزیشن کے نام سے ایک مرکزی تنظیم قائم ہوئی۔ اس تنظیم کے آئین کا مسودہ میں نے ہی تیار کیا تھا۔ تنظیم کے پہلے مرکزی عہدیداروں کے انتخابات بھی میری نگرانی میں ہوئے بلکہ لاہور سے آنے والے طلبہ کا آنے جانے کا کرایہ بھی میں نے ہی ادا کیا جو تنظیم کو دیئے جانے والے عطیوں کے علاوہ تھا۔ چلاس کے وہاب شاہ تنظیم کے پہلے مرکزی صدر چنے گئے۔ بلتستان کے آغا محمد نائب صدر اور استور کے محمد خورشید جنرل سیکرٹری منتخب ہو گئے۔ اس مرکزی تنظیم کے قیام کے سلسلے میں جن طلباء نے بڑی محنت کی ان میں بلتستان کے آغا محمد، محمد حسین، محمد سکندر اسد علی وغیرہ اور گلگت اور دیامر سے شیر ولی (آف جنگلوٹ) محمد خورشید، امیر حمزہ، محمد اشرف، محمد ایوب، حشمت اللہ، غلام مصطفٰے، میاں گل، نعمت اللہ، محمد داؤد، شیر جہاں میر، کریم خان، شوکت رشید، محبوب علی خان، عالمگیر، محمد امین، ثابت رحیم، متولی خان، خلیل الرحمان، حسن خان، شیر افضل، وہاب شاہ عبدالقدوس، طالب اللہ شاہ، عبدالودود چلاس، رحمت اللہ، محمد ایاز، اکبر ولی، اکبر میر، غلام حسن میر، عتیق اللہ، محمد برہان، حنیف اللہ، علی محمد، محمد انور، نور محمد، ظفر جنگ (ہنزہ) اکبر جہان، شہریار، اکرم، کلب علی، اقبال (پونیالی)، گلباز، مشروف ہنزائی، غلام نبی (ڈپٹی کمشنر) محمود غزنوی،

راجہ صلاح الدین، محمد یوسف، بہرام خان، محمود احمد، محمد نواز (مرحوم) وغیرہ شامل ہیں۔
گلگت بلتستان سٹوڈنٹس سینٹرل آرگنائزیشن نے 1968ء سے 1976ء تک طلباء کے مسائل کے علاوہ ان علاقوں کے عوامی حقوق کے سلسلے میں بھی بھرپور آواز اٹھائی۔ تنظیم کے تحت راولپنڈی، مظفر آباد اور کراچی میں کئی مظاہرے بھی ہوئے۔ حکومت کو مراسلے بھی بھیجے جاتے رہے۔ تنظیم کی ان سرگرمیوں اور اس کے ممبروں میں مکمل اتحاد کی وجہ سے حکومت بھی ان کے مطالبات کا سنجیدگی سے نوٹس لیتی رہی اس طرح اس تنظیم نے گلگت بلتستان کے معاملات میں خاصا کردار ادا کیا۔ چلاس کے وہاب شاہ کے بعد بلتستان کے آغا محمد بونجی کے حشمت اللہ خان اور استور کے محبوب علی خان (سابق ممبرانِ اے کونسل) یکے بعد دیگرے اس کے صدر رہے۔ بہرحال 1976ء کے بعد یہ تنظیم منتشر ہوگئی۔ بلتستان کے طلباء نے اپنی ایک تنظیم بلتستان سٹوڈنٹس فیڈریشن بنائی جو اب بھی خاصی سرگرم اور فعال ہے۔ البتہ گلگت اور دیامر کے طلباء مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

گلگت بلتستان یونائیٹڈ آرگنائزیشن

1957ء تک کراچی میں گلگت بلتستان کے ہزاروں افراد جمع ہوگئے تھے ان میں اکثریت مزدور پیشہ لوگوں اور طلباء کی تھی۔ شملہ سے ہجرت کر کے کراچی آنے والے بلتیوں کی تعداد ہی ہزاروں تک پہنچی تھی اور ان کی بھاری اکثریت کراچی کی ایک بستی اےلے سینیا لائنز میں سکونت پذیر تھی۔ ان لوگوں نے اپنی علاقائی تہذیب ثقافت خاص کر زبان کو زندہ رکھا ہے چنانچہ اےلے سینیا لائنز کی یہ بستی چھوٹا سا بلتستان نظر آتی تھی۔ کچھ حضرات ٹھیکیداری بھی کرتے تھے جن میں محمد اسحاق صاحب، محمد الیاس صاحب، محمد علی صاحب، سلطان مہدی صاحب، غلام محمد صاحب سرفہرست تھے۔ بلتستان کی ایک انتہائی قابلِ احترام اور محب وطن شخصیت سعید حسن صاحب سندھ ٹائمز پریس کے مالک تھے۔ گلگت سکاؤٹس کے سابق کمانڈنٹ کرنل حامد شکری سعید حسن مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں۔
بلتستان والوں کے علاوہ کراچی میں استور، ہنزہ اور نگر کے بہت سے لوگ بھی تھے۔ چنانچہ ہم نے انہیں منظم کر کے گلگت بلتستان یونائیٹڈ آرگنائزیشن کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ بلتستان کے محمد اسحاق صاحب اس کے صدر اور میں جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔ مجلس عاملہ میں گلگت بلتستان کے ہر علاقے کو نمائندگی دی گئی۔ یہ تنظیم بنیادی طور پر ایک فلاحی تنظیم تھی اور اس کا مقصد کراچی میں مقیم گلگت بلتستان کے لوگوں کو ملازمتیں دلانا، مستحق طلباء کی رہنمائی اور مالی مدد کرنا اور لوگوں میں اتحاد اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنا تھا۔ لیکن جلد ہی ہم

نے سیاسی سرگرمیاں بھی شروع کیں اور حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا کہ وہ گلگت بلتستان کے عوام کو سیاسی حقوق دینے کے علاوہ وہاں کی اقتصادی ترقی کی رفتار بھی تیز کرے۔ اس سلسلے میں ہم حکومت کو مسلسل یادداشتیں بھیجتے رہے۔ گلگت بلتستان پر لٹریچر تیار کر کے پاکستان کی سیاسی پارٹیوں اور ذرائع ابلاغ کو بھیجتے رہے۔ اس سے قبل کراچی میں ایک کشمیر کانفرنس ہوئی تھی جس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ آزاد کشمیر میں ایک قانون ساز اسمبلی قائم کی جائے۔ ہم نے مشیر امورِ کشمیر شیخ دین محمد مرحوم سے ملاقات کر کے مطالبہ کیا کہ اس اسمبلی میں گلگت بلتستان کو بھی نمائندگی دی جائے - شیخ صاحب کی کوششوں سے وزیر اعظم پاکستان نے یہ مطالبہ اصولی طور پر تسلیم کیا تھا۔ لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر آزاد کشمیر اسمبلی کے قیام کی تجویز کو عملی شکل نہ دی جا سکی۔

1958ء میں پاکستان میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ہماری سیاسی سرگرمیاں بھی معطل ہوگئیں البتہ ہم نے فلاحی اور سماجی کام جاری رکھا۔ 1964ء میں ہم نے گلگت بلتستان سے متعلق ایک ڈرامے کی شکل میں گلگت بلتستان کی جنگ آزادی کی تفصیلات بھی پیش کیں۔ اس شو کے مہمانوں خاص کر پاکستان کے مشہور شاعر فیض احمد فیض نے تمام آرٹسٹوں کو بہت سراہا۔

اس تنظیم کی سرگرمیوں میں جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں طلباء کے علاوہ محمد اسحاق صاحب ، سعید حسن صاحب ، سلطان مہدی صاحب' سردار ابراہیم صاحب، محمد رضا صاحب ، رضا انصاری صاحب' غلام رضا صاحب' کا غلام' غلام احمد صاحب' غلام مہدی صاحب' غلام محمد صاحب' غلام قادر صاحب ، غلام مہدی صاحب ، غلام محمد صاحب' رضا حسرت نگوباری ، غلام قادر صاحب' غلام مہدی صاحب ، غلام محمد صاحب' محمد عباس صاحب' محمد الیاس صاحب ، علی محمد صاحب ، عیسیٰ چنگیزی اور خان شیرین خان سرفہرست ہیں۔ میں نے بھی اس کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے خاصا کام کیا۔

جموں کشمیر لبریشن لیگ

آزاد کشمیر کے سابق صدر کے ایچ خورشید کی تنظیم جموں کشمیر لبریشن لیگ 1962ء میں اپنے قیام سے آج تک گلگت بلتستان کے عوامی حقوق اور ان علاقوں کو آزاد کشمیر کے ساتھ ملانے کے بارے میں مسلسل آواز اٹھاتی رہی ہے البتہ آج تک وہاں اس تنظیم کی شاخ قائم نہ ہو سکی' نہ ہی اس کا کوئی اہم لیڈر وہاں گیا۔

اس تنظیم نے 1965ء میں اپنے قیام سے ہی گلگت بلتستان سے ایف سی آر اور ایجنسی نظام کے خاتمے اور ان علاقوں کو آزاد کشمیر کے ساتھ ملانے کے لئے جدوجہد شروع کی۔ 1970ء میں ہفتہ گلگت بلتستان منایا اور سارے آزاد کشمیر و پاکستان میں جلسے جلوس اور پریس کانفرنسوں کے علاوہ اپنے وفود گلگت بھیجے ۔ تنظیم کے صدر عبدالخالق انصاری نے گلگت بلتستان کو ایف سی آر اور ایجنسی نظام کی زنجیروں میں جکڑے رکھنے کے خلاف ایک جوشیلی تقریر کرنے کی پاداش میں مارشل لاء کے تحت تین ماہ کی قید کاٹی اور میں نے اسی جرم میں پندرہ ماہ کی۔ ہم نے گلگت بلتستان میں تنظیم کی شاخ قائم کی جس کے کنوینر محمد عیسیٰ ایڈووکیٹ تھے دوسرے ممبروں میں شیر ولی پونیالی ایڈووکیٹ اور سعید احمد ایڈووکیٹ شامل تھے لیکن افسر شاہی نے اسے کام کرنے نہیں دیا۔

تنظیم ملت

نومبر 1970ء میں گلگت میں میری گرفتاری کے بعد مقامی لوگوں میں کچھ سرگرمی پیدا ہو گئی تھی چنانچہ دسمبر 1970ء کے وسط میں ہونے والے ایک جلسہ عام میں تنظیم ملت کے نام سے ایک سیاسی تنظیم قائم کی گئی۔ جوہر علی ایڈووکیٹ صدر اور سعید احمد ایڈووکیٹ اس کے سیکریٹری جنرل منتخب ہوئے۔ اس تنظیم کے قیام سے تین ہفتے بعد گلگت میں ہونے والے عوامی مظاہروں کے نتیجے میں ہونے والی گرفتاریوں کے ساتھ ہی یہ تنظیم بھی ختم ہو گئی۔

پاکستان پیپلزپارٹی

1971ء کے اواخر میں پاکستان میں پیپلزپارٹی کے برسراقتدار آنے کے بعد گلگت بلتستان میں بھی اس پارٹی کی شاخ قائم ہوئی اور غلام محمد بٹ ، مرزا حسن خان ، شیخ غلام محمد ، جوہر علی خان اور قربان علی یکے بعد دیگرے اس کے سربراہ بنے لیکن پیپلزپارٹی کے دور اقتدار میں عملاً اس کے سربراہ ریذیڈنٹ خاص کر اجلاس حسین زیدی ہوتے تھے۔ اس دور میں پارٹی کے اکثر ممبروں نے ترقیاتی کاموں کے لئے منظور ہونے والی رقوم سے خوب ہاتھ رنگے۔ بہرحال گلگت بلتستان کو ایف سی آر۔ ایجنسی نظام اور جاگیرداری نظام کی لعنتوں سے نجات دلانے اور مقامی پڑھے لکھے نوجوانوں کو سرکاری ملازمتیں دینے کا سہرا بھی پیپلزپارٹی کی حکومت کے ہی سر ہے۔

آزاد کشمیر جماعت اسلامی

جماعت اسلامی آزاد کشمیر نے گلگت بلتستان میں اپنی شاخ قائم کی ہے اور ان علاقوں کے عوامی حقوق کے لئے خاصی سرگرم ہے اس کے سابق امیر مولانا عبدالباری کو ایک بار گلگت بدر بھی کیا گیا تنظیم کے مرکزی امیر باقاعدگی سے ان علاقوں کا دورہ کرتے ہیں آجکل گلگت بلتستان شاخ کے لئے تنظیم کے امیر مولوی عبدالسنان اور سیکریٹری مشتاق احمد ایڈووکیٹ ہیں۔

آزاد کشمیر تحریک استقلال

ساتویں عشرے کے اواخر میں پاکستان کی تحریک استقلال نے آزاد کشمیر گلگت بلتستان پر مشتمل اپنی شاخ قائم کی اور گلگت کے کرنل مرزا حسن خان مرحوم اس کے سربراہ بنے۔ اس تنظیم نے بھی جلسوں اور قرار دادوں کے ذریعہ یہاں کے عوام کے حقوق اور ان علاقوں کو آزاد کشمیر سے ملانے کا بھرپور مطالبہ کیا۔ بہرحال نومبر 1983ء میں کرنل حسن مرحوم کی وفات کے ساتھ ہی گلگت بلتستان میں اس کی سرگرمیاں بھی ماند پڑ گئیں۔

سینٹرل بار ایسوسی ایشن

گذشتہ ڈیڑھ عشرے کے دوران گلگت بلتستان کی سینٹرل بار ایسوسی ایشن نے گلگت بلتستان کے عوامی حقوق خاص کر ان علاقوں کی آئینی حیثیت کے بارے میں بھرپور آواز اٹھائی ہے وہ گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت کے بارے میں تین متبادل حل پیش کرتی رہی ہے یعنی (1) ان علاقوں کو پاکستان کا پانچواں صوبہ بنایا جائے (2) یہاں مقامی سطح پر آزاد کشمیر کے طرز کی حکومت بنائی جائے۔ (3) ان علاقوں کو آزاد کشمیر کے ساتھ ملایا جائے۔

جمعیت علمائے اسلام پاکستان

جمعیت العلمائے اسلام کی شاخ بھی گلگت اور دیامر اضلاع میں قائم ہے اور گلگت بلتستان کے عوامی حقوق اور ان علاقوں کو آزاد کشمیر کے ساتھ ملانے کے حق میں آواز اٹھاتی

رہی ہے۔

پاکستان مسلم لیگ

پاکستان میں محمد خان جونیجو کی حکومت کے دوران اس کے مرکزی وزیر امور کشمیر سید قاسم شاہ نے یہاں کے اکثر ممبران این اے کونسل پر مشتمل پاکستان مسلم لیگ کی شاخ قائم کی ہے جو ان ممبروں تک ہی محدود ہے۔

علاقائی تنظیمیں

ان تنظیموں کے علاوہ کچھ علاقائی تنظیموں خاص کر ہنزہ اور نگر سے جاگیرداری نظام کے خاتمے کے لئے سرگرم عمل تنظیموں نے بھی خاصی جدوجہد کی۔ ان تنظیموں میں ہنزہ کے مولامدد، محمد شفیع، رحمت اللہ بیگ، محبوب علی، شاہ زمان، شیر زمان، قربان شاہ، عبداللہ شاہ، میرباز، مطابقت شاہ، محبوب علی وغیرہ اور نگر کے قربان علی، محمد بشیر، محمد داؤد وغیرہ پیش پیش تھے نگر کے سیدوں خاص کر سید یحیٰی شاہ اور سید مصطفےٰ شاہ کی سرکردگی میں بھی میر آف نگر کے خلاف خاصی تحریک چلتی رہی جس کی پاداش میں بہت سے لوگ گولیوں کا نشانہ بننے کے علاوہ قید ہوئے۔ قید ہونے والوں میں بھاری اکثریت عمر رسیدہ لوگوں کی تھی۔ ان میں بہت سے بزرگ 1971ء میں میرے ساتھ گلگت جیل میں تھے۔ جن میں عبداللہ نمبردار، زوار داؤد، زوار حبیب، شعبان علی، سلطان علی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

لٹریچر

گلگت بلتستان کو بیرونی دنیا میں متعارف کرانے اور عوامی حقوق کے سلسلے میں کچھ جریدوں اور کتابوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ لاہور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ بادشمال اس سلسلے کا پہلا جریدہ تھا۔ اسے لاہور کے بلتستان نژاد غلام محمد مرحوم شائع کرتے تھے لیکن یہ جریدہ مالی مشکلات اور دیگر وجوہات کی بنا پر زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ کراچی سے رضا انصاری مرحوم ملکہ بلتستانی اور نسیم چنگیزی کی طرف سے شائع ہونے والے صدائے بلتستان نے بھی خاصا کام کیا۔ گورنمنٹ ڈگری کالج گلگت کے جریدے بلورستان میں بھی گلگت کی تاریخ جغرافیہ اور تہذیب کے بارے میں خاصی معلومات تھی۔ لاہور میں زیر تعلیم گلگتی طلباء کی طرف

سے شائع ہونے والے 'میارو' میں بھی گلگت کے بارے میں خاصی معلومات تھیں۔ اسے شائع کرنے والوں میں جوہر حسین ' تاجور اشرف ' طالب اللہ شاہ ' محمد سعود خان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ گلگت بلتستان سٹوڈنٹس فرنٹ کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے "یل" میں بھی ان علاقوں کے بارے میں معلومات ہوتی تھیں۔ بلتستان کو بیرونی دنیا میں روشناس کرانے میں غنیم بلتستانی اور محمد یوسف حسین آبادی کی قلمی کاوشوں کا حصہ غالباً" سب سے زیادہ ہے۔ بلتستان سے تعلق رکھنے والے طلباء بھی اس میدان میں خاصے متحرک رہے ہیں۔ گلگت بلتستان کے عوامی حقوق ' آئینی پوزیشن ' ترقیاتی منصوبوں اور افسرشاہی کی من مانیوں سے متعلق معاملات اور ان علاقوں کو پاکستان اور بیرونی دنیا میں روشناس کرانے کے سلسلے میں میرے ماہنامہ وائس آف کشمیر (کراچی) نے بھی خاصا کام کیا۔ یہ رسالہ پاکستان میں دنیا بھر کے سفارت خانوں ' دنیا کی اہم لائبریریوں اور ذرائع ابلاغ کو بھیجا جاتا تھا۔ امریکہ کے ایک سابق نائب صدر کے قراقرم رینج سے متعلق ایک تعریفی تبصرے کو میں وائس کے ہر دوسرے تیسرے شمارے میں شائع کرتا تھا جس سے یہاں کی سیاست کو خاصا فروغ ملا۔

گلگت بلتستان پر بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں جن میں مولوی حشمت اللہ اور ڈاکٹر ناموس ' استور کے وزیر محمد اشرف صاحب وغیرہ کی کتابیں مشہور ہیں۔ دوسرے مورخوں خاص کر یورپ والوں کی دوسرے علاقوں خاص کر کشمیر ' ہندوستان پاکستان اور افغانستان پر لکھی ہوئی کتابوں میں بھی ان علاقوں کا تفصیلی ذکر ہے۔

حال ہی میں گلگت بلتستان پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں گلگت کے نوجوان ہدایت اللہ اختر کی تالیف "آئینہ دردستان" اور بونجی (استور) کے منظوم علی کی تالیف "قراقرم ہندوکش" ان علاقوں کی تاریخ ' جغرافیہ تہذیب و ثقافت اور جنگ آزادی سے متعلق قیمتی معلومات کی حامل ہیں۔ گلگت بلتستان کے پہلے اور آخری ڈوگرہ گورنر گھنسارا سنگھ کی انگریزی میں لکھی گئی کتاب "گلگت 1947ء سے پہلے" بھی خاصی معلوماتی ہے شیر باز علی برچہ صاحب نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے البتہ پاکستان انٹیلیجنس کے سابق سربراہ اے بی اعوان کی کتاب میں ان علاقوں کی تاریخ کو مسخ کیا گیا ہے۔ میرے سسر عبدالحمید خاور مرحوم نے ان علاقوں کی تاریخ کے بارے میں بڑا قیمتی مواد جمع کیا تھا لیکن اسے کتابی شکل دینے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دنیا کے اہم رسالوں خاص کر ریڈرز ڈائجسٹ اور نیشنل جیاگرافک میں بھی ان علاقوں کے بارے میں تفصیلی اور معلوماتی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

یہ تھا گلگت بلتستان کے بارے میں دوسرے افراد اور تنظیموں کی کارکردگی کا ایک سرسری جائزہ۔ میں ان لوگوں سے صدق دل سے معافی کا خواستگار ہوں جنہوں نے گلگت بلتستان کی جنگ آزادی عوامی حقوق یا ان علاقوں کو بیرونی دنیا میں روشناس کرانے کے لئے

جدوجہد کی ہو لیکن معلومات نہ ہونے کی وجہ سے میں اس کتاب میں ان کا تذکرہ نہ کر سکا ہوں۔

میری ذاتی کارکردگی

آیئے اب گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے سلسلے میں میری اپنی کارکردگی کی طرف۔

اوائل 1952ء میں مقبوضہ کشمیر سے پاکستان آنے کے بعد میں نے پشاور کے ایڈورڈز کالج میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں گلگت کے گشپور (گلگت کے مختلف علاقوں کے مقامی جاگیردار خاندانوں کے لڑکے) ہی کالجوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ عام لوگوں کے بہت کم لڑکے کالجوں تک پہنچتے تھے۔ ان گشپوروں میں سے زیادہ تر اسلامیہ کالج پشاور میں زیر تعلیم تھے۔ میں نے ان سے رابطہ کرکے تجویز پیش کی کہ ہمیں گلگت کے طلباء کی ایک تنظیم قائم کرنی چاہیئے تاکہ طلباء مسائل کو حل کرنے کے لئے اجتماعی کوششیں کی جائیں لیکن میری اس تجویز کو ابتدائی طور پر کسی نے قبول نہیں کیا ایک اس لئے کہ شہزادے ہونے کی وجہ سے وہ اس قسم کی عوامی سرگرمیوں سے دور رہنا چاہتے تھے اور دوسرے اس لئے کہ یہ تجویز بھی استور کے ایک عام نوجوان کی تھی جس کی بات پر لبیک کہنا شہزادوں کی شان کے خلاف تھا۔ البتہ چند عوامی ذہنیت کے گشپوروں خاص کر پونیال کے محمد ولی مرحوم اور حسین ولی اور ہنزہ کے غازی جوہر نے میرا ساتھ دیا۔ اسی دوران گلگت سے عوامی طبقے کے کچھ طلباء یعنی علی احمد جان مرحوم، محمد اشرف خان، خالد کاشمیری، محمد رحیم وغیرہ گورنمنٹ ہائی سکول پشاور میں داخل ہو گئے انہوں نے بھی میرا ساتھ دیا۔ چنانچہ کافی تگ و دو کے بعد ہم گلگت سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جو گلگت کے طلباء کی تاریخ کی پہلی تنظیم تھی۔ نگر کے سلطان حمید اس کے صدر میں جنرل سیکرٹری اور غازی جوہر جوائنٹ سیکرٹری منتخب ہو گئے۔ ہائی سکول کے طلباء کے علاوہ یاسین کے شیرزاد خان اور شیر باز خان نے بھی ساتھ دیا۔ یہ تنظیم چند ماہ بہت سرگرم رہی لیکن نومبر 1952ء میں میری کراچی منتقلی کے بعد غیر متحرک اور کچھ مدت بعد ختم ہو گئی۔

کراچی میں اپنے قیام کے ابتدائی چند سال میں ذاتی مسائل میں جکڑا رہا اس کے باوجود میں گلگت کے طلباء خاص کر ان کے داخلوں اور رہائش کے سلسلے میں ان کی مدد اور رہنمائی کرتا رہا۔ مثلاً استور کے یوسف علی مرحوم (سابق ایگزیکٹو انجینئر) کی این ای ڈی انجینئرنگ کالج کراچی میں نامزدگی کالج والوں نے چند اہم وجوہات کی بنا پر مسترد کر دی تھی۔ استور ہی کے محمد علی کی اسی کالج میں مختص شدہ سیٹ پاکستان کے ایک مرکزی وزیر کے بیٹے کو دی گئی تھی۔ میں نے مسلسل کوششوں اور تگ و دو کے بعد دونوں کا داخلہ کرا دیا۔ مالی استطاعت حاصل ہونے

کے بعد میں نے لی مارکیٹ میں اپنی رہائش گاہ کو ایک قسم کے ہوسٹل میں تبدیل کر دیا جہاں گلگت کے مستحق اور بے روزگار نوجوان قیام کرتے ۔ ان میں سے اکثر کے کھانے پینے کے اخراجات بھی میں ہی برداشت کرتا تھا اور یہ سلسلہ دس بارہ سال تک جاری رہا ۔ اس دوران میں نے کراچی کے مختلف صنعتی ' سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں گلگت کے سینکڑوں افراد کو ملازمتیں بھی دلائیں ۔

میں نے کراچی میں اپنے سکولوں کو بھی گلگت بلتستان (اور آزاد کشمیر) کے طلباء کے لئے مالی مدد کا ذریعہ بنایا ۔ کراچی کے اعلیٰ تعلیمی اور فنی اداروں میں زیرِ تعلیم ان علاقوں کے درجنوں طلباء کو میں نے یکے بعد دیگرے اپنے سکولوں میں جزوقتی یا کل وقتی ملازمت دے کر انہیں تعلیمی اخراجات برداشت کرنے کے قابل بنایا اور ان علاقوں کے سینکڑوں طلباء نے میرے سکولوں میں بغیر فیس کے تعلیم حاصل کی ۔ اس کے علاوہ میں دوسرے طلباء کی بھی حتی المقدور مالی مدد اور رہنمائی کرتا رہا ۔ ان تمام حقائق کے گواہ وہ لوگ ہیں جو 1956ء سے 1976ء تک کراچی میں زیرِ تعلیم یا برسرروزگار تھے ۔

کراچی میں قائم ہونے والی گلگت بلتستان یونائیٹڈ آرگنائزیشن اور گلگت بلتستان سٹوڈنٹس فیڈریشن اور کراچی والوں ہی کی تحریک پر بننے والی گلگت بلتستان سٹوڈنٹس سینٹرل آرگنائزیشن نے گلگت بلتستان کے طلباء کے مسائل کے علاوہ وہاں کے عوامی حقوق اور ان علاقوں کو پاکستان میں متعارف کرانے کے سلسلے میں خاصا کردار ادا کیا ۔ ان تنظیموں کے قیام ' ان کی مالی اور اخلاقی مدد اور ان کی رہنمائی میں میرا حصہ کلیدی تھا ۔

میں اپنے ماہنامہ "وائس آف کشمیر" کراچی کے ذریعہ بھی گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے لئے بھرپور آواز اٹھاتا رہا ۔ بلکہ جنوری 1964ء میں گلگت بلتستان کے بارے میں اس کا ایک خصوصی سپلیمنٹ نکالا جس میں ٹھوس اعداد شمار کے ذریعہ ان علاقوں کی اقتصادی زبوں حالی اور غیر مقامی افسروں کی طرف سے ترقیاتی منصوبوں کے لئے مختص رقوم کی لوٹ کھسوٹ کا صحیح نقشہ کھینچا جس پر پاکستان کی وزارت امور کشمیر میرے خون کی پیاسی ہو گئی اور مجھے اس "گستاخی" کی بھاری سزا بھگتنی پڑی ۔

گلگت بلتستان کے عوام کے آئینی ' سیاسی ' قانونی ' اقتصادی اور سماجی حقوق کے لئے میں آزاد کشمیر اور پاکستان کے اخبارات اور اپنی طرف سے شائع کئے گئے کتابچوں اور پمفلٹس کے ذریعہ بھی بھرپور آواز اٹھاتا رہا جس کے نتیجے میں وزارت امور کشمیر کے علاوہ گلگت بلتستان کے ارباب اقتدار بھی سیخ پا ہو گئے ۔ یہاں تک کہ گلگت بلتستان کے ریذیڈنٹ برگیڈیئر حبیب الرحمٰن نے استور کے اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ (حکیم عبداللطیف صاحب) کو حکم دیا کہ وہ استور میں میری جائیداد (زمین مکانات وغیرہ) ضبط کر لیں ۔ حکیم صاحب پہلے تو خاموش رہے لیکن

جب اس بارے میں گلگت سے یاد دہانیاں کرائی گئیں تو انہوں نے ریذیڈینٹ کو جواب دیا کہ میرے پاس امان اللہ کی جائیداد کی ضبطی کا کوئی قانونی جواز نہیں اور اس سے بھی اہم بات یہ کہ اگر یہ قدم اٹھایا گیا تو ایک طرف استور میں بدامنی پھیل سکتی ہے اور دوسری طرف پاکستان میں اخبارات کے ذریعہ شور شرابہ ہو سکتا ہے جس سے گلگت کی انتظامیہ مزید بدنام ہو جائے گی۔ حکیم صاحب کے اس جواب کے بعد ریذیڈینٹ نے سرکاری ملازمتوں میں میرے بزرگوں اور عزیزوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ میرے بھانجے محمد نواز مرحوم کو جس نے میری مالی مدد سے انجینئرنگ کی ڈگری امتیازی نمبروں میں حاصل کی تھی، انجینئروں کی کئی اسامیاں خالی ہونے کے باوجود دو سال تک ملازمت نہیں دی۔ ادھر ڈی ایف او منظور احمد نے اپنے وکیل کے ذریعے مجھے ہتک عزت کا نوٹس بھیجا اور مجھ پر یہ الزام لگاتے ہوئے کہ میں نے اس پر سرکاری فنڈز کے خرد برد کے سلسلے میں بے بنیاد الزامات لگائے ہیں، ازالہ حیثیت عرفی کے طور پر بھاری رقم طلب کی تو میں نے اپنے وکیل کے ایچ خورشید صاحب (سابق صدر آزاد کشمیر) کے ذریعہ اسے جواب دیا کہ وہ اس سلسلے میں عدالت سے رجوع کریں میں اپنا جواب عدالت میں دے دوں گا۔ لیکن اسے ایسا کرنے کی جرات نہیں ہوئی۔ ایک اور غیر مقامی افسر نے مجھے گلگت میں پٹوانے کی بھی کوشش کی۔ ارباب اقتدار کے ان حربوں کا مقصد مجھے بلیک میل کرکے اور مجھ پر دباؤ ڈال کر عوامی حقوق کے بارے میں میری زبان بند کرنا تھا۔ لیکن میں نے اس دباؤ میں آنے کی بجائے اپنی سرگرمیاں اور بھی تیز کر دیں۔

پاکستان میں پیپلز پارٹی کے برسراقتدار آنے کے دو سال بعد غالباً" 1973ء میں ریذیڈنٹ اجلال حسین زیدی نے استور آکر اپنے سیکرٹری ہمایوں بیگ کے ذریعہ مجھے کہلوایا کہ میں گلگت بلتستان میں پیپلزپارٹی کی شاخ کی سربراہی سنبھال لوں مجھے یہ بھی کہا گیا کہ گلگت بلتستان کو جلد ہی پاکستان کا صوبہ بنایا جا رہا ہے اس لئے پیپلزپارٹی کے مقامی سربراہ کی حیثیت سے آپ یہاں کے پہلے چیف منسٹر ہوں گے۔ (ان دنوں پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اپنی سیاسی ضرورت کے تحت ان علاقوں کو پاکستان کے صوبے کا درجہ دینا چاہتے تھے تاکہ پاکستان کی سینٹ میں ان کی پارٹی کو اکثریت حاصل ہو جائے۔ جہاں ان کی پارٹی کے ممبروں کی تعداد کے برابر حزب اختلاف کے ممبروں کی موجودگی ان کے لئے سیاسی مشکلات پیدا کر رہی تھی) مجھ پر اس سلسلے میں میرے بزرگوں خاص کر میرے ماموں زاد بھائی محمد اسماعیل خان جو ان دنوں دیامر کے ڈپٹی کمشنر تھے اور میرے سسر عبدالحمید خاور کے ذریعہ بھی دباؤ ڈلوایا گیا۔ دراصل اجلال حسین صاحب ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ اولاً" وہ بھٹو صاحب کی ہدایت کے تحت پیپلزپارٹی کی مقامی شاخ کے اس وقت کے سربراہ جوہر علی خان ایڈووکیٹ کو ان کے عہدے سے ہٹا کر کسی "سمجھدار" شخص کو پارٹی کا سربراہ بنانا چاہتے تھے اور ثانیاً" میری زبان بندی کرنا

چاہتے تھے کیونکہ حکومتی پارٹی خاص کر گلگت بلتستان شاخ کے سربراہ کے لئے حکومت کے ہر اقدام کے سلسلے میں اس کی ہاں میں ہاں ملانا ضروری ہوتا تھا لیکن میں نے اس "پر کشش" پیشکش کو مسترد کرنے کا فیصلہ کیا اور معاملے کو ٹالنے کے لئے پہلے تو سوچنے کی مہلت مانگی اور کچھ دنوں کے بعد صاف انکار کیا کیونکہ میں ان علاقوں کی آئینی حیثیت کے بارے میں اپنے موقف اور عوامی حقوق کو اس پر کشش پیشکش پر قربان نہیں کر سکتا تھا۔ میری اس "خودکشی" پر میرے دونوں بزرگوں کے علاوہ بہت سے مقامی دوست بھی مجھ سے ناراض ہو گئے لیکن میں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔

میں نے برطانیہ میں اپنے دس سالہ قیام کے دوران بھی گلگت بلتستان کو فراموش نہیں کیا اور اس دوران بھی ان علاقوں کے عوامی حقوق کے بارے میں آواز اٹھاتا رہا یہاں تک کہ اپنے ماہنامے وائس آف کشمیر انٹرنیشنل (برطانیہ) کے کالموں کے ذریعہ بھی آواز اٹھاتا رہا جس کا ثبوت اس میں شائع ہونے والے دوسرے مضامین کے علاوہ اس کے ستمبر 1979ء کے شمارے میں "گلگت بلتستان کے ساتھ یہ ظلم کیوں" کے عنوان سے میرا لکھا ہوا اداریہ ہے۔

گو گلگت بلتستان کے کچھ عناصر اپنے مخصوص مفادات کے تحت مجھ پر الزام لگاتے ہیں کہ میں گلگت بلتستان کو آزاد کشمیر کے ساتھ ملانے کا مطالبہ کرکے گلگت بلتستان کے عوامی مفادات کو نقصان پہنچا رہا ہوں لیکن اپنے موقف کے حق میں میرے پاس انتہائی ٹھوس اور ناقابل تردید دلائل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ گلگت بلتستان کے آئینی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کا حل یہ ہے کہ گلگت بلتستان کو مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ آزاد کشمیر کے ساتھ ملایا جائے۔

1۔ آزاد کشمیر اسمبلی میں گلگت بلتستان سے کم از کم سولہ اور کشمیر کونسل میں تین منتخب نمائندے لئے جائیں اور آزاد کشمیر کابینہ میں ان علاقوں سے کم از کم تین وزیر لئے جائیں۔
2۔ آزاد کشمیر کے صدر اور وزیر اعظم میں سے ایک ان علاقوں سے ہو۔
3۔ آزاد حکومت کا دارالحکومت سال میں چھ ماہ گلگت میں رہے۔
4۔ آزاد کشمیر سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے جج گلگت اور بلتستان میں ہوں۔
5۔ گلگت اور اسکردو کو ہوائی سروس سے مظفر آباد سے ملایا جائے اور نیلم ویلی روڈ کے ذریعہ مظفر آباد کو اسکردو اور استور سے ملایا جائے۔
6۔ کشمیری سیاسی پارٹیوں کو گلگت بلتستان میں کام کرنے کے راستے سے رکاوٹیں ہٹائی جائیں اور
7۔ قومی زندگی کے ہر میدان میں موجودہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو ایک سطح پر لانے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں۔

میرے خیال میں گلگت بلتستان کا کوئی بھی ذی شعور انسان ان شرائط کے ساتھ آزاد

کشمیر کے ساتھ ادغام کو غیر معقول قرار نہیں دے سکتا۔

گلگت بلتستان کے عوامی مفادات کے ساتھ میری گہری اور غیر متزلزل وابستگی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں نے ان علاقوں سے رسوائے زمانہ ایف سی آر ' ایجنسی نظام اور افسر شاہی کی بالا دستی کے خاتمے اور وہاں کے عوام کے آئینی سیاسی ' اقتصادی ' قانونی اور سماجی حقوق کے لئے بھرپور اور انتہائی جرات مندانہ آواز اٹھانے کی پاداش میں پندرہ ماہ (نومبر 1970ء سے فروری 1972ء) کی جیل کاٹی اور اس دوران نہ تو مشروط رہائی قبول کی نہ ایک مقامی لیڈر کی طرح جیل سے حکام کو معافی نامہ طرز کے خط لکھے اور نہ ہی مقامی عوامی تحریک کو تخریب کاری قرار دیا۔ میری یہ اسیری گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے لئے کاٹی جانے والی سب سے لمبی قید تھی۔ گو کرنل حسن خان مرحوم (مجھ سے زیادہ مدت تک یعنی) تقریباً 19 ماہ نظر بند رہے لیکن ان کی نظر بندی پاکستان کے اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سے ذاتی اختلاف ' پیپلز پارٹی سے متعلق معاملات میں ان کے آمرانہ طرز عمل کے خلاف احتجاج اور بھٹو صاحب کے ایک طنزیہ ریمارک کے جوابی طنزیہ ریمارک کا نتیجہ تھی۔ (85ء میں شائع کی گئی کتاب "قراقرم ہندوکش" میں شامل اور کتاب کے مولف منظوم علی صاحب کے مضمون کے مطابق راولپنڈی میں پاکستان پیپلزپارٹی کے اجلاس کے دوران ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور کرنل صاحب کے مابین درج ذیل مکالمہ کرنل صاحب کی پارٹی سے علیحدگی اور بعد ازاں نظر بندی پر منتج ہوا۔ (انگریزی کا ترجمہ)

بھٹو۔ کرنل! آپ راولپنڈی سازش کیس میں ملوث تھے۔

حسن۔ جی ہاں! میں کشمیر حاصل کرنے کی سازش میں ملوث تھا مشرقی پاکستان کو دوسروں کے حوالے کرنے کی سازش میں نہیں۔

الغرض میری اسیری گلگت بلتستان کے عوام کے حقوق کے حق میں آواز اٹھانے کی پاداش میں اب تک کاٹی جانے والی سب سے لمبی قید ہے۔

یہ تھا گلگت بلتستان کے عوامی حقوق کے بارے میری جدوجہد کا انتہائی مختصر جائزہ۔ میں نے یہ جدوجہد ایک اہم فرض کی ادائیگی سمجھ کر کی ہے ' کسی پر احسان کے طور ' کسی ذاتی فائدے کی خاطر یا سستی شہرت کے لئے نہیں کی اور انشاء اللہ اسے آئندہ بھی جاری رکھوں گا۔ آج اپنے مخصوص مفادات ' محدود سوچ اور کوتاہ اندیشی کی بنا پر یہ الزام لگانے والے کہ امان اللہ کو گلگت بلتستان کے عوامی مفاد سے کوئی دلچسپی نہیں' میری اس جدوجہد کا موازنہ مجھ پر یہ الزام لگانے والے مقامی لیڈروں کی کارکردگی سے کریں انہیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ کس کی جدوجہد ٹھوس' تعمیری' غیر متزلزل ' بے غرض ' اور وسیع النظری اور دور اندیشی پر مبنی رہی ہے اور کس کی اس کے برعکس۔

تیسرا باب

میری صحافتی زندگی

مجھے مڈل سکول کی طالب علمی سے ہی مضمون نویسی کا شوق تھا۔اردو اورانگریزی میں اچھے مضامین لکھنے کی وجہ سے ہی امتحان میں ان دونوں مضامین میں اچھے نمبر ملتے تھے۔ کراچی میں کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری اور بعد میں صدر کی حیثیت سے اقوام متحدہ کے نمائندوں کو یادداشتیں بھیجا کرتا تھا ۔ اور یہ یادداشتیں ڈرافٹ کرنے کے لئے تاریخ اور مسئلہ کشمیر کے پس منظراور اس سے متعلقہ اہم معاملات کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا جس کے نتیجے میں دونوں کے بارے میں میری معلومات خاصی وسیع ہو گئیں۔ اسی دوران سوچا کہ کیوں نہ اخبارات کو بھی مضامین بھیجوں چنانچہ میرا پہلا مضمون 1958ء میں پاکستان کے اس وقت کے اہم ترین انگریزی اخبار روزنامہ ڈان کراچی میں اداریئے کے صفحے پر شائع ہوا۔ جس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس کے بعد میں نے دوسرے انگریزی اور اردو اخبارات اور جرائد کو بھی مضامین بھیجنے شروع کئے ۔ جن میں اکثر شائع ہوتے رہے۔

1960ء تک میرے تعلیمی ادارے (کئی سال تک خسارے میں چلنے کے بعد) مالی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے تھے بلکہ کچھ بچت بھی ہونے لگی تھی۔ ادھر میں ذہنی طور پر تحریک آزادی کشمیر سے پوری طرح وابستہ ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں پاکستان میں الجزائر کی جلا وطن حکومت کے سفیر جناب محمد کلو سے ذاتی قریبی تعلقات اور اس تحریک کے لٹریچر نے بھی تحریک آزادی کشمیر کے لئے میرے جذبات میں طلاطم پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے سکولوں کی آمدنی کو (اپنے عزیزوں کی تعلیمی کفالت کے علاوہ) تحریک آزادی پر صرف کرنے کا فیصلہ کیا۔ میری نظر میں اس کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ ایک رسالہ جاری کروں تاکہ میری آمدنی کے ساتھ ساتھ میری تحریری صلاحیتیں بھی تحریک آزادی کے کام آئیں۔ اس سے قبل مشہور کشمیری دانشور اور صحافی پنڈت پریم ناتھ بزاز دہلی سے وائس آف کشمیر (Voice of Kashmir) کے نام سے ایک رسالہ نکالتے تھے جس کے چند شمارے دیکھنے کا مجھے بھی اتفاق ہوا تھا۔ اب یہ رسالہ بند ہو گیا تھا چنانچہ میں نے اسی نام سے اپنا ماہنامہ (انگریزی زبان میں) شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کا ڈیکلریشن

مجھے تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد مل گیا۔ اس طرح جنوری 1962ء میں اس کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ زر ضمانت اور ابتدائی اخراجات کے لئے میرے دوست جی ایم لون مرحوم نے بھی میری کچھ مالی مدد کی۔

ذہن، دل اور قلم جوان اور جذباتی تھے۔ چنانچہ وائس آف کشمیر کے مضامین اور اداریئے بڑے جاندار ہوتے تھے۔ میری زندگی بھر یہ کوشش رہی ہے کہ جو کام بھی کروں معیاری کروں۔ چنانچہ زوردار اداریوں اور مضامین کے علاوہ وائس آف کشمیر کی ظاہری خوبصورتی بھی اعلیٰ پائے کی ہوتی تھی۔ کئی بار اس کا سرورق چار رنگوں کا چھپا۔ ادھر مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کے علاوہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے معاملات سے متعلق میرے جاندار اور تنقیدی مضامین اور اداریوں نے حکومت پاکستان کی وزارت امور کشمیر کے علاوہ وزارت خارجہ کو بھی خاصا پریشان کر دیا تھا۔ اپریل 1963ء میں میں نے خودمختار کشمیر کے حق میں ایک انتہائی زوردار اداریہ لکھا۔ اس کے بعد میں نے گلگت بلتستان کے بارے میں ایک خصوصی سپلیمنٹ (Supplement) بھی شائع کیا۔ دونوں نے حکومت کو خاصا پریشان کر دیا کیونکہ وائس آف کشمیر کے پرچے ہر سفارت خانے کے علاوہ دنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں اور پریس کلبوں کو بھی جاتے تھے۔ ایک بار امریکہ میں پاکستان کے سفیر واشنگٹن کے نیشنل پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے۔ سوال و جواب کے دوران ایک صحافی نے ان سے پوچھا کہ خودمختار کشمیر کے بارے میں پاکستان کا موقف کیا ہے۔ سفیر نے جواب دیا کہ کشمیری خودمختاری نہیں پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں۔ اس پر صحافی نے کہا کہ ان کے پاس انگریزی زبان میں ایک ہی کشمیری رسالہ وائس آف کشمیر آتا ہے اور وہ کشمیر کی خودمختاری کا پرچار کرتا ہے۔ آپ کیسے کہتے ہیں کہ کشمیری خودمختاری نہیں چاہتے۔

وائس آف کشمیر نے بھارتی حکومت کو بھی خاصا پریشان کر دیا تھا۔ میرے اکثر مضمون کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضے کا پردہ چاک کرتے تھے۔ کبھی کبھی بڑے بڑے چبھنے والے بھارت مخالف کارٹون بھی شائع ہوئے تھے۔

واشنگٹن کے متذکرہ بالا واقعے کے کچھ مدت بعد راولپنڈی میں مجھے پیغام ملا کہ وزارت امور کشمیر کے جوائنٹ سیکرٹری امان اللہ نیازی کسی بہت ہی ضروری کام کے سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں خاصی سوچ بچار کے بعد ان کے دفتر واقع شہزادہ کوٹھی گیا۔ ان کی میز پر وائس آف کشمیر کے تمام شماروں کا ایک سیٹ (Set) رکھا ہوا تھا علیک سلیک کے بعد کہنے لگے۔ مسٹر امان اللہ، آپ کے رسالے کا گیٹ اپ (Get-up) کتنا خوبصورت ہے۔ کاش اس کا مواد بھی اتنا ہی خوبصورت ہوتا۔ میں نے کہا نیازی صاحب میری نظر میں رسالے کا مواد اس کے ٹائیٹل سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ اس کے بعد انہوں نے پیشکش کی کہ اگر میں وائس کی پالیسی

حکومت پاکستان کی کشمیر پالیسی کے مطابق رکھوں تو حکومت میری پوری مالی مدد کرے گی۔ میں نے ایسا کرنے سے صاف انکار کیا تو انہوں نے بھی مجھ سے صاف صاف کہا کہ حکومت نے آپ کے اداریوں اور مضامین کا سخت نوٹس لیا ہے۔ اس پر ہماری گفتگو اختتام پذیر ہوئی۔

میں نے سال بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد کچھ مدت قبل ہی پاکستان کے اہم اداروں، پی آئی اے (PIA) پی آئی ڈی سی (PIDC) اور محکمہ سیاحت وغیرہ اور کچھ پرائیویٹ تجارتی اداروں سے بھی اشتہارات کے سال بھر کے لئے آرڈر لئے تھے اور میرا اندازہ تھا کہ ان اشتہاروں کی وجہ سے سال بھر میں رسالے کا بھاری خسارہ پورا کر سکوں گا۔

میں امان اللہ نیازی سے ملاقات کے دو ہفتے بعد کراچی پہنچا تو دفتر میں پی آئی اے وغیرہ کے خط پڑے تھے۔ جن میں اشتہارات کے بارے میں ان کے سابقہ معاہدوں کی منسوخی (بغیر وجہ بتائے) کی اطلاع دی گئی تھی۔ کچھ مدت بعد اکثر نجی اداروں کے اشتہارات بھی بند ہو گئے۔ اس طرح قرضوں کا بھاری بوجھ اتر جانے کی آخری امید بھی ختم ہو گئی۔ چنانچہ میں نے مئی جون 1964ء میں وائس آف کشمیر کا ایک خصوصی نمبر نکال کر اسے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا کیونکہ مزید مالی بوجھ میرے بس سے باہر تھا۔ اس کے بعد کئی سال تک رسالے کے واجبات اپنے سکولوں کی آمدنی سے ادا کرتا رہا۔ سندھ ٹائمز پریس کراچی جہاں سے رسالہ چھپتا تھا، بلتستان کے سعید حسن مرحوم کی ملکیت تھا اور سعید صاحب ایک عظیم محب وطن تھے۔ چنانچہ انہوں نے واجبات کی ادائیگی کے سلسلے میں مجھے مناسب وقت دیا۔

وائس آف کشمیر نے تحریک آزادی کے سلسلے میں خاص کر نظریۂ خودمختار کشمیر کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ مجھے اس کی اشاعت کے سلسلے میں بھاری خسارے کا زیادہ افسوس نہیں ہوا۔ وائس آف کشمیر بند ہونے کے بعد میں نے پاکستان اور آزاد کشمیر کے اخبارات اور جرائد میں لکھنے کا کام جاری رکھا۔

جون 1976ء میں برطانیہ چلا گیا اور اگلے ماہ ہی وائس آف کشمیر انٹرنیشنل (Voice of Kashmir International) کے نام سے انگریزی زبان میں ایک ماہنامہ برمنگھم سے جاری کیا۔ پہلے شمارے کے سارے اخراجات اپنی جیب سے ادا کئے۔ شروع میں پرچہ این ایل ایف کے ترجمان کے طور پر شائع ہوتا رہا۔ بعد میں اسے لبریشن فرنٹ کا ترجمان بنایا گیا۔ پہلے شمارے کی اشاعت کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مسئلہ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ برطانیہ میں مقیم کشمیریوں کو بھی مسئلے کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ پرچہ آدھا انگریزی، آدھا اردو میں شائع ہوتا رہا۔ بعد میں پرچہ صرف اردو میں شائع ہوتا رہا۔ البتہ کبھی کبھی اس کا انگریزی سپلیمنٹ (Supplement) بھی شائع ہوتا تھا۔ بین الاقوامی سطح پر تقسیم کرنے کے لئے ہم نے الگ سے انگریزی میں لٹریچر خاصی مقدار میں

چھپوایا تھا اور اسے دنیا بھر میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔

وائس آف کشمیر انٹرنیشنل میں اداریوں ' مضامین اور مزاحیہ کالموں کے ذریعہ مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں' نظریۂ خودمختار کشمیر ' کشمیری لیڈروں کی فرض ناشناسیوں اور ملت فروشیوں ' لبریشن فرنٹ کی سرگرمیوں اور حب الوطنی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا رہا۔ وائس آف کشمیر انٹرنیشنل کے طنز و مزاح پر مبنی کالم "جہاں گرد کا سفر نامہ" ' "سیلانی کی سیاسی ڈائری" "دیکھتا چلا گیا" اور "خبروں پر تبصرہ" خاصے چبھنے والے ہوتے تھے۔ وائس میں شائع ہونے والے میرے بہت سے مضامین کو آزاد کشمیر کے کچھ نوجوان لکھاڑی معمولی سے رودبدل کے ساتھ اپنے نام سے شائع کراتے رہے۔ وائس کے بھارت مخالف مضامین بہت مؤثر ہوتے تھے۔ چنانچہ بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے بھارت اور کشمیر میں وائس کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ بہرحال کچھ مدت بعد بھارت کے نئے وزیراعظم مرارجی ڈیسائی نے یہ پابندی ہٹا دی۔

1976ء میں جب میں برطانیہ گیا تو اس وقت وہاں مقیم تقریباً ڈیڑھ لاکھ آزاد کشمیریوں میں سے نوے فیصد کشمیری کہلاتے ہوئے شرماتے اور اپنے آپ کو پاکستانی گردانتے تھے۔ دس سال کے اندر اندر ان لوگوں کی بھاری اکثریت کشمیری کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگی۔ برطانیہ میں مقیم کشمیریوں میں اس ذہنی اور نظریاتی تبدیلی میں دوسرے عوام کے علاوہ وائس آف کشمیر انٹرنیشنل اور لبریشن فرنٹ کے لٹریچر کا کردار کلیدی تھا۔

ہر نظریاتی جریدے کی طرح وائس آف کشمیر بھی شدید مالی مشکلات سے دوچار رہا۔ اور آخر اسی وجہ سے بند ہو گیا گو اس کے بند ہونے میں کچھ دوسرے عوامل بھی شامل تھے۔

وائس آف کشمیر انٹرنیشنل کے سلسلے میں مالی مشکلات کا میں نے کس طرح مقابلہ کیا اس کی وضاحت درج ذیل چند مثالیں کرتی ہیں۔

1976ء کے ستمبر یا اکتوبر میں برمنگھم کے محمود نظامی صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ وہ میرے اعزاز میں ایک ظہرانہ دینا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اس پر خرچہ کتنا آئے گا۔ کہنے لگے ڈیڑھ دو سو پونڈ' میں نے کہا کیا آپ مزید ایک سو پونڈ خرچ کر سکتے ہیں۔ کہنے لگے ہاں آپ مزید مدعوئین کی فہرست دے دیں۔ وہ سمجھے تھے کہ شاید میں کچھ اور لوگوں کو ظہرانے میں بلانا چاہتا ہوں - میں نے کہا نظامی صاحب ! وائس آف کشمیر کا مواد تیار ہے۔ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی اشاعت رکی ہوئی ہے۔ میرے اعزاز میں ظہرانہ دینے سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ وائس آف کشمیر شائع ہو۔ اس لئے آپ میرے اعزاز میں دیا جانے والا ظہرانہ منسوخ کریں اور اس پر آنے والے خرچ کی رقم مجھے دیں تاکہ وائس آف کشمیر شائع ہو سکے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اس واقعے کے کچھ مدت بعد پھر وہی صورت پیدا ہوئی۔ ایک دن میں دفتر میں مغموم سا بیٹھا تھا کہ حاجی گلزار بھٹی مرحوم اندر آ گئے ' میری افسردگی کی وجہ پوچھی تو میں نے وائس سے

متعلق صورت حال بیان کی۔ وہ چلے گئے اور چند دن بعد آ کر 9 سو پونڈ میرے حوالہ کر دیئے جو انہوں نے اپنے احباب اور رشتہ داروں سے لئے تھے۔ چنانچہ اس رقم سے وائس کے تین شمارے شائع ہوئے۔ لندن کے عبدالجبار صاحب نے پانچ سو پونڈ کمپنی میں انوسٹ کئے تھے۔ وہ بھی وائس پر صرف ہو گئے۔ لاہور کے غلام نبی لون صاحب نے اپنے دورۂ لندن کے دوران وائس کے لئے چار سو پونڈ کا عطیہ دیا۔ 1980ء میں میں نے انشورنس کی ایجنسی لی۔ جس سے سال بھر میں تقریباً چار ہزار پونڈ کمائے۔ جن میں سے ڈھائی ہزار پونڈ لبریشن فرنٹ کو دیئے۔ جو وائس پر خرچ کئے گئے۔ لبریشن فرنٹ کے ممبروں نے بھی چھوٹے بڑے عطیات دیئے۔ برمنگھم کے چوہدری عظیم اور ناٹنگھم کے محمد اسلم صاحب نے بھی کئی سو پونڈ کے عطیات دیئے۔ اس کے علاوہ اشتہاروں سے بھی کچھ آمدنی ہوتی تھی۔ بایں ہمہ وائس کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے کئی بار تو یہاں تک ہوا کہ مجھے وائس کا من بھر کا بنڈل اپنے کاندھوں پر اٹھا کر پریس سے دفتر لانا پڑا۔ جو پریس سے تقریباً دو کلومیٹر دور تھا۔ اس لئے کہ میرے پاس ٹیکسی یا بس کے لئے پیسے نہیں تھے اور کوئی گاڑی والا ساتھی بھی نہیں ملا۔ پریس کے مالک مسٹر ہیلی (Mr. Heally) نے بھی بڑی مدد کی۔ کئی بار رسالہ ادھار چھاپا۔ مسٹر ہیلی وائس آف کشمیر کے انگریزی حصے اور ہمارے انگریزی لٹریچر کی پروف ریڈنگ (Proof Reading) کرتے کرتے مسئلہ کشمیر سے خاصے واقف اور ہمارے ہمدرد بن گئے تھے۔ 1981ء میں انہیں کسی سلسلے میں دو ماہ کی سزا ہوئی۔ جیل میں کچھ بھارتی باشندے بھی تھے۔ ان سے مسٹر ہیلی نے کہا تمہارے بھارت نے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ کشمیری آزادی کے مستحق ہیں۔ اس پر بات بڑھ گئی اور بھارتیوں نے مسٹر ہیلی کی پٹائی کر دی۔ رہا ہونے کے بعد مسٹر ہیلی نے مجھے وہ قصہ سناتے ہوئے کہا کہ مجھے اس پٹائی کا افسوس نہیں کیونکہ ان لوگوں کو کم از کم یہ احساس تو ہو گیا ہو گا کہ کشمیر کے بارے میں بھارت کے موقف کو ایک انگریزی بھی جس کا کشمیر سے کوئی تعلق نہیں، غلط سمجھتا ہے۔

وائس آف انٹرنیشنل کا آخری شمارہ 1984ء کے وسط میں انگریزی سپلیمنٹ کی شکل میں شائع ہوا۔ اور اسی کے ساتھ ہی میری صحافتی زندگی معطل ہو گئی گو اس کے بعد بھی میرے مضامین دوسرے اخبارات اور جرائد میں شائع ہوتے رہے۔

مجھے برطانیہ میں قیام کی اجازت وائس آف کشمیر کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہی ملی تھی جس کے لئے میں اسے رسمی طور پر شائع کرنے والی کمپنی یونائیٹڈ کشمیر پبلیکیشنز کے حصہ داروں کا مشکور ہوں۔ علاوہ ازیں وائس کی تیاری چھپائی پوسٹنگ اور تقسیم کے سلسلے میں مرزا صدیق، مرزا بشیر، اسلم مرزا، محصوم انصاری، محمد یٰسین، محمد نذیر، زبیر الحق، محمد نعیم، جہانگیر مرزا میری مدد کرتے رہے۔ جس کے لئے میں ان نوجوانوں کا بھی مشکور ہوں۔

مجھے اس بات پر خوشی بھی ہے اور فخر بھی کہ میری ادارت اور ملکیت میں شائع ہونے

والے ماہنامہ وائس آف کشمیر کراچی اور میری ادارت والے وائس آف کشمیر انٹرنیشنل برطانیہ نے کشمیریوں خاص کر نوجوانوں میں حب الوطنی کے جذبات اجاگر کرنے، نظریۂ خودمختار کشمیر کی تشہیر و تبلیغ اور اسے بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنے کے سلسلے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ میں تحریک آزادی میں اپنے صحافتی کردار سے مطمئن ہونے میں حق بجانب ہوں۔

چوتھا باب

کشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی

1957ء کے بعد بھارت اقوام متحدہ' عالمی برادری' پاکستان اور کشمیریوں سے کئے گئے ان وعدوں سے بالکل منحرف ہو گیا تھا جو اس نے اس سے قبل خاص کر 48-1947ء کے دوران کشمیریوں کو حق خودارادیت دینے کے بارے میں کئے تھے 1960ء کے امریکی صدارتی انتخابات میں نوجوان کینیڈی امریکہ کے صدر بن گئے اور کچھ مدت بعد انہوں نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں ثالثی کی پیشکش کی ۔ جسے بھارت نے بری طرح ٹھکرا دیا لیکن جب1962ء میں بھارت اور چین کے درمیان سرحدی جنگ شروع ہوئی اور بھارت چینیوں کے ہاتھوں بری طرح پٹنے لگا تو بھارتی وزیراعظم پنڈت نہرو نے صدر کینیڈی سے رجوع کیا اور ان کے ذریعہ حکومت پاکستان کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ (پاکستان) اس جنگ کے دوران کشمیر میں فوجی مداخلت کر کے بھارت کے لئے مزید مشکلات پیدا نہ کرے تو جنگ کے بعد بھارت مسئلہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کے ساتھ پرخلوص اور نتیجہ خیز مذاکرات کرے گا ۔ پنڈت نہرو نے اس سلسلے میں برطانوی حکومت سے بھی رجوع کیا تھا ۔ چنانچہ امریکہ اور برطانیہ کی حکومتوں نے پاکستان کے صدر ایوب خان پر دباؤ ڈالا کہ وہ بھارت کی ان مشکلات سے فائدہ اٹھا کر کشمیر میں مداخلت نہ کرے ۔ صدر ایوب نے یہ دباؤ قبول کیا اور بھارت نے پاکستان کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنی پوری فوجی طاقت چینی بھارت سرحد پر مرکوز کر لی ۔

چین بھارت جنگ کے خاتمے کے بعد امریکہ اور برطانیہ کی حکومتوں کی کوششوں سے بھارت اور پاکستان کے مابین مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے وزارتی سطح پر مذاکرات شروع ہوئے۔ پاکستانی وفد کی قیادت مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے کی جبکہ بھارتی وفد کے قائد بھارت کے وزیر خارجہ سردار سوارن سنگھ تھے ۔ ان مذاکرات کے پاکستان اور بھارت میں پانچ راؤنڈ ہوئے ۔ 1962ء تک پاکستان کے حکمرانوں نے مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں اپنے سابق موقف یعنی کشمیریوں کے حق خودارادیت کی غیر مشروط حمایت میں کچھ لچک پیدا کر دی تھی ۔ اب اس مسئلے کے حل کے سلسلے میں پاکستان کی طرف سے اکثر و بیشتر مسئلہ کشمیر کا منصفانہ اور آبرومندانہ حل

(Equitable and Honourable Solution) کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی ۔ جس سے سنجیدہ کشمیری حلقے خاصے فکر مند ہو گئے تھے ۔ بھارت اور پاکستان کے ان مذاکرات کے پہلے راؤنڈ کے اختتام پر مغربی ذرائع ابلاغ نے خبر دی کہ مذاکرات کے ابتداء میں ہی دونوں وفود کے مابین یہ معاہدہ ہوا تھا کہ ان مذاکرات کے دوران نہ تو پاکستان کشمیریوں کے حق خودارادیت کا مطالبہ کرے گا نہ بھارت یہ مؤقف اختیار کرے گا کہ پوری ریاست بھارت کا اٹوٹ انگ ہے بلکہ مذاکرات کچھ لو کچھ دو کے اصول پر مبنی ہوں گے ۔ چنانچہ پاکستان نے ابتداء ہی میں پیشکش کی کہ بھارت ریاست کے ہندو اکثریتی علاقے لے لے اور باقی حصہ پاکستان کو دے دے ۔ اس کے برعکس بھارت نے حد متارکہ جنگ میں معمولی سی ردوبدل کر کے اس مسئلے کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی تجویز سے مذاکرات کا آغاز کیا ۔ کچھ مدت کے بعد مغربی ذرائع ابلاغ نے یہ خبر دی کہ مذاکرات کے دوران دریائے جہلم کو پاک بھارت سرحد بنانے کی تجویز بھی سننے میں آتی رہی چنانچہ محب وطن اور سنجیدہ کشمیری حلقے اور بھی پریشان ہو گئے ۔ کیونکہ اس تجویز کے تحت سارے صوبہ جموں اور لداخ کے علاوہ وادی کشمیر کا تقریباً آدھا حصہ بھی بھارت کو جاتا ۔ یہی نہیں بلکہ وادی کشمیر کے شہر سرینگر سوپور اور بارہ مولہ بھی بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہوتے کیونکہ دریائے جہلم ان شہروں کے درمیان سے گزرتا ہے ۔ یہ ایسی صورتحال تھی جسے کوئی بھی محب وطن کشمیری برداشت نہیں کر سکتا تھا ۔

ان دنوں کراچی کے خواجہ غلام محمد لون آزاد کشمیر سٹیٹ کونسل کے آزاد ممبر تھے ۔ ہم دونوں نے جب تقسیم کشمیر سے متعلق یہ خبر پڑھی تو انتہائی پریشان ہو گئے ۔ آخر طے پایا کہ لون صاحب آزاد کشمیر اور پاکستان کا تفصیلی دورہ کر کے اس تجویز کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے محب وطن کشمیریوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں ۔ چنانچہ وہ اس مشن پر روانہ ہو گئے ۔ ادھر میں نے اپنے رسالے وائس آف کشمیر کے اپریل 1963ء کے شمارے میں (The Only Way Out) کے عنوان سے ایک زور دار اداریہ لکھا جس میں ان مذاکرات کی اس نوعیت کی پر زور مذمت کرتے ہوئے واضح کیا کہ اگر مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں موعود رائے شماری کا متبادل ڈھونڈنا ہی مقصود ہے تو یہ متبادل ریاست کی بندر بانٹ نہیں بلکہ پوری ریاست کی مکمل خودمختاری ہے ۔

ادھر لون صاحب نے ہم خیال ہم وطنوں سے تبادلہ خیال کے بعد 12 مئی 1963ء کو ڈان ہوٹل راولپنڈی میں ہم خیال سیاسی کارکنوں کا اجلاس بلایا اور مجھے اس میں شرکت کرنے کی تاکید کی - چنانچہ میں اجلاس سے دو دن پہلے ہی راولپنڈی پہنچا اور لون صاحب سے ان کی کوششوں کی تفصیل سنی - 12 مئی کو اجلاس ہوا جس میں آزاد کشمیر و پاکستان سے کشمیری وکلاء صحافیوں اور سیاسی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور ہر مقرر نے مسئلہ کشمیر سے

متعلق اس صورت حال پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس کے خلاف بھرپور آواز اٹھانے کی ضرورت پر زور دیا - اس کے بعد ایک قرار داد منظور ہوئی جس میں ریاست کی تقسیم کی تجاویز کی پر زور مذمت کرتے ہوئے مطالبہ کیا گیا کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں اگر ریاست میں رائے شماری کرانے کا متبادل ہی ڈھونڈنا ہے تو یہ متبادل پوری ریاست جموں و کشمیر کی مکمل خود مختاری ہی ہو سکتا ہے - اجلاس میں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اس مطالبے کو آگے بڑھانے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جائے - چنانچہ جی ایم لون (کنوینر) قاضی خورشید عالم سٹیٹ کونسلر سیالکوٹ عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ میرپور، ملک عبدالمجید ایڈووکیٹ میرپور، امان اللہ خان ایڈیٹر وائس آف کشمیر کراچی (میں) میر عبدالعزیز ایڈیٹر انصاف راولپنڈی، میر عبدالرشید ایڈیٹر فری کشمیر مظفر آباد، مجید امجد بٹ ایڈیٹر ولر سیالکوٹ، غلام نبی گلکاربانی صدر آزاد کشمیر، شیخ محمد سلیم سیالکوٹ، ایم اے فاروق ایڈووکیٹ مظفر آباد، میر عبدالقیوم کراچی، سعید شاہ ناز کی لاہور، ڈاکٹر غلام احمد جراح سیالکوٹ اور علی محمد ملک آف پشاور پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی - جس کا نام کشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی (Kashmir Independence Committee) رکھا گیا اور اسے ہدایت کی گئی کہ وہ کمیٹی کے مطالبے کی وسیع تشہیر کرے ۔ کمیٹی نے قرار داد کی کاپیاں بھارت، پاکستان، امریکہ اور برطانیہ کی حکومتوں، اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اور قومی اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کو بھیج دیں اور تقسیم کشمیر کے خلاف نحیف سی سیاسی مہم بھی شروع کی ۔

پاک بھارت مذاکرات کے آخری راؤنڈ کے اختتام پر مذاکرات کی ناکامی کا اعلان ہوا اس طرح ریاست جموں کشمیر ایک انتہائی غیر انسانی اور غیر قدرتی طرز پر ہمیشہ کے لئے تقسیم ہونے سے بچ گئی اور اس کے نتیجے میں انڈیپنڈنس کمیٹی بھی آہستہ آہستہ خاموش اور آخر ختم ہو گئی اور میرے سمیت اس کے اکثر ممبر بعد میں یعنی اپریل 1965ء میں قائم ہونے والے محاذ رائے شماری میں شامل ہو گئے۔

پانچواں باب

کشمیر کمیٹی برائے افریشیائی عوامی اتحاد

1945ء میں دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے ساتھ ہی دنیا بھر کی محکوم قوموں کی آزادی کا دور شروع ہوا اور چار سال کے اندر اندر بھارت، پاکستان، چین اور انڈونیشیا جیسے بڑے ملکوں سمیت بہت سے ملک آزاد ہو گئے - 1952ء میں مصر میں فوجی انقلاب کے بعد وہاں برطانوی سامراج کا اثر تقریباً ختم ہو گیا چنانچہ ان ملکوں کے آزادی پسند عناصر نے ایشیا اور افریقہ کی باقی ماندہ قوموں کی آزادی، آزاد شدہ ملکوں سے مغربی سامراج کے باقی ماندہ اثرات کے مکمل خاتمے اور ان (آزاد شدہ ممالک) کے عوام کے مابین دوستانہ اور برادرانہ تعلقات قائم کرنے کی غرض سے افریشیائی عوامی یکجہتی کی تنظیم (Organisation of Afro-Asian Peoples Solidarity) قائم کی۔

افریشیائی عوامی اتحاد کی تنظیم کی پاکستان میں بھی شاخ قائم ہو گئی اور کراچی کے بیرسٹر ثمین خان اور لاہور کے ملک معراج خالد ایڈووکیٹ (جو بعد میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی رہے) اس شاخ کے روح رواں تھے۔ میری بیرسٹر ثمین خان سے علیک سلیک تھی۔ وہ کبھی کبھی ہمارے مظاہروں میں شرکت کرتے تھے۔ ان سے تبادلہ خیال کے بعد فیصلہ ہوا کہ افریشیائی عوامی اتحاد کی پاکستان شاخ میں کشمیر کے بارے میں ایک شعبہ قائم کیا جائے جو قائم ہوا اور میں نے اس شعبے کے سربراہ کے فرائض سنبھالے۔ 1963ء میں ہم نے ہوٹل میٹروپل کراچی میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں ایک کانفرنس بلائی - جس میں آزاد کشمیر کے صدر مسٹر کے ایچ خورشید مہمان خصوصی تھے - کانفرنس میں بہت سے سفارتی نمائندوں کے علاوہ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کے نمائندوں نے بھی شرکت کی اور اس میں کشمیریوں کے حق خودارادیت کے حق میں ایک زور دار قرار داد بھی منظور کی گئی - جس کی کاپیاں ہم نے اقوام متحدہ کے علاوہ ایشیاء اور افریقہ کے تمام ممالک میں افریشیائی عوامی اتحاد کی شاخوں اور ذرائع ابلاغ کو بھیج دیں -

کچھ مدت کے بعد مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ کشمیر کمیٹی برائے افریشائی عوامی اتحاد کے نام سے ایک آزاد و خودمختار کمیٹی قائم کی جائے - پاکستان کمیٹی کے ایک حصے کی حیثیت سے افریشیائی سطح پر ہماری آواز متاثر کن ثابت نہیں ہو رہی تھی کیونکہ بااثر بھارتی کمیٹی ہمیں افریشیائی سطح پر پاکستان کمیٹی کی کٹھ پتلی گردانتی تھی - چنانچہ اس سلسلے میں 11 جون 1966ء کو راولپنڈی میں ایک

اجلاس ہوا ۔ جس میں کشمیر کمیٹی برائے افریشیائی عوامی اتحاد (Kashmir Committee for Afro-Asian people Solidarity) کے نام سے ایک آزاد و خودمختار تنظیم قائم کی گئی۔ جی ایم لون اس کے کنوینر اور میں سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے ۔ اس کے علاوہ کراچی سے ملک رشید ' میرپور سے عارف کمال ' خواجہ مشتاق ' صابر انصاری ' لاہور سے نصیر محمود وانی ' راولپنڈی کے میر عبدالعزیز اور اکرم اللہ جسوال اور مظفر آباد سے ایم اے فاروق ایڈووکیٹ پر مشتمل ایک کنوینگ کمیٹی بھی منتخب کی گئی ۔

کمیٹی کی تشکیل کے بعد ہم نے مسئلہ کشمیر پر خاصا لٹریچر شائع کر کے افریشیائی عوامی اتحاد کی تمام شاخوں کو بھیجا تاکہ تیسری دنیا میں مسئلہ کشمیر اپنی اصلی شکل میں اجاگر ہو جائے ۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے قاہرہ مصر میں قائم تنظیموں کے مرکزی ہیڈ کوارٹر کو تنظیم کی رکنیت کے لئے درخواست بھیجی لیکن وہاں تعینات مرکزی تنظیم کے بھارتی ڈپٹی سیکرٹری جنرل نے ہماری درخواست پہلے تو غائب کر دی اور ہماری طرف سے بار بار کی یاد دہانیوں پر اس کی منظوری کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر دیں ۔ 1969ء میں افریشیائی عوامی اتحاد کی تنظیم کو وسعت دے کر اس کے دائرہ کار کو لاطینی امریکہ تک بڑھایا گیا اور اس وسیع تر تنظیم کا نام افریشیائی اور لاطینی امریکی عوامی اتحاد کی تنظیم رکھا گیا اور اس کا پہلا اجلاس کیوبا کے دارالحکومت ہوانا میں بلایا گیا ۔ اس کانفرنس میں پاکستانی وفد کی قیادت مولانا عبدالحمید بھاشانی نے کرنی تھی ۔ چنانچہ میں کراچی میں مولانا سے ملا اور انہیں نئی تنظیم میں کشمیر کمیٹی کو رکنیت دلانے کی کوشش کرنے پر آمادہ کیا ۔ میں خود ہوانا جانا چاہتا تھا لیکن پاسپورٹ نہ ملنے کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا ۔ میں نے مولانا کو کانفرنس کے دوران مندوبین میں تقسیم کرانے کے لئے ایک یادداشت بھی دی اور ساتھ ہی رکنیت کے لئے درخواست بھی ' یادداشت میں مسئلہ کشمیر کے پس منظر بھارت اور پاکستان کی طرف سے کشمیریوں کو حق خود ارادیت دینے کے سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر کئے گئے اعلانات اور مسئلہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کا تفصیلی ذکر کیا گیا تھا ۔ مولانا نے ہماری یادداشت اور درخواست کی کاپیاں اپنی روانگی سے پہلے ہی وفد کے دوسرے ممبر اعجاز حسین بٹالوی ایڈووکیٹ (جو بعد میں گنگا ہائی جیکنگ کیس میں صفائی کے وکلاء میں سے ایک تھے) کے ہاتھ ہوانا بھیج دیں ۔ مولانا وقت پر پاسپورٹ نہ ملنے کی وجہ سے ہوانا تاخیر سے پہنچے چنانچہ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں پاکستانی وفد کی قیادت وفد کے ڈپٹی لیڈر اے ٹی ایم مصطفٰے نے کی لیکن وہ اپنی تقریر کے دوران ہی حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے ۔ چنانچہ پاکستانی وفد ہماری درخواست متعلقہ کمیٹی میں پیش کئے بغیر ہی مسٹر مصطفٰے کی لاش کے ساتھ پاکستان لوٹ آیا۔ اس طرح ہم ایک بار پھر ایک اہم بین الاقوامی تنظیم کی رکنیت حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے۔

اس سے قبل بھارت انڈونیشیا ' کیوبا ' مصر اور یوگوسلاویہ کے لیڈروں کی کوششوں سے

ایشیاء ' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے نو آزاد شدہ اور غیر جانبدار ممالک پر مشتمل سرکاری سطح کی تنظیم غیر وابستہ تحریک (Non-Aligned Movement) قائم ہوئی چونکہ یہ تنظیم حکومتی سطح کی ہے اس لئے ہم ایک غیر سرکاری تنظیم کی حیثیت سے اس کی رکنیت کے لئے درخواست دینے کے مجاز نہیں (اس تنظیم میں فلسطین کے پی ایل او اور جنوبی افریقہ کے سواپو کو مبصر کی حیثیت حاصل ہے) ادھر غیر وابستہ تحریک کے قیام کے بعد افریشیائی لاطینی امریکہ کی عوامی اتحاد کی تنظیم خاصی حد تک پس منظر میں چلی گئی ۔ علاوہ ازیں میں 1970ء سے 1972ء تک قید رہا - رہائی کے بعد گنگا کیس کے سلسلے میں مصروف رہا اور کچھ مدت بعد برطانیہ چلا گیا - اس اثناء میں کمیٹی کے دوسرے ممبر جو پہلے ہی غیر متحرک تھے منتشر ہو گئے - اس طرح یہ کمیٹی ختم ہو گئی۔

چھٹا باب

جموں کشمیر محاذِ رائے شماری

میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) کے بانیوں میں سے تھا اور اس کے ساتھ تقریباً تیرہ سال تک وابستہ رہا پہلے ساڑھے چار سال سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے اور مزید تقریباً سات سال تک چیئرمین پبلٹی بورڈ کی حیثیت سے ۔ آیئے محاذ رائے شماری کے قیام اس کے پس منظر اور اس کی رکنیت کے دوران میری کارکردگی پر ایک نظر ڈالیں ۔

اگست 1953ء میں بھارتی حکومت نے مقبوضہ کشمیر کے وزیراعظم شیخ محمد عبداللہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور شیخ صاحب کو ان کے سینکڑوں ساتھیوں سمیت گرفتار کیا - 1955ء میں شیخ صاحب کے دست راست مرزا محمد افضل بیگ جیل سے رہا ہو گئے اور انہوں نے جموں کشمیر محاذرائے شماری نام سے ایک سیاسی تنظیم بنائی جو دیکھتے ہی دیکھتے مقبوضہ کشمیر کی مقبول ترین جماعت بن گئی - کیونکہ وہ ریاست کے بھارت سے نام نہاد الحاق کو چیلنج کر کے ریاست میں رائے شماری کا مطالبہ کر رہی تھی -

1964ء تک پاکستان میں بھی سیالکوٹ کے میر عبدالرشید وغیرہ اور پشاور کے علی محمد ملک نے اسی نام سے تنظیمیں بنائی تھیں - ادھر 1963ء میں بنی ہوئی کشمیر انڈ پینڈنس کمیٹی بھی مسئلہ کشمیر پر پاک بھارت مذاکرات کی ناکامی کے بعد غیر متحرک ہو گئی تھی - البتہ اس کے اکثر ممبر اس کے نظریئے کو کسی تنظیم کے پلیٹ فارم سے آگے بڑھانا چاہتے تھے - چنانچہ 1964ء میں ہم نے کراچی میں بھی اس نام سے تنظیم قائم کی اور فیصلہ کیا کہ تنظیم کو آزاد کشمیر و پاکستان سطح پر منظم کیا جائے اور اس بارے میں پاکستان کے دوسرے شہروں اور آزاد کشمیر میں ہم خیال لوگوں سے مشورہ کرنے کے لئے مجید امجد بٹ صاحب (ایڈیٹر ہفت روزہ ولر سیالکوٹ جو ان دنوں کراچی میں تھے) کو آزاد کشمیر و پاکستان کے دورے پر بھیجا گیا - بٹ صاحب نے واپس آکر ایک حوصلہ افزا رپورٹ دی - چنانچہ 4 اپریل 1965ء کو سیالکوٹ میں میر عبدالمنان (کنوینر) کی زیر صدارت ہونے والے کنونشن میں میرا مرتب کردہ آئینی مسودہ منظور ہونے کے بعد جموں کشمیر محاذ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) کا قیام عمل میں آیا - عبدالخالق انصاری صاحب اس کے صدر ، جی

ایم لون سینئر نائب صدر غلام نبی گلکار نائب صدر ، میں سیکرٹری جنرل ، مجید امجد بٹ جوائنٹ سیکرٹری جی ایم خان اسسٹنٹ سیکرٹری ، میر عبدالقیوم خزانچی اور مقبول احمد بٹ پبلسٹی سیکرٹری منتخب ہوئے ۔ انتخابات کے بعد پشاور کے سالار عبدالغنی کی تجویز پر فیصلہ ہوا کہ نو منتخب عہدیدار پاک کشمیر سرحد (سوچیت گڑھ) پر جا کر مقبوضہ کشمیر کی مٹی ہاتھ میں لے کر حلف اٹھائیں ۔ چنانچہ کنونشن کے جملہ شرکاء بسوں میں سو چیت گڑھ پہنچ گئے ۔ کوئی صاحب نو مینز لینڈ (No-Man's Land) عبور کر کے مقبوضہ کشمیر کے علاقے سے کچھ مٹی اٹھا لائے اور ہم نو منتخب عہدیداروں نے اس مٹی کو ہاتھ میں لے کر حلف اٹھایا کہ ہم اس کی آزادی کے لئے کسی قسم کی مالی ، جسمانی حتیٰ کہ جانی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے ۔

حلف وفاداری کا یہ منظر رقت انگیز تھا ۔ ہمارے ہاتھوں میں مادر وطن کے اس حصے کی مٹی تھی جو دشمن کے قبضے میں تھا ۔ ہمارے وطن کا سرمائی دارالحکومت جموں جو میر عبدالمنان مجید امجد بٹ ، ڈاکٹر غلام احمد جراح ، مرزا امین بیگ اور ملک فیض محمد سمیت وہاں پر موجود ہمارے بہت سے ساتھیوں کا جنم بھومی بھی تھا اور جہاں ان لوگوں نے اپنا پیارا بچپن (اور کچھ نے جوانی بھی) گزارا تھا ، صرف بیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور اپنی آزادی کے بارے میں ہمارے ضمیروں کو جھنجھوڑ رہا تھا ۔ چنانچہ اس صورت حال نے ہمارے جذبات میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا ۔ چنانچہ ہر عہدہ دار نے حلف وفاداری ہچکیوں میں اور آنسوؤں کی بارش میں اٹھایا ۔ نزدیک ہی کھڑے غیر عہدہ دار ساتھیوں کی آنکھیں بھی اشک بار تھیں اور ان کی ہچکیاں فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں ۔ مجید امجد بٹ صاحب حلف کی عبارت دہراتے ہوئے " میرا وطن میرا جموں ، میری ماں " پکارتے پکارتے گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے ۔ حلف برداری کی اس جذباتی رسم کے بعد ہم ساتھ ہی کھڑی بسوں کی چھتوں پر چڑھے تو ہمیں جموں شہر کا ایک حصہ صاف نظر آیا ۔ چنانچہ لوگوں پر پہلی سی کیفیت ایک بار پھر طاری ہو گئی اور کچھ احباب زور زور سے مادر وطن کو پکارنے لگے ۔ سرحد کی دوسری طرف بھارت کے قابض فوجی حیران ، پریشان یہ عجیب نظارہ دیکھتے رہے ۔ الغرض ہم سیالکوٹ سے حصول آزادی مادر وطن کی جدوجہد کے لئے ایک نیا جوش ، نیا جذبہ ، نیا ولولہ اور ایک نیا عزم لے کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے اور مجھے یہ دعویٰ کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ حصول آزادی کے لئے مقبول بٹ شہید کے پھانسی کے پھندے کو چومنے اور میری بعد کی جہد مسلسل میں اس مقدس حلف کا اثر بنیادی حیثیت رکھتا ہے ۔

میں نے محاذ کے قیام سے قبل الجزائریوں کی جنگ آزادی کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ قومی آزادی مسلح جدوجہد کے ذریعہ ہی حاصل کی جا سکتی ہے اور میں اسی غرض سے محاذ رائے شماری میں شامل ہوا تھا ۔ یہاں تک کہ میں نے محاذ کے آئین میں بھی (پوری وضاحت کئے بغیر) مسلح جدوجہد کو جدوجہد آزادی کے حصے کے طور پر شامل کیا تھا ۔ ادھر محب

وطن کشمیری حلقوں میں آزاد کشمیر میں ایک آئین ساز اسمبلی کے قیام کی ضرورت بھی محسوس کی جا رہی تھی تاکہ آزاد کشمیر پر سے حکومت پاکستان کی طرف سے مسلط شدہ رولز آف بزنس (Rules of Business) اور وزارت امور کشمیر کا تسلط ختم ہو جائے۔ چنانچہ میں نے مقبول بٹ اور چند دیگر ساتھیوں سے مشورے کے بعد 12 اپریل 1965ء کو میرپور میں ہونے والے محاذ کی مرکزی مجلس عاملہ کے پہلے ہی اجلاس میں تجاویز پیش کیں کہ ہمیں ایک زوردار قرارداد کے ذریعہ آزاد کشمیر کے لئے ایک آئین ساز اسمبلی کے قیام کا مطالبہ کرنا چاہئے اور ساتھ ہی ہمیں حصول آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کا کوئی پروگرام مرتب کرنا چاہئے لیکن کافی بحث مباحثہ کے بعد جس دوران ممبران میں کچھ تلخی بھی پیدا ہوئی دونوں تجاویز کو اکثریت نے رد کر دیا۔ جس سے مجھے اور میرے ہم خیال ساتھیوں کو بہت دکھ ہوا۔ اس واقعے کے نتیجے میں محاذ رائے شماری کے اندر تنظیم کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے طریقہ کار پر اختلافات کی ابتداء ہوئی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتے گئے۔ میری اور مقبول بٹ کی نظر میں مسلح جدوجہد کے بغیر حصول آزادی ناممکن تھی۔ چنانچہ میرپور سے راولپنڈی واپسی کے سفر کے دوران ہم نے محاذ رائے شماری کی طرف سے مسلح جدوجہد کا مجوزہ پروگرام رد ہونے کے موضوع پر تفصیلی تبادلہ خیال کیا جس کے نتیجے میں جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ (این ایل ایف) اصولی طور پر وجود میں آگیا گو اس کا رسمی قیام ایک ماہ بعد عمل میں آیا۔

اتحاد ثلاثہ

جون 1966ء میں ہونے والے محاذ رائے شماری کی مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس میں میری بالواسطہ طور پر پیش کی گئی اس تجویز کو ہاؤس نے منظور کیا کہ تحریک آزادی کو زیادہ نتیجہ خیز اور مؤثر بنانے، مسئلہ کشمیر کو اس کی اصل شکل دینے اور آزاد کشمیر میں جمہوری قدروں کو فروغ دینے کے لئے دوسری کشمیری تنظیموں سے اتحاد کی کوشش کی جائے اور اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں دوسری پارٹیوں کے سربراہوں سے بات چیت کرنے کے لئے جی ایم لون ملک عبدالمجید اور مجھ پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس سلسلے میں بھی ابتدائی کام میں نے کیا کیونکہ لون صاحب اور ملک صاحب اس کے لئے وقت نہ نکال سکے۔

میں سب سے پہلے گھوڑا گلی جا کر چوہدری غلام عباس صاحب سے ملا اور ان کے سامنے اتحاد کی تجویز پیش کی۔ انہوں نے کہا مسلم کانفرنس کے صدر سردار عبدالقیوم ہیں۔ آپ اس سلسلے میں ان سے بات کریں۔ سردار صاحب کہیں باہر جانے کے لئے کراچی پہنچے تھے۔ چنانچہ میں فوراً کراچی آیا اور ان سے ملاقات کر کے انہیں مجوزہ اتحاد کے لئے بات چیت پر آمادہ کیا۔

انہوں نے مسلم کانفرنس کے جنرل سیکرٹری خواجہ محمد علی کنول اور شیخ بشارت احمد ایڈووکیٹ کو مجوزہ مذاکرات میں مسلم کانفرنس کی نمائندگی کے لئے نامزد کیا۔ لبریشن لیگ کے صدر کے ایچ خورشید صاحب بھی کراچی میں تھے۔ میں نے اتحاد کے سلسلے میں ان کی رضامندی بھی حاصل کی انہوں نے راولپنڈی کے خواجہ منظور الحق ڈا . اور گجرات کے مرزا منیر حسین کو لبریشن لیگ کی نمائندگی کے لئے نامزد کیا۔ میں لاہور میں سردار محمد ابراہیم خان اور راولپنڈی میں میرواعظ محمد یوسف شاہ صاحب اور مولوی نورالدین صاحب سے بھی ملا۔ یہ تینوں اصحاب ان دنوں آزاد مسلم کانفرنس کے قیام کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ چنانچہ وہ ہمارے مذاکرات میں شریک نہ ہو سکے۔

5 ستمبر 1966ء کو مسلم کانفرنس کے خواجہ محمد علی کنول اور شیخ بشارت احمد لبریشن لیگ کے منظور الحق ڈار اور مرزا منیر حسین اور محاذ رائے شماری کے جی ایم لون ملک عبدالمجید اور میں ریکس ہوٹل راولپنڈی (جہاں میں ٹھہرا کرتا تھا) میں جمع ہوئے اور مذاکرات کی ابتداء ہوئی۔ محاذ رائے شماری کے میر عبدالعزیز اور نعیم اللہ قریشی نے بھی اجلاس میں بحیثیت مبصرین شرکت کی۔ مذاکرات 6 ستمبر کو بھی جاری رہے جس کے نتیجے میں ہم تین اصولوں پر متفق ہو گئے۔ یہ تین اصول یہ تھے۔

1۔ یہ کہ ریاست جموں کشمیر ایک ناقابل تقسیم سیاسی وحدت ہے۔

2۔ یہ کہ ریاست جموں کشمیر کے اقتدار اعلیٰ کے مالک صرف وہاں کے عوام ہیں اور وہی اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔

3۔ یہ کہ مندرجہ بالا اصولوں نمبر1 اور نمبر2 کے تحت مسئلہ کشمیر کے حل ہونے تک آزاد جموں کشمیر کی حکومت جمہوریت کے مسلمہ اصولوں کے مطابق نمائندہ ہونی چاہئے۔

تینوں تنظیموں کے نمائندے اس بات پر بھی متفق ہو گئے کہ ان اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تینوں تنظیمیں متحدہ طور پر جدوجہد کریں گی۔ دونوں امور سے متعلق دستاویز پر مسلم کانفرنس کی طرف سے بشارت احمد شیخ نے لبریشن لیگ کی طرف سے خواجہ منظور الحق ڈار نے اور محاذ رائے شماری کی طرف سے میں نے دستخط کئے۔ ان مذاکرات کے ابتدائی دو دن کے بعد ہم تین ہی آپس میں ملتے رہے۔ دستاویز پر تینوں سربراہوں کے دستخطوں کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ اس دستاویز کا متن ایک اعلامیہ کے طور پر ذرائع ابلاغ کو بھیجا جائے اور یہ فیصلہ بھی ہوا کہ اس سلسلے میں ہم خود بھی اخباروں کے ایڈیٹروں سے ملیں۔ نزدیک ترین اخبار کوہستان تھا جب ہم اس کے ایڈیٹر سے ملے تو انہوں نے ہمیں بتایا کہ اس معاہدے کی مذمت میں مسلم کانفرنس کے چند کارکنوں کا مشترکہ بیان پہلے ہی ان تک پہنچا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن اخبارات میں ہمارے اعلامیہ کے علاوہ مسلم کانفرنسی کارکنوں (خواجہ غلام رسول بیگ، خواجہ عبدالصمد وانی وغیرہ) کا بیان بھی شائع ہوا جس میں ان تین اصولوں کو جن پر یہ اتحاد ہوا تھا۔ مسلم کانفرنس کے

بنیادی نظریات سے متصادم قرار دے کر اس اتحاد کی مذمت کی گئی تھی - اس کے ساتھ ہی مسلم کانفرنس کے اسی حلقے نے خوب پروپیگنڈہ شروع کیا کہ امان اللہ خان نے مسلم کانفرنس اور لبریشن لیگ کے لیڈروں اور نمائندوں کو بے وقوف بنا کر ان سے محاذ رائے شماری کے نظریات پر مبنی دستاویز پر دستخط لئے ہیں - کچھ مدت کے بعد ہونے والے مسلم کانفرنس کے مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس میں بھی اس اتحاد کے سلسلے میں گرما گرم بحث ہوئی - چوہدری غلام عباس صاحب نے معاہدے کی ڈٹ کر مخالفت کی البتہ سردار عبدالقیوم نے یہ کہہ کر اس کی مذمت کرنے سے انکار کیا کہ انہوں نے دستاویز پر دستخط کئے ہیں بہر حال مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا کہ اس اتحاد کی کھل کر مذمت نہ کی جائے البتہ اس پر عمل بھی نہ کیا جائے - اس طرح مسلم کانفرنس والوں کے اس رویے کے نتیجے میں یہ اتحاد جنم لیتے ہی ختم ہو گیا - اس کے بعد اب تک کشمیری تنظیموں کے یکے بعد دیگرے کئی اتحاد (اربعہ و ثلاثہ) ہوئے اور اپنے مقصد حاصل کئے بغیر یا کچھ مقاصد حاصل کرنے کے بعد ختم ہوتے رہے - البتہ 1966ء کی اس ناکامی کے بعد میری محاذ رائے شماری سے وابستگی کے دوران ہم کسی اتحاد میں شامل نہیں ہوئے -

محاذ میں اندرونی انتشار

ستمبر 1966ء میں مقبول احمد بٹ کی مقبوضہ کشمیر میں گرفتاری کے بعد محاذ رائے شماری کا اندرونی انتشار کھل کر سامنے آگیا (تفصیلات این ایل ایف سے متعلق باب میں ضرور پڑھئے) اور اس کے دو واضح گروپ بن گئے - این ایل ایف گروپ کی قیادت میں کر رہا تھا اور این-ایل-ایف مخالف گروپ کی قیادت میر عبدالعزیز کر رہے تھے - عبدالخالق انصاری صاحب سمیت میرپور کے اکثر ساتھی ابتداء میں میر عبدالعزیز کا بھرپور ساتھ دیتے رہے لیکن ایک سال بعد ہمارے ہمنوا ہو گئے - 1968ء میں میر عبدالعزیز کو محاذ رائے شماری سے خارج کیا گیا (بقول میر صاحب انہوں نے خود ہی محاذ کو چھوڑ دیا) اور انہوں نے چوہدری شریف طارق ایڈووکیٹ سے مل کر متوازی محاذ رائے شماری قائم کیا جو چند سال ہی قائم رہا اور وہ بھی میر صاحب کے ہفت روزہ انصاف کے کالموں کی حد تک - 1966ء سے ہی میر صاحب نے انصاف کے کالموں کے ذریعہ میرے خلاف زہر اگلنا شروع کیا تھا جو کئی سال تک جاری رہا - غالباً 1973ء میں میری پیر مقبول صاحب گیلانی کے ہاں اچانک میر صاحب سے ملاقات ہو گئی اور لمبی گلہ گزاریوں کے بعد ہماری صلح ہو گئی - جس کے بعد انہوں نے میرے خلاف مہم بند کر دی - یہی نہیں بلکہ میرے قیام برطانیہ خاص کر وہاں میری اسیری کے دوران اور برطانیہ بدری کے بعد وہ انصاف میں ہمیں خاصی کوریج دیتے رہے اور اب تک دے رہے ہیں -

ستمبر 1966ء سے 1968ء کے اواخر تک محاذ رائے شماری مجموعی طور پر غیر متحرک رہا۔ جس کی بنیادی وجہ اندرونی اختلافات تھے۔ البتہ 1968ء میں اس کا کونشن (میرپور میں) ہوا۔ میں نے اس کونشن میں پیش کرنے اور اس سے منظور کرانے کے لئے بڑی محنت اور سوچ بچار کے بعد ایک دس نکاتی قرطاس ابیض (White Paper) کا مسودہ تیار کیا تھا جس میں مسئلہ کشمیر کی اصل نوعیت اور اس کے حل۔ اس کے مختلف پہلوؤں اور تحریک آزادی سے متعلق کشمیریوں کے فرائض کے بارے میں محاذ کے نظریات درج کئے گئے تھے۔ ان دس نکات میں سب سے اہم نکتہ پوری ریاست جموں کشمیر کی مکمل خود مختاری کا واضح مطالبہ تھا۔ جنرل کونسل کے اجلاس سے پہلے میں نے ساری دستاویز کو مجلس عاملہ سے اصولی طور پر منظور کرایا تھا۔ مگر اسے آئینی حیثیت دینے کے لئے جنرل کونسل کی طرف سے ان کی منظوری ضروری تھی لیکن جنرل کونسل کے اجلاس میں اس کی اہم ترین دفعہ (ریاست کی مکمل خود مختاری سے متعلق) پر بحث کے دوران سیالکوٹ کے چوہدری پرویز ایڈووکیٹ نے اجلاس کے شرکاء کو اس موضوع پر کہ آیا اقتدار اعلیٰ کے مالک عوام ہوتے ہیں یا حکام ایک وکیلانہ بحث میں الجھا دیا۔ جب بحث طول پکڑ گئی تو صدر اجلاس عبدالخالق انصاری صاحب نے اچانک قرطاس ابیض کی اس مد کو ہی دستاویز سے خارج کرتے ہوئے اجلاس کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ اس طرح یہ مد جس کے لئے میں نے قرطاس ابیض تیار کیا تھا۔ اس میں شامل نہ ہو سکی اور محاذ غیر محدود غیر مشروط رائے شماری کی آوٹ ڈیٹڈ (Out-dated) اصطلاح کو ہی اپنے نظریئے کی بنیاد بنائے رہا۔

اس کونشن میں عبدالخالق انصاری کو ایک بار پھر تنظیم کا صدر اور مجھے سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ ہمارا اگلا کونشن نومبر 1969ء میں مظفر آباد میں ہوا۔ مقبول احمد بٹ دسمبر 1968ء میں سرینگر جیل سے فرار ہو کر آزاد کشمیر پہنچے اور وہاں گرفتار ہونے کے بعد مارچ 1969ء میں رہا ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی اس کونشن میں شرکت کی۔ میں نے اس کونشن میں شرکت کے لئے پاکستان میں فلسطین کی اہم ترین تنظیم الفتح کے نمائندے خالد شیخ اور ان کے کچھ طالب علم ساتھیوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ خالد شیخ سے کراچی میں میرے گہرے ذاتی مراسم تھے۔ وہ ہمارے کونشن میں شرکت کے لئے کراچی سے راولپنڈی پہنچے لیکن حکومت پاکستان نے انہیں مظفر آباد آنے کی اجازت نہیں دی جس کی اطلاع انہوں نے مجھے بذریعہ تار دیدی۔ اس سے پہلے میں ان کے دو ساتھیوں کو مظفر آباد پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کونشن سے ایک دن پہلے مظفر آباد میں افواہ پھیلی کہ ان دو فلسطینیوں کو گرفتار کر کے آزاد کشمیر بدر کیا جا رہا ہے۔ میں اس ہال کے سامنے جہاں کونشن ہونے والا تھا انتظامات کا جائزہ لے رہا تھا کہ کالج کے کچھ طلباء میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ اگر فلسطینیوں کو گرفتار کیا گیا تو آپ کیا کریں گے میں نے ان سے مذاقاً" کہا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم قصر صدارت پر قبضہ کر کے انہیں رہا کر دیں گے

ان طلباء کے ساتھ کچھ دوسرے افراد بھی محاذ کے بیج لگائے کھڑے تھے - میں انہیں اپنے مندوبین سمجھا تھا بعد میں پتہ چلا کہ وہ انٹیلیجنس والے تھے اور انہوں نے اسی وقت قصر صدارت پر قبضہ کرنے کے مذاق کی رپورٹ چیف سیکرٹری کو دی تھی۔

دوسرے دن صبح سویرے میں یوسف زرگر کے ہاں سے (جہاں میں ٹھہرا تھا) میر ہدایت اللہ صاحب کے گھر کی طرف گیا جہاں فلسطینیوں کو ٹھہرایا گیا تھا - تاکہ دیکھ سکوں کہ آیا ان کی مناسب دیکھ بھال ہو رہی ہے یا نہیں - میں جب وہاں پہنچا تو مکان کے باہر سب جج عبدالصمد صاحب پولیس لے کر کھڑے تھے - میں نے اس سے ان کی وہاں موجودگی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے فلسطینیوں کے پاسپورٹ چیک کرنے ہیں - ان کے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ انہیں فلسطینیوں کو گرفتار کرنے بھیجا گیا ہے - میں نے انتہائی سنجیدگی سے ان پر واضح کیا کہ وہ ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی فلسطینیوں کو گرفتار کر سکتے ہیں - اس پر وہ خاصے پریشان ہو گئے اور کہنے لگے آپ چل کر اے آئی جی پولیس سے بات کریں - چنانچہ ہم اے آئی جی کے ہاں گئے جس نے مجھے جیپ میں بٹھا کر سیدھے چیف سیکرٹری کے ہاں پہنچا دیا۔ چیف سیکرٹری نے پہلے تو میری گذشتہ روز کی دھمکی (قصر صدارت پر قبضہ کرنے کی) کے بارے میں استفسار کیا - جس کا میں نے مناسب جواب دیا - پھر کہنے لگے آپ ان غیر ملکیوں کو حکومت کی اجازت کے بغیر یہاں کیوں لائے ہیں - میں نے کہا ان میں سے ایک حال ہی میں آزاد کشمیر میں ایک ہفتہ گزار کر گیا ہے آپ نے اس وقت اس کے یہاں قیام پر کوئی اعتراض نہیں کیا اب کیوں کر رہے ہیں - اس طرح چیف سیکرٹری کے ساتھ میری خاصی بحث ہوئی اور اسے اندازہ ہو گیا کہ فلسطینیوں کو گرفتار کر کے آزاد کشمیر بدر کرنا حکومت کو خاصا مہنگا پڑے گا - اس کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لئے دوسرے کمرے میں چلے گئے (غالباً کسی کو فون کرنے) اور واپس آ کر کہنے لگے کہ فلسطینیوں کو اس شرط پر آپ کے کنونشن میں شرکت کی اجازت دی جائے گی کہ وہ وہاں تقریریں نہ کریں - میں نے یہ شرط ماننے سے انکار کیا البتہ اس بارے میں یقین دہانی کرائی کہ اگر ہمیں اکسایا نہ گیا تو ہمارا جلسہ اور جلوس بالکل پرامن ہوں گے - چیف سیکرٹری کچھ سوچ میں پڑ گئے اور میں وہاں سے چلا آیا - بعد میں فلسطینیوں نے جلسے میں تقریریں بھی کیں۔ دراصل پاکستان کی وزارت امور کشمیر والے سمجھتے تھے کہ محاذ کے کنونشن میں فلسطینیوں کی موجودگی اور تقاریر سے آزاد کشمیر کے نوجوانوں میں جذبہ حریت ابھرے گا۔ جو کسی وقت بھی آزاد کشمیر اور مسئلہ کشمیر پر وزارت امور کشمیر کی اجارہ داری کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسلام آباد کی طرف سے ملنے والی ہدایت کے تحت ہی آزاد کشمیر گورنمنٹ نے فلسطینیوں کو گرفتار کر کے آزاد کشمیر بدر کرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن میرے سخت رویے اور رائے عامہ پر بھی اس کے منفی اثرات کے احتمال کے پیش نظر یہ حکم واپس لے لیا گیا۔

کنونشن میں مقبول احمد بٹ کو محاذ رائے شماری کا صدر میر عبدالمنان کو سیکرٹری جنرل اور مجھے چیئرمین پبلسٹی بورڈ منتخب کیا گیا - بٹ صاحب نے ہم سے مشورہ کئے بغیر ہی اپنی صدارتی تقریر میں این ایل ایف کو محاذ رائے شماری کا عسکری ونگ قرار دیا -

30 اکتوبر 1970ء کو آزاد کشمیر کے انتخابات ہونے تھے - محاذ رائے شماری نے ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا اور ساتھ ہی ہفتہ گلگت بلتستان منایا اور اس سلسلے میں آزاد کشمیر اور پاکستان میں جلسے کئے ' پریس کانفرنسیں کیں اور گلگت بلتستان کے عوام کو ان کے آئینی ' سیاسی ' قانونی اور معاشی حقوق دینے اور ان علاقوں کو آزاد کشمیر کے ساتھ ملانے کے مطالبات کرتے رہے - 29 اکتوبر کو عبدالخالق انصاری ' مقبول احمد بٹ ' میر عبدالمنان اور مجھ پر مشتمل محاذ کا ایک گروپ گلگت گیا تاکہ وہاں لوگوں کو ان علاقوں کے بارے میں اپنے مطالبات اور دیگر سرگرمیوں سے آگاہ کرے لیکن مقامی انتظامیہ نے ہمیں اسی رات جبرًا ایک جیپ میں بٹھا کر دوسرے دن قبائلی علاقے میں چھوڑ دیا - ہم نے اسی سفر کے دوران دوسرے دن ریڈیو پر آزاد کشمیر کی صدارت کے لئے سردار عبدالقیوم خان کے منتخب ہونے کی خبر سنی - ہمارے راولپنڈی پہنچنے کے چند دن بعد عبدالخالق انصاری صاحب کو ہفتہ گلگت بلتستان منائے جانے کے دوران ایبٹ آباد میں ایک "قابل اعتراض" تقریر کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا اور ایبٹ آباد کی ایک فوجی عدالت نے انہیں تین ماہ کی سزا سنا کر ہری پور جیل بھیج دیا۔

سردار عبدالقیوم خان نے مظفر آباد میں اپنی پہلی صدارتی تقریر کے دوران اعلان کیا کہ وہ خود مختار کشمیر کا نعرہ لگانے والوں اور مطالبہ کرنے والوں کو دریائے جہلم میں ڈبو دیں گے - یہ وہی سردار عبدالقیوم تھے جو اس سے کچھ ہی ماہ قبل ہمارے این ایل ایف اور اپنے المجاہد کے مابین اشتراک عمل کی تجویز پیش کرنے ہمارے پاس کراچی پہنچے تھے اور اس سلسلے میں ہونے والے مذاکرات میں انہوں نے ہمارے مطالبۂ خود مختاری کے حق کو پوری طرح تسلیم کیا تھا -بہرحال جب میں نے سردار صاحب کی تقریر اخبارات میں پڑھی تو اس بارے میں احباب سے مشورہ کرکے فیصلہ کیا کہ ہمیں بھی مظفر آباد میں ایک جلسۂ عام کر کے سردار صاحب کے اس چیلنج کا مردانہ وار جواب دینا چاہئے - ہم مظفر آباد پہنچے تو وہاں اکثر ساتھیوں اور ہمدردوں نے مشورہ دیا کہ ہم جلسے کا ارادہ ترک کریں لیکن ہم نے ایسا کرنے سے انکار کیا - دراصل اس سے کچھ دن قبل مسلم کانفرنس والوں نے ایک شرابی کے ذریعہ لبریشن لیگ اور آزاد کشمیر پیپلز پارٹی کے جلسے درہم برہم کرائے تھے - ہم نے کہا کچھ بھی ہو ہم جلسہ کریں گے - سچی بات تو یہ ہے کہ خود مجھے بھی خاصی فکر تھی لیکن اب یہ ہماری انا کا مسئلہ بن گیا تھا کیونکہ ہمارے جلسے کا اعلان پہلے ہی ہو چکا تھا - میں رات دیر سے کالج ہوسٹل گیا اور وہاں اپنے جلسے کے بارے میں طلباء سے تبادلہ خیال کیا - ان طلباء کی اکثریت گلگتیوں کی تھی طلباء نے مجھ سے کہا کہ آپ بے فکر ہو کر جلسے

کے انتظامات کریں - اگر کسی نے گڑ بڑ کرنے کی کوشش کی تو اس سے ہم اچھی طرح نپٹ لیں گے۔

دوسرے دن اپر اڈے پر جلسہ ہوا - ابتداء میں لوگ جلسہ گاہ میں آنے کی بجائے آس پاس کی گلیوں میں اور مکانات کی چھتوں پر کھڑے دیکھتے رہے - اسی دوران طلباء کی ایک بڑی تعداد جن میں اکثریت گلگت والوں کی تھی - گلگتی چوغے پہنے ہوئے جلسہ گاہ میں پہنچی اور پہلی قطار میں کرسیوں پر بیٹھ گئی - ہر ایک نے چوغے کے نیچے ہاکی چھپا رکھی تھی - آہستہ آہستہ لوگ بھی آ کر کرسیوں پر بیٹھنے لگے - تھوڑی دیر میں پہلوان نما وہ صاحب بھی آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے جس نے پیپلز پارٹی اور لبریشن لیگ کے جلسے خراب کئے تھے - میں نے ایک صاحب کو ان کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ اگر اس نے کوئی گڑ بڑ کی تو طلباء کی ہاکیاں اس کا کچومر نکال دیں گی - پہلوان جی نے ایک شان بے نیازی سے طلباء پر ایک نظر ڈالی - طلباء نے اسے ہاکیاں دکھائیں اور اشاروں اشاروں میں اسے اپنے ارادوں سے بھی آگاہ کیا تو پہلوان صاحب کا نشہ بھی جاتا رہا - چنانچہ وہ جلسے کے اختتام تک وہاں خاموش بیٹھا رہا - جلسے سے میرے علاوہ غلام مصطفےٰ علوی، جی ایم میر اور یوسف زرگر وغیرہ نے خطاب کیا - میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ جو شخص ہمیں جہلم میں ڈبونے کی کوشش کرے گا ہم اسے جہلم اور نیلم کے سنگم پر ڈبو دیں گے - بہر حال جلسہ بخیر و عافیت اختتام پذیر ہوا اور جو لوگ ہمارا تماشا دیکھنے آئے تھے وہ بھی ناامید ہو کر واپس چلے گئے - بقول شاعر

؎ تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے دیکھنے ہم بھی گئے پر تماشا نہ ہوا

نومبر 1970ء کے اواخر میں مقبول احمد بٹ، میر عبدالمنان، غلام مصطفےٰ علوی، جی ایم میر اور مجھ پر مشتمل ایک گروپ پھر گلگت گیا اور جاتے ہی ہم گلگت شہر میں جیپ پر لاؤڈ سپیکر لگا کر جگہ جگہ تقریریں کرتے رہے اور چند گھنٹے بعد پھر گرفتار ہو گئے - میرے ساتھیوں کو تو رات بھر گلگت سکاؤٹس کے کوارٹر گارڈ (حوالات) میں رکھ کر دوسری صبح جہاز سے راولپنڈی بھیج دیا گیا البتہ میرے خلاف بغاوت کا کیس درج کر کے مجھے جیل بھیج دیا گیا - جہاں سے پندرہ ماہ بعد رہائی ملی۔

مئی 1972ء میں گنگا کیس کے فیصلے کے بعد محاذ رائے شماری کے اندر مقبول بٹ کے خلاف جی ایم میر کی سرکردگی میں ایک گروپ خاص سرگرم ہو گیا تھا - چنانچہ بٹ صاحب نے محاذ رائے شماری کا کوئی عہدہ دوبارہ قبول نہ کرنے کا فیصلہ کیا - محاذ کا پانچواں کنونشن مئی 1974ء میں میرپور میں ہوا اس کی سب سے اہم بات اس میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی شرکت تھی جو اسی مقصد سے برطانیہ سے آئے تھے۔

اس دوران میں نے بھی فیصلہ کیا تھا کہ محاذ رائے شماری میں کوئی عہدہ لینے کی بجائے

اپنی پوری توجہ این ایل ایف کے معاملات پر مرکوز کروں گا ۔ کنونشن میں جنرل کونسل کے اجلاس کے دوران میرا نام پہلے محاذ کی مرکزی صدارت کے لئے اور پھر سیکرٹری جنرل کے عہدے کے لئے پیش ہوا لیکن میں نے انکار کیا اور اس سلسلے میں سٹیج پر مجموعی طور پر تقریباً ایک گھنٹے تک بحث و تکرار ہوتی رہی ۔ آخر میں ان عہدوں سے اپنے آپ کو الگ رکھنے کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور عبدالخالق انصاری صاحب صدر اور جی ایم میر سیکرٹری جنرل منتخب ہو گئے ۔ انتخابات ہو ہی رہے تھے کہ شدید طوفان آیا اور شامیانے اکھڑ گئے اور اسی افراتفری کے دوران اور میرے چیخنے چلانے کے باوجود مجھے متفقہ طور پر چیئرمین پبلسٹی بورڈ منتخب کیا گیا ۔ دوسرے دن جلسہ عام سے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے بھی خطاب کیا اور محاذ رائے شماری اور این ایل ایف کے نظریات کی پر زور حمایت کی ۔ ڈاکٹر فاروق نے محاذ رائے شماری کے نو منتخب عہدیداروں سے حلف وفاداری بھی لیا ۔ اس کے بعد انہوں نے مری، مظفر آباد، راولاکوٹ، سیالکوٹ اور لاہور میں بھی بڑے جلسوں سے خطاب کیا اور اپنی ہر تقریر میں ہمارے نظریات کی حمایت کی ۔ اس پورے دورے میں میں اور شہید مقبول بٹ ان کے ساتھ تھے۔

راولپنڈی میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے پاکستان کے صدر فضل الٰہی چوہدری اور وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو سے بھی ملاقات کی ۔ ان ملاقاتوں کے لئے جاتے ہوئے بھی میں ان کے ساتھ تھا ۔ صدر صاحب سے ملاقات تو بالکل سرسری اور رسمی سی تھی ۔ البتہ بھٹو صاحب سے ان کی ملاقات تفصیلی ہوئی ۔ بھٹو صاحب کے کہنے پر مجھے باہر ہی رکھا گیا ۔ بھٹو صاحب کے اقتدار میں آنے سے پہلے میری ان سے دوبار تفصیلی ملاقاتیں ہوئی تھیں ۔ ان ہی ملاقاتوں کے پس منظر کے پیش نظر غالباً" بھٹو صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ سے ان کی ملاقات کے دوران میں وہاں موجود رہوں ۔ بہرحال گھنٹہ بھر کی ملاقات کے بعد ڈاکٹر فاروق عبداللہ باہر آئے اور دوران سفر مجھے بتایا کہ بھٹو صاحب نے ان سے کہا کہ پاکستان اگلے تقریباً دس سال تک کشمیریوں کی کسی قسم کی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں اس لئے آپ لوگ (شیخ محمد عبداللہ وغیرہ) بھارت سے جو کچھ بھی ملے فی الحال لیں بعد میں دیکھا جائے گا ۔ یاد رہے کہ ان دنوں بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے ایلچی مسٹر پارتھا سارتھی اور شیخ صاحب کے ساتھی مرزا محمد افضل بیگ کے مابین کشمیر کے مستقبل کے بارے میں مذاکرات ہو رہے تھے جن کے نتیجے میں فروری 1975ء میں دہلی ایکارڈ ہوا جس کے تحت شیخ صاحب نے تحریک آزادیٔ کشمیر کو خیرباد کہہ کر پوری ریاست جموں کشمیر کو بھارت کا آئینی حصہ (اٹوٹ انگ) تسلیم کیا اور اس کے عوض بھارتی مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ کا عہدہ لیا۔ شیخ صاحب اور ساتھیوں کی طرف سے دہلی ایکارڈ پر دستخط کرنے کے پس منظر میں بھٹو صاحب کی ڈاکٹر فاروق سے بات چیت کا کتنا ہاتھ تھا ۔ اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔

دوران ملاقات بھٹو صاحب نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو یہ بھی بتایا تھا کہ اسی صبح آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم خان نے ان سے ملاقات کر کے ان سے اس بات پر سخت احتجاج کیا تھا کہ فاروق عبداللہ جیسے غدار کو پاکستان آنے کے لئے ویزا کیوں دیا گیا۔ بہر حال فاروق صاحب بھٹو صاحب سے اپنی ملاقات کو انتہائی کامیاب قرار دے رہے تھے اور بہت خوش تھے۔ انہوں نے متذکرہ بالا دو باتوں کے علاوہ اس ملاقات کی مزید تفصیلات نہیں بتائیں۔

ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ سردار عبدالقیوم سے نہ ملیں کیونکہ سردار صاحب نے ان کے خلاف بھٹو صاحب کے پاس بھی اور اخبارات کے ذریعہ بھی خوب زہر اگلا تھا لیکن سردار صاحب نے اپنی بھابھی پروفیسر زینب بٹ (جو سرینگر کی رہنے والی ہیں اور سردار صاحب کے بھائی سردار غفار خان کی اہلیہ ہیں) کے ذریعہ ہمیں ان سے ملنے پر مجبور کیا کیونکہ زینب بٹ نے راولپنڈی میں محمد صدیق بابا کی رہائش گاہ جہاں ڈاکٹر فاروق کا قیام تھا آ کر روتے ہوئے فاروق عبداللہ سے منتیں کیں کہ وہ سردار قیوم صاحب سے ضرور ملیں - چنانچہ فاروق عبداللہ نے زینب بٹ صاحبہ کو "طلاق سے بچانے" کے لئے سردار صاحب سے ملنے کا پروگرام بنایا اور پونچھ ہاؤس میں سردار صاحب سے ملے۔ میں اس ملاقات میں بھی ان کے ساتھ تھا - سردار صاحب نے ابتدا ہی میں کہا کہ میں نے بھٹو صاحب سے احتجاج کیا ہے کہ انہوں نے آپ کی آمد کی خبر ہمیں کیوں نہیں دی - کیونکہ ہم آپ کا یہاں پروقار استقبال کرنا چاہتے تھے - مسئلہ کشمیر پر گفتگو کرتے ہوئے سردار صاحب پاکستان کے حکمرانوں اور سیاستدانوں کے خلاف زہر اگلتے رہے اور کشمیریوں کی جملہ مشکلات کی ذمہ داری پاکستان کے ارباب اقتدار پر ڈالتے رہے اور میں انگشت بدنداں سردار صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے سوچتا رہا کہ سردار صاحب کے اس سارے طرز عمل کو کیا نام دیا جائے -

1973ء میں گنگا ہائی جیکنگ کیس کے فیصلے کے بعد محاذ رائے شماری ایک بار پھر اندرونی انتشار کا شکار ہو گیا تھا اور میر عبدالمنان وغیرہ سمیت ہمارے بہت سے اہم ساتھی غیر متحرک ہو گئے تھے۔ ادھر محاذ کی مرکزی مجلس عاملہ نے 1975ء کے آزاد کشمیر اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ جس اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا - اس میں میں شریک نہیں ہو سکا تھا - میں نے فیصلے کی خبر سن کر اس کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی لیکن میری آواز صدا بہ صحرا ہو گئی - چنانچہ مجھے پارٹی ڈسپلن کے تحت اس کے اس فیصلے کو تسلیم کرنا پڑا بلکہ جی ایم لون کے چیف پولنگ ایجنٹ کی حیثیت سے ریٹرننگ افسر کی جانبداری کے خلاف سخت احتجاج کرنے کی پاداش میں ایک گھنٹہ تک حراست میں بھی رہنا پڑا - بہر حال ان انتخابات میں مقبول بٹ جی ایم لون صوفی محمد زمان اور سردار رشید حسرت سمیت محاذ کے تمام امیدوار ہار گئے - گو اس ہار میں سب سے بڑا ہاتھ پیپلز پارٹی کے مشہور زمانہ "جھرلو" کا تھا۔ اس کے باوجود انتخابات میں شرکت سے محاذ کے امیج

کو بڑا دھچکہ لگا۔ محاذ کے بارے میں یہ عام تاثر کہ اسے اقتدار کی بجائے صرف تحریک آزادی سے دلچسپی ہے' بری طرح متاثر ہوا اور اس کی طاقت اور مقبولیت کے بارے میں بھی سابقہ تاثر مجروح ہوا اور ان ہی خدشات کے تحت میں نے انتخابات میں حصہ لینے کی پر زور مخالفت کی تھی۔

1975ء میں عبدالخالق انصاری صاحب اپنی آنکھوں کے علاج کے لئے برطانیہ چلے گئے جہاں ان کے دو سگے بھائیوں کے علاوہ بڑی تعداد میں دوسرے رشتہ دار بھی آباد ہیں - کچھ مدت کے بعد انہوں نے وہاں سے میرے اور جی ایم میر صاحب کے لئے ٹکٹ اور سپانسر شپ بھجوائے اور میں 20 جون 1976ء کو برطانیہ چلا گیا - جی ایم میر صاحب ویزا نہ ملنے کی وجہ سے نہ جا سکے - برطانیہ میں قیام کے چند ماہ کے اندر اندر میں نے محسوس کیا کہ اگر وہاں مناسب نام اور اغراض و مقاصد کی حامل کوئی تنظیم قائم کی جائے اور وہ متحرک رہے تو برطانیہ کو بیس (Base) بنا کر مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر دوبارہ اور ان کی اصل شکل میں اجاگر کیا جا سکتا ہے - چنانچہ میں نے محاذ رائے شماری برطانیہ (جو محاذ رائے شماری برائے آزاد کشمیر و پاکستان سے قریبی نظریاتی اور عملی تعلقات رکھنے کے باوجود آئینی طور پر ایک خود مختار تنظیم تھی) کو اپنا نام اور اغراض و مقاصد تبدیل کرنے پر آمادہ کیا اور مئی 1977ء میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری برطانیہ کا نام جموں کشمیر لبریشن فرنٹ میں تبدیل کر دیا گیا اور انقلابی نظریات اور اغراض و مقاصد پر مبنی اس کا نیا آئین بھی منظور ہوا جس میں لبریشن فرنٹ کو واضح طور پر ایک آزاد و خود مختار تنظیم قرار دیا گیا تھا - یہ ساری کارروائی جموں کشمیر محاذ رائے شماری برائے آزاد کشمیر و پاکستان کے صدر عبدالخالق انصاری صاحب کی موجودگی میں اور ان کی مرضی سے ہوئی بلکہ انہوں نے آئین پر ہونے والی بحث میں بھرپور حصہ لینے کے علاوہ لبریشن فرنٹ کے عہدیداروں سے حلف وفاداری بھی لیا اسی طرح جس طرح 1974ء میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے میرپور آزاد کشمیر میں انصاری صاحب سمیت محاذ رائے شماری کے عہدیداروں سے لیا تھا لیکن برطانیہ کے محاذ رائے شماری کو لبریشن فرنٹ میں تبدیل کرنے پر محاذ رائے شماری آزاد کشمیر' پاکستان والے خاص کر اس کے سیکرٹری جنرل جی ایم میر صاحب صرف میرے خلاف سیخ پا ہو گئے اور انہوں نے اس سلسلے میں مجھ سے تحریری جواب طلبی بھی کی۔

میں نے فروری 1978ء میں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کی رکنیت باقاعدہ طور پر حاصل کی اور اس کے ساتھ ہی مجھے فرنٹ کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا - اس طرح میرا محاذ رائے شماری برائے آزاد کشمیر و پاکستان سے آئینی رشتہ بھی ٹوٹ گیا کیونکہ لبریشن فرنٹ کے آئین کے تحت میں کسی دوسری کشمیری سیاسی پارٹی کا رکن نہیں رہ سکتا تھا - اس کے بعد محاذ سے میرے تعلقات کس نوعیت کے رہے۔ اس کی کچھ تفصیل لبریشن فرنٹ کے باب کے متعلقہ حصے میں درج ہے۔

میری جموں کشمیر محاذ رائے شماری برائے آزاد کشمیر و پاکستان سے مجموعی طور پر تقریباً تیرہ سال کی وابستگی (خاص کر ابتدائی دس سال) کے دوران اس میں میری کارکردگی اور بڑی حد تک حیثیت بھی اہم ترین نوعیت کی رہی - اس کے ابتدائی آئین اور قرار دادوں سے لے کر کتابچوں تک کے اکثر مسودے میں ہی تیار کرتا اور منظوری کے بعد شائع کراتا رہا - تنظیمی دورے بھی سب سے زیادہ میں کرتا تھا اور ان دوروں اور اجلاسوں کے لئے مجھے ہر تیسرے چوتھے مہینے کراچی سے آزاد کشمیر یا راولپنڈی جانا پڑتا تھا - جن پر ہونے والے اخراجات میں خود برداشت کرتا تھا - چنانچہ مالی طور پر بھی سب سے زیادہ بوجھ میں ہی اٹھاتا رہا - 1966ء کے اواخر سے 1968ء کے اواخر تک کے دو سال کے دوران تو کئی کئی ماہ کے کئی وقفے ایسے بھی گزرے جب میرے اخباری بیانات اور دورے محاذ رائے شماری کے وجود کا واحد ثبوت مہیا کرتے تھے اور سب سے اہم بات یہ کہ جس این ایل ایف نے بعد میں محاذ کے عسکری بازو کی حیثیت سے محاذ کو عوام خاص کر نوجوانوں میں مقبولیت عطا کی، میں اس کے بانیوں اور اہم ترین ممبروں میں سے تھا اور ابتداء میں این ایل ایف کے قیام کے جرم میں ہی محاذ کے اکثر ممبروں کے ہاتھوں بڑی چوٹیں کھا چکا تھا - بہر حال محاذ والے آج ان تمام حقائق کو پس پشت ڈال کر میری کردار کشی میں مصروف ہیں - اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ محاذ سے تعلق رکھنے والے بہت سے اصحاب (سب نہیں) کے اس انتہائی قابل افسوس طرز عمل سے قطع نظر محاذ سے میری طویل وابستگی بہت سی حسین یادوں کی بھی امین ہے۔

آزاد کشمیر ہائیکورٹ کا تاریخی فیصلہ

1969ء میں مقبوضہ کشمیر کے دو نوجوان الطاف خاں (جو اب اعظم انقلابی کے نام سے مشہور ہیں) اور محمد مقبول سیز فائر لائن عبور کر کے آزاد کشمیر پہنچے جہاں انہیں گرفتار کر کے مظفر آباد گوجرہ قلعے میں رکھا گیا۔ کئی ماہ بعد جب ہمیں اس کی اطلاع ملی تو ہم نے آزاد کشمیر ہائیکورٹ میں رٹ دائر کی۔ ہائی کورٹ نے اس رٹ پر یہ تاریخی فیصلہ دے کر دونوں کو رہا کر دیا کہ ریاست کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں آنا کوئی جرم نہیں۔

ساتواں باب

این ایل ایف

1957ء سے 1962ء تک الجزائر کی جنگ آزادی دنیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی اور الجزائر کے جیالوں نے حصول آزادی کے لئے اپنی مسلح جدوجہد کے دوران بہادری، جرات اور جذبہ قربانی کی اعلیٰ مثالیں پیش کر کے دنیا بھر کے آزادی پسندوں کے دل موہ لئے تھے۔ پاکستان میں الجزائر کی جلاوطن حکومت کے نمائندے جناب محمد کلو اور آزادی کے حصول کے بعد پاکستان میں الجزائر کے سفارتخانے کے اتاشی جناب نور الدین سے میرے خاصے مراسم تھے۔ ان لوگوں کی باتیں سن کر اور الجزائر کی تحریک آزادی سے متعلق لٹریچر پڑھ کر میرا یہ یقین ایمان کی حد تک پختہ ہو گیا کہ کشمیر کی آزادی مسلح جدوجہد کے بغیر کسی صورت میں بھی حاصل نہیں ہو سکتی چنانچہ جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے قیام کے سلسلے میں کم از کم میری کوششوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ حصول آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کا پروگرام مرتب کیا جائے۔

محاذ کی مرکزی مجلس عاملہ کا پہلا اجلاس 12 جولائی 1965ء کو میرپور میں ہونا تھا۔ چنانچہ میں کراچی سے ہی قصد کر کے گیا تھا کہ اس میں مسلح جدوجہد کے حق میں کوئی ٹھوس فیصلہ کرایا جائے۔ اجلاس سے ایک دن قبل میں نے اس سلسلے میں مقبول بٹ صاحب سے بات کی تو معلوم ہوا کہ وہ بھی انہی خطوط پر سوچ رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے مسلح جدوجہد کی تجویز مجلس عاملہ میں پیش کی لیکن تنظیم کے صدر عبدالخالق انصاری سمیت ممبروں کی اکثریت نے اس کی مخالفت کی اور اس بحث کے دوران تلخ فضا بھی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ناامید ہو کر میں نے تجویز ہی واپس لے لی۔ میں اس صورت حال سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ دوسرے دن یوم شہدائے کشمیر کے سلسلے میں ہونے والے جلسے کے فوراً بعد مقبول احمد بٹ کے ہمراہ راولپنڈی روانہ ہو گیا۔ دوران سفر ہم نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلح جدوجہد کی داعی ایک زیر زمین تنظیم بنانی چاہئے۔ میں راولپنڈی سے دوسرے دن پھر میرپور گیا اور انصاری صاحب سے تفصیلی بات کی لیکن انہیں اس سلسلے میں اپنا ہم خیال بنانے میں ناکام ہو کر واپس کراچی آ گیا۔

زیر زمین تنظیم بنانے کے فیصلے کے بعد میں نے بٹ صاحب سے کہا کہ وہ اس سلسلے میں

پشاور میں میجر امان اللہ سے بات کریں۔ میجر صاحب مقبوضہ کشمیر کے علاقہ ہائی ہامہ سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ فوج میں تھے اور برما میں جاپانیوں کے قیدی بننے کے بعد سبھاش چندر بوس کی انڈین نیشنل آرمی (آئی این اے) جو برصغیر کی آزادی کے لئے انگریزوں سے برسرپیکار تھی اور جسے جاپانیوں کی حمایت حاصل تھی میں شامل ہو کر گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کر چکے تھے - 1947ء میں انہوں نے آزاد کشمیر کے شمالی محاذ پر کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے اور جنگ بندی کے بعد وہ آزاد کشمیر ریگولر فورسز (اے کے آر ایف) میں شامل ہو کر 1964ء میں میجر کے عہدے سے ریٹائر ہو گئے تھے اور پشاور میں مقیم تھے۔ متذکرہ بالا اجلاس کے لئے میرپور جانے سے پہلے میں کسی ذاتی کام سے پشاور گیا تھا جہاں ایک ملاقات کے دوران میجر صاحب نے تجویز پیش کی تھی کہ ان کے فوجی خاص کر گوریلا جنگ کے تجربے اور ہمارے سیاسی تجربے کو ملا کر حصول آزادی کے لئے کوئی تنظیم بنائی جائے۔ میجر صاحب کی اس تجویز کے پیش نظر میں نے مقبول بٹ صاحب سے کہا کہ وہ میجر صاحب سے بات کریں۔

کراچی واپس آنے کے بعد میں نے میر عبدالقیوم صاحب سے بات کی تو وہ مجوزہ تنظیم میں شامل ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ جس کی اطلاع میں نے بٹ صاحب کو دے دی۔ 10 اگست کو مجھے بٹ صاحب کی طرف سے تار ملا کہ میں میر صاحب کو لے کر پشاور پہنچوں چنانچہ 12 کو میں اور میر صاحب پشاور پہنچ گئے۔ جہاں میجر امان اللہ کے گھر پر ہماری نشست ہوئی جو 13 اگست کی شام تک جاری رہی۔ جولائی میں حکومت پاکستان کی طرف سے مقبوضہ کشمیر میں خفیہ طور پر گوریلا کاروائیاں شروع ہوئی تھیں - اور 9 اگست کو منظر عام پر آئی تھیں۔ ہم نے اس صورت حال پر بھی تفصیل اور سنجیدگی سے غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان سرگرمیوں کی کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں۔ کیونکہ حکومت پاکستان نے اس سلسلے میں مقبوضہ کشمیر کی عام آبادی تو درکنار پاکستان نواز لیڈروں کو بھی اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ اس نتیجے کی روشنی میں ہم نے فیصلہ کیا ہمیں اپنی مجوزہ تنظیم قائم کرنی چاہیے۔ چنانچہ اسی اجلاس میں جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ (این ایل ایف) نام سے تنظیم قائم کی گئی۔ این ایل ایف کے اغراض و مقاصد کو صرف ایک جملے تک محدود رکھا یعنی "مسلح جدوجہد سمیت ہر قسم کی جدوجہد کے ذریعہ ریاست جموں کشمیر کے عوام کے لئے ایک ایسی حیثیت حاصل کرنا جس میں وہ اپنے مادر وطن کے واحد مالک کی حیثیت سے ریاست کے مستقبل کا تعین کر سکیں۔"

تنظیمی ڈھانچے کے بارے میں میری تجویز پر فیصلہ ہوا کہ این ایل ایف کا تنظیمی ڈھانچہ الجزائر کے ایف ایل این (جو فرانسیسی زبان میں این ایل ایف کا ہی متبادل ہے) کے طرز کا ہو یعنی اس کی مرکزی تنظیم عہدوں کی بجائے شعبوں یعنی (Wings) پر مشتمل ہو۔ چنانچہ ہم نے بھی این ایل ایف کو چار مرکزی شعبوں یعنی مسلح ونگ (جس کے سربراہ میجر امان اللہ مقرر

ہوئے) سیاسی ونگ (جس کا سربراہ مجھے بنایا گیا) مالی ونگ (سربراہ میر عبدالقیوم) رابطہ ونگ (سربراہ مقبول احمد بٹ) میں تقسیم کیا اور ان شعبوں کے سربراہوں پر مشتمل سینٹرل کمیٹی بنی۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ این ایل ایف کی رکنیت لینے والا ہر شخص اپنے خون سے ایک حلف نامے پر دستخط کرے کہ وہ این ایل ایف کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے اعلیٰ ترین جسمانی مالی یہاں تک کہ جانی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ این ایل ایف سے متعلق معاملات کے بارے میں پوری راز داری رکھے گا۔ چنانچہ ہم چاروں نے اپنے خون سے حلف ناموں پر دستخط کئے۔

اکتوبر 1965ء کے اواخر تک میں نے لاہور، سیالکوٹ، میرپور، راولپنڈی اور مظفر آباد کے خفیہ دورے کئے۔ جن کے نتیجے میں این ایل ایف کی خاصی رکنیت ہو گئی۔ نومبر میں کراچی میں سینٹرل کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس سے قبل مقبول احمد بٹ صاحب کی کوششوں سے جی ایم لون صاحب بھی ممبر بن چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی اجلاس میں شرکت کی۔ اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ این ایل ایف کے دو گروپ مقبوضہ کشمیر جائیں۔ ایک گروپ زیر زمین تنظیم کی رکن سازی کرے۔ اور دوسرا ان اراکین کو گوریلا جنگ کی تربیت دے۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ مقبوضہ کشمیر جانے والے سیاسی گروپ کی قیادت مقبول احمد بٹ اور مسلح گروپ کی قیادت میجر امان اللہ کریں گے۔

چند عملی مشکلات کی بناء پر یہ دو گروپ اوائل جون 1966ء تک مقبوضہ کشمیر نہ جا سکے۔ اس اثناء میں این ایل ایف میں مظفر آباد کے میر ہدایت اللہ صاحب (ڈیفنس سیکرٹری آزاد گورنمنٹ) غلام دین عشائی (ایس ڈی ایم) پیرزادہ غلام مصطفیٰ علوی، صوبیدار کالا خان اور صوبیدار حبیب اللہ، سیالکوٹ کے مجید امجد بٹ، کراچی کے محمد صدیق بابا اور پشاور میں زیر تعلیم گلگت کے اورنگ زیب کے علاوہ بہت سے اصحاب شامل ہو گئے تھے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ میر ہدایت اللہ صاحب، جی ڈی عشائی صاحب اور غلام مصطفیٰ علوی صاحب مقبوضہ کشمیر جانے والوں اور کراچی والوں کے مابین رابطہ کا کام کریں۔ صوبیدار کالا خان، صوبیدار حبیب اللہ بٹ اور اورنگ زیب مقبول بٹ صاحب اور میجر صاحب کے ساتھ مبتوضہ کشمیر جائیں، محمد صدیق بابا مقبول بٹ صاحب کی فیملی کو دو سو روپے ماہوار دیں۔ اور مجید امجد بٹ میرے نائب کی حیثیت سے کام کریں۔ 10 جون 1966ء کو دونوں گروپ دودنیال میں مقیم ہائی ہامہ کے ایوب خان کو ساتھ لے کر سیز فائر لائن پار کر گئے۔ میجر امان اللہ اور ساتھی سیز فائر لائن کے ساتھ ہی رہے جبکہ مقبول بٹ، کالا خان اور اورنگ زیب نے ڈھائی ماہ کے دوران سری نگر، سوپور، بارہ مولا بانڈی پورہ، اسلام آباد کے خفیہ دورے کر کے وہاں تنظیم کے زیر زمین سیل (Cell) قائم کئے۔ سنٹرل کمیٹی کے فیصلے کے مطابق دونوں گروپوں کو ابتدائی تنظیمی کام کے بعد آزاد کشمیر

واپس آنا تھا چنانچہ بٹ صاحب وغیرہ سرینگر سے آزاد کشمیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن راستے میں سوپور کے نزدیک بھارتی ملٹری انٹیلی جنس کا ایک انسپکٹر امرچند بٹ صاحب کے ساتھی اورنگ زیب یا غلام محمد ڈار کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ جس کی اطلاع دوسرے ہی دن بھارتی افواج کو مل گئی جس نے فوراً ہی ایک سو مربع میل رقبے کا محاصرہ کیا جسے تنگ کرتے کرتے آخر وہ اس مکان کا محاصرہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں جہاں بٹ صاحب وغیرہ روپوش تھے۔ فائرنگ کے تبادلے میں بہت سے بھارتی ہلاک ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اورنگ زیب شہید اور صوبیدار کالا خان زخمی ہو گئے۔ جس کے بعد مقبول بٹ اور میر احمد نے اپنے آپ کو بھارتی فوج کے حوالہ کر دیا۔ ادھر جب میجر امان اللہ کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو وہ اپنے ماموں عافیت خان اور دو اور رشتہ داروں یار محمد خان اور محمد یوسف کی مدد سے بھارتی فوج کا گھیرا توڑ کر آزاد کشمیر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ جہاں انہیں پاکستانی افواج نے گرفتار کیا اور چار ماہ بعد رہا کر دیا۔ ادھر بٹ صاحب کی گرفتاری کے بعد مقبوضہ کشمیر میں سینکڑوں افراد کو این ایل ایف کے ممبر یا ہمدرد ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور انہیں ایک سے چار سال تک پابند سلاسل رکھا گیا۔ ان لوگوں میں میرے بھانجے الطاف علی خان اور ان کے بہنوئی رستم علی خان اور سعید احمد گیلانی جو آجکل امریکہ میں ہیں بھی شامل تھے۔ بٹ صاحب وغیرہ پر بھارت کے خلاف بغاوت کرنے کشمیریوں کو بھارت کے خلاف بغاوت پر اکسانے اور امرچند کے قتل کے سلسلے میں کیس رجسٹر کیا گیا۔

ہم نے این ایل ایف کے قیام اور اس کی سرگرمیوں کو مکمل راز داری میں رکھا تھا چنانچہ جب مقبول بٹ صاحب اور ان کے ساتھیوں کی مقبوضہ کشمیر میں گرفتاری کی خبر ذرائع ابلاغ کے ذریعہ پھیل گئی تو دوسروں کی طرح محاذ رائے شماری والوں کے لئے بھی یہ خبر انتہائی حیران کن تھی۔ اور ان میں سے کچھ نے این ایل ایف اور اس کی سرگرمیوں کے خلاف اخبارات کے ذریعہ بیان بازی شروع کر دی۔ چنانچہ بٹ صاحب کی گرفتاری کے تقریباً دو ہفتے بعد یعنی اواخر ستمبر 1966ء میں ہونے والا محاذ رائے شماری کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس انتہائی ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ اجلاس میں این ایل ایف کے قیام اور مسلح جدوجہد کے نظریہ پر مجلس عاملہ دو واضح گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک کی قیادت میں کر رہا تھا اور دوسرے کی میر عبدالعزیز۔ کراچی اور سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے میرے ہمنوا تھے۔ جن کا موقف یہ تھا کہ این ایل ایف کا قیام تحریک آزادی کو انقلابی خطوط پر چلانے کے لئے عمل میں آیا ہے اور مسلح جدوجہد کا نظریہ محاذ کے اغراض و مقاصد کا حصہ ہے۔ جبکہ راولپنڈی، میرپور اور لاہور سے تعلق رکھنے والے ممبر این ایل ایف کے قیام کو غیر آئینی قرار دیتے تھے اور مسلح جدوجہد کے نظریئے کے بھی خلاف تھے۔ پہلے موضوع پر رائے شماری میں ہمیں شکست ہو گئی۔ چنانچہ این ایل ایف

کے قیام کو غیر آئینی قرار دے کر مجھ پر پابندی لگا دی گئی کہ میں آئندہ این ایل ایف کا نام تک نہ لوں۔ دوسرے موضوع یعنی مسلح جدوجہد پر رائے شماری دوپہر کے کھانے کے بعد ہوئی۔ اور اس اثناء میں ہم نے بڑی زبردست لابینگ (Lobbying) کر کے میرپور کے ملک عبدالمجید اور صوفی محمد زمان اور راولپنڈی کے غلام نبی گلکار صاحب کو اپنا ہمنوا بنایا تھا۔ چنانچہ دوسری رائے شماری میں ہمیں مخالفین کی نسبت دو ووٹ زیادہ ملے چنانچہ بڑے پاپڑ بیلنے کے بعد ہم مسلح جدوجہد کے نظریئے کو محاذ کے اغراض و مقاصد میں واضح طور پر شامل کرا سکے لیکن این ایل ایف کو غیر آئینی قرار دے کر اس پر پابندی لگائی گئی۔

اس تاریخی معرکے میں جن لوگوں نے میرے استدلال کے حق میں بھرپور حصہ لیا۔ ان میں کراچی سے خواجہ غلام محمد لون اور میر عبدالقیوم اور سیالکوٹ سے مجید امجد بٹ اور مرزا امین بیگ سرفہرست تھے۔ جبکہ میرے استدلال کے خلاف بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں میں سرفہرست راولپنڈی سے میر عبدالعزیز اور اکرام اللہ جسوال، میرپور سے عبدالخالق انصاری لاہور سے سعید شاہ ناز کی تھے۔ اسی رات پولیس مجھے میرپور سے راولپنڈی لے گئی اور دوسری صبح وزارت داخلہ اور امور کشمیر کی کشمیر انٹیلی جنس کے سربراہ ملک حبیب اللہ کے سامنے پیش کر دیا۔ ملک حبیب اللہ نے این ایل ایف کے قیام اور اس کی سرگرمیوں کو پاکستان کے خلاف سازش قرار دیتے ہوئے مجھے مرعوب کرنے کی بڑی کوشش کی۔ بلکہ میز پر رکھے ہوئے ایذا رسانی کے آلات کی طرف بار بار اشارہ بھی کرتا رہا۔ لیکن میں نے مرعوب ہونے کی بجائے اس کے اوٹ پٹانگ سوالوں کے ڈٹ کر جواب دیئے۔ آخر میں اس نے ایک تحریری سوال نامہ مجھے تھما دیا۔ جس کے میں نے تفصیلی جواب لکھ کر اس کے حوالہ کر دیئے دوسرے دن جی ایم لون اور مجید امجد بٹ راولپنڈی آئے تو انہیں بھی ملک حبیب اللہ کے سامنے پیش کیا گیا اور انہوں نے بھی این ایل ایف کے قیام کو جذبہ حب الوطنی پر مبنی قرار دیا۔

چند دن بعد مجھے میر مقبول گیلانی مرحوم نے بتایا کہ ہمارے بیانات کے دوسرے دن ملک حبیب اللہ نے ان کے گھر آ کر انہیں بتایا کہ وہ اور حکومت پاکستان کے اکثر متعلقہ افسر کشمیری سیاسی کارکنوں خاص کر مقبوضہ کشمیر سے تعلق رکھنے والوں کو سیاسی بھکاریوں کا ایک ٹولہ سمجھتے تھے۔ لیکن مقبول بٹ، امان اللہ، جی ایم لون، میر عبدالقیوم اور مجید امجد بٹ جیسے اعلیٰ جذبہ حب الوطنی اور جذبہ ایثار و قربانی کے مالک لوگوں کی باتیں سن کر اور ان کی سرگرمیاں دیکھ کر مجھے انتہائی خوشگوار تعجب ہوا ہے، واقعی یہ لوگ بڑے محب وطن اور اعلیٰ جذبہ ایثار و قربانی کے مالک ہیں۔

مقبول بٹ صاحب اور ان کے ساتھیوں میر احمد اور صوبیدار کالا خان پر مقبوضہ کشمیر میں مقدمہ چلا اور اگست 1968ء میں مقبول بٹ اور میر احمد کو سزائے موت اور کالا خان کو عمر قید کی

سزا سنائی گئی۔ لیکن اس سزا پر عمل ہونے سے پہلے ہی مقبول بٹ میر احمد اور چوہدری یاسین جو (1965ء سے سری نگر جیل میں قید تھا) دسمبر 1968ء کے اواخر میں سرینگر جیل سے فرار ہو کر اور سولہ دن تک برف پوش پہاڑوں پر سے چل کر آزاد کشمیر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ جہاں انہیں پاکستانی افواج نے گرفتار کیا اور تین ماہ بعد محاذ رائے شماری اور این ایل ایف کی طرف سے حکومت پاکستان پر ڈالے جانے والے شدید دباؤ کے نتیجے میں رہا کر دیا۔

1966ء میں بٹ صاحب کی گرفتاری سے لے کر مارچ 1969ء میں ان کی رہائی تک این ایل ایف عجیب سے حالات سے دوچار رہا۔ ایک طرف محاذ رائے شماری نے این ایل ایف کو غیر آئینی قرار دے کر اس پا پابندی لگائی تھی اور این ایل ایف کے بارے میں بات کرنے پر بھی محاذ کی طرف سے مجھ سے تحریری باز پرس ہوئی تھی (لیکن ہم نے اس کے باوجود این ایل ایف کو کسی نہ کسی طرح زندہ رکھا تھا) اور دوسری طرف کچھ اختلافات کی وجہ سے میجر امان اللہ بھی عملاً ہم سے الگ ہو گئے تھے۔ ادھر اسی دوران راولپنڈی کے ڈاکٹر فاروق حیدر میر عبدالقیوم کی کوششوں سے این ایل ایف میں شامل ہو گئے تھے۔ بہرحال مقبول بٹ صاحب کے سری نگر جیل سے فرار کے بعد این ایل ایف آزاد کشمیر کے نوجوانوں میں بہت مقبول ہو گیا۔ چنانچہ محاذ رائے شماری والوں نے بھی (خاص کر مارچ 1968ء میں میر عبدالعزیز کی محاذ سے علیحدگی کے بعد) این ایل ایف کے خلاف سخت رویہ ترک کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ محاذ والوں نے نومبر 1969ء میں ہونے والے اپنے کنونشن میں (میری مرضی اور منشا کے خلاف) مقبول بٹ صاحب کو محاذ رائے شماری کا صدر منتخب کیا اور انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں (ہم سے مشورہ کئے بغیر) این ایل ایف کو محاذ رائے شماری کا عسکری بازو قرار دیا۔ جس سے ساری صورت حال ہی تبدیل ہو گئی۔ دراصل میں محاذ والوں کے سابقہ طرز عمل کے پیش نظر این ایل ایف کو محاذ سے الگ تھلگ رکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میر عبدالعزیز کی علیحدگی کے باوجود محاذ میں این ایل ایف کی آئیڈیالوجی کے مخالفین بڑی تعداد میں موجود تھے اور انہوں نے وقتی مصلحتوں کے تحت ہی این ایل ایف مخالف سرگرمیوں میں کمی کر دی تھی۔ چنانچہ مقبول بٹ اور اپنے بارے میں بھی میرا یہی خیال تھا کہ ہمیں محاذ میں کوئی اہم ذمہ داری قبول کرنے کی بجائے اپنی زیادہ تر توجہ این ایل ایف پر صرف کرنی چاہئے اور این ایل ایف کو محاذ رائے شماری کے کنٹرول میں نہیں دینا چاہئے۔ لیکن بٹ صاحب اس ساری صورت حال سے خاصی حد تک بے خبر تھے۔ چنانچہ انہوں نے این ایل ایف کو محاذ کے کنٹرول میں دے دیا۔ جس کے بڑے سنگین نتائج نکلے اور آخر سات سال بعد این ایل ایف محاذ رائے شماری کے ہاتھوں زندہ دفن ہو گیا۔

حکومت پاکستان کی طرف سے وارننگ

1970ء کے اوائل یا وسط میں ایک دن کراچی پولیس کے سیاسی شعبے کے نائب سربراہ مسٹر ارشد حسین نے مجھے فون کر کے کہا کہ انہیں ہم لوگوں سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ اس لئے میں دوسرے دن جی ایم لون - میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان اور مقبول بٹ کو ساتھ لے کر ان کے دفتر جاؤں، میں نے ان سے کہا کہ مقبول بٹ صاحب پشاور میں ہوتے ہیں۔ بہرحال دوسرے دن جی ایم لون، میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان اور میں ارشد حسین کے دفتر گئے۔ انہوں نے ہمارا پرتپاک استقبال کرنے اور چائے پلانے کے بعد کہا کہ انہوں نے ہمیں ایک انتہائی تکلیف دہ فرض کی ادائیگی کے سلسلے میں دفتر آنے کی تکلیف دی ہے (ارشد حسین ہماری حب الوطنی کے پوری طرح قائل تھے) اس کے بعد انہوں نے ایک فائل سے ایک ٹائپ شدہ کاغذ نکال کر مجھے تھما دیا اور پڑھ کر دوسروں کو سنانے کے لئے بھی کہا۔ یہ حکومت پاکستان کا ایک حکمنامہ تھا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ امان اللہ خان، مقبول بٹ، جی ایم لون، میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان اور ان کے ساتھیوں پر مشتمل ایک گروہ حکومت پاکستان سے اجازت لئے بغیر ہی بھارتی مقبوضہ کشمیر کو بھارت سے آزاد کرانے کے لئے مسلح جدوجہد کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ جس کو حکومت پاکستان برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لئے اس گروہ کو تنبیہہ کی جائے کہ وہ ان سرگرمیوں سے باز آئے ورنہ گروہ کے تمام سرغنوں (Ring Leaders) کو گرفتار کیا جائے گا۔

میں نے یہ حکمنامہ پڑھ کر سنایا اور ارشد صاحب سے کہا کہ ہمیں آپ کی طرف سے پیغام مل گیا۔ یہ پیغام ہم تک پہنچانا آپ کا منصبی فرض تھا جو آپ نے ادا کیا۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اس حکم یا تنبیہہ پر عمل کرتے ہیں یا نہیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جدوجہد آزادی میں مصروف افراد اور تنظیموں کے لئے اس قسم کے حکمنامے جاری ہونا کوئی نئی بات نہیں اگر یہ تنظیمیں ایسے حکمناموں پر عمل کرتیں تو شاید آج دنیا کی کوئی قوم آزاد نہ ہوتی۔ بہرحال خط کی عبارت ہمارے لئے اس لئے زیادہ تکلیف دہ ہے کہ حکومت پاکستان یہ بات تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ ہماری جدوجہد کشمیر کی آزادی کے لئے ہے اور بھارت کے خلاف ہے ہمیں اس قسم کی وارننگ دیتی ہے۔ جی ایم لون اور میر عبدالمنان صاحب نے بھی اسی قسم کے تبصرے کئے اور ہم وہاں سے نکل آئے۔ پاکستان کی افسر شاہی کا یہ حکم نامہ اصل میں پاکستان کی جملہ حکومتوں کے کشمیر کے بارے میں کئے جانے والے بلند بانگ دعوؤں اور اعلانات کے پردے کے پیچھے چھپے ہوئے ان کے اصل چہرے دکھا رہا تھا۔

سردار عبدالقیوم کی پیشکش

1970ء ہی کی بات ہے کہ ایک دن ہفت روزہ "قائد" مظفر آباد کے ایڈیٹر جی ایم مفتی جو اس زمانے میں مسلم کانفرنس کے ایک انتہائی سرگرم رکن تھے۔ کراچی میں میرے دفتر آئے اور مجھ سے کہا کہ سردار عبدالقیوم صاحب کراچی آئے ہیں اور وہ این ایل ایف کی لیڈر شپ سے ایک انتہائی اہم موضوع پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ میرے اصرار پر انہوں نے اشارتاً کہا کہ سردار صاحب غالباً این ایل ایف اور المجاہد کے مابین اشتراک عمل کی تجویز لے کر آئے ہیں۔ سردار صاحب نے المجاہد نام سے ایک تنظیم بنائی تھی اور خوب پبلسٹی کر رہے تھے کہ یہ تنظیم جہاد کے ذریعہ مقبوضہ کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے بنائی ہے۔ راولپنڈی میں ایک عالی شان عمارت میں اس کا صدر دفتر بنا لیا گیا تھا اور پاکستان بھر میں اس کے پبلسٹی آفس تھے۔ مولانا عبدالباری اس کے مرکزی خزانچی تھے اور سردار عبدالقیوم صاحب کے بھائی سردار عبدالغفار اس کے کمانڈر انچیف۔

میں نے مفتی صاحب کے پیغام کے بارے میں احباب سے فون پر مشورہ کیا اور دوسرے دن ہم میر عبدالقیوم صاحب کے دفتر میں جمع ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں سردار عبدالقیوم صاحب بھی مفتی صاحب کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گئے۔ سردار صاحب نے این ایل ایف اور الجاھد کے مابین اشتراک عمل کی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ اس حقیقت کو تسلیم کریں گے کہ آزاد کشمیر میں آپ لوگوں کی نسبت میرا اثر رسوخ کہیں زیادہ ہے اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ مقبوضہ کشمیر میں آپ لوگوں کے رابطے (Contacts) میری نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ اس لئے کیوں نہ ہم ایک دوسرے سے تعاون کریں تاکہ دونوں کے اثر و رسوخ سے زیادہ سے زیادہ اور اجتماعی استفادہ کیا جا سکے۔ میں نے کہا سردار صاحب! ہماری منزلیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اتحاد کیسے اور کس مقصد کے لئے ہو سکتا ہے اور دوسری بات یہ کہ مسلح جدوجہد کی داعی تنظیموں کے لئے راز داری دشمن کے خلاف ان کا موثر ترین ہتھیار ہوتا ہے۔ کیونکہ ابتدا میں اپنے وجود کو اور بعد میں اپنے منصوبوں اور پروگراموں کو راز میں رکھ کر ہی وہ اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن پر کامیاب وار کر سکتی ہیں جبکہ آپ اپنے المجاہد کی پبلسٹی شہر شہر گاؤں گاؤں کر رہے ہیں۔ آپ کا یہ طرز عمل تو گوریلا جنگ کے بنیادی اصولوں ہی کے خلاف ہے۔ سردار صاحب نے کہا بھارت دشمنی این ایل ایف اور المجاہد کی قدر مشترک ہے اس لئے بھارت کو کشمیر سے نکالنے کے سنگ میل تک ہم ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔ جس میں دونوں کا مفاد ہے۔ اس کے بعد آپ لوگ اپنی منزل یعنی پوری ریاست کی مکمل خود مختاری کے لئے جدوجہد کریں اور ہم اپنی منزل یعنی الحاق پاکستان کے لئے۔ جہاں تک المجاہد کی پبلسٹی کا تعلق

ہے۔ میں اہل پاکستان کو اعتماد میں لینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس تبادلہ خیال کے دوران سردار صاحب نے یہ تاثر واضح طور پر دیا کہ ان کی نظر میں ریاست کی خود مختاری کا مطالبہ کرنا کوئی جرم نہیں۔

بہرحال خاصے بحث مباحثے کے بعد (جس میں جی ایم لون اور میر عبدالمنان نے بھی بھرپور حصہ لیا اور میر قیوم صاحب بھی کبھی کبھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے) فیصلہ ہوا کہ سردار صاحب اس موضوع پر راولپنڈی میں مقبول بٹ اور ڈاکٹر فاروق حیدر سے مزید بات چیت کریں چنانچہ سردار صاحب اور بٹ صاحب کے مابین مذاکرات کے کئی راؤنڈ ہوئے لیکن سردار صاحب کی تجویز کے عملی پہلوؤں پر اتفاق رائے نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔

بھارتی جہاز گنگا کا اغواء

ساتویں دہائی کے دوران دنیا کی اہم تحریک آزادی خاص کر فلسطینیوں نے عالمی رائے عامہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے دشمن کے ہوائی جہاز اغوا کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ چنانچہ ہم بھی انہی خطوط پر سوچنے لگے۔ کیونکہ بھارت اور پاکستان کی حکومتیں ہماری سرگرمیوں کو بلیک آؤٹ کر رہی تھیں چنانچہ دنیا ہماری تحریک اور مطالبات سے بالکل بے خبر تھی۔ لیکن کچھ عملی مشکلات ہمارے راستے میں حائل تھیں اور ان میں سے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس بھارت یا مقبوضہ کشمیر میں مقیم اور مناسب جرات و جذبہ قربانی کا حامل کوئی شخص نہیں تھا۔ جو انڈین ایئر لائن کی کسی اندرون ملک پرواز کے دوران جہاز کو اغوا کرتا۔ کسی بین الاقوامی پرواز کے دوران جہاز کو اغوا کرنا ہمارے لئے خاصا مشکل تھا۔ ہم اس سلسلے میں مناسب شخص کی تلاش میں تھے کہ 1969ء کے اواخر یا 1970ء کے اوائل میں اپنی بہن کی شادی کے سلسلے میں پشاور آئے ہوئے سری نگر کے ہاشم قریشی کی ملاقات مقبول بٹ سے ہوئی۔ بٹ صاحب نے اور میں نے ہاشم کو مختلف طریقوں سے پرکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس سے کوئی بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ایسے بڑے کاموں کے لئے ضروری بنیادی خوبی یعنی جرات و بہادری کا حامل تھا۔ اس نے خود بھی این ایل ایف میں شامل ہونے اور اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کی شدید خواہش کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ اس کی سرینگر واپسی سے پہلے ہم نے اسے این ایل ایف کی آئیڈیالوجی اور طریقہ کار کے بارے میں مناسب تربیت دی اور ساتھ ہی سرینگر میں این ایل ایف کی خفیہ طور پر ممبر شپ کرنے کی ہدایت بھی کی۔ کچھ مدت کے بعد وہ سیز فائر لائن عبور کر کے پھر راولپنڈی پہنچا اور خواہش ظاہر کی کہ اسے تحریک آزادی

کے سلسلے میں کوئی اہم کام سونپا جائے چنانچہ ڈاکٹر فاروق حیدر کے برادر نسبتی جمشید منٹو جن کا ہوابازی میں خاصا تجربہ تھا نے ہاشم کو ہوائی جہاز اغواء کرنے کی تربیت دی۔ جس کے بعد اسے مقبوضہ کشمیر میں بنے ہوئے این ایل ایف کے ممبروں کی مدد سے بھارتی ہوائی جہاز اغواء کرنے کی ہدایت اور مطلوبہ سامان دے کر مقبوضہ کشمیر واپس بھیج دیا گیا۔ لیکن سرحد عبور کرتے ہی اسے بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس نے گرفتار کر لیا۔ چنانچہ اگست 1970ء میں بھارت کا ہوائی جہاز اغواء کرانے کا ہمارا پروگرام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ نومبر 1970ء کے اواخر میں میں گلگت میں گرفتار ہو گیا۔ جنوری 1971ء کی گلگت کی عوامی تحریک کے دوران عوام نے جیل توڑ کر مجھے اور گلگت کے دوسرے قیدیوں کو رہا کرایا تھا۔ لیکن تین دن کے بعد ہم نے خود کو فوجی حکام کے حوالہ کیا تو ہمیں دوبارہ ڈسٹرکٹ جیل گلگت بھیجا گیا۔ جہاں ہمیں تقریباً ایک ماہ تک 24 گھنٹے دو دو کو ایک ہی ہتھکڑی میں باندھ کر رکھا گیا۔ اس دوران ہم باہر کی دنیا سے بالکل منقطع رہے۔

5 فروری 1971ء کو مجھے کسی طرح معلوم ہوا کہ کشمیری حریت پسندوں ہاشم قریشی اور اشرف قریشی نے 31 جنوری 1971ء کو بھارتی جہاز گنگا اغواء کر کے لاہور پہنچایا تھا۔ جہاں جہاز کی سواریاں تو بحفاظت واپس بھارت پہنچائی گئیں۔ لیکن جہاز کو جلا دیا گیا - یہ بھی معلوم ہوا کہ اغواء کنندگان کا اور این ایل ایف کے ممبروں خاص کر مقبول بٹ کا لاہور میں زبردست استقبال ہوا ہے۔ بعد ازاں ان سب کا آزاد کشمیر خاص کر میرپور اور مظفر آباد میں بھی شاہانہ استقبال ہوا اور میرپور کی فضائیں "آزادی کے تین نشان۔ ہاشم، اشرف اور امان" کے نعروں سے گونجتی رہیں۔ ہائی جیکنگ کے ہمارے اصل پروگرام کے مطابق جہاز اغواء ہونے کے بعد پریس اور دوسرے حلقوں کے ساتھ این ایل ایف کے ترجمان کے فرائض مجھے انجام دینے تھے۔ لیکن اس موقع پر میں لاہور سے سینکڑوں کلومیٹر دور گلگت میں پس دیوار زنداں تھا۔ 5 فروری کے بعد جیل میں ہم پر عائد پابندیاں بھی کچھ نرم کر دی گئی تھیں۔ چنانچہ میں نے پرانے اخبارات منگوا کر جہاز کے اغواء سے متعلق تمام خبریں پڑھیں جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ میری غیر حاضری کی وجہ سے مقبول بٹ پر کام کا سخت دباؤ ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ کچھ غیر متعلقہ لوگوں خاص کر پاکستان پیپلز پارٹی کے غیر ضروری طور پر جوشیلے کارکنوں نے انہیں گھیرے میں لے رکھا ہے اور وہ این ایل ایف اور محاذ رائے شماری کے کارکنوں سے خاصے دور ہو گئے ہیں۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ ان کے کچھ اخباری بیانات حالات کے تقاضوں کے منافی ہیں۔ ہاشم قریشی کے کچھ بیانات غیر ذمہ دارانہ معلوم ہوئے چنانچہ میں نے جیل سے بٹ صاحب کو ایک تفصیلی خط لکھا جس میں انہیں کچھ مشورے دیئے لیکن وہ خط ان تک پہنچا ہی نہیں۔

ادھر مارچ 1971ء میں ہی اخبارات کے ذریعہ مختلف حلقوں کی طرف سے ہائی جیکروں اور این ایل ایف کی حب الوطنی اور جہاز کے اغواء کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا

جانے لگا۔ جس کی ابتداء آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم نے کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سردار صاحب نے اغواء کے فوراً بعد ہاشم اور اشرف کو پیغام بھیجا تھا کہ اگر وہ یہ اعلان کریں کہ جہاز کو سردار صاحب کی تنظیم الجاہد نے اغواء کرایا ہے تو سردار صاحب انہیں ایک بڑی رقم دیں گے۔ لیکن ہاشم اور اشرف نے سردار صاحب کی اس پیشکش کو رد کر کے اپنے سابقہ اعلان کو دہرایا کہ جہاز کو این ایل ایف نے اغواء کرایا ہے چنانچہ سردار صاحب نے جہاز کے ہائی جیکروں اور این ایل ایف کے خلاف شکوک و شبہات کی ایک مہم شروع کی جس کی دوسرے حلقوں سے بھی تائید کرائی جاتی رہی۔ حالانکہ ہائی جیکنگ کے واقع کے فوراً بعد پاکستان کی ملٹری اور سول انٹیلیجنس ایجنسیوں نے تفصیلی تحقیق کے بعد رپورٹ دی تھی کہ جہاز کی ہائی جیکنگ این ایل ایف کا حب الوطنی پر مبنی اقدام تھا۔ جس کا واحد مقصد عالمی رائے عامہ کی توجہ مسئلہ کشمیر کی طرف مبذول کرانا تھا۔

دسمبر 1970ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کو زبردست اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ پورے پاکستان میں مجموعی طور پر عوامی لیگ کو اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ لیکن مرکز میں حکومت جمہوری اصولوں کے مطابق عوامی لیگ کے حوالے کرنے کے راستے میں ذوالفقار علی بھٹو اور صدر جنرل یحییٰ خان کے ذاتی اور گروہی مفادات حائل تھے چنانچہ مرکزی حکومت عوامی لیگ کو نہ دی گئی جس کے نتیجے میں شیخ مجیب الرحمٰن مسٹر بھٹو اور جنرل یحییٰ خان کے مابین تعلقات انتہائی تلخ ہو گئے۔ ادھر گنگا کے اغواء کے بارے میں بھی شیخ مجیب الرحمٰن اور بھٹو صاحب کے موقف میں بڑا فرق تھا۔ بھٹو صاحب نے اس کی پرزور حمایت کی تھی۔ جس پر شیخ مجیب نے بھٹو صاحب پر الزام لگایا کہ جہاز کا اغواء بھٹو نے کروایا ہے تاکہ مرکز میں اقتدار عوامی لیگ کے حوالے نہ کرنے کے لئے ہنگامی صورت حال کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ جنرل یحییٰ خان کا ذاتی مفاد اسی میں تھا کہ مجیب الرحمٰن اور بھٹو صاحب کے مابین خلیج اور بھی وسیع ہو۔ چنانچہ اس نے ان اختلافات کو مزید بڑھانے کے لئے اقدامات کئے اور پاکستان کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی طرف سے جہاز کے اغواء کو حب الوطنی پر مبنی اقدام اور این ایل ایف کو محب وطن اور حریت پسند تنظیم قرار دیئے جانے کے باوجود کراچی ہائی کورٹ کے ایک جج نورالعارفین پر مشتمل ایک یک نفری تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جس نے سرسری سی تحقیقات کے بعد (یحییٰ خان کی منشاء کے عین مطابق) جہاز کے اغواء کو بھارتی سازش اور این ایل ایف کو بھارتی مفادات کے لئے کام کرنے والی تنظیم قرار دیا۔ اس رپورٹ کے منظر عام پر آنے سے پہلے ہی ہائی جیکروں اور مقبول بٹ سمیت این ایل ایف اور محاذ رائے شماری کے سینکڑوں ممبروں کو گرفتار کیا گیا اور ان سے بھارت کے لئے کام کرنے کے اقراری بیانات حاصل کرنے کے مقصد سے ان پر شاہی قلعہ

لاہور، دولائی کیمپ مظفر آباد اور دوسرے عقوبت خانوں میں انسانیت سوز جسمانی اور ذہنی اذیتیں دی جاتی رہیں۔ یہ سلسلہ ان کی اپریل 1971ء کے اوائل میں ہونے والی گرفتاریوں سے لے کر دسمبر 1971ء تک جاری رہا۔ جب حکومت پاکستان بین الاقوامی حلقوں سے پڑنے والے دباؤ کے تحت ان گرفتار شدگان پر عدالت میں مقدمہ چلانے پر مجبور ہو گئی اور یہ مقدمہ چلانے کے لئے سپریم کورٹ کے جج جسٹس یعقوب علی خان اور سندھ ہائی کورٹ کے جج عبدالقادر شیخ پر مشتمل ایک خصوصی عدالت قائم کی گئی اس کے اختیارات بھی محدود تھے اور ملزموں سے بھی ان کے بہت سے قانونی حقوق چھینے گئے تھے۔ استغاثہ نے ابتداء میں تقریباً ڈیڑھ سو افراد پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا تھا جس میں تخفیف ہوتی رہی اور آخر دسمبر میں صرف چھ افراد یعنی ہائی جیکروں ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کے علاوہ مقبول احمد بٹ، غلام محمد لون، میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان پر مقدمہ شروع ہوا اور دوسروں کو بغیر مقدمہ چلائے جیلوں اور تفتیشی مرکزوں میں رکھا گیا۔ میرا نام بھی ملزموں کی فہرست میں شامل تھا جسے آخری مرحلے پر اس سے نکال دیا گیا۔

میں فروری 1972ء کے آخری ہفتے میں گلگت جیل سے رہا ہو کر لاہور پہنچا۔ جہاں ہم نے اپنے ساتھیوں کے قانونی دفاع کے لئے ایک ڈیفنس کمیٹی بنائی۔ اپریل 1972ء میں عبدالخالق انصاری صاحب وغیرہ بھی رہا ہو گئے تو فیصلہ ہوا کہ انصاری صاحب ملزموں کی قانونی مدد کریں اور میں پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں اور صحافیوں سے مل کر انہیں اصل حقائق سے آگاہ کروں کیونکہ صدر یحییٰ خان کی ہدایات کے تحت پاکستان کے ذرائع ابلاغ نے جہاز کے اغواء کے مقصد، ہائی جیکروں، این ایل ایف اور محاذ رائے شماری کے ممبروں کے خلاف بے بنیاد اور انتہائی گھناؤنے الزامات کی وسیع تشہیر کی تھی۔ جس کے نتیجے میں پاکستان کی رائے عامہ ان سبھوں کی خون کی پیاسی ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں نے اسلام آباد جا کر مرکزی وزیروں، مولانا کوثر نیازی، معراج محمد خان، صدر بھٹو کے مشیر یوسف بچھ اور اپوزیشن کے لیڈروں خان عبدالولی خان، مولانا نورانی، مفتی محمود، رضا قصوری، جنیفر موسیٰ، غوث بخش بزنجو، پروفیسر غفور احمد، خیر بخش مری وغیرہ سے اور لاہور میں ملک معراج خالد اور مجید نظامی سے تفصیلی بات کر کے انہیں ہائی جیکنگ سے متعلق اصل حقائق اور کشمیری حریت پسندوں پر کئے جانے والے انسانیت سوز تشدد سے آگاہ کیا۔ میں راولپنڈی میں اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار سے بھی ملا۔ غوث بخش بزنجو نے قومی اسمبلی میں این ایل ایف کے ممبروں پر ہونے والے انسانیت سوز تشدد کی تفصیلات بیان کیں۔ میں نے اپنے دوست اور مرکزی وزیر مملکت معراج محمد خان کی وساطت سے ذوالفقار علی بھٹو (جو دسمبر 1971ء میں سقوط مشرقی پاکستان کے بعد باقی ماندہ پاکستان کے صدر بن گئے تھے) سے بھی ملنے کی کوشش کی لیکن بھٹو صاحب نے ملاقات دینے سے انکار کیا۔ ڈیفنس کمیٹی کے دفتر میں انصاری صاحب کے علاوہ میر ہدایت اللہ صاحب، پیرزادہ علوی صاحب، جی ایم میر، نسیم لون، مجید امجد

بٹ، غلام احمد بٹ، نصیر وانی، سعید شاہ نازکی وغیرہ کام کرتے رہے۔ ملزموں کی پیروی اعجاز بٹالوی، عابد حسن منٹو، دوست محمد اعوان اور ڈاکٹر عبدالباسط نے کی۔ کچھ مدت تک ایم انور بار ایٹ لاء بھی اس ٹیم سے منسلک رہے، ان وکلاء کو کچھ فیس حکومت کی طرف سے ملتی تھی اور باقی ملزم خود برداشت کرتے تھے۔ شہید مقبول بٹ کے وکیل کی بھاری فیس جی ایم لون کے بھائی غلام نبی لون نے برداشت کی۔ یہ فیس تقریباً چار سو روپے یومیہ کے حساب سے تھی۔ اور تقریباً ڈیڑھ سال جاری رہی۔ غلام نبی لون کا یہ جذبۂ ایثار و قربانی انتہائی قابل قدر ہے۔

پولیس نے ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب کو جسمانی اذیتیں دینے کے بعد سلطانی گواہ بنایا تھا اور انہوں نے (میری رہائی سے پہلے ہی) عدالت میں ملزموں کے خلاف اور استغاثہ کے حق میں بیان دیا تھا۔ میں نے لاہور پہنچنے اور ڈاکٹر صاحب کے بارے میں تفصیلات سننے کے بعد ایک فرضی نام سے جیل میں ان سے ملاقات کی اور انہیں ان کی فاش غلطی کا احساس دلایا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت اپنے طرز عمل پر خاصے نادم نظر آ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ کر خاصی دیر روئے اور میرے دلائل سننے کے بعد انہوں نے پوچھا کہ آیا کوئی ایسا راستہ ہے کہ وہ عدالت میں پیش ہوں اور اپنے سابقہ بیان سے منحرف ہو کر اصل حقائق بیان کریں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اس بارے میں وکیلوں سے مشورہ کرنے کے بعد مطلع کروں گا۔ وکلاء نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب دوبارہ عدالت میں پیش تو نہیں ہو سکتے۔ البتہ وہ عدالت کو تحریری طور پر اصل حقائق سے آگاہ کریں اور ان کا خط جیل حکام کی وساطت سے آئے تو ممکن ہے اس سے فیصلے پر کچھ اثر پڑے۔ میں دوسری بار ڈاکٹر صاحب کے انکم ٹیکس مشیر کے روپ میں اور باجی (ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ) کو ساتھ لے کر جیل گیا اور ڈاکٹر صاحب کو مناسب ہدایات دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے این ایل ایف اور ہائی جیکنگ کے بارے میں اصل حقائق اور ان حالات کی تفصیلات پر مشتمل جن کے تحت ان سے عدالت میں جھوٹا بیان دلوایا گیا تھا۔ خط لکھا اور جیل حکام کے ذریعے عابد حسن منٹو ایڈووکیٹ کو بھیج دیا۔ جنہوں نے اسے عدالت میں پیش کر کے عدالت سے کہا کہ خط کو سربمہر کر کے عدالت کے ریکارڈ میں رکھا جائے اور کیس کی سماعت کے مناسب مرحلے پر کھولا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور گواہوں کے بیانات اور وکلاء کے دلائل کے بعد اسے کھولا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خط کا ججوں پر خاصا نفسیاتی اثر پڑا۔

گنگا کیس میں استغاثہ کی طرف سے 1984ء گواہ اور صفائی کی طرف سے 1942ء گواہ پیش ہوئے۔ صفائی کے گواہوں میں آزاد کشمیر کے سابق صدر کے ایچ خورشید، میر مقبول گیلانی مرحوم، عبدالخالق انصاری، سردار رشید حسرت، غلام نقی صاحب اور میں بھی شامل تھے۔ میر ہدایت اللہ صاحب عدالتی گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے۔ حکومت کی طرف سے عدالت کے مطالبے پر پیش ہونے والوں میں پاکستان کے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار صاحب اور وزارت خارجہ کے

آفتاب احمد خان صاحب قابل ذکر تھے۔

صفائی کے گواہوں میں سے طویل ترین گواہی میری تھی جو ڈھائی دن یعنی 12 جون 1972ء کو شروع ہو کر 14 جون تک جاری رہی۔ استغاثہ اور صفائی کے وکلاء کے علاوہ جج صاحبان نے بھی مجھ سے خاصے سوال کئے۔ بلکہ میری گواہی کی ابتداء ہی جسٹس یعقوب علی خان کی طرف سے گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت کے بارے میں سوالات سے ہوئی۔ دونوں ججوں نے دوسرے معاملات کے بارے میں بھی سوالات کئے۔ جن کے میں نے ٹھوس دلائل کے ساتھ تفصیلی جواب دیئے۔ اسی دوران میں نے عدالت سے کہا کہ میرا بہت سا ریکارڈ پولیس کی تحویل میں ہے۔ میں ان میں سے بہت سی دستاویزات کو عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ مجھے پولیس کی نگرانی میں اپنے ریکارڈ کی چھان بین کرنے کی اجازت ملی جو پولیس نے کراچی میں میرے گھر اور دفتر پر چھاپے مار کر اپنی تحویل میں لیا تھا۔ میں نے اس ریکارڈ سے 196 دستاویزات منتخب کر کے انہیں ایکزبٹس (Exhibits) کے طور پر عدالت میں پیش کیا۔ ان دستاویزات میں ذوالفقار علی بھٹو کا میرے نام اوائل 1969ء میں لکھا ہوا وہ خط بھی شامل تھا جس میں انہوں نے مقبول بٹ کو ایک عظیم حریت پسند قرار دیا تھا۔ دوسرے دن روزنامہ پاکستان ٹائمز میں بھی اس خط اور اس کے مندرجات کا ذکر ہوا۔ (جس کے لئے میں پاکستان ٹائمز کے اس وقت کے ایڈیٹر خواجہ محمد آصف صاحب کا مشکور ہوں جنہوں نے میری درخواست پر توہین عدالت کا خطرہ مول لے کر خط کے مندرجات شائع کئے) جس سے کیس کے فیصلے پر فیصلہ کن اثر پڑا۔ کیونکہ اس خط کی اشاعت سے بھٹو صاحب جو اب پاکستان کے صدر تھے' کا مقبول بٹ کے بارے میں حافظہ تازہ ہو گیا اور انہوں نے اس بارے میں اپنے اٹارنی جنرل جناب یحیٰی بختیار کو مناسب ہدایات دیں۔ چنانچہ اٹارنی جنرل نے عدالت میں اپنے بیان کے دوران مسئلہ کشمیر، تحریک آزادیٔ کشمیر' نظریۂ خود مختار کشمیر اور گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت اور کیس سے متعلق صفائی کے وکلاء کی طرف سے کئے جانے والے دوسرے سوالات کے حقیقت پسندانہ جواب دیئے۔

میں اپنی گواہی کے کچھ عرصے بعد کراچی آ گیا تھا۔ ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ جسٹس یعقوب علی کے پرسنل اسسٹنٹ کا فون آیا کہ جسٹس صاحب مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں وہ ان دنوں کراچی میں کسی اہم کیس کی سماعت کر رہے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو جسٹس عبدالقادر شیخ بھی ان کے چیمبر میں بیٹھے تھے۔ جسٹس یعقوب علی نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھ سے گنگا کیس کے سلسلے میں کچھ اور اہم سوال پوچھنا چاہتے ہیں اس لئے میں دوسرے ہفتے لاہور پہنچوں - چنانچہ میں دوسرے ہفتے لاہور پہنچا اور عدالت میں پیش ہوا۔

میں نے دو سال پیشتر لکھی اپنی کتاب فری کشمیر (Free Kashmir) میں حصول آزادی' مسئلہ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنے اور دنیا کی توجہ مسئلہ کشمیر کی طرف مبذول کرانے

کے ممکنہ طریقوں کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس سلسلے میں کچھ شارٹ کٹس (Short Cuts) بھی اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ جسٹس یعقوب علی نے مجھ سے ان شارٹ کٹس کی وضاحت اور مثال مانگی میں نے جواب دیا اس سے میری مراد بھارت کی کسی اہم شخصیت یا ہوائی جہاز کا اغواء ہے کیونکہ ایسے اقدامات دنیا کی توجہ آناً فاناً مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر کی طرف مبذول کر سکتے ہیں۔ میرے اس استدلال سے صفائی کے اس موقف کو بڑی تقویت ملی کہ بھارتی جہاز گنگا خود بھارتی حکومت نے اغواء نہیں کرایا تھا (جیسا کہ استغاثہ کا الزام تھا) بلکہ این ایل ایف والے مدت سے بھارتی جہاز اغواء کرنے کے بارے میں سوچ رہے اور تیاری کر رہے تھے۔

میرے اس جواب کے بعد جسٹس یعقوب علی نے ریکارڈ میں سے میرا 1969ء میں شہید مقبول بٹ کے نام لکھا گیا ایک خط نکالا اور مجھے پڑھنے کو کہا۔ میں نے وہ خط اپنے کتابچے "ایف ایل این - الفتح اور کشمیری نوجوان" کی چند سو کاپیوں کے ساتھ بٹ صاحب کو مظفر آباد بھیجا تھا اور ان سے کہا تھا کہ اس کتابچے کی کچھ کاپیاں مقبوضہ کشمیر بھیج دیں اور کچھ آزاد کشمیر میں سیاسی کارکنوں' طلباء اور آزاد کشمیر ریگولر فورسز (AKRF) کے کرنل سے نیچے کے عہدوں کے افسروں میں تقسیم کرائیں۔

جسٹس یعقوب علی نے مجھ سے کہا کہ یہ بات ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ فوجی افسروں کو سیاسی لٹریچر بھیجنا اور انہیں سیاسی سبق پڑھانے کی کوشش کرنا ایک بہت بڑا قانونی جرم ہے اور آپ نے لاء گریجویٹ ہوتے ہوئے بھی یہ حرکت کیوں کی اور یہ لٹریچر کرنل سے نیچے کے عہدہ داروں میں تقسیم کرنے کا کیا مطلب تھا۔ میں نے کہا دراصل بات یہ ہے کہ آزاد کشمیر ریگولر فورسز کا قیام پوری ریاست کی آزادی کے لئے مجاہدین آزادی کے طور پر عمل میں آیا تھا۔ اسی طرح جس طرح انڈین نیشنل آرمی بنی تھی۔ چنانچہ اے کے آر ایف اس فوج سے بالکل مختلف ہے جس کا کام ایک آزاد ملک کی جغرافیائی سرحدوں کا دفاع کرنا ہوتا ہے کیونکہ اے کے آر ایف کا بنیادی کام ریاست کے بقیہ حصے کو بیرونی جبری قبضے سے آزاد کرانا تھا۔ اس طرح آزاد فوج کی بنیادی حیثیت کشمیری حریت پسندوں کی فوج یا لبریشن آرمی کی تھی عام فوج کی نہیں۔ اس لئے اس لبریشن آرمی کو اس کے بنیادی فرائض کی یاد دہانی کرانا کوئی جرم نہیں - جہاں تک عہدوں کا تعلق ہے۔ AKRF میں کرنل کے عہدے سے اوپر کے افسر پاکستان آرمی سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ کتابچے کے مندرجات سے غیر متعلق ہیں اس لئے انہیں یہ کتابچہ بھیجنا بے مقصد ہی نہیں قانونی جرم بھی ہوتا۔ اس لئے میں نے بٹ صاحب کو تلقین کی تھی کہ وہ کتابچہ کرنل سے نیچے کے عہدوں کے افسروں میں تقسیم کرائیں کیونکہ یہ سب کشمیری ہوتے ہیں۔

عدالت نے مجھ سے چند اور سوال بھی کئے اور میں نے ان کے مناسب جواب دیئے۔

استغاثہ نے دسمبر 1968ء میں شہید مقبول بٹ کے سری نگر جیل سے فرار کے بارے میں یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ انہیں بھارتی حکام نے خود جیل سے نکال کر آزاد کشمیر بھیجا تھا تاکہ وہ یہاں اور پاکستان میں بھارت کے لئے کام کرے۔ اس سلسلے میں استغاثہ کا بنیادی استدلال یہ تھا کہ سری نگر جیل سے فرار ناممکن ہے۔ عدالت بھی استغاثہ کے اس استدلال کو وزنی تصور کر رہی تھی۔ چنانچہ ہم نے 1948ء میں سری نگر جیل سے فرار ہو کر پاکستان آنے والے غلام نقی صاحب کو جو اب پاکستان میں حبیب بنک میں ایک اعلیٰ افسر تھے۔ صفائی کے گواہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ انہوں نے عدالت میں سری نگر جیل سے اپنے فرار کی تفصیلات بیان کیں تو عدالت نے اسے اس کا عملی مظاہرہ کرنے کے لئے کہا۔ چنانچہ دو دن بعد انہوں نے مظفر آباد کے بشیر لون کی مدد سے کیمپ جیل لاہور کی دیوار پھلانگ کر فرار ہونے کا عملی مظاہرہ ججوں اور اخباری نمائندوں کے سامنے کامیابی سے کیا۔ جس سے استغاثہ کے مؤقف کو ایک اور زور دار دھچکا لگا۔

گنگا کیس کی سماعت دسمبر 1971ء میں شروع ہوئی تھی اور ڈیڑھ سال بعد 17 مئی 1973ء کو اس کا تاریخی فیصلہ سنایا گیا۔ یہ طویل فیصلہ 407 ٹائپ شدہ صفحات پر مشتمل تھا۔ فیصلے میں مقبول بٹ، جی ایم لون، میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان کو باقی تمام الزامات سے بری کیا گیا۔ البتہ انہیں بغیر لائسنس اسلحہ خرید کر مقبوضہ کشمیر بھیجنے کے جرم میں تابرخاست عدالت سزا دی گئی اور اسی دن رہا کر دیا گیا۔ اشرف قریشی کو عظیم حریت پسند قرار دے کر بری کر دیا گیا۔ جبکہ ہاشم قریشی کو 14 سال کی سزا سنائی گئی۔ البتہ اسے اس سزا کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کا حق دیا گیا۔ مقبول بٹ صاحب اور میں نے فیصلے کے چند دن بعد ہی یہ اپیل سپریم کورٹ میں داخل کرائی۔ لیکن سماعت کی باری آنے میں سات سال لگ گئے اور جب 1980ء میں اپیل کی سماعت کی باری آئی تو سپریم کورٹ نے ہاشم قریشی کی رہائی کا حکم دے دیا۔ اس طرح ہاشم تقریباً نو سال جیل میں رہ کر رہا ہو گیا۔

کیس کے فیصلے میں مجھ سے متعلق اہم ترین بات یہ تھی کہ عدالت نے یہ دلیل دے کر کہ ملزموں کے کچھ ساتھیوں خاص کر امان اللہ خان کی سرگرمیوں کے تذکرے کے بغیر این ایل ایف اور محاذ رائے شماری، ان کے نظریات اور ان کی کارکردگی کی صحیح تصویر سامنے نہیں آ سکتی، عدالتی فیصلے میں میرے بارے میں انیس صفحوں (عدالتی فیصلے کے صفحہ 271 سے 289 تک) پر پھیلی ہوئی تفصیلات بیان کی تھیں جن میں میری کارکردگی کی تفصیلات کے علاوہ ان کے بارے میں عدالت کے تبصرے بھی شامل تھے۔ ایک انتہائی اہم سیاسی مقدمے کے فیصلے میں ایک ایسے شخص کے بارے میں جو ملزم نہیں تھا۔ اتنا تفصیلی تبصرہ ایک نہایت غیر معمولی بات تھی۔ عدالت نے میری تحریروں کو انتہائی متاثر کن اور مجھے دیوانگی کی حد تک نظریۂ خود مختار کشمیر کا حامی، شیخ محمد عبداللہ کا شیدائی اور ایک اچھا منتظم قرار دیا تھا۔ فیصلے میں ایک سے زیادہ بار یہ ریمارک بھی

دیا گیا تھا کہ نظریۂ خود مختار کشمیر کی حامل تنظیموں یعنی محاذ رائے شماری اور این ایل ایف کے منصوبوں اور پروگرام کے پس منظر میں امان اللہ خان کا ذہن کام کر رہا تھا۔ فیصلے میں میرے علاوہ عبدالخالق انصاری کے بارے میں تین صفحات' غلام مصطفیٰ علوی اور میر ہدایت اللہ کے بارے میں 8 صفحات اور سردار رشید حسرت پر ڈھائی صفحات پر مشتمل ریمارکس تھے۔ یہ چاروں بھی ملزم نہیں تھے۔

گنگا کیس کی سماعت کے دوران جن لوگوں نے پیسے' وقت اور ذہنی سکون کی قربانیاں دیں اور بڑی دوڑ دھوپ کی ان میں غلام نبی لون' میر مقبول گیلانی' جی ایم میر' کے ایچ خورشید' عبدالخالق انصاری' میر ہدایت اللہ ' یوسف زرگر' مجید امجد بٹ' تسیم لون' نصیر محمود وانی' سردار محمد ارشاد مرحوم' صابر انصاری' سردار رشید حسرت' میر عبداللطیف' محمد صدیق بابا' غلام احمد بٹ' بشیر تبسم' بشیر لون' ستار مجاہد' سعید شاہ نازکی' برکت علی' شیخ حسین شمیم' صوفی محمد زمان' میر عبدالرشید' ڈاکٹر روشن' خواجہ عطا اللہ - حاکم منھاس ' غلام رسول بٹ ' بشیر بٹ ' عصمت اللہ ' علی محمد ' متولی خان ' خلیل الرحمٰن وغیرہ شامل ہیں - کچھ عرصہ عدالت مری میں لگی - ان دنوں مری کے کشمیریوں نے بھی بڑی دوڑ دھوپ کی۔ صفائی کے وکلاءمیں سے عابد حسن منٹو ' اعجاز بٹالوی ' اور ڈاکٹر عبدالباسط نے غیر معمولی اور بے لوث محنت کی اور پوری ذاتی دلچسپی سے کام کیا۔

استغاثہ کی طرف سے اکثر پولیس افسر اور ان کی طرف سے بنائے گئے اکثر دوسرے گواہ عام طور پر سفید جھوٹ بولے البتہ پاکستان کے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار ' گلگت کے اے آئی جی پولیس محمد بابر خان اور ایس ڈی ایم شیر باز خان نے حقائق پر مبنی باتیں کیں - گنگا ہائی جیکنگ سے متعلق پولیس نے حکام بالا کے ان زبانی احکامات کے تحت کہ ملزموں کے خلاف عائد کردہ الزامات ہر قیمت پر ثابت ہونے چاہیں ہمارے ضبط شدہ اسلحہ پر ایسی عبارتیں کندہ کرائی تھیں جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ یہ اسلحہ ہمیں بھارت سے ملا ہے - اور یہ کہ ہم اسے پاکستان اور آزاد کشمیر میں تخریب کاری کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے - یہ اسلحہ گلگت کے علاقہ چلاس سے پکڑا گیا تھا (اور اس سلسلے میں میرے ماموں زاد بھائی محمد اسماعیل خان جو اس زمانے میں چلاس میں اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ تھے کے گھریلو ملازم عمری کو بھی گرفتار کیا گیا تھا) اسلحہ عدالت میں حکومت کی طرف سے بابر خان صاحب نے پیش کیا تھا - جنہوں نے عدالت میں اپنے بیان کے دوران صفائی کے وکلاءکے اس استدلال سے اتفاق کیا کہ رائفلوں پر کندہ کی گئی عبارت اصلی نہیں بلکہ بعد میں کندہ کرائی گئی معلوم ہوتی ہے - بابر صاحب کی اس حق گوئی سے بھی استغاثہ کے الزامات کا بھانڈا پھوٹ گیا۔

این ایل ایف کے قیام اور اس کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ہونے والے اخراجات کے

سلسلے میں ابتدائی طور پر جی ایم لون نے اور میر عبدالقیوم نے بہت بھاری بوجھ اٹھائے - میں نے بھی ابتدائی اخراجات کے سلسلے میں اور بعد میں اس کی سرگرمیوں کے تعلق سے تنگ و دو کے سلسلے میں اپنی طاقت سے کہیں زیادہ مالی بوجھ اٹھایا - یہاں تک کہ اپنا ٹائپنگ سکول بھی اونے پونے بیچ کر این ایل ایف کی ایک فوری مالی ضرورت پوری کی - یہی نہیں بلکہ ایک مرحلے پر اپنا سکول بیچنے پر بھی تیار ہو گیا تھا - لیکن جی ایم لون مرحوم نے اس کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ مسئلہ حل کر دیا۔

این ایل ایف کے سلسلے میں کچھ پاکستانی بھائیوں نے اعلے درجے کی کشمیر دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے یہی نہیں کہ ہماری خاصی مالی مدد کی بلکہ گنگا کیس کے دوران پولیس کے دباؤ میں آنے سے بھی انکار کر کے انتہائی بلند اخلاق کا مظاہرہ کیا - پولیس ان سے یہ بیان لینا چاہتی تھی کہ انہوں نے این ایل ایف کی کوئی مالی مدد نہیں کی ہے - تاکہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ این ایل ایف نے فرضی مالی حساب رکھا تھا اور اصل میں انہیں بھارت سے مالی مدد ملتی تھی - جن پاکستانی اصحاب نے ہماری بھرپور مالی مدد کی ان میں کریم سلک ملز کراچی کے مالک حاجی کریم مرحوم نواب برادرس کراچی کے شیخ محمد اشتیاق صاحب اور قیصر سیونگ مشین کمپنی کراچی کے شیخ خورشید انور سرفہرست ہیں - پشاور کے جہانگیر خان اور مظفر آباد کے سپین گل صاحب نے بھی اپنے متعلقہ میدان میں ہماری بڑی مدد کی - اہل کشمیر اپنے ان پاکستانی بھائیوں کے احسان مند ہیں - کچھ کشمیریوں نے بھی ہماری مالی مدد کی تھی لیکن میر قیوم صاحب نے جن کے پاس این ایل ایف کا حساب تھا یہ کتاب لکھتے وقت (1987 میں) مجھے ان کشمیریوں کی فہرست دینے سے انکار کیا - اس لئے میں خواہش کے باوجود یہاں ان کا انفرادی طور پر تذکرہ نہیں کر سکتا - میر عبدالقیوم صاحب نے این ایل ایف کا حساب ٹھیک ٹھاک رکھا تھا اس لئے پولیس اپنے مذموم مقصد میں ناکام ہوئی۔

گنگا کیس کے فیصلے کے نتیجے میں کچھ اہم حقائق اور متنازعہ دکھائی دینے والے مسائل کی واضح تصویر بھی سامنے آ گئی - اس فیصلے میں جہاں این ایل ایف اور محاذ رائے شماری کو (جن پر دو سال سے کیچڑ اچھالا جا رہا تھا اور سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع ابلاغ کے ذریعہ انہیں بھارت کی ایجنٹ تنظیمیں قرار دیا جا رہا تھا) محب وطن اور حریت پسند تنظیمیں قرار دیا گیا - وہاں پاکستان کے اٹارنی جنرل کے عدالتی بیان کی بنیاد پر یہ حقائق بھی واضح ہو گئے کہ (1) پوری ریاست جموں کشمیر کی مکمل خود مختاری کا مطالبہ کرنا کوئی قانونی، آئینی یا اخلاقی جرم نہیں بلکہ کشمیریوں کا حق ہے اور (2) گلگت بلتستان کے علاقے ریاست جموں کشمیر کا آئینی حصہ ہیں اور ان علاقوں کو آزاد کشمیر کے ساتھ ملانے کا مطالبہ کوئی جرم یا پاکستان دشمنی نہیں ہے۔

تنظیمی بحران

اسیری کے دوران ہی گنگا کیس کے ملزموں جی ایم لون اور شہید مقبول بٹ کے مابین کچھ تلخی پیدا ہو گئی تھی - جس کی بنیاد کچھ انتہائی معمولی باتیں تھیں - جن میں ہاشم قریشی کی سیماب طبیعت بھی شامل تھی - یہ تلخی وقت کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی گئی - چنانچہ عدالت سے بری ہونے کے بعد لون صاحب نے یہ موقف اختیار کیا کہ این ایل ایف اور محاذ کے ممبروں پر یہ سارا عتاب ہاشم قریشی کے چھچھورے پن اور شہید مقبول بٹ کی طرف سے ہاشم کی بے جا حمایت کے علاوہ بٹ صاحب کی چند لا پرواہیوں کی وجہ سے نازل ہوا - ہم نے عدالتی فیصلے کے دوسرے ہی دن ان اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے - کچھ مدت کے بعد میرپور میں اس سلسلے میں ایک اور کوشش کی گئی وہ بھی ناکام رہی۔ اس کے بعد میں اپنی شادی کے سلسلے میں گلگت چلا گیا - اسی دوران میری شادی میں شرکت کرنے کے لئے مقبول بٹ صاحب، عبدالخالق انصاری صاحب جی ایم میر صاحب، ڈاکٹر عبدالباسط صاحب، علوی صاحب، اشرف قریشی، صوفی محمد زمان، چوہدری شہباز صاحب اور چوہدری صادق صاحب بھی استور پہنچے - ادھر ایک حادثہ میں میجر امان اللہ کی اچانک موت کی وجہ سے میری شادی ملتوی ہو گئی تھی اور میں بھی سخت بیمار تھا - چنانچہ میری خواہش کے باوجود اس موضوع پر وہاں بھی بات نہ ہو سکی اور جب میں گلگت میں کئی ماہ رہنے کے بعد واپس آیا تو حالات بالکل بدل چکے تھے - لون صاحب این ایل ایف اور میر عبدالمنان صاحب محاذ سے علیحدہ ہو چکے تھے اور دونوں تنظیموں کے بانی ممبر بھی روٹھے روٹھے اور دل برداشتہ نظر آ رہے تھے۔

مئی 1976ء میں مقبول بٹ صاحب اپنے ساتھیوں حمید بٹ اور ریاض ڈار کے ساتھ پھر مقبوضہ کشمیر چلے گئے - یہ اقدام انہوں نے میرے علم کے بغیر اور میری مرضی کے خلاف کیا تھا۔ میں نے اس سے قبل بٹ صاحب کو سختی سے مشورہ دیا تھا - (بلکہ اس سلسلے میں میری ان سے تلخ کلامی بھی ہوئی تھی) کہ وہ خود مقبوضہ کشمیر نہ جائیں کیونکہ وہاں ان کی سزائے موت قائم ہے اور ان کی وہاں ممکنہ دوبارہ گرفتاری خود ان کے لئے ہی نہیں تنظیم کے لئے بھی مہلک ثابت ہو سکتی ہے - بہر حال میرے خدشات صحیح ثابت ہوئے اور وہ وہاں دوبارہ گرفتار ہو گئے جس کے نتیجے میں انہیں آٹھ سال بعد تختہ دار پر چڑھنا پڑا۔

بٹ صاحب کی مقبوضہ کشمیر روانگی کے بعد محاذ رائے شماری والوں نے یہی نہیں کہ ان سے لاتعلقی کا اعلان کیا - بلکہ میری برطانیہ روانگی کے بعد اس بہانے سے کہ این ایل ایف کو سرگرم رکھنے کے لئے طویل المیعاد منصوبہ بندی ہونی چاہئے، اس کی سرگرمیاں معطل کر دیں جس کے نتیجے میں این ایل ایف زندہ دفن ہو گیا - اس طرح 1969ء میں بٹ صاحب کی طرف

سے این ایل ایف کو محاذ رائے شماری کا ایک حصہ بنائے جانے پر میرے ظاہر کئے گئے خدشات صحیح ثابت ہوئے - بہر حال خود مجھے اس سلسلے میں بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا اس لئے کہ مجھے بٹ صاحب کی طرف سے کئے جانے والے اچانک اعلان پر بعد میں ان سے شکوہ شکایت کرنے کی بجائے اسی وقت ان کے اس اعلان کے خلاف پوری طاقت سے آواز اٹھانی چاہئے تھی جو میں نے نہیں اٹھائی۔

این ایل ایف نے اپنی دس بارہ سالہ قلیل مگر انقلابی اور ہنگامہ خیز زندگی میں کشمیریوں خاص کر کشمیر کی نوجوان نسل کو ایک نیا ولولہ ، نئی امنگ اور نیا عزم دیا - اس نے تحریک آزادی کشمیر کو روایتی سیاست کاری سے نکال کر انقلابی بنیادوں پر کھڑا کر دیا - اس نے کشمیر کی آزادی کے بیرونی غاصبوں کے علاوہ اندرون کشمیر ان کے ایجنٹوں کی بھی نیندیں حرام کر دیں - اس نے تحریک آزادی کے نام پر کرسیاں حاصل کرنے اور تجوریاں بھرنے والوں کو بھی حیران پریشان کر دیا اور سب سے اہم بات یہ کہ اس نے تحریک آزادی کشمیر کے بارے میں پہلی بار صحیح منزل کی نشاندہی کرکے اس تک پہنچنے کا صحیح راستہ بھی متعین کیا تھا۔ لیکن افسوس اسے کسی کی نظر کھا گئی۔ دشمن تو اپنی بہترین کوششوں کے باوجود اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے - اسے اس کے اپنوں (محاذ رائے شماری کے انقلاب دشمن عناصر) نے زندہ دفن کر دیا۔

اگرچہ این ایل ایف کے صحیح جانشیں یعنی جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کی جدوجہد آزادی کے تینوں میدانوں میں اس وقت (1987) تک کی کارکردگی بھی این ایل ایف کی مجموعی کارکردگی سے کہیں زیادہ اور زیادہ نتیجہ خیز ہے - اس کے باوجود کشمیر کی تحریک آزادی کی تاریخ میں این ایل ایف کا اپنا ایک اعلیٰ مقام ہے - جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے اسے اپنی طرف سے زندہ دفن کیا تھا - وہ اس کے اعلیٰ تاریخی امیج کے پیش نظر آج پھر اس کا لبادہ اوڑھ کر اپنا سیاسی قد اونچا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

آٹھواں باب

جموں کشمیر لبریشن فرنٹ

یورپ اور مشرق وسطیٰ کے کشمیری

دوسری جنگ عظیم کے دوران ریاست جموں کشمیر کے ضلع میرپور کے بہت سے لوگ برطانوی ہندوستان کی نیوی اور مرچنٹ نیوی میں بھرتی ہوئے تھے - جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد ان میں سے کچھ لوگوں نے برطانیہ کی صنعتوں میں ملازمتیں حاصل کیں - برطانیہ کی صنعت کو سستے مزدوروں کی ضرورت تھی چنانچہ وہاں کے صنعتکاروں نے میرپور سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں کو اجازت دے دی کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو بھی برطانیہ بلائیں - چھٹے اور ساتویں عشرے کے دوران میرپور میں منگلا ڈیم کی تعمیر کے سلسلے میں بے گھر ہونے والے لاکھوں لوگوں کی ایک بڑی تعداد بھی برطانیہ پہنچ گئی چنانچہ 1976ء تک برطانیہ میں مقیم آزاد کشمیر کے باشندوں کی تعداد ڈیڑھ اور دو لاکھ کے درمیان پہنچ گئی تھی۔ ان کی بڑی اکثریت نے اب برطانوی شہریت حاصل کر لی ہے اور وہاں ہی "مستقلاً" رہائش پذیر ہیں البتہ سال دو سال میں ایک بار اپنے آبائی وطن آتے ہیں۔ ضلع میرپور کے لوگوں کو برطانیہ پہنچانے میں ڈڈیال میرپور کے چوہدری زمان مرحوم (ستارہ خدمت) نے اہم کردار ادا کیا۔ برطانیہ میں داخلے پر ذرا پابندی لگ گئی تو آزاد کشمیر کے بہت سے لوگ یورپ کے دوسرے ملکوں خاص کر فرانس، مغربی جرمنی، ہالینڈ، ڈنمارک، سویڈن اور ناروے پہنچے اور ایک چھوٹی سی تعداد امریکہ بھی پہنچ گئی - ساتویں عشرے میں مشرق وسطیٰ میں تیل سے حاصل ہونے والی دولت سڑکوں، عمارتوں، ہوائی اڈوں اور کسی حد تک صنعتوں کی تعمیر پر صرف ہونے لگی تو آزاد کشمیر کے ضلع پونچھ سے لاکھوں افراد وہاں پہنچ گئے - جدہ ایئرپورٹ پر کام کرنے والے مزدوروں کی بھاری اکثریت آزاد کشمیر کے ضلع پونچھ کی تھی - کچھ مظفر آباد اور دوسرے اضلاع سے بھی تعلق رکھتے تھے - آزاد کشمیر کے ان لوگوں کو مشرق وسطیٰ پہنچا کر انہیں بڑی بڑی تنخواہیں دلانے میں ایم ایم خان صاحب کا ہاتھ کلیدی ہے - چنانچہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ آزاد کشمیر کے ضلع پونچھ کی موجودہ خوشحالی بڑی حد تک ایم ایم خان صاحب کی

مرہونِ منت ہے۔

برطانیہ میں مقیم آزاد کشمیر کے باشندوں میں آزادی کشمیر کی تڑپ موجود تھی لیکن وہ مدت تک منظم نہیں ہو سکے - ایک تو وہ برطانیہ بھر میں بکھرے ہوئے تھے اور دوسرے ان کی بھاری اکثریت ناخواندہ یا نیم خواندہ تھی - اس کے باوجود ساتویں دہائی کے دوران لالہ عبدالرحمٰن، صوفی اعظم، حبیب خان، ان کے بھائی، بابو عبدالرحیم، کرنل ظفر اقبال قریشی، کامریڈ مقبول، سلطان علی شاہ وغیرہ کشمیریوں کو منظم کرنے کی کوشش کرتے رہے - لالہ عبدالرحمٰن نے کشمیر انڈ۔پینڈنٹس موومنٹ نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی جبکہ صوفی اعظم نے مسلم کانفرنس کی شاخ قائم کی تھی۔

1971ء میں جب بھارتی جہاز گنگا کے اغوا کے بعد این ایل ایف اور محاذ رائے شماری کے ممبروں پر پاکستان میں عتاب نازل ہوا تو برمنگھم کے کچھ نوجوانوں خاص کر چوہدری عبدالمجید، نذیر نازش، کامریڈ یونس، محمد بشیر، مرزا صدیق، عارف انصاری وغیرہ نے یونائیٹڈ کشمیر لبریشن فرنٹ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کے تحت این ایل ایف اور محاذ رائے شماری کے ممبروں پر ہونے والے ذہنی اور جسمانی تشدد کے خلاف لندن میں کچھ مظاہرے ہوئے اور اس تنظیم کے وفود پاکستان کے سفیر اور برطانیہ کے دوروں پر آنے والے پاکستان کے وزیروں سے بھی ملتے رہے 1973ء میں گنگا کیس کے فیصلے کے بعد یونائیٹڈ لبریشن فرنٹ کے مرزا صدیق اور عارف انصاری (یہ دونوں محاذ رائے شماری کے سربراہ عبدالخالق انصاری کے قریبی عزیز ہیں) نے محاذ رائے شماری نام سے اپنی تنظیم بنائی - 1974ء میں اس کی تنظیم نو کی گئی جس کے نتیجے میں لالہ عبدالرحمٰن اسکے صدر، نذیر نازش جنرل سیکرٹری، مرزا صدیق خزانچی اور عارف انصاری پبلسٹی سیکرٹری مقرر ہوئے - گو برطانیہ کا یہ محاذ رائے شماری آئینی لحاظ سے خودمختار تھا لیکن عملاً یہ آزاد کشمیر کے محاذ رائے شماری کی شاخ تھا اور اس میں شامل ممبروں کی اکثریت عبدالخالق انصاری صاحب کی برادری سے تعلق رکھتی تھی - برطانیہ میں عام تاثر یہی تھا کہ محاذ رائے شماری انصاری برادری کی تنظیم ہے چنانچہ دوسری برادریوں کے بہت کم لوگ اس میں شامل ہوتے تھے۔

لبریشن فرنٹ کا قیام

1975ء میں محاذ رائے شماری کے صدر عبدالخالق انصاری اپنی آنکھوں کے علاج کے سلسلے میں برطانیہ گئے - 1976ء کے اوائل میں برطانیہ کے محاذ رائے شماری نے میرے اور محاذ رائے شماری (آزاد کشمیر) کے سیکرٹری جنرل جی ایم میر کے لئے لندن جانے کے لئے ٹکٹ اور اسپانسرشپ بھیجے اور میں 20 جون 1976ء کو برطانیہ پہنچا -

میں نے برطانیہ پہنچ کر چند دن کے دوران ہی محسوس کیا کہ برطانیہ کو بیس بنا کر تحریک آزادئ کشمیر کو خاصی تقویت پہنچائی جا سکتی ہے - خاص کر بین الاقوامی سطح پر مسئلہ کشمیر کے بارے میں پیدا شدہ غلط تاثر کو ختم کیا جا سکتا ہے - چنانچہ میں نے وائس آف کشمیر انٹرنیشنل کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا - 13 جولائی کو یوم شہدائے کشمیر کے سلسلے میں برمنگھم کے ڈگبیتھ سوک ہال میں ایک بڑا جلسہ عام ہوا۔ یوم شہدائے کشمیر کے سلسلے میں برطانیہ میں یہ پہلا بڑا جلسہ عام تھا - اس سے پہلے بجز چند گنے چنے افراد کے کسی کو 13 جولائی کی اہمیت کا علم ہی نہیں تھا - میں نے انصاری صاحب پر زور دیا کہ وہ برطانیہ کے مختلف شہروں میں محاذ رائے شماری کی شاخیں قائم کریں - چنانچہ انہوں نے چند شمالی شہروں کا دورہ کیا اور وہاں محاذ کی شاخیں قائم کیں - البتہ یہ شاخیں بھی انصاری صاحب ہی کی برادری کے اراکین پر مشتمل بنیں اور ان میں سے اکثر 1977ء میں انصاری صاحب کی آزاد کشمیر واپسی کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں۔

اس دوران میں نے برطانیہ کے ذرائع ابلاغ اور سفارتی حلقوں سے رابطہ قائم کیا - اکثر سفارتی اور صحافتی حلقے محاذ رائے شماری کے نام پر ہی یہ کہہ کر تعجب کا اظہار کرتے کہ ملک کشمیریوں کا اور خود کشمیری اس کے مستقبل کو رائے شماری کا تابع بناتے ہیں۔

برطانیہ میں قیام کے چند ماہ کے اندر میں نے محسوس کیا کہ ہم تنظیم کے اس نام پر اور اس کی موجودہ ساخت اور اغراض و مقاصد کو برقرار رکھ کر تحریک آزادی کو آگے نہیں بڑھا سکتے - بین الاقوامی سطح پر محاذ رائے شماری کا نام کوئی کشش نہیں رکھتا تھا نہ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ہم قومی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اس کے علاوہ یہی نام مقبوضہ کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی تنظیم کا بھی تھا اور برطانیہ میں مقیم آزاد کشمیر کے باشندے 1975ء کے دہلی ایکارڈ (Delhi Accord) کی وجہ سے شیخ صاحب سے سخت نالاں تھے - چنانچہ ان کا بڑی تعداد میں محاذ رائے شماری برطانیہ میں شامل ہونا ناممکنات میں سے تھا - علاوہ ازیں یہ تاثر کہ محاذ رائے شماری انصاری برادری کی تنظیم ہے، دوسری برادریوں کے لوگوں کو اس میں شمولیت سے روک رہا تھا۔ چنانچہ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ محاذ رائے شماری برطانیہ کا نام بدل کر کوئی انقلابی نام رکھنا چاہئے اور اس کا آئین بھی انقلابی اصولوں اور نظریات پر مبنی ہونا چاہئے۔

اپریل 1977ء تک میں نے عبدالخالق انصاری صاحب اور محاذ رائے شماری برطانیہ کے ممبران مجلس عاملہ کو محاذ کا نام تبدیل کرنے اور اسے انقلابی بنیادوں پر منظم کرنے پر آمادہ کیا چنانچہ 12 اپریل کو ہونے والے اجلاس میں مجلس عاملہ نے میری تجویز رسمی طور پر بھی منظور کی اور 29 مئی 1977ء کو برمنگھم میں ہونے والے کونشن میں محاذ رائے شماری برطانیہ کا نام تبدیل کر کے جموں کشمیر لبریشن فرنٹ رکھا گیا اور اس کے لئے میرا مرتب کردہ ایک جامع آئین بھی منظور ہوا جس کے تحت لبریشن فرنٹ ایک آزاد خود مختار تنظیم بنا البتہ اس کے اغراض و مقاصد

میں یہ بات شامل تھی کہ وہ اندرون ریاست حصول آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والی تنظیموں کی مدد کرے گا۔ اگرچہ لبریشن فرنٹ کا آئین مرتب کرنے اور کنونشن کے انتظامات کے سلسلے میں زیادہ تر کام میں نے ہی کیا تھا لیکن میں ایک آئینی اور قانونی رکاوٹ کی وجہ سے لبریشن فرنٹ کا عہدیدار بننے کا اہل نہیں تھا چنانچہ کنونشن سے 9 ماہ بعد یکم فروری 1978ء تک میں نے رسما" اس کی رکنیت بھی حاصل نہیں کی۔ فروری 1978ء میں وہ قانونی رکاوٹ ختم ہونے کے بعد میں اس کا رکن بن گیا اور ساتھ ہی مجھے لبریشن فرنٹ کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔

عبدالخالق انصاری صاحب نے بھی میرے ساتھ ہی برطانیہ میں مستقل قیام کی اجازت کی درخواست دی تھی پہلی بار دونوں کی درخواستیں مسترد ہو گئیں چنانچہ دونوں نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی۔ میری اپیل منظور ہوئی اور انصاری صاحب کی نامنظور ہو گئی چنانچہ وہ اواخر 1977ء میں آزاد کشمیر چلے آئے۔

لبریشن فرنٹ کے نظریات، اغراض و مقاصد، پالیسیاں اور حکمت عملی

گزشتہ تقریباً دس سال کے دوران لبریشن فرنٹ کی اور اس کے حوالے سے میری سرگرمیوں کی تفصیلات میں جانے سے پہلے ضروری ہے کہ لبریشن فرنٹ کے نظریات اور اغراض و مقاصد کے علاوہ اس کے طریقہ کار، پالیسی، حکمت عملی کا بھی ایک سرسری جائزہ لیا جائے جو ہم نے اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے اور اغراض و مقاصد کی تکمیل کی جدوجہد کے سلسلے میں اختیار کی۔

نظریات

مسئلہ کشمیر اور اس سے متعلق جملہ امور کے بارے میں لبریشن فرنٹ کے نظریات اسکے آئین کے متعلقہ آرٹیکل میں درج ہیں اور 14 دفعات پر مشتمل ہیں ان میں سے اہم دفعات مندرجہ ذیل ہیں۔

1- مسئلہ کشمیر بھارت اور پاکستان کے مابین قطعہ زمین کی ملکیت سے متعلق کوئی تنازعہ نہیں بلکہ ریاست جموں کشمیر کے باشندوں کی قومی آزادی کا مسئلہ ہے۔

2- ریاست جموں کشمیر یا اس کا کوئی حصہ بھارت یا پاکستان کا آئینی یا قانونی حصہ نہیں۔

3- مسئلہ کشمیر کا بہترین حل یہ ہے کہ پوری ریاست جموں کشمیر کو ایک آزاد اور خود مختار مملکت بنایا جائے۔

اغراض و مقاصد

لبریشن فرنٹ کے اغراض و مقاصد میں سے اہم دفعات مندرجہ ذیل ہیں

1- پوری ریاست جموں کشمیر کو بیرونی تسلط سے آزاد کرانے، اسے ایک آزاد و خود مختار مملکت بنانے، اسے اقوام عالم کی صف میں ایک باوقار مقام دلانے اور اندرون ریاست جمہوریت، عوامی بہبود اور سماجی انصاف پر مبنی نظام مملکت اور معاشرہ قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرنا۔

2- حصول آزادی کی جنگ ان تمام محاذوں پر لڑنا جنہیں اقوام متحدہ نے محکوم قوموں کی جنگ آزادی کے لئے جائز قرار دیا ہے اور جس میں مسلح جدوجہد بھی شامل ہے۔

3- ایسی تمام تنظیموں اور افراد کی اخلاقی اور عملی مدد کرنا جو ریاست کی مکمل خود مختاری کے لئے جدوجہد کر رہے ہوں۔

پالیسی اور حکمت عملی

میں نے ابتداء میں ہی لبریشن فرنٹ کے لئے ایک پالیسی اور حکمت عملی مرتب کی اور اسے تنظیم کے پالیسی ساز ادارے ایگزیکٹیو کونسل (Executive Council) میں پیش کیا جس نے اس پالیسی اور حکمت عملی کو چند معمولی سی ترامیم کے ساتھ منظور کر لیا۔ ایگزیکٹو کونسل (اور 1984ء کے بعد سینٹرل کمیٹی) وقتاً فوقتاً ان پالیسیوں اور حکمت عملی پر غور کر کے بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں اس میں ترمیم کرتی رہی البتہ حکمت عملی کے بنیادی اصول تقریباً وہی رہے جو ابتداء میں مرتب ہوئے تھے۔ اس حکمت عملی کے اہم باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

1- ہمیں اپنی بیشتر توجہ مسئلہ کشمیر کو کشمیریوں کی قومی آزادی کی تحریک کے طور پر بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنے، اس کے حق میں بین الاقوامی رائے عامہ کی حمایت حاصل کرنے اور اندرون ریاست تحریک آزادی پر مسلط جمود کو توڑنے پر صرف کرنی چاہئے۔

2- ہمیں معاہدہ شملہ (1972ء کا پاک بھارت معاہدہ) اور 1975ء کے دہلی ریکارڈ کی پرزور مخالفت کرنی چاہئے۔

3- ہمیں دنیا بھر کی تحاریک آزادی کی حمایت کرنی چاہئے۔

4- ہمیں دوسری کشمیری سیاسی پارٹیوں سے غیر اختلافی مسائل پر پورا تعاون کرنا چاہئے ان کی باہمی چپقلشوں میں غیر جانبدار رہنا چاہئے اور تحریک آزادی کے سلسلے میں ان کا تعاون حاصل کرنا

چاہئے۔

5- ہمیں اپنے نظریات کو دائیں یا بائیں بازو کا رنگ دینے کی بجائے انہیں قومی آزادی کی تحریک کے طور پر اجاگر کرنا چاہئے۔

6- ہم پاکستان کے عوام، اس کی علاقائی سالمیت اور اس کی آزادی کے خیر خواہ ہیں البتہ پاکستان کی حکومتوں کو ان کی کشمیر پالیسی کے ترازو سے تولتے ہیں ہم بھارت کے حکمران ٹولے کو اس لئے اپنا دشمن سمجھتے ہیں کہ وہ ہمیں ہمارا پیدائشی، موعود اور بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حق خود ارادیت دینے سے انکار کرتا ہے اور ہمارے وطن کو بھارت کا اٹوٹ انگ گردانتا ہے جس کا کوئی آئینی، قانونی، تاریخی یا اخلاقی جواز نہیں۔

7- ہمیں بڑی طاقتوں کا نہ تو حاشیہ بردار بننا چاہئے اور نہ ہی ان کی بے جا مخالفت کرنی یا مول لینی چاہئے۔

8- ہمیں تیسری دنیا کی آزادی پسند قوتوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔

9- ہمیں اندرون ریاست یعنی آزاد کشمیر اور بھارتی مقبوضہ کشمیر میں آزادی پسند قوتوں کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنانے اور ان کا تعاون حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔

10- ہمیں ریاست سے فرقہ وارانہ، نسلی، لسانی اور علاقائی تعصبات کے خاتمے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔

11- ہمیں اپنی جنگ آزادی جدوجہد آزادی کے تینوں میدانوں یعنی سیاسی جدوجہد، سفارتی جدوجہد اور مسلح جدوجہد کے میدانوں میں لڑنی چاہئے۔ البتہ مسلح جدوجہد صرف بھارتی قابض فوج اور حکام کے خلاف ہونی چاہئے۔

یہ پالیسیاں اور حکمت عملی مرتب کرنے اور تنظیم کے متعلقہ اداروں سے منظور کرانے میں میں نے کلیدی کردار ادا کیا اور تنظیم ان پر امکانی حد تک عمل کرتی رہی ہے۔

جدوجہد آزادی کے تین محاذ

یہ استدلال تحریک آزادی کے طریقہ کار کے بارے میں ہمارے نظریئے کا بنیادی ستون ہے کہ دور جدید میں جب تک کوئی محکوم قوم حصول آزادی کے لئے جدوجہد آزادی کے تینوں محاذوں یعنی سیاسی جدوجہد کے محاذ، سفارتی جدوجہد کے محاذ پر اور مسلح جدوجہد کے محاذ پر مسلسل سرگرم عمل نہ ہو اس وقت تک اسے آسانی سے آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ گو دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد کے دو عشروں کے دوران آزادی حاصل کرنے والی قوموں کی ایک بڑی

تعداد بڑے پیمانے پر مسلح جدوجہد کئے بغیر ہی آزاد ہو گئی - یہاں تک کہ صرف ایک سال (1960ء) میں دنیا کی بیس محکوم قوموں نے آزادی حاصل کر لی لیکن یہ ایک استثنیٰ تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ یہ اقوام کی آزادی کی ایک ایسی انتہائی غیر معمولی لہر تھی جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی لیکن ایسی لہریں نہ تو روز روز آتی ہیں نہ ہی انہیں جدوجہد آزادی کے پروگرام کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔

سیاسی جدوجہد، لٹریچر، تقاریر، پریس کانفرنسوں، اخباری بیانات، مظاہروں اور ہڑتالوں کے ذریعے ایک طرف اپنے عوام میں سیاسی شعور اور حصول آزادی کا جذبہ پیدا کرنے اور دوسری طرف اپنی آزادی کے غاصب غیر ملکیوں تک اپنے مطالبات اور جذبات پہنچانے کا دوسرا نام ہے اور دنیا بھر کی حکومتوں، بین الاقوامی اداروں، عالمی ذرائع ابلاغ اور دنیا بھر کے عوام تک مختلف طریقوں سے اپنی آزادی کی جوازیت اور استحقاق کے بارے میں حقائق پہنچا کر اپنی تحریک آزادی کے لئے عالمی رائے عامہ کی حمایت حاصل کرنے کی کوششوں کو سفارتی جدوجہد کہا جاتا ہے - جبکہ محکوم قوموں کی آزادی پسند تنظیموں کی طرف سے اپنی قومی آزادی کے غاصبوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے اور گوریلا جنگ کے ذریعے انہیں اپنے وطن سے نکال باہر کرنے کی کوشش کو مسلح جدوجہد آزادی کے نام سے پکارا جاتا ہے -

جدوجہد آزادی کے یہ تینوں محاذ تحریک آزادی ہی کے لئے ضروری نہیں بلکہ ایک دوسرے کے لئے بھی لازم ملزوم ہیں۔ سیاسی جدوجہد کے میدان میں کامیابی تحریک کو دوسرے دو محاذوں پر بھی تقویت پہنچاتی ہے اور سفارتی جدوجہد میں پیش رفت سیاسی اور عسکری میدانوں میں جدوجہد کے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے اسی طرح مسلح جدوجہد کے میدان میں حاصل ہونے والی کامیابیاں سیاسی اور سفارتی محاذ میں تحریک آزادی کی پیش قدمی کا باعث بنتی ہیں - چنانچہ قومی تحاریک آزادی اسی صورت میں منزل آزادی کی طرف پوری رفتار میں گامزن ہو سکتی ہیں جب وہ جدوجہد آزادی کے ان تینوں محاذوں پر پوری طرح سرگرم عمل ہو جائیں۔

لبریشن فرنٹ نے اپنے قیام کے وقت سے ہی درج بالا حقائق کو پوری طرح مدنظر رکھا چنانچہ ابتداً ہماری ساری توجہ سیاسی اور سفارتی میدانوں پر رہی اور اس سلسلے میں ہماری اور میری کارکردگی کی تفصیلات اگلے صفحوں میں درج ہیں - میں نے قارئین کی آسانی کے لئے سیاسی اور سفارتی میدانوں میں لبریشن فرنٹ کی اور میری اپنی کارکردگی کو مختلف ابواب اور عنوانات میں تقسیم کیا ہے اور یہ تفصیلات ذیل میں پیش خدمت ہیں۔

وائس آف کشمیر انٹرنیشنل

میں نے جون 1976ء میں برطانیہ پہنچتے ہی "وائس آف کشمیر انٹرنیشنل" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ میں نے اپنے جیب خرچ کے لئے کراچی سے لائی ہوئی رقم سے نکالا۔ اس کے بعد اس کی مالی ضروریات محاذ رائے شماری برطانیہ کے ممبروں اور مئی 1977ء میں لبریشن فرنٹ کے قیام کے بعد فرنٹ کے ممبروں کی طرف سے ملنے والے عطیات، سالانہ چندوں اور اشتہارات سے پوری ہوتی رہیں۔

1980ء میں میں نے ایک انشورنس کمپنی کی ایجنسی لے لی جس سے مجھے سال بھر میں کمیشن کے طور پر تقریباً چار ہزار پونڈ ملے جن میں سے ڈھائی ہزار پونڈ میں نے لبریشن فرنٹ کے ذریعے وائس آف کشمیر کو عطیئے کے طور پر دیئے۔ پہلے شمارہ صرف انگریزی میں تھا اس کے بعد کچھ مدت تک نصف انگریزی اور نصف اردو میں شائع ہوتا رہا اور بعد ازاں سارا پرچہ اردو میں شائع ہوتا رہا البتہ وقفے وقفے سے اس کا انگریزی سپلیمنٹ شائع ہوتا رہا۔ اردو شمارہ کشمیریوں میں تقسیم ہوتا تھا اور انگریزی سپلیمنٹ لندن، نیویارک، اسلام آباد اور نئی دہلی میں سفارت خانوں، ذرائع ابلاغ، بین الاقوامی تنظیموں اور مختلف ملکوں کے اہم ممبران پارلیمنٹ کو بھیجا جاتا تھا۔ دونوں ایڈیشنوں کے اداریئے اور اکثر مضامین میرے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔

لٹریچر

وائس آف کشمیر کے علاوہ ہم نے انگریزی اور اردو میں متعدد کتابچے بھی شائع کر کے تقسیم کئے۔ تقریباً سب کتابچے میرے لکھے ہوئے تھے۔ سب سے پہلا کتابچہ عالمی ضمیر کے نام (To World Concience) انگریزی میں تھا۔ سولہ صفحات پر مشتمل اس کتابچے میں کشمیر کی تاریخ و جغرافیہ۔ مسئلہ کشمیر کے پس منظر۔ اسکی اصل نوعیت مسئلہ کشمیر کے بارے میں پاکستان بھارت اور اقوام متحدہ کے کردار اور کشمیریوں کے حقوق کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے عالمی ضمیر سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ہمارے پیدائشی اور بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حق خودارادیت کی حمایت کرے۔ اس کی کاپیاں لندن، نیویارک، نئی دہلی اور اسلام آباد میں دنیا بھر کے سفارت خانوں، دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ اور بین الاقوامی تنظیموں کو بھیجنے کے علاوہ مظاہروں کے دوران بھی تقسیم ہوتی رہیں 1979ء میں ہم نے ایک اور کتابچہ بعنوان "کشمیر کی المناک کہانی" (The Tragic Story of Kashmir) شائع کیا۔ 1983ء میں میں نے "نظریہ خودمختار کشمیر" کے

عنوان سے ایک کتابچہ لکھا جس میں سوال و جواب کی صورت میں ان بیس اعتراضات کے مدلل اور مفصل جواب دیئے جو ریاست کی مکمل خود مختاری کے نظریئے کے بارے میں کئے جاتے ہیں اردو میں لکھے گئے اور 36 صفحات پر مشتمل اس کتابچے کے اس وقت تک دو ایڈیشن شائع ہوئے ہیں - 1985ء میں برطانیہ میں گرفتار ہونے سے پہلے میں نے مقبول بٹ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سولہ صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ لکھا تھا جو کراچی میں شائع ہوا - اکتوبر 1985ء میں برطانیہ کے لیسٹر جیل میں میں نے ایک کتابچہ "خود مختار کشمیر کیوں؟" لکھا۔ اس کتابچے میں کشمیر کی مکمل خود مختاری کے فوائد بیان کئے گئے ہیں -

ان کتابچوں کے علاوہ ہم نے بے شمار چھوٹے چھوٹے پمفلٹ اور لیفلیٹ (Pamphlets and leaflets) اور کھلے خط شائع کر کے بین الاقوامی سطح پر تقسیم کئے۔ جون 1977ء میں لندن میں مسلسل پانچ دن تک ہونے والے مظاہروں کے دوران ہم نے اپنے کتابچے "عالمی ضمیر کے نام" کا خلاصہ ایک پمفلیٹ کی صورت میں شائع کر کے ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا - جون 1978ء میں بھارتی وزیراعظم مسٹر مرارجی ڈیسائی کے دورہ لندن کے موقع پر ہم نے "بھارتی وزیر اعظم کے نام کھلا خط" کی ہزاروں کاپیاں تقسیم کیں اس کھلے خط میں ہم نے بھارتی وزیراعظم کو کشمیر کے بارے میں بھارت کے وعدے یاد دلائے تھے - 1979ء میں ہم نے عالمی ضمیر کے نام سے کتابچہ کے خلاصے کی ہزاروں کاپیاں نیویارک میں اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کے سامنے ہونے والے اپنے مظاہرے اور دوسروں کے مظاہروں کے دوران تقسیم کرنے کے علاوہ اقوام متحدہ میں دنیا بھر کے سفیروں کو بھی ان کی کاپیاں بھیجیں۔

ستمبر 1980ء میں میں نے ایک پمفلٹ بعنوان "صیہونیت سے عالم اسلام کو سب سے بڑا خطرہ ہے لیکن بھارت کے ہندو مذہبی جنونیوں کی طرف سے لاحق خطرہ بھی اس سے کچھ کم نہیں۔" لکھ کر نیویارک میں مسلمان سفیروں کے علاوہ اہم مسلم شخصیتوں میں تقسیم کرایا۔ اس سے قبل میں نے انگریزی زبان میں "عالم اسلام کی زبوں حالی کی وجوہات ، اسلامی دنیا کے مسائل اور ان کا حل" کے عنوان سے اکیس (21) بڑے صفحات پر پھیلے ہوئے ایک مضمون کی ہزاروں کاپیاں لندن میں پندرھویں صدی کے آغاز کے سلسلے میں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس کے شرکاء میں تقسیم کرانے کے علاوہ لندن میں مسلمان ملکوں کے سفیروں اور مسلمان ممالک کے وزرائے خارجہ اور ذرائع ابلاغ کو بھیج دیں - عالم اسلام کے بہت سے غیر سرکاری اکابرین نے اس مضمون کو بہت سراہا اور اس سلسلے میں مجھے خطوط لکھے۔ اس مضمون کو بہت سے عرب اخبارات کے علاوہ بھارت کے ہفت روزہ ریڈینس (RADIANCE) شکاگو کے بلالین نیوز (Bialian News) نے قسط وار شائع کیا - کچھ پاکستانی اور کشمیری اخبارات اور جرائد نے بھی اس پر تبصرے کئے۔

9 اکتوبر 1980ء کو عیدالاضحیٰ کے موقع پر میں نے "عالم اسلام کی حکومتوں تنظیموں اور افراد کے نام ایک اپیل" کے عنوان سے ایک مختصر سا لیفلیٹ لکھ کر نیویارک کی تمام مسجدوں خاص کر ان مسجدوں میں تقسیم کرایا جہاں مسلم سفارت کار نماز عید پڑھتے ہیں - اس لیفلیٹ میں مسئلہ کشمیر سے متعلق حقائق بیان کرتے ہوئے میں نے عالم اسلام سے ہماری تحریک آزادی کی حمایت کی اپیل کی تھی - اکتوبر 1980ء میں میں نے "دنیا کی باضمیر حکومتوں' تنظیموں اور افراد کے نام" کے عنوان سے ایک لیفلیٹ شائع کر کے اقوام متحدہ کے تمام سفیروں اور ذرائع ابلاغ کو بھیجا۔ اکتوبر ہی میں ایک اور لیفلیٹ بعنوان "بھارت کشمیر پر بھارت کا مذاق اڑا رہا ہے۔" (India Ridicules India on Kashmir) کے عنوان سے ایک لیفلیٹ لکھا جس میں کشمیر کے بارے میں بھارت کے سابقہ وعدوں اور موجودہ دعوؤں کی تفصیلات بیان کر کے دونوں کا موازنہ کیا گیا تھا - اس لیفلیٹ کی ہزاروں کاپیاں سفارتی حلقوں' ذرائع ابلاغ کے نمائندوں اور بین الاقوامی تنظیموں کو بھیجی گئیں - ہماری ایگزیکٹو کونسل اور مجلس عاملہ کے اجلاسوں اور سالانہ کنونشنوں کے دوران مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کے بارے میں بھارت اور پاکستان کے اقدامات' بین الاقوامی معاملات اور دوسری تحاریک آزادی سے متعلق منظور ہونے والی قراردادوں کی کاپیاں بھی ہم سفارتی دنیا اور ذرائع ابلاغ کے علاوہ بین الاقوامی تنظیموں کو بھیجتے رہے اسکے علاوہ میری پریس کانفرنسوں کے دوران ذرائع ابلاغ کے نمائندوں میں تقسیم ہونے والے بیانات کی کاپیاں بھی سفارت خانوں اور بین الاقوامی تنظیموں کو بھیجی جاتی رہیں۔ لندن اور دوسرے شہروں میں بھارتی اور پاکستانی سفارت خانوں کے حوالے کی جانے والی یادداشتوں کی کاپیاں بھی دوسرے سفارت خانوں اور ذرائع ابلاغ کو بھیجی جاتی رہیں۔ 22 مارچ 1982ء کو لکھے گئے "بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے نام کھلے خط" کی کاپیاں بھی سفارت خانوں ' ذرائع ابلاغ (بشمول بھارتی ذرائع ابلاغ) کو بھیجی گئیں - دو صفحوں پر مشتمل اس کھلے خط میں میں نے کشمیر سے متعلق بھارت کے کشمیریوں سے اور بین الاقوامی سطح پر کئے گئے وعدوں کے حوالے دے کر اس کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی اور آخر میں کشمیری حریت پسند مقبول بٹ کو سنائی جانے والی سزائے موت کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ بھارتی اہنسا کے نام نہاد پجاریوں سے تو انگریز سامراجی ہی بہتر تھے کہ انہوں نے آئی۔ این۔ اے کے لیڈروں کو پھانسی کی سزائیں نہیں دیں - 19 دسمبر 1982 کو لندن ' پیرس ' برلن ' دی ہیگ اور کوپن ہیگن میں ہونے والے ہمارے تاریخی مظاہرے کے دوران بھارت اور پاکستان کے سفیروں کے نام ہماری یادداشت کی یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کی گئی کاپیاں ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہوئیں۔

مارچ 1983ء میں نئی دہلی میں غیر جانبدار تحریک کی سربراہ کانفرنس ہونے والی تھی چنانچہ ہم نے 30 جنوری 1983ء کو "دو چہروں والی غیر جانبدار تحریک" (The Double Faced

(Non-Aligned Movement) کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر لندن، نئی دہلی اور اسلام آباد میں غیر جانبدار تحریک کے ممبر ملکوں کے سفارت خانوں کے ذریعے ان حکومتوں کو بھیجنے کے علاوہ دوسرے سفارت خانوں اور ذرائع ابلاغ کو بھی بھیجیں۔ مضمون میں کہا گیا تھا کہ غیر جانبدار تحریک کے ممبر مغربی اور مشرقی سامراجوں کے خلاف تو خوب بولتے ہیں لیکن اپنے ہی ایک بانی ممبر کی طرف سے ایک کروڑ افراد پر مشتمل ایک قوم کو بزور طاقت محکوم رکھنے کے جرم کی چشم پوشی کر رہے ہیں۔ مضمون میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں بھارت کے سامراجی کردار اور پاکستان کے غیر دانشمندانہ اقدامات کی تفصیل بتائی گئی تھی۔ اس سے قبل 1981ء میں دہلی میں غیر جانبدار تحریک کے وزرائے خارجہ کے اجلاس کے دوران بھی "مسئلہ کشمیر غیر جانبدار تحریک کے لئے ایک امتحان" (Kashmir Issue - A Test for Non-Aligned Movement) کے عنوان سے ایک طویل مضمون تمام وزرائے خارجہ کو بھیجا گیا تھا۔ اس میں بھی ان کے ضمیروں کو جھنجھوڑا گیا تھا اور اس کی کاپیاں بھی لندن میں دنیا بھر کے سفیروں، ذرائع ابلاغ اور بین الاقوامی تنظیموں کو بھیجی گئی تھیں۔

1983ء میں میں نے انگریزی میں ایک مضمون بعنوان "دس ناقابل تردید حقائق جو بھارتی لیڈروں کے عالم اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہونے کے مکارانہ دعوؤں کے پردے کے پیچھے چھپے ہوئے اصل بد صورت چہرے کو بے نقاب کرتے ہیں"

(TEN UN-DENAIBLE FACTS THAT EXPOSE INDIAN LEADERS' REAL UGLY FACE HIDDEN BEHIND THE VIEL OF THEIR HYPOCRITIC EXPRESSIONS OF GOODWILL AND FRIENDSHIP TOWARDS MUSLIMS AND THE MUSLIM WORLD)

لکھا اور اس کی کاپیاں مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ۔ لندن، اسلام آباد اور دہلی میں مسلم ممالک کے سفیروں، عالم اسلام کے ذرائع ابلاغ اور اسلامی تنظیموں کو بھیجنے کے علاوہ عید کے دن لندن کے اسلامک سینٹر میں بھی تقسیم کرائیں۔ مضمون میں دس ایسے حقائق اور واقعات کی تفصیل بتائی گئی تھی جن سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ بھارتی حکومت مسلمانوں اور عالم اسلام کی خیر خواہ نہیں بلکہ بدخواہ ہے۔ 1983ء کے وسط میں میں نے بھارتی عوام کے نام ایک طویل مراسلہ تیار کر کے اس کی سینکڑوں کاپیاں بھارت کے ممبران پارلیمینٹ، سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں اور ذرائع ابلاغ کو بھیجیں اور ان کی نقول لندن میں دنیا بھر کے سفارت خانوں کو بھی بھیجی گئیں۔ انگریزی میں لکھے گئے اس کھلے خط میں کہا گیا تھا کہ طویل وقت گزرنے، بھارت کے بلند بانگ دعوؤں اور بھارت اور پاکستان کے مابین ایک سے زیادہ تباہ کن جنگوں کے باوجود مسئلہ کشمیر کو دفن نہیں کیا جا سکا اس لئے کہ وقت جنگیں اور کھوکھلے دعوے انصاف کا متبادل ثابت

نہیں ہو سکتے۔ اس لئے یہ مسئلہ اس وقت تک بھارت اور پاکستان کے لئے درد سر بنا رہے گا جب تک اسے منصفانہ طور پر حل نہ کیا جائے اور ہماری نظر میں بھارت' پاکستان اور کشمیریوں کا مفاد اسی میں ہے کہ جبری طور پر منقسم ریاست جموں کشمیر کو دوبارہ متحدہ کر کے اسے ایک آزاد خود مختار مملکت بنایا جائے۔

ستمبر 1983ء میں بھارت کے اپوزیشن لیڈروں کا ایک اجلاس سری نگر میں ہونے والا تھا چنانچہ ہم نے "بھارت کے اپوزیشن لیڈروں کے نام کھلا خط" کے عنوان سے ایک طویل مراسلہ ان لیڈروں کے نام اور اس کی کاپیاں بھارتی اور کشمیری اخبارات کو بھیجیں۔ اس خط میں بھی یہ واضح کرتے ہوئے کہ پوری ریاست کی مکمل خود مختاری بھارت' پاکستان اور کشمیریوں کے مفاد میں ہے۔ ان لیڈروں سے اپیل کی کہ وہ اس نظریئے کی حمایت کریں۔

لبریشن فرنٹ کی طرف سے شبیر چوہدری کا لکھا ہوا کتابچہ (The Kashmir Issue) شائع کر کے اسے وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا۔ اس کتابچے میں بھی چوہدری صاحب نے مسئلہ کشمیر پر بھارت کے سامراجی موقف کا پردہ پوری طرح چاک کیا ہے۔ برطانیہ شاخ کے ممبر عظمت خان کے لکھے ہوئے بہت سے مضمون بھی وسیع پیمانے پر تقسیم ہوئے اور کچھ اخبارات میں شائع ہوئے۔ ہم نے کیلنڈر بھی شائع کئے۔ 81-1980ء کے کیلنڈر کے اوپر "ریاست جموں و کشمیر ہمارا جبری طور پر منقسم، محکوم، روندا گیا اور مسخ شدہ مادر وطن" لکھا ہوا تھا۔ دائیں طرف حاشئے میں مسئلہ کشمیر سے متعلق اہم حقائق اور بائیں طرف ریاست کے اہم تاریخی اور جغرافیائی حقائق لکھے ہوئے تھے جبکہ درمیان میں مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کی متعدد رنگین تصاویر تھیں۔ بعد کے سالوں میں پانچ اور کیلنڈر بھی شائع کر کے لندن میں دنیا بھر کے سفیروں' ذرائع ابلاغ اور ممبران پارلیمینٹ کو بھیجے۔ ہم نے کئی بار نئے سالوں کے کارڈ بھی شائع کر کے لندن میں دنیا بھر کے شہروں، ذرائع ابلاغ اور ممبران پارلیمنٹ کو بھیجے۔ ان کارڈوں میں انہیں سال نو کی مبارکباد دیتے ہوئے ان کی توجہ مسئلہ کشمیر اور کشمیریوں کی تحریک آزادی کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ ہم نے کئی بار عید کارڈ بھی شائع کئے جن میں عید مبارک کے ساتھ ساتھ کشمیریوں کو تحریک آزادی کے سلسلے میں ان کے قومی فرائض کی یاد دہانی کرائی۔

ہم نے مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے سٹیکر چھپوا کر آزاد کشمیر میں بڑی تعداد میں دیواروں پر چسپاں کرائے۔ نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاسوں کے دوران بھی ہمارے انگریزی میں بنے ہوئے سٹیکر اقوام متحدہ کی بیرونی عمارت کی دیوار' بجلی کے کھمبوں، بس اسٹینڈز' گرینڈ سنٹرل سٹیشن اور ان ہوٹلوں کے ارد گرد بھی چسپاں ہوتے رہے جہاں مختلف ملکوں کے وفود ٹھہرے ہوتے تھے۔

الغرض گزشتہ نو سال کے دوران مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر کے مختلف پہلوؤں

کے بارے میں جتنا لٹریچر ہم نے شائع کیا اور جس وسیع پیمانے پر تقسیم کیا' دوسری تمام کشمیری سیاسی پارٹیوں کی طرف سے شائع شدہ لٹریچر کا مجموعہ بھی اس کے عشر عشیر کے برابر نہیں۔

مظاہرے

1977ء میں لبریشن فرنٹ کے قیام سے اب تک ہم نے لندن' برمنگھم' نیویارک' ایمسٹرڈم' دی ہیگ' مغربی برلن' بون' پیرس' اور کوپن ہیگن میں تین درجن سے زیادہ احتجاجی مظاہرے کئے ہیں۔ جون 1981ء اور دسمبر 1982ء کے مظاہرے تو لندن' پیرس' ایمسٹرڈم اور کوپن ہیگن میں ایک ہی دن ہوئے جبکہ جون 1977ء میں لندن میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس کے دوران ہم نے مسلسل پانچ دن مظاہرے کئے ایک دن کچھ نوجوانوں نے انڈیا ہاؤس پر پتھراؤ کیا جس کے بعد ہمارے تین ممبر صدیق بھٹی محمد ناظم اور محمد ریاست کو گرفتار کیا گیا۔

جون 1983ء میں کوپن ہیگن میں بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے خلاف ہم نے اور سکھوں نے بہت بڑا مظاہرہ کیا۔

مارچ 1982ء میں جب بھارتی وزیر اعظم مسز گاندھی فیسٹویل آف انڈیا کے افتتاح کے لئے لندن آئیں تو ہم نے اور سکھوں نے مل کر ان کے خلاف اتنا شدید مظاہرہ کیا کہ رات نوبجے بی بی سی ٹیلیویژن کی قومی خبروں میں اس مظاہرے کو پہلے آئٹم کے طور پر دکھایا گیا اور مقبول بٹ صاحب کا فوٹو پورے سکرین پر پھیلا کر دکھایا گیا اور ساتھ ہی یہ عبارت بھی کہ اس کشمیری حریت پسند کو بھارتی حکومت پھانسی دینے والی ہے۔ اس خبر اور اسے اتنی اہمیت دینے پر مسز گاندھی نے برطانوی حکومت سے احتجاج بھی کیا۔ 1983ء میں مسز گاندھی غیر جانبدار تحریک کے ایک اجلاس کی صدارت کرنے ' اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرنے اور امریکی حکومت سے مذاکرات کرنے نیویارک گئیں۔ ہم نے وہاں اس کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور ہزاروں کی تعداد میں سٹیکر لگائے۔ نیویارک ٹیلیویژن کے چینل 47 نے مسز گاندھی کے اس دورے کے دوران ہمارے مظاہرے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ نے مسز گاندھی کے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔

26 فروری 1984ء کو لندن میں برطانیہ کی تمام کشمیری پارٹیوں اور دوسرے کشمیریوں نے مقبول بٹ شہید کی پھانسی کے خلاف تاریخی مظاہرہ کیا جو تقریباً دس ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ انڈیا ہاؤس کے نزدیک پہنچ کر ہمارا پولیس سے ٹکراؤ ہوا جس کے بعد پولیس نے میرے سمیت 38 افراد کو گرفتار کیا۔ ان گرفتار شدگان میں بھی سب سے زیادہ تعداد لبریشن فرنٹ کے ممبروں کی تھی۔

ہمارے باقی سارے مظاہرے بھارتی سفارت خانوں پر ہوئے البتہ نومبر 1981ء والا صرف لندن کے پاکستان سفارتخانے پر ہوا۔ یہ مظاہرہ میرپور آزاد کشمیر میں مظاہرین پر فائرنگ کے خلاف تھا۔ ایک مظاہرہ اس خبر پر کہ بھارت اور پاکستان کی حکومتیں دہلی میں جنوری 1983ء میں ہونے والی پاک بھارت کانفرنس کے دوران مسئلہ کشمیر کو معاہدہ شملہ کے تحت حل کرنا چاہتی ہیں۔ بھارت اور پاکستان دونوں کے سفارت خانوں پر ہوا اور دونوں حکومتوں سے احتجاجی مراسلوں میں کہا گیا کہ ہم معاہدہ شملہ کے تحت مسئلہ کشمیر کے کسی حل کو تسلیم نہیں کرتے کیونکہ اس میں نہ تو کشمیریوں کو مسئلہ کشمیر کا فریق تسلیم کیا گیا ہے اور نہ ہی ہمارے حق خوداراویت کا کوئی ذکر ہے۔

لندن میں ہمارے مظاہرے عام طور پر ہائیڈ پارک سے شروع ہوتے رہے ہیں۔ مظاہرین ہمارے مطالبات اور نظریات پر مشتمل کتبوں کے علاوہ ایک تابوت بھی اٹھائے ہوتے تھے جس پر کالے کپڑے پر "کشمیر میں بھارتی سامراج" لکھا ہوتا تھا اور مظاہرین "جبری ناطے توڑ دو کشمیر ہمارا چھوڑ دو"۔ "کشمیر ہمارا ہے سارے کا سارا ہے"۔ "کشمیریوں کی ایک پکار کشمیر بنے گا خودمختار"۔ "کشمیریوں کی آواز خودمختار کشمیر"۔ "بھارتی غاصبو کشمیر سے نکل جاؤ"۔ "جابر قابضو کشمیر سے نکل جاؤ"۔ "کشمیر میں غیر ملکی قابض فوج مردہ باد"۔ "قابض فوجیو کشمیر سے نکل جاؤ"۔ "ہم لے کے رہیں گے آزادی" وغیرہ کے نعرے (انگریزی اور اردو میں) لگتے اور تقریباً چار کلومیٹر کا سفر طے کر کے جب مظاہرین بھارتی سفارتخانے پر پہنچتے تو ان نعروں میں شدت آ جاتی اور مظاہرین انتہائی جذباتی ہو جاتے۔ بھارتی سفارتخانے پر پہنچتے ہی کھڑکیوں سے سفارتخانے والے ان مظاہروں کا نظارہ کرتے۔ سفارتخانے کو بھاری تعداد میں پولیس نے گھیرا ہوتا تھا۔ یہی طریقہ کار (بجز تابوت) یورپی ملکوں میں ہمارے ساتھی اختیار کرتے تھے۔ نیو یارک کے ایک مظاہرے میں بھی ہم تابوت اٹھا کر اقوام متحدہ کے سامنے مظاہرہ کرنے کے بعد اسے بھارتی مشن تک لے گئے تھے۔ مظاہروں کے دوران ہمارا لٹریچر بڑی مقدار میں تقسیم ہوتا تھا۔ ہم نے بہت سے مظاہرے سکھوں، افغانوں، فلسطینیوں اور جنوبی افریقہ والوں کے ساتھ مل کر بھی کیے۔

جلسے

لبریشن فرنٹ کے قیام سے اب تک ہم نے برطانیہ کے درجنوں شہروں کے علاوہ پیرس، ایمسٹرڈیم، دی ہیگ، کوپن ہیگن، نیو یارک، آزاد کشمیر اور پاکستان میں سینکڑوں جلسے کیے ہیں، ان جلسوں کے دوران مقررین ہمارے نظریات اور اغراض و مقاصد کے علاوہ دوسرے متعلقہ معاملات کے بارے میں ہمارے موقف کی وضاحت کرتے اور آخر میں شرکاء جلسہ کو لبریشن فرنٹ

کے نظریات و اغراض و مقاصد' اس کی کارکردگی اس کے ماضی حال اور مستقبل کے بارے میں سوال پوچھنے کی دعوت دی جاتی اور جلسے سے خطاب کرنے والا اہم ترین مقرر جو اکثر میں ہوتا تھا' ان سوالوں کا جواب دیتا' سوال و جواب کا یہ سلسلہ آگے چل کر لبریشن فرنٹ کا طرۂ امتیاز بن گیا کیونکہ کسی اور پارٹی نے یہ طریقہ کار اختیار کرنے کی جرأت نہیں کی۔ ان جلسوں کے دوران ہمارا لٹریچر بھی خاصی مقدار میں تقسیم ہوتا ہے دوسری کشمیری اور پاکستانی سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں اور دوسری تحاریک آزادی خاص کر پی ایل او۔ سواپو۔ شن فین اور تحریک خالصتان کے راہنماؤں کو بھی ہمارے جلسوں سے خطاب کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔

جولائی 1985ء میں یوم شہدائے کشمیر کے سلسلے میں برمنگھم کے ڈگبتھ ہال میں ہونے والے ہمارے جلسے سے جمہوریہ خالصتان کی جلاوطن حکومت کے صدر ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان اور وزیراعظم مسٹر گل نے بھی خطاب کیا ڈاکٹر چوہان نے قرآنی آیات اور احادیث کے حوالوں سے شہید کے رتبے کی وضاحت کی۔ کبھی کبھی دوسری سیاسی یا سماجی تنظیمیں مجھے مہمان مقرر کی حیثیت سے بھی مدعو کرتیں اور میں ان کے جلسوں سے خطاب کر کے لبریشن فرنٹ کے نظریات اور اغراض و مقاصد کی وضاحت بھی کرتا۔ ایک بار لندن کی پاکستانی بیرسٹرز ایوی ایشن نے بھی مجھے مہمان مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا اور میں نے لنکنز ان میں ان کے جلسے سے خطاب کیا۔ اسی طرح میں نے برطانیہ اور نیو یارک میں خالصتان کے حامی سکھوں کے جلسوں سے بھی خطاب کیا۔

کنونشن

ہماری تنظیم جمہوری قدروں میں یقین رکھتی ہے چنانچہ ہم نے اپنی تنظیم میں بھی جمہوری قدریں اپنائی ہیں اور شاخوں اور مرکز کے انتخابات باقاعدگی سے ہوتے رہتے ہیں۔ مرکز میں انتخابات کے سلسلے میں کنونشن بلائے جاتے رہے ہیں۔ ہمارا پہلا کنونشن 29 مئی 1977ء کو برمنگھم میں ہوا جس میں لبریشن فرنٹ وجود میں آیا۔

دوسرا کنونشن 1978ء میں برمنگھم میں ہوا' تیسرا بھی 1981ء میں برمنگھم میں ہوا۔ چوتھا 1982ء میں لیوٹن میں اور پانچواں 1985ء میں ہوا نیشنل زون کا پہلا کنونشن راولا کوٹ میں ہوا۔ 1985ء میں آئین میں ترمیم کے نتیجے میں دو کنونشنوں کی درمیانی مدت بڑھا کر چار سال کر دی گئی۔

ہمارے کنونشن کئی سیشنوں پر محیط ہوتے ہیں - پہلا اجلاس کنونشن کے متعلق کمیٹی کا ہوتا ہے جس میں وہ انتظامات کا جائزہ لیتی ہے۔ اس کے بعد پہلا سیشن ہوتا ہے جس میں استقبالیہ

کمیٹی کے چیئرمین خطبہ استقبالیہ پڑھتے ہیں جس میں مسئلہ کشمیر، تحریک آزادیٔ کشمیر اور خود لبریشن فرنٹ سے متعلق معاملات کے بارے میں ایک جائزہ پیش ہوتا ہے اس کے بعد سیکرٹری جنرل سابقہ کنونشن سے اس کنونشن تک لبریشن فرنٹ کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرتے ہیں اس کے بعد مالی رپورٹ پیش ہوتی ہے۔ جس کے بعد مندوبین اپنی تقریروں میں اس رپورٹ اور فرنٹ کی کارکردگی کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور کمزوریوں اور غفلتوں کی نشاندہی کرنے کے علاوہ کامیابیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں اس کے بعد انتخابات کے سلسلے میں لابینگ کرنے کے لئے وقفہ ہوتا ہے اور بعد ازاں عہدیداروں کے انتخابات انتہائی جمہوری انداز میں ہوتے ہیں۔ انتخابات کے سلسلے میں ہم نے برطانوی کی بجائے فرانسیسی طریقہ اپنایا ہے جس کے نتیجے میں اکثریت کی حمایت کا حامل امیدوار ہی منتخب ہوتا ہے جبکہ برطانوی طریقہ کار اور برصغیر میں رائج طریق کار کے مطابق بھی اقلیت کی حمایت کا حامل امیدوار بھی منتخب ہو سکتا ہے اور اکثر ہوتا ہے۔

انتخابات کے بعد کھانے کا وقفہ ہوتا ہے اور اس کے بعد جلسہ عام۔ اس جلسہ عام میں مندوبین کے علاوہ مبصرین اور مدعوبین خصوصی بھی شرکت کرتے ہیں دوسری پارٹیوں کے ممبر اور رہنماؤں کے علاوہ دوسری تحاریک آزادی کے نمائندے بھی شریک ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے نومنتخب عہدیداروں اور ممبران مجلس عاملہ کا حلف وفاداری ہوتا ہے۔ اس کے بعد تقریریں ہوتی ہیں۔ اور اسی دوران مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر سے متعلق لبریشن فرنٹ کے موقف، دیگر متعلقہ معاملات، بین الاقوامی معاملات اور دوسری تحاریک آزادی کے حق میں قرار دادیں پیش ہوتی ہیں۔ کنونشن کا ہال لبریشن فرنٹ کے نظریات اور مطالبات پر مشتمل کتبوں اور بینرز اور شہیدوں اور مشہور حریت پسندوں کی تصویروں سے مزین ہوتا ہے۔ تنظیم کی استقبالیہ کمیٹی اور والنٹیر کور کے ممبر متعلقہ بیج لگا کر مستعدی سے اپنا کام کرتے ہیں۔ کنونشن کے دوران ہمارا لٹریچر خاصی مقدار میں کچھ مفت تقسیم اور کچھ فروخت ہوتا ہے۔

میرے مختلف ممالک کے دورے

میں نے لبریشن فرنٹ کے قیام سے اب تک تحریک آزادی کے سلسلے میں برطانیہ کے ان تمام شہروں کے کئی دورے کیے ہیں جہاں کشمیری آباد ہیں۔ ان میں لندن، وٹفورڈ، لیوٹن، بیڈ فورڈ، پیٹر برا، کونٹری، برمنگھم، والسل، مانچسٹر، اولڈہم، برنلے، کیتھلے، ہیلی فیکس، راچڈیل، شیفیلڈ، پرسٹن، بلیک برن، بریڈ فورڈ، ایکرنگٹن اور گلاسگو وغیرہ شامل ہیں۔ ہر شہر میں تنظیم کے اجلاسوں کے علاوہ جلسوں سے بھی خطاب کیا ہے۔

برطانیہ کے مختلف شہروں کے ان دوروں کے علاوہ میں چار بار نیو یارک، چار بار

ایمسٹرڈم (ہالینڈ) دوبار دی ہیگ (ہالینڈ) ایک بار روٹرڈم (ہالینڈ) تین بار کوپن ہیگن (ڈنمارک) ایک ایک بار مغربی برلن اور سٹٹ گارڈ (مغربی جرمنی) دو بار پیرس (فرانس) دو بار جدہ اور دہران (سعودی عرب) اور ایک ایک بار ابو ظہبی، شارجہ، راس الخیمہ، دبئی اور کویت گیا ہوں - یہ سب دورے تحریک اور تنظیم کے سلسلے میں کیے۔

مندکرہ بالا ممالک کے علاوہ میں مصر، بحرین، قطر، شام، اردن، ترکی، مشرقی جرمنی، بیلجیم اور جمہوریہ آئرلینڈ بھی گیا ہوں لیکن یہ دورے یا تو سیاسی کے علاوہ نجی بھی تھے یا دوران سفر وہاں سے گذرا اور وہاں عارضی قیام ہوا ہے۔

مقبول بٹ کی رہائی کے لئے ہماری کوششیں

اواخر 1975ء کی ایک رات میں اور مقبول بٹ صاحب، ڈاکٹر فاروق حیدر کے ہاں این ایل ایف کے معاملات پر تبادلہ خیال کر رہے تھے جس کے دوران بٹ صاحب نے مقبوضہ کشمیر جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے اس خیال کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ رات بھر کی اس بحث کے دوران کئی بار ماحول تلخ بھی ہو گیا۔ میرا استدلال تھا کہ اگر بٹ صاحب مقبوضہ کشمیر میں گرفتار ہو گئے تو بھارتی حکومت انہیں 1968ء میں سنائی جانے والی سزائے موت کو عملی جامہ پہنائے گی اس کے برعکس بٹ صاحب کا کہنا تھا کہ جس مقصد کے لیے وہ مقبوضہ کشمیر جا رہے ہیں اسے کوئی دوسرا حاصل نہیں کر سکتا۔ دوسرے دن بٹ صاحب کی ایبٹ آباد روانگی کے وقت بھی میری اور بٹ صاحب کی تلخ کلامی ہوئی۔ بہرحال میں کراچی آ گیا اور کئی ماہ تک راولپنڈی کی طرف نہ جا سکا۔ کبھی کبھی ڈاکٹر فاروق صاحب سے فون پر بات ہوتی تھی لیکن انہوں نے بٹ صاحب کے مقبوضہ کشمیر جانے کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

اسی دوران میں نے برطانیہ جانے کے لیے 20 جون 1976ء کے لیے سیٹ بک کرائی۔ 18 جون 1976ء کو مجھے لاہور سے محاذ رائے شماری کے سیکرٹری جنرل جی ایم میر صاحب نے فون پر اطلاع دی کہ بٹ صاحب مقبوضہ کشمیر پہنچ گئے ہیں۔ میں نے اسی رات فون پر ڈاکٹر فاروق حیدر سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن ان سے رابطہ نہ ہو سکا۔ دوسرے دن جی ایم میر صاحب خود کراچی پہنچ گئے اور انہوں نے خبر سنائی کہ بٹ صاحب مقبوضہ کشمیر میں اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہو گئے ہیں۔ مجھ پر تو جیسے بجلی گری اس لئے کہ مجھے اس کے نتائج کا پورا اندازہ تھا۔ میں اس دن اور رات بھر سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے برطانیہ جانا چاہئے کیونکہ میں وہاں بٹ صاحب اور ساتھیوں (حمید بٹ اور ریاض ڈار) کی رہائی کے لئے پاکستان کی نسبت زیادہ مؤثر کام کر سکوں گا۔ چنانچہ دوسری صبح میں برطانیہ کے لئے

روانہ ہو گیا۔ لندن ایئرپورٹ پر محاذ رائے شماری کے صدر عبدالخالق انصاری صاحب اپنے بہت سے ساتھیوں کے ساتھ میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔ لندن سے برمنگھم کے سفر کے دوران انہوں نے بھی بٹ صاحب کے اس اقدام پر غصے اور گرفتاری پر افسوس کا اظہار کیا۔ چند دن کے بعد گلاسگو کے بابو عبدالرحیم صاحب نے سرینگر کے اخبارات کا ایک بنڈل بھیجا جن میں بٹ صاحب کی گرفتاری کی تفصیلات کے علاوہ محاذ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) کی طرف سے بٹ صاحب سے لاتعلقی کے اعلان کی خبر بھی شہ سرخیوں میں شائع ہوئی تھی۔ محاذ رائے شماری کے اس اعلان کا مجھے علم ہی نہیں تھا۔ اس پر میرے علاوہ انصاری صاحب کو بھی انتہائی دکھ ہوا۔ بھارتی حکومت نے اس خبر کی کشمیری اخبارات میں وسیع تشہیر کرائی تاکہ مقبوضہ کشمیر کے عوام کے دلوں میں بٹ صاحب کے کردار کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہو گئی۔ یہاں تک کہ ان شکوک و شبہات کو ہماری آٹھ سال کی کوششیں بھی پوری طرح رفع نہ کر سکیں۔

1976ء سے 84ء میں بٹ صاحب کی شہادت تک ہم نے خاص کر میں نے ان کی رہائی کے لئے جو کوششیں کیں اگر ان کی تفصیل بیان کی جائے تو یہ تفصیل بجائے خود ایک ضخیم کتاب بن جائے گی اس لئے میں ان کوششوں کا ذکر انتہائی مختصر پیرائے میں کروں گا۔

مئی 1977ء کے اواخر میں لبریشن فرنٹ کے قیام سے پہلے بھی میں نے محاذ رائے شماری برطانیہ اور این ایل ایف کی طرف سے بین الاقوامی تنظیموں اور دنیا بھر کی حکومتوں کو بٹ صاحب کی سزائے موت کے اصل پس منظر سے خطوط کے ذریعہ آگاہ کیا تھا۔ جون 1977ء میں لندن میں ہونے والی دولت مشترکہ کے ممالک کی وزرائے اعظم کانفرنس کے دوران ہم نے لندن میں پانچ دن تک مسلسل مظاہرے کئے اور اس دوران وزرائے اعظم کو بھیجی جانے والی یادداشت اور لوگوں میں تقسیم کئے جانے والے پمفلٹ میں بھی بٹ صاحب کی سزائے موت کے پس منظر کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے ان کی رہائی کے لئے بھارتی وزیراعظم پر دباؤ ڈالنے کی اپیل کی گئی۔

1978ء میں خبر آئی کہ بھارتی سپریم کوٹ نے بٹ صاحب کی سزائے موت بحال کر دی ہے اس پر ہم نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل، غیر جانبدار تحریک، اسلامی کانفرنس اور انسانی حقوق کے عالمی کمیشن کو تار اور مراسلے بھیجے۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے ہمارا خط انسانی حقوق کے عالمی کمیشن کو بھیجا۔ جس کی طرف سے ہمیں خط آیا کہ انہوں نے اس سلسلے میں بھارتی حکومت سے وضاحت طلب کی ہے۔ کچھ مدت بعد ہماری طرف سے کمیشن کو یاددہانی کے خط کے جواب میں ہمیں کمیشن والوں نے لکھا کہ بھارتی حکومت اس کے خط کا جواب ہی نہیں دے رہی ہے۔ اس اثناء میں ہم نے بٹ صاحب کا مسئلہ ایمنسٹی انٹرنیشنل میں اٹھایا۔ ایمنسٹی والوں نے اس معاملے کے بارے میں اپنی طرف سے تحقیقات کرنے کے بعد اپنے صدر دفتر اور

دنیا بھر میں اپنی شاخوں کی طرف سے بھارتی حکومت کو احتجاجی تار اور خط بھجوائے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی طرف سے بھارتی حکومت کو بھیجی جانے والی یادداشتوں کا یہ سلسلہ فروری 84ء میں بٹ صاحب کی شہادت تک جاری رہا۔

ہم نے مقبوضہ کشمیر کے اخبارات کے نام تاروں اور مراسلات کے ذریعہ وہاں کے عوام اور سیاسی پارٹیوں سے بھی اپیل کی کہ وہ بھی بٹ صاحب کی سزائے موت کے خلاف آواز اٹھائیں۔ ہماری کوششوں کے نتیجے میں برطانیہ کی دوسری کشمیری سیاسی پارٹیوں نے بھی بھارتی حکومت کو احتجاجی تار بھیجے - اِدھر میں نے برطانیہ کے صحافیوں کی انجمن کی ممبر شپ حاصل کی تھی۔ چنانچہ میں نے بٹ صاحب کا مسئلہ وہاں بھی اٹھایا اور جب انہیں پتہ چلا کہ بٹ صاحب صحافی تھے تو انہوں نے بھی بھارتی حکومت کو تار بھیجے اور مراسلے بھی۔ میں نے 79ء 80ء اور 83ء میں اپنے قیام نیو یارک کے دوران اقوام متحدہ میں دنیا بھر کے سفیروں' ذرائع ابلاغ اور دنیا بھر کے وفود کو بھی بٹ صاحب کے بارے میں یادداشتیں بھیجیں۔ اقوام متحدہ کے ڈائریکٹر تعلقات عامہ مسٹر شیری سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ہماری طرف سے اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کے سامنے ہونے والے مظاہروں کے دوران بھی ہم بٹ صاحب کے بارے میں تیار کئے گئے پمفلٹس بڑی تعداد میں تقسیم کرتے رہے۔

1981ء میں خبر آئی کہ بٹ صاحب کو تہاڑ جیل کی پھانسی کی کوٹھڑی میں منتقل کیا گیا ہے چنانچہ ہم نے نئی دہلی' ہالینڈ اور بیلجیم میں کچھ ایسے اقدامات کئے جنہوں نے بھارتی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا - ادھر ہماری درخواست پر پی ایل او کے سربراہ یاسر عرفات اور لیبیا کے صدر قذافی نے بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے اپیل کی کہ وہ بٹ صاحب کو پھانسی نہ دیں۔ ہماری ڈنمارک کی شاخ کی کوششوں سے وہاں کی پارلیمنٹ کے پچاس ممبروں نے جن میں ہر سیاسی پارٹی کے سربراہ شامل تھے مسز گاندھی سے مطالبہ کیا کہ وہ مقبول بٹ کو پھانسی دینے کا فیصلہ منسوخ کریں۔ اس دوران ہماری مقامی شاخوں نے لندن' ڈنمارک' ہالینڈ' مغربی جرمنی اور نیویارک میں بھارتی سفارت خانوں کے سامنے زبردست مظاہرے کئے۔ ادھر مقبوضہ کشمیر میں بٹ صاحب کی سزائے موت کے خلاف اٹھنے والی آوازوں میں بھی شدت پیدا ہو گئی اس سلسلے میں پیپلز کانفرنس کے سربراہ عبدالغنی لون صاحب اور محاذ آزادی نے بڑی محنت کی۔ چنانچہ ان معاملات کے نتیجے میں بھارتی حکومت بٹ صاحب کو پھانسی کی سزا دینے کی جرات نہ کر سکی۔ اسی دوران بٹ صاحب نے بھارت کی سپریم کورٹ سے رجوع کیا تو میں نے اور کوٹلی کے حاجی غلام سرور صاحب مقیم لیوٹن برطانیہ نے ذاتی کوششوں سے تقریباً 15 سو پونڈ (تقریباً 23 ہزار بھارتی روپے جمع کر کے) بٹ صاحب کو تہاڑ جیل بھیج دیئے۔ حاجی صاحب کے بٹ صاحب سے گہرے ذاتی تعلقات تھے اور وہ ان سے تہاڑ جیل دہلی میں ملاقات بھی کر آئے تھے میرا بٹ صاحب سے رابطہ

حاجی صاحب کے ذریعہ ہی تھا۔

82ء اور 83ء کے دوران بھی ہم نے بٹ صاحب کی رہائی کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ 82ء میں ہم نے نئی دہلی میں ایک ایسی کاروائی کی جس نے بھارتی حکومت کو تو ہلا کر رکھ دیا لیکن ہم بٹ صاحب کو آزاد نہ کرا سکے۔ اس سلسلے میں ہمارا ایک اور انتہائی جرأت مندانہ اقدام بھی ایک اتفاقیہ معاملے اور اقدام کرنے والوں میں غلط فہمی کی وجہ سے ناکام ہوا۔

روزنامہ ''ٹائمز آف انڈیا'' (14 فروری 84ء) کے مطابق بھارتی کابینہ کی ایک خصوصی کمیٹی نے جنوری 84ء میں مسز اندرا گاندھی کی صدارت میں ہونے والے ایک اجلاس میں فیصلہ کیا تھا کہ مقبول بٹ کو خاموشی سے پھانسی دی جائے۔

اُدھر لبریشن فرنٹ کے کچھ ممبروں نے میری اور تنظیم کی منظوری اور علم کے بغیر ہی کشمیر لبریشن آرمی نام کی ایک خفیہ تنظیم بنائی اور برمنگھم میں بھارت کے اسسٹنٹ ہائی کمشنر رویندر امہاترے کو اغوا کر لیا۔ اغوا کنندگان نے اعلان کیا کہ اگر بھارتی حکومت نے 24 گھنٹے کے اندر اندر مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں حمید اور ریاض اور مقبوضہ کشمیر کے جیلوں میں قید دوسرے حریت پسندوں کو رہا نہ کیا تو مہاترے کو قتل کر دیا جائے گا۔ میں نے واقع کی اطلاع ملنے اور اس پر خاصا غور و خوض کرنے کے بعد بھارتی صحافیوں کے علاوہ بی بی سی اور رائٹر نیوز ایجنسی لندن کے ذریعہ اور پھر براہ راست لندن میں بھارتی ہائی کمشنر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تا کہ اس مسئلے کا حل نکالا جا سکے لیکن بھارتی ہائی کمیشن نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ اگر ہم نے امان اللہ سے بات چیت کی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے لبریشن فرنٹ کو تسلیم کیا ہے۔ بہر حال بھارتی ہائی کمیشن ٹالتا رہا یہاں تک کہ دوسرے دن مجھے زبیر الحق انصاری اور ہاشم قریشی سمیت لبریشن فرنٹ کے بہت سے اہم ممبروں کو گرفتار کیا گیا اس طرح میری کوششوں کا سلسلہ بالکل کٹ گیا۔

اُدھر جب اغوا کنندگان کی طرف سے 24 گھنٹے کی بجائے 54 گھنٹے انتظار کرنے کے باوجود کوئی جواب نہیں ملا تو مہاترے کو قتل کیا گیا جس کی اطلاع پولیس نے مجھے پولیس اسٹیشن میں دی جہاں میں زیر حراست تھا۔

اِدھر زبیر الحق نے پولیس کی حراست سے رہا ہوتے ہی میری گرفتاری کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ کر دی تھی اور پولیس کو مہاترے کے اغواء میں میرے ملوث ہونے کا کوئی ثبوت نہیں مل رہا تھا چنانچہ مجھے اور ہاشم قریشی کو 72 گھنٹے حراست میں رکھنے کے بعد عدالت کے حکم پر رہا کر دیا گیا۔ اسی رات بی بی سی کی عالمی سروس نے خبر دی کہ بھارتی حکومت نے بٹ صاحب کو پھانسی دینے کا فیصلہ کیا ہے اور 11 فروری کو انہیں پھانسی دی جا رہی ہے۔ یہ سن کر ہم پر بجلی سی گری - اس وقت ہاشم قریشی اور افضل طاہر بھی میرے پاس تھے - 9 فروری کو میں نے فارن

پریس ایسوسی ایشن لندن میں پریس کانفرنس کی اور کہا کہ مقبول بٹ کو ناکردہ گناہوں کی سزا دی جارہی ہے کیونکہ مہاترے کے اغواء میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اُدھر بٹ صاحب کے وکیل مظفربیگ نے بھارتی سپریم کوٹ سے رجوع کیا تو اس نے آئینی اور قانونی اصولوں کی دھجیاں اڑاتے ہوئے رٹ نا منظور کی۔ 10 فروری کو ہم نے لندن، برمنگھم، ڈنمارک، ہالینڈ، پیرس اور مغربی جرمنی میں بھارتی سفارت خانوں پر زبردست مظاہرے کرائے۔ ہم لندن میں انڈیا ہاؤس کے سامنے مظاہرہ کر رہے تھے کہ بی بی سی کے نمائندے رابن ڈ لکز نے آکر مجھے اطلاع دی کہ ابھی ابھی رائٹر نے دہلی سے اطلاع دی ہے کہ بھارتی سپریم کورٹ نے بٹ صاحب کی پھانسی سے متعلق حکم امتناعی کی درخواست بھی مسترد کر دی ہے۔

ہم شام کو گھر پہنچے اور رات بھر جاگتے رہے۔ برطانیہ کے وقت کے مطابق رات 2 بجے اور بھارتی وقت کے مطابق صبح ساڑھے سات بجے بی بی سی کی عالمی سروس کی پہلی ہی خبر یہ تھی کہ کشمیری حریت پسند مقبول بٹ کو انتہائی سخت حفاظتی انتظامات کے تحت تہاڑ جیل دہلی میں تختہ دار پر چڑھایا گیا۔انا للہ وا انا الیہ راجعون

بٹ صاحب کے تختہ دار پر چڑھنے کے کوئی دس دن بعد لبریشن فرنٹ کے ممبر راجہ عبدالقیوم کو گرفتار کر کے اس کے خلاف مہاترے کے اغواء اور قتل میں ملوث ہونے کے الزام میں کیس رجسٹر کیا گیا اور اس کے چند دن بعد محمد صدیق بھٹی، مجید انصاری، جہانگیر اختر مرزا اور ان کے کئی دن بعد ریاض ملک کو گرفتار کر کے ان سب کے خلاف بھی کیس رجسٹر کیا گیا۔ چند دن بعد راجہ قیوم کے رشتہ دار راجہ اسحاق کو بھی گرفتار کر کے ضمانت پر رہا کیا گیا۔ تقریباً تیرہ ماہ کے بعد گرفتار شدگان میں سے راجہ قیوم اور ریاض ملک کو عمر قید، صدیق بھٹی کو بیس سال، جہانگیر مرزا کو تین سال اور مجید انصاری کو دو سال کی سزائیں سنائی گئیں۔ راجہ اسحاق کو پانچ سو پونڈ جرمانہ کیا گیا۔ مجید انصاری اور جہانگیر مرزا سزا کاٹ کر رہا ہو گئے ہیں جبکہ صدیق بھٹی، ریاض ملک اور راجہ قیوم ابھی تک قید ہیں۔

جیسا کہ اس باب کے شروع میں کہا گیا ہے ہم نے مقبول بٹ شہید کی رہائی کے لئے جو کوششیں کیں ان کی پوری تفصیل بیان کی جائے تو وہ بذات خود ایک کتاب بن جائے گی۔ اس لئے میں نے انتہائی اختصار سے کام لیا ہے ہمیں انتہائی افسوس ہے کہ ان تمام کوششوں کے باوجود ہم اپنے اس عظیم حریت پسند ساتھی کو تختۂ دار سے نہ بچا سکے۔

بٹ صاحب کی شہادت کے بعد ہمارے نیشنل زون (آزاد کشمیر اور پاکستان میں ہماری شاخوں) نے بٹ صاحب کی حبُ الوطنی۔ ان کی حریت پسندی اور جراُت الغرض ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں سے متعلق معاملات ان کی شہادت پر لکھے جانے والے اداریوں اور تبصروں اور مضامین پر مشتمل کتابچے شائع کر کے وسیع پیمانے پر تقسیم کئے تا کہ قوم خاص کر نئی نسل اور

آئندہ نسلیں ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں کے بارے میں با خبر رہیں - میں نے بھی ان کی شخصیت پر ایک کتابچہ لکھا - ہم ہر سال 11 فروری کو بٹ صاحب کا یوم شہادت پورے احترام سے مناتے اور ان کے مشن کی تکمیل کے لئے جدوجہد جاری رکھنے کا عزم کا اعادہ کرتے ہیں۔

مقبول بٹ شہید جدید کشمیر کے عظیم ترین سپوتوں میں سے ایک تھے انہوں نے قوم کو آزادی کی منزل کی طرف جانے والے صحیح راستے کی نشاندہی کی اور اسی راہ پر چلتے ہوئے آزادیٔ وطن پر اپنی جان قربان کر دی - آسماں تری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

تنظیمی معاملات

شاخوں کا قیام:-

مئی 1977ء میں لبریشن فرنٹ کے قیام کے وقت اس کی پیشرو تنظیم محاذ رائے شماری (برطانیہ) کے ممبروں کے تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی اور ان میں سے بھی اکثر افراد میرپور کی ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے ابتدا میں اپنی زیادہ تر توجہ تنظیم کے پھیلاؤ اور اس کے صرف ایک برادری کی تنظیم ہونے کے تاثر کو ختم کرنے پر صرف کی چنانچہ ایک سال کے اندر اندر ہماری تنظیم برطانیہ کے مختلف شہروں تک پھیل گئی اور اس میں آزاد کشمیر کی ہر برادری اور ہر علاقے کے لوگ شامل ہونے لگے اس کے بعد میں نے یورپ کے دوسرے ممالک' امریکہ اور مشرق وسطیٰ میں اس کی شاخیں قائم کیں۔ چنانچہ چند سال کے اندر اندر ہماری تنظیم کی شاخیں' نیویارک' ہالینڈ' مغربی جرمنی' ڈنمارک' فرانس' سعودی عرب' متحدہ عرب امارات اور کویت میں بھی قائم ہوئیں۔ ہالینڈ ' مغربی جرمنی اور سعودی عرب میں تو دو دو شاخیں قائم ہوئیں۔

1982ء میں آزاد کشمیر و پاکستان میں بھی تنظیم کی شاخیں قائم ہوئیں۔

لبریشن فرنٹ کے ذرائع آمدنی میں سب سے بڑا ذریعہ ممبروں کی طرف سے ملنے والے عطیات ہوتے ہیں ہمارے مشرق وسطیٰ اور یورپ کے اکثر ممبر اس سلسلے میں اعلیٰ درجے کی حب الوطنی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اپنے ممبروں کے علاوہ کچھ دیگر کشمیری اور پاکستانی بھی ہماری مالی مدد کرتے رہے ہیں۔

محاذ رائے شماری سے اختلاف

محاذ رائے شماری میں ایک مضبوط گروپ 1966ء سے ہی میرا اور این ایل ایف سے وابستہ دوسرے افراد خاص کر مقبول بٹ کا سخت مخالف تھا۔ اس مخالفت کی وجہ این ایل ایف کا قیام اور مسلح جدوجہد کے بارے میں ہمارے واضح نظریات تھے۔ ابتداء میں اس گروپ کی قیادت میر عبدالعزیز کر رہے تھے۔ ان کی محاذ سے علیحدگی کے بعد جی ایم میر، اکرام اللہ جسوال کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے ہی مئی 1976ء میں مقبول بٹ کی مقبوضہ کشمیر روانگی کے بعد میری غیر حاضری میں محاذ کی مجلس عاملہ میں مقبول بٹ سے ہی نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر مسلح جدوجہد کے نظریئے سے ہی لا تعلقی کی قرار داد پیش کر کے اسے منظور کروایا تھا۔ جون 1976ء میں میری برطانیہ روانگی اور مئی 1977ء میں وہاں لبریشن فرنٹ کے قیام کے بعد محاذ کے اندر اس گروپ نے میرے خلاف آسمان سر پر اٹھایا۔ لبریشن فرنٹ کے قیام کو میری طرف سے محاذ کے خلاف بغاوت اور غداری قرار دے کر مجھ سے انتہائی سخت الفاظ میں تحریری طور پر جواب طلبی بھی کی۔ گو لبریشن فرنٹ کے قیام میں عبدالخالق انصاری بھی برابر کے شریک تھے لیکن جواب طلبی صرف مجھ سے کی گئی لیکن جونہی لبریشن فرنٹ بین الاقوامی سطح پر سرگرم ہو گیا اور اس کی سرگرمیاں اخبارات کی زینت بننے لگیں تو محاذ والے اپنے سابقہ رویے کو بھول کر ہماری یعنی لبریشن فرنٹ کی کامیابیوں کو اپنے کھاتے میں ڈالنے لگے۔ محاذ رائے شماری کے بااثر افراد کی طرف سے میری بے جا مخالفت کے باوجود میرا عبدالخالق انصاری صاحب سے (ان کے قیام برطانیہ کے دوران ہی) اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا تھا کہ لبریشن فرنٹ بین الاقوامی سطح پر کام کرے اور محاذ رائے شماری آزاد کشمیر و پاکستان میں۔ اس سلسلے میں میری بنیادی شرط یہ تھی کہ محاذ رائے شماری اپنے اندرونی انتشار اور جمود کو ختم کر کے متحرک ہو جائے اور مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کے بارے میں مناسب لائحہ عمل اپنائے لیکن محاذ نہ تو اپنے اندرونی انتشار کو ختم کر سکا اور نہ ہی متحرک ہوا۔ جس کی وجہ سے ہمیں بین الاقوامی سطح پر بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ جب ہم کسی ملک کے سفیر یا وزیر خارجہ سے ملتے اور اس سے کشمیریوں کے حق خودارادیت کی حمایت طلب کرتے تو اس کا سب سے پہلا سوال یہی ہوتا کہ اندرون ریاست آپ کی تنظیم کی کیا پوزیشن ہے ہم اسے کہتے کہ اندرون ریاست ہماری سسٹر آرگنائزیشن (Sister Organisation) محاذ رائے شماری کام کر رہی ہے۔ وہ وزیر خارجہ اسلام آباد میں اپنے سفیر سے محاذ رائے شماری کے بارے میں رپورٹ طلب کرتا اور جب اسے یہ جواب ملتا کہ محاذ رائے شماری نام کی کسی تنظیم کا وجود تو ہے لیکن اس کی سرگرمیاں کہیں نظر نہیں آتیں تو اس صورت حال سے ہمیں پریشانی ہی نہیں خفت بھی اٹھانی پڑتی۔ ایک ملک کے سفیر نے ہمیں ہر قسم کی مدد دینے کا وعدہ کیا لیکن جب

اسلام آباد میں اس ملک کے سفیر کی طرف سے اسے محاذ رائے شماری کے بارے میں متذکرہ بالا رپورٹ ملی تو ہمیں مدد ملنے کی بجائے شرمندگی اٹھانی پڑی ۔ میں محاذ رائے شماری والوں کو مسلسل لکھتا رہا کہ وہ منظم و متحرک ہو جائیں لیکن انہوں نے میری گذارشات کا کوئی نوٹس نہیں لیا ۔ چنانچہ مئی 1980ء میں میں خود پاکستان و آزاد کشمیر آیا اور میری درخواست پر محاذ رائے شماری کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا گیا۔ محاذ پر مسلط جمود کا یہ حال تھا کہ مجلس عاملہ کا یہ اجلاس تیرہ ماہ کے بعد ہو رہا تھا اور وہ بھی میری درخواست پر حالانکہ محاذ کے آئین کے مطابق زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کے بعد اجلاس ہونا لازمی ہے میں نے محاذ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں محاذ پر مسلط جمود کے نتیجے میں ہمارے لئے پیدا ہونے والی مشکلات کی وضاحت کرنے کے بعد تجویز پیش کی کہ لبریشن فرنٹ اور محاذ کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے اس کا نام بھی لبریشن فرنٹ رکھا جائے تاکہ ہم سب ایک ہی پروگرام ایک ہی پالیسی اور ایک ہی جھنڈے تلے کام کریں ۔ میں نے کہا کہ اگر محاذ والے اس تجویز سے اختلاف کرتے ہیں تو پھر دونوں تنظیموں کے درمیان ایک باقاعدہ اور تحریری معاہدہ ہونا چاہئے کہ وہ ایک دوسرے سے تعاون اور ایک دوسرے کے مشوروں اور تجاویز پر عمل کریں گے لیکن دونوں تجاویز کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ محاذ رائے شماری اپنے اندرونی انتشار کو ختم کرے اور پوری طرح متحرک ہو جائے۔ میں نے اس اجلاس میں بھی اور بعد میں ایک استقبالیہ کے دوران اپنی تقریر میں بھی محاذ والوں پر پوری طرح واضح کیا کہ اگر وہ اپنے اندرونی انتشار کو ختم کر کے پوری طرح متحرک نہیں ہوئے تو ہم یعنی لبریشن فرنٹ آزاد کشمیر و پاکستان میں اپنی شاخیں قائم کریں گے۔ محاذ والوں نے ہم سے وعدہ کیا کہ وہ اپنی جنرل کونسل کے آئندہ اجلاس میں ان تجاویز پر غور کر کے ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔ محاذ کا اگلا کنونشن 1981ء میں کوٹلی میں ہوا لیکن اس میں ان تجاویز کو زیر بحث لایا ہی نہیں گیا حالانکہ میں نے اس موقعے پر محاذ کی جنرل کونسل کے ممبروں کے نام ایک خط بھی بھیجا تھا اور محاذ کے سیکرٹری جنرل سے گذارش کی تھی کہ وہ یہ خط اجلاس کے دوران پڑھ کر سنائیں لیکن ایسا نہیں کیا گیا بلکہ اجلاس میں بعض مقررین نے میری ذات پر رکیک حملے کئے۔ اس طرح محاذ رائے شماری کے ساتھ کوئی تنظیمی رابطہ رکھنے کی میری یہ آخری کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ یہی نہیں بلکہ اس کنونشن کے فوراً بعد محاذ رائے شماری والوں نے لبریشن فرنٹ کو اندرونی انتشار سے دو چار کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اس سلسلے میں فرنٹ کے صدر جبار بٹ صاحب کو استعمال کیا گیا (تفصیلات لبریشن فرنٹ میں اندرونی انتشار کے عنوان کے تحت) 18 اپریل کو برمنگھم میں ہونے والے لبریشن فرنٹ کی مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس میں (محاذ رائے شماری کی حامی لابی کی طرف سے شدید ترین مخالفت کے باوجود) دو تہائی سے زیادہ اکثریت سے فیصلہ ہوا کہ لبریشن فرنٹ کو آزاد کشمیر و پاکستان میں اپنی شاخیں قائم کرنی چاہئیں ۔ چونکہ میں مقبوضہ کشمیر سے آئی ہوئی اپنی

ہمشیرہ سے ملنے پاکستان آ رہا تھا اور فرنٹ کے سیکرٹری جنرل افتخار احمد خان بھی ذاتی دورے پر آزاد کشمیر آ رہے تھے اس لئے مجلس عاملہ نے ہمیں ہدایت کی کہ ہم اپنے قیام آزاد کشمیر و پاکستان کے دوران یہاں فرنٹ کی شاخیں قائم کریں۔

ہمارے اس فیصلے سے پہلے محاذ رائے شماری میں این ایل ایف کے حامی گروپ نے محاذ رائے شماری سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن وہ یہ فیصلہ ابھی نہیں کرپائے تھے کہ آیا انہیں محاذ رائے شماری سے الگ ہو کر این ایل ایف (جس کی سرگرمیوں پر محاذ نے پابندی لگائی تھی) کو دوبارہ زندہ کریں، کوئی اور تنظیم بنائیں یا لبریشن فرنٹ میں شامل ہو جائیں۔

میں جب پاکستان پہنچا تو یہاں محاذ رائے شماری والوں نے لوگوں کو یہ تاثر دیا تھا کہ لبریشن فرنٹ اور محاذ رائے شماری کے مابین مفاہمت میں صرف امان اللہ کی ذات حائل ہے - (حالانکہ میں نے اس مفاہمت کی تلاش اور کوششوں میں تقریباً تین سال ضائع کئے تھے)۔ چنانچہ غلام احمد بٹ، صابر انصاری وغیرہ نے محاذ رائے شماری کے کہنے پر دونوں تنظیموں کے مابین اتحاد کی کوششیں شروع کر دیں - البتہ دونوں تنظیموں کے مابین مذاکرات کے لئے یہ شرط رکھی گئی کہ لبریشن فرنٹ آزاد کشمیر و پاکستان میں اپنی شاخیں قائم کرنے کے فیصلے پر عمل نہ کرے - دراصل محاذ رائے شماری والے صرف یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح آزاد کشمیر میں لبریشن فرنٹ کی شاخوں کے قیام کے فیصلے کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکے۔

میں نے اتحاد کی کوشش کرنے والوں سے کہا کہ چونکہ آزاد کشمیر و پاکستان میں لبریشن فرنٹ کی شاخیں قائم کرنے کا فیصلہ میرا ذاتی نہیں فرنٹ کی مجلس عاملہ کا ہے اس لئے میں ہر صورت میں اس فیصلے پر عمل کرنے کا پابند ہوں البتہ میں نے محاذ رائے شماری والوں سے اس موضوع پر بات چیت کرنے کی حامی بھری کہ لبریشن فرنٹ کی آزاد کشمیر و پاکستان شاخ اور محاذ رائے شماری ایک دوسری کی مخالفت سے احتراز کریں لیکن محاذ والوں نے اس پر گفت و شنید سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ ہماری اولین شرط یہ ہے کہ لبریشن فرنٹ آزاد کشمیر و پاکستان میں اپنی شاخ قائم نہ کرے۔ میں اس سلسلے میں محاذ رائے شماری کے سربراہ عبدالخالق انصاری صاحب سے ملنے پلندری جیل بھی گیاجہاں وہ میرپور کے پانی اور پلاٹوں سے متعلق تحریک کے سلسلے میں نظر بند تھے لیکن ملاقات کے دوران انصاری صاحب کا رویہ اتنا ترش تھا کہ میں پچھتایا کہ میں ملاقات کے لئے آیا ہی کیوں تھا۔ بہر حال میں نے برطانیہ واپسی سے پہلے آزاد کشمیر و پاکستان میں لبریشن فرنٹ کی شاخوں کے سلسلے میں ڈاکٹر فاروق حیدر، مجید امجد بٹ، ہاشم قریشی، فاروق شیخ اور نذیر گیلانی پر مشتمل ایک کنوینگ کمیٹی مقرر کی اور اسے آزاد کشمیر و پاکستان میں فرنٹ کی ممبر شپ اور شاخیں قائم کرنے کی ہدایت کی۔ اس کمیٹی کو میں نے سختی سے یہ ہدایت بھی کی کہ وہ محاذ رائے شماری کی مخالفت بالکل نہ کرے یہاں تک کہ محاذ کی طرف سے مخالفت کی صورت میں

بھی اس کا جواب نہ دے اور یہ کمیٹی مدت تک میری ان ہدایت پر سختی سے کار بند رہی۔ میری برطانیہ واپسی کے ساتھ ہی محاذ والوں نے ہم پر بے بنیاد الزامات کا سلسلہ ہی تیز نہیں کیا بلکہ لبریشن فرنٹ کے اندر پھوٹ ڈالنے کی کوششیں بھی تیز کر دیں۔ محاذ والوں کے حملوں کا اصل نشانہ میری ذات ہی ہے اور یہ حملے اب تک جاری ہیں۔

دراصل محاذ رائے شماری اور لبریشن فرنٹ کے مابین اس تصادم کے پس منظر میں اصل وجہ نظریات و جدوجہد آزادی کے طریقہ کار اور دوسرے متعلقہ معاملات کے بارے میں دونوں تنظیموں کے درمیان پائی جانے والی وسیع خلیج تھی جسے ابتداء میں ہم نے نظر انداز کیا تھا لیکن یہ خلیج وقت کے ساتھ ساتھ وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی اور آخر میں ایک دوسرے سے دور لے گئی کیونکہ دونوں اپنے اپنے استدلال پر قائم رہے۔

لبریشن فرنٹ میں اندرونی انتشار

لبریشن فرنٹ کے ممبروں کی ایک چھوٹی سی تعداد جن میں سے کچھ تو محاذ رائے شماری (آزاد کشمیر) کے قائد عبدالخالق انصاری کی برادری سے تعلق رکھتے تھے اور کچھ ان کے ذاتی دوست تھے۔ ذہنی طور پر عبدالخالق انصاری سے وابستہ تھی۔ چنانچہ جب لبریشن فرنٹ اور محاذ رائے شماری کے اختلافات سامنے آ گئے تو ان لوگوں نے محاذ رائے شماری والوں کی ہدایات کے مطابق جبار بٹ اور صدیق مرزا کی قیادت میں اعلانیہ طور پر محاذ کا ساتھ دیا اور لبریشن فرنٹ میں ایک بحران پیدا کر دیا۔

1981ء تک جبار بٹ صاحب (جو مئی 1977ء سے ستمبر 1981ء تک لبریشن فرنٹ کے صدر تھے) مقبول بٹ کے شیدائی تھے اور میرے لئے بھی عزت و احترام رکھتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے ایک دفعہ بھری مجلس میں کہا تھا کہ میں امان اللہ صاحب کا چپراسی بننے پر فخر محسوس کروں گا لیکن 1981ء کے وسط میں جب وہ اپنے بھائی صوفی زمان صاحب کی وفات پر میرپور آزاد کشمیر آئے تو یہاں محاذ رائے شماری کے مقبول بٹ کے خلاف عنصر (جو میرا بھی انتہائی مخالف تھا) نے مقبول بٹ اور میرے خلاف جبار بٹ کی خوب برین واشنگ (Brain Washing) کی اور ہم دونوں کے خلاف انہیں خوب اکسایا۔ چنانچہ لندن واپسی پر ایک طرف تو جبار بٹ نجی محفلوں میں مجھے اور مقبول بٹ کو ماں بہن کی گالیاں دیتے رہے اور دوسری طرف مجھ سے انتہائی تحکمانہ انداز میں بات کرنے لگے۔ جبار بٹ کے قیام میرپور کے دوران ہی مجھے اطلاع ملی تھی کہ محاذ رائے شماری کا مخصوص گروپ میرے اور مقبول بٹ کے خلاف جبار بٹ کے کان خوب بھر رہا ہے اور انہیں مجھ سے ایک خاص قسم کا برتاؤ کرنے کا مشورہ دے رہا ہے چنانچہ جبار بٹ انگلینڈ

آ کر ان مشوروں پر پوری طرح عمل کر رہا تھا اسی دوران ایک دن ہماری ایگز یکیٹو کونسل کا اجلاس تھا - جبار بٹ صدارت کر رہے تھے انہوں نے اجلاس شروع ہوتے ہی انتہائی جارحانہ انداز میں اور میز پر مکے مار مار کر مطالبہ کرنا شروع کیا کہ لبریشن فرنٹ بھی محاذ رائے شماری کی طرح مقبول بٹ سے لا تعلقی کا اعلان کرے اور اپنے اوپر سے مقبول بٹ کی چھاپ اتار پھینکے کیونکہ مقبول بٹ نے محاذ رائے شماری کے فیصلوں کی خلاف ورزی کی ہے اور اس کا کردار بھی مشکوک ہے - ہمیں معلوم نہیں کہ وہ بھارت کا ایجنٹ ہے یا پاکستان کا۔ جبار بٹ کے ان ریمارکس پر میری اور اس کی تلخ کلامی ہوئی - اسی دوران لیوٹن کے حاجی غلام سرور صاحب بھی پہنچے - انہیں ایک دن قبل تہاڑ جیل دہلی سے مقبول بٹ صاحب کا ایک خط ملا تھا جس میں انہوں نے اپنے کیس کی تفصیلات بتاتے ہوئے بھارتی سپریم کورٹ میں کیس کی مناسب پیروی کے لئے پیسوں کی ضرورت کا ذکر کیا تھا - میں نے وہ خط پڑھ کر ممبروں کو سنایا اور اس پر غور کرنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے خط جبار بٹ (جو اجلاس کی صدات کر رہے تھے) کے سامنے رکھا تو انہوں نے یہ خط واپس پھینک دیا جو جا کر ردی کی ٹوکری میں گر گیا - جبار بٹ کی اس حرکت سے میری ان سے دوبارہ جھڑپ ہوئی - اس دوران میں نے محسوس کیا کہ ایگز یکیٹو کونسل کے دو اور ممبر بھی جبار بٹ کے ہمنوا ہیں گو انہوں نے جبار بٹ کی طرح جارحانہ انداز اختیار نہیں کیا تھا - یہ اجلاس دراصل لبریشن فرنٹ کے اندرونی بحران کی ابتدا تھا اور محاذ رائے شماری والے جبار بٹ وغیرہ کو اس سلسلے میں مناسب ہدایت دے رہے تھے۔ (یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مقبول بٹ صاحب کے خط کے جواب میں ہم نے انہیں کیس کی پیروی کے لئے ڈیڑھ ہزار پونڈ بھیجے لیکن جبار بٹ اور ان کے ساتھیوں نے اس سلسلے میں ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔)

ستمبر 1981ء کے اواخر میں لبریشن فرنٹ کا سالانہ کنونشن ہونا تھا جبار بٹ اور اس کے ساتھی اس کوشش میں تھے کہ آئین میں ترمیم کر کے جبار بٹ کو تیسری مرتبہ فرنٹ کا صدر منتخب کرنے کی گنجائش نکالی جائے جس کی میں نے اور دوسرے ممبروں نے مخالفت کی کیونکہ ایک شخص کو ایک عہدہ دلانے کے لئے آئین میں ترمیم کرنے سے ایک انتہائی غلط اور خطرناک روایت قائم ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد جبار بٹ اور ساتھیوں نے تجویز پیش کی کہ لبریشن فرنٹ کی صدارت کے لئے عبدالخالق انصاری کے نوجوان ناتجربہ کار اور انتہائی غیر ذمہ دار بیٹے افتخار انصاری کو منتخب کیا جائے ہم نے بوجوہ اس کی بھی مخالفت کی کیونکہ افتخار انصاری کی واحد کوالیفیکیشن یہ تھی کہ وہ عبدالخالق انصاری کا بیٹا تھا ورنہ وہ کسی طرح بھی ایک تحریک کی قیادت کا اہل نہیں تھا پھر کوشش کی گئی کہ افتخار انصاری کو سیکرٹری جنرل منتخب کیا جائے لیکن یہ تجویز بھی قابل قبول نہیں تھی۔ جبار بٹ اور ساتھی در اصل یہ چاہتے تھے کہ لبریشن فرنٹ کی قیادت

محاذ رائے شماری کے پر زور حامیوں کے ہاتھ میں رہے - جس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔
کنونشن کے بعد جبار بٹ وغیرہ نے لبریشن فرنٹ کی پالیسیوں سے واضح طور پر انحراف کرنا شروع کیا۔ نومبر 1981ء میں برطانیہ کی سیاسی پارٹیوں نے میرپور آزاد کشمیر کے واقعات کے خلاف لندن میں ایک احتجاجی مظاہرہ کیا جس کے دوران جبار بٹ نے میری طرف سے بار بار کی ممانعت کے باوجود "پاکستانی کتو کشمیر سے نکل جاؤ" کے نعرے لگائے اس کے بعد لیوٹن میں ایک جلسہ عام میں جبار بٹ نے اپنی پوری تقریر حکومت پاکستان کے خلاف ہی نہیں بلکہ مملکت پاکستان کے خلاف کی۔ بھارت کا نام تک نہیں لیا اور جب میں نے اپنی صدارتی تقریر میں اس بات کی وضاحت کی کہ جبار صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے ذاتی خیالات ہو سکتے ہیں - لبریشن فرنٹ کے نظریات نہیں تو اس پر جبار بٹ اور ان کے حواریوں نے برہمی کا اظہار کیا۔

18 اپریل 1982ء کے لبریشن فرنٹ کی مرکزی مجلس عاملہ کے دو تہائی اکثریتی فیصلے کے مطابق جب میں نے آزاد کشمیر و پاکستان میں لبریشن فرنٹ کی شاخ قائم کی تو جبار بٹ اور صدیق مرزا نے اور بھی جارحانہ انداز اختیار کیا۔ میری برطانیہ سے غیر حاضری کے دوران انہوں نے مختلف شہروں میں اپنے رشتہ داروں (جن کا لبریشن فرنٹ کے نظریات سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا) پر مشتمل شاخیں قائم کیں۔ شاخوں کے صدر اور سیکرٹری بلحاظ عہدہ مرکزی مجلس عاملہ کے ممبر بن جاتے ہیں۔ اسی دوران انہوں نے میرپور کے کامریڈ مشتاق کو بھی لبریشن فرنٹ کا ممبر بنایا۔ وہ لاء گریجویٹ ہے اور سیاسی جوڑ توڑ کا ماہر۔ اس نے ممبر بنتے ہی محاذ رائے شماری آزاد کشمیر کی مجلس عاملہ کے ممبروں کے نام ایک طویل خط لکھا کہ میں نے لبریشن فرنٹ میں اس لئے شمولیت اختیار کی ہے کہ لبریشن فرنٹ کو عملاً محاذ رائے شماری کی شاخ بناؤں اور اسے محاذ رائے شماری کے مفادات کے لئے استعمال کروں - یہ خط ملتے ہی محاذ والے پھولے نہ سمائے اور انہوں نے خط کی کاپیاں اپنے ممبروں میں تقسیم کیں اور اس میں سے ایک کاپی کسی نے مجھے بھیج دی۔ کامریڈ مشتاق نے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ جبار بٹ اور صدیق مرزا میرے ان مقاصد میں میرا پورا ساتھ دے رہے ہیں بلکہ وہ لوگ ہی مجھے ان مقصد کے لئے لبریشن فرنٹ میں لائے ہیں۔

میں نے برطانیہ واپس پہنچتے ہی لبریشن فرنٹ میں شامل محاذ رائے شماری کے حامیوں کا ایک غیر رسمی اجلاس بلایا۔ (جبار بٹ اور کامریڈ مشتاق نے اس میں شرکت نہیں کی)۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ انہوں نے لبریشن فرنٹ سے وابستگی کا حلف اٹھایا ہے اور عملاً لبریشن فرنٹ کے خلاف اور محاذ رائے شماری کے حق میں کام کر رہے ہیں آپ لوگ یا تو پوری طرح لبریشن فرنٹ کے ساتھ رہیں یا لبریشن فرنٹ سے الگ ہو کر محاذ رائے شماری کی شاخ بنائیں۔ دوسری صورت میں میں آپ لوگوں کی مدد کروں گا۔ اس کے برعکس اگر موجودہ صورت حال جاری رہی تو جلد ہی دوسرے لوگ ہمارا تماشا دیکھ رہے ہوں گے - ان لوگوں نے میری ایک نہ سنی اس طرح

یہ غیر رسمی اجلاس بھی تلخی میں ختم ہو گیا دراصل محاذ کے حامی ان لوگوں کا خیال تھا کہ اپنی برادری کے نئے اور پرانے ممبران مجلس عاملہ کے بل بوتے پر وہ مجھے لبریشن فرنٹ سے ہی خارج کر دیں گے۔ ایک صاحب نے تو اس غیر رسمی اجلاس کے دوران ہی اس طرف اشارہ بھی کیا تھا۔

میں نے تنظیم کے سربراہ کی حیثیت سے آئین میں درج اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے کامریڈ مشتاق کے محاذ رائے شماری والوں کے نام خط کے مندرجات (خاص کر لبریشن فرنٹ میں اس کی شمولیت کے مقاصد) اور کامریڈ مشتاق ، جبار بٹ اور صدیق مرزا کی لبریشن فرنٹ اور اس کے نظریات اور پالیسیوں کے خلاف سرگرمیوں کی بنیاد پر تینوں کی لبریشن فرنٹ کی رکنیت تابع منظوری مرکزی مجلس عاملہ معطل کر دی اور اس معاملے پر بحث اور حتمی فیصلے کے لئے 12 ستمبر 1982ء کو مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا اور جبار بٹ ، صدیق مرزا اور کامریڈ مشتاق کو بھی خط لکھے کہ وہ اجلاس میں اپنی صفائی پیش کریں۔ 12 ستمبر کو برمنگھم میں اجلاس شروع ہوتے ہی کامریڈ مشتاق نے الٹے پلٹے مطالبات کرنے شروع کئے بہر حال جب اصل موضوع پر بحث ہوئی اور کامریڈ اور ساتھیوں کو اندازہ ہو گیا کہ مجلس عاملہ کی بھاری اکثریت ان کے خلاف میرے اقدام کو صحیح سمجھتی ہے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ ان کی رکنیت کی معطلی کی توثیق ہو جائے گی تو کامریڈ مشتاق نے کوئی واضح وجہ بتائے بغیر اجلاس سے واک آؤٹ کیا۔ اس کے ساتھ جبار بٹ اور صدیق مرزا کے علاوہ کچھ اور ممبر بھی باہر چلے گئے۔ ہال میں باقی رہنے والے ممبروں کی تعداد مطلوبہ کورم سے کہیں زیادہ تھی چنانچہ واک آؤٹ کرنے والوں کو واپس لانے کی خاصی کوششوں میں ناکامی کے بعد ہم نے اجلاس جاری رکھا اور مجلس عاملہ نے اس مسئلے پر تفصیلی غور کرنے کے بعد اتفاق رائے سے تینوں افراد کی رکنیت مختلف مدتوں کے لئے معطل کر دی۔

چند دن کے بعد جبار بٹ اور اس کے کچھ حامیوں نے لبریشن فرنٹ (جبار بٹ گروپ) کے نام سے اپنی تنظیم کے قیام کا اعلان کیا اور مجھے اپنے وکیل کے ذریعہ نوٹس بھیجا کہ وہ اپنی رکنیت کی معطلی کے "غیر آئینی" اقدام کے خلاف عدالت سے رجوع کریں گے۔ میں نے ان کے وکیل کو جواب دیا کہ وہ خوشی سے عدالت میں جائیں - عدالت میں ہی دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا لیکن جبار بٹ وغیرہ کو عدالت سے رجوع کرنے کی جرأت نہیں ہوئی البتہ میری کردار کشی کی ایک زبردست مہم شروع کی گئی انہوں نے ہزاروں پونڈ خرچ کرکے "آواز" نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جس کے صفحے میرے خلاف انتہائی لغو اور بے بنیاد الزامات سے کالے ہوتے تھے - جب "آواز" میری بے جا کردار کشی کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں گر گیا اور لوگ اسے پڑھنے کے بجائے زرد صحافت کی بدترین مثال قرار دینے لگے تو جبار بٹ گروہ نے "بلیٹن"

نام سے ایک اور چیتھڑا جاری کیا اور میری کردار کشی جاری رکھی لیکن بلیٹن بھی اپنی موت آپ مر گیا۔

جبار گروہ کے اس طرز عمل سے ان لوگوں کی اکثریت بھی ان سے علیحدہ ہو گئی جو 12 ستمبر1982ء کو ان کی باتوں میں آ کر محاذ رائے شماری والوں کی ہدایت کے تحت برادری کی بنیاد پر ان کے ساتھ چلی گئی تھی چنانچہ تھوڑی ہی مدت کے بعد گروہ میں برمنگھم اور سلو (لندن) کے چند گنے چنے افراد ہی رہ گئے البتہ میری کردار کشی کے سلسلے میں محاذ رائے شماری اور جبار گروہ کے درمیان پورا پورا اتفاق جاری رہا اور اب تک ہے۔ جب جبار گروہ کا کوئی آدمی اپنے کسی کام سے یا موروثی جائیداد کے جھگڑوں کے سلسلے میرپور آتا ہے تو محاذ رائے شماری والے اسے ایک آدھ استقبالیہ دے کر یا پریس کانفرنس کرا کے یا کوئی "مشترکہ اجلاس" بلا کر اس سے میرے خلاف زہرا اگلواتے ہیں۔ دونوں کی گذشتہ سالوں کی کارکردگی میری کردار کشی تک ہی محدود ہے۔

1985ء میں لبریشن فرنٹ میں ایک اور چھوٹا سا بحران پیدا ہو گیا - اب کے انتہائی بائیں بازو(کمیونزم) کے نظریات رکھنے والے کچھ افراد نے جو انتہائی چالاکی سے تنظیم کی سینٹرل کمیٹی تک پہنچے تھے' تنظیم کو اس کے اصل راستے سے ہٹا کر اسے انتہائی بائیں بازو کی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی اور چونکہ ان کے راستے میں بھی سب سے بڑی رکاوٹ میری ذات تھی اس لئے انہوں نے بھی میرے خلاف ہی محاذ کھولا اور اس سلسلے میں انہوں نے بھارتی سفارت کار کے اغواء کے سلسلے میں لمبی سزا پانے والے راجہ عبدالقیوم کو میرے خلاف ورغلا کر اس کے نام پر میرے خلاف مہم شروع کی لیکن وہ بھی اپنے مقصد میں ناکام ہو کر آخر لبریشن فرنٹ سے الگ ہو گئے اور پس منظر میں چلے گئے۔

محاذ رائے شماری کے بہت سے ممبروں - جبار گروہ اور انتہائی بائیں بازو کے گروپ نے میرے خلاف کیا کچھ کیا، کیا کیا بے بنیاد الزامات لگائے اور میرے خلاف الزام تراشی میں وہ کن کن اخلاقی پستیوں تک پہنچے - اس کتاب میں اس کے تفصیلی تذکرے کی گنجائش نہیں اس لئے کہ اس قسم کی سرگرمیوں کی مناسب جگہ تاریخ کے اوراق نہیں تاریخ کی ردی کی ٹوکری ہوتی ہے -

اقوام متحدہ میں سرگرمیاں

اس حقیقت کے باوجود کہ اقوام متحدہ نے کشمیر سمیت بہت سے بین الاقوامی مسائل کو سلجھانے کی بجائے الجھا دیا ہے ۔ اس بین الاقوامی تنظیم کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

مسئلہ کشمیر کے بارے میں اس کا واحد مثبت کام یہ ہے کہ اسکی سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے بھارت و پاکستان کی قراردادوں کے ذریعہ کشمیریوں کا حق خود ارادیت (گو محدود شکل میں) بین الاقوامی طور پر تسلیم ہوا ہے اور کسی قوم کے حق خود ارادیت کا بین الاقوامی طور پر تسلیم ہونا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

میں 1979ء سے 1984ء تک اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سیشن کے دوران چار بار نیویارک گیا۔ میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا کہ اقوام متحدہ ہمیں آزادی دلائے گا یا کشمیر میں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی مجوزہ رائے شماری ہو گی۔ میں وہاں اس لئے جاتا رہا کہ جنرل اسمبلی کے اجلاس کے دوران وہاں دنیا بھر کے ملکوں کے وزرائے خارجہ' سینئر سفارت کار' سیاست دان اور ذرائع ابلاغ کے نمائندے جمع ہوتے ہیں جن سے آسانی سے رابطہ اور تبادلہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر میں نے 1977ء سے ہی جنرل اسمبلی کے دوران نیو یارک جانے کی کوششیں شروع کی تھیں لیکن 1979ء سے پہلے وہاں کا ویزا نہ مل سکا۔

ابتدائی تیاری اور مظاہرے

میں اوائل ستمبر 1979ء میں ہی نیو یاک پہنچا ابتدائی چند دنوں میں میں نے اپنے میزبان سلیم چوہدری کی مدد سے نیو یارک میں مقیم کشمیریوں (آزاد کشمیر والوں) سے ملاقاتیں کیں اور وہاں لبریشن فرنٹ کی شاخ قائم کرنے کے لئے میدان ہموار کیا۔ مزید چند دنوں تک اقوام متحدہ میں اے پی پی کے نمائندے چوہدری افتخار صاحب (جنہیں میں راولپنڈی سے جانتا تھا) رابطہ عالمی اسلامی کے نیویارک دفتر کے کشمیری نژاد رضوی صاحب اور ان کی وساطت سے ڈاکٹر ہمدانی' ریڈیو وائس آف اسلام کے ڈائریکٹر غازی خاقان صاحب' روزنامہ جنگ کی نمائندہ گل افشاں خلیل' اسلامی موضوعات پر فیچر فلمیں بنانے والی کمپنی اسلامیڈیا کے ڈائریکٹر مسٹر اکرم زادے اور دوسرے احباب سے ملاقات کر کے اقوام متحدہ کے طریقہ کار اور مختلف شخصیتوں سے ملنے کے امکانات کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ اسی دوران برطانیہ سے لبریشن لیگ کے چوہدری صادق اور پیپلز کانفرنس کے عجائب چوہان بھی نیو یارک پہنچے تھے' چنانچہ نیویارک کے کشمیریوں سے مشورے کے بعد فیصلہ ہوا کہ جس دن جنرل اسمبلی میں بھارتی وزیر خارجہ کی تقریر ہو ہم اسی دن اقوام متحدہ کے باہر مظاہرہ کریں گے۔ اس سلسلے میں میں نے ہی پولیس اور پارک ڈیپارٹمنٹ سے ضروری اجازت نامے حاصل کئے اور زبردست مظاہرہ کیا - یہ اقوام متحدہ کے سامنے کشمیریوں کا پہلا منظم مظاہرہ تھا -

تاریخی پریس کانفرنس

ایک دن مجھے غازی خاقان صاحب نے بتایا کہ کچھ مسلم تحاریک آزادی اور امریکی مسلمانوں کی تنظیم کی طرف سے اقوام متحدہ کے پریس روم میں ایک پریس کانفرنس ہو رہی ہے چنانچہ میری درخواست پر مجھے بھی اس میں شامل کیا گیا اور 8 اکتوبر 1979ء کو ہونے والی اس پریس کانفرنس میں میں نے مسئلہ کشمیر، تحریک آزادئ کشمیر اور ان سے متعلقہ معاملات کی وضاحت کی۔ اقوام متحدہ کے پریس روم میں کسی کشمیری تنظیم کے نمائندے کی یہ پہلی اور (اب تک) آخری پریس کانفرنس تھی۔

نمازیوں سے خطاب

اقوام متحدہ کی چھٹی منزل پر ایک ہال کو ہر جمعہ کو نماز جمعہ پڑھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے نماز جمعہ کا اہتمام ایک فلسطینی مسٹر محمود کرتے تھے۔ چنانچہ میں ان سے ملا اور مسئلہ کشمیر اور مسئلہ فلسطین پر تبادلہ خیال کیا۔ اس کے بعد انہوں نے میری اس تجویز سے اتفاق کہ میں نماز جمعہ کے بعد نمازیوں سے خطاب کروں۔ چنانچہ نماز شروع ہونے سے پہلے ہی انہوں نے اعلان کیا کہ نماز کے فوراً بعد ہمارے ایک کشمیری بھائی خطاب کریں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا نمازیوں نے جن میں بہت سے سفارت کار بھی شامل تھے' میری تقریر غور سے سنی۔ میں نے مسئلہ کشمیر کے حوالے سے عالم اسلام کی بے حسی کی مذمت کی - دوسرے جمعہ کو میں نے مسجد کے دروازے پر اپنا بہت سا لٹریچر بھی رکھا اور یہ سلسلہ مدت تک جاری رہا۔ میرے خطاب کے بعد سوال و جواب بھی ہوئے۔اقوام متحدہ کی مسجد میں مسئلہ کشمیر پر تقریر کرنے والا پہلا کشمیری بھی میں ہی تھا۔

لبریشن فرنٹ کی شاخ

میرے نیویارک پہنچنے کے دو ہفتے بعد یہاں لبریشن فرنٹ کی شاخ بھی قائم ہوئی۔ لبریشن فرنٹ کی شاخ بھی نیویارک میں قائم ہونے والی کسی کشمیری سیاسی تنظیم کی پہلی شاخ تھی۔

ایک ٹھوس تجویز

پاکستان کے وزیر خارجہ جناب آغا شاہی سے میری علیک سلیک 1966ء سے تھی۔ چنانچہ میں ستمبر 1979ء میں نیویارک میں پاکستان مشن میں ان سے ملا اور مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر کے بارے میں پاکستان اور کشمیریوں کے کردار کے بارے میں ایک ٹھوس اور جامع تجویز پیش کی جسے انہوں نے بھی پسند کیا اور مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں صدر پاکستان سے بات کریں گے۔ دوسرے دن پاکستان کے سفیر جناب نیاز نائیک سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی آغا شاہی سے میری بات چیت کا ذکر کرتے ہوئے میری تجویز کو سراہا۔ آغا شاہی صاحب کچھ دن کے بعد واپس پاکستان آ گئے اور دو ہفتوں کے بعد پھر نیویارک آ گئے کیونکہ انہیں تخفیف اسلحہ سے متعلق اقوام متحدہ کی کمیٹی (جس کے وہ صدر تھے) کے ایک اجلاس میں شرکت کرنی تھی اور مجھے نیاز نائیک کے ذریعہ پیغام بھیجا کہ صدر پاکستان نے میری تجویز کو مسترد کر دیا ہے۔ اس سے مجھے حکومت پاکستان کی کشمیر پالیسی کے بارے میں ایک اور ذہنی جھٹکا لگا۔

شروع شروع میں مجھے اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ میں داخل ہونے میں بڑی دقت پیش آتی تھی اور ہر بار چوہدری افتخار سے ملاقات کابہانہ بنانا پڑتا تھا کچھ مدت بعد میں وائس آف کشمیر انٹرنیشنل کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ایک ماہ کا پریس پاس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور بعد میں اس کی تجدید کراتا رہا میرے اقوام متحدہ پہنچنے کے بعد بھارتی سفارت خانے کو میری سرگرمیوں کا علم ہو گیا تو اس نے اپنے مشن کے ایک آدمی کو میری سرگرمیوں پر نظر رکھنے پر مامور کیا جو وہاں سائے کی طرح میرا پیچھا کرتا رہا اس کی اس سرگرمی کے دوران بہت سے لطیفے بھی ہوتے رہے۔

پاکستان مشن کی مجرمانہ غفلتیں

نیو یارک میں ڈیڑھ ماہ کے قیام کے بعد برطانیہ آنے سے پہلے میں نے اقوام متحدہ کی ایک بک شاپ سے اقوام متحدہ کے سرکاری نقشۂ دنیا کی درجن بھر کاپیاں خریدیں اور بعد میں کئی سال تک اسے اپنے مؤقف کے حق میں استعمال کرتا رہا کیونکہ اس میں ریاست جموں کشمیر کو بھارت اور پاکستان دونوں سے الگ تھلگ دکھایا گیا تھا اور فٹ نوٹ میں دو جگہ وضاحت کی گئی تھی کہ ریاست جموں کشمیر بھارت یا پاکستان کا آئینی حصہ نہیں۔ 1986ء میں مجھے برکسٹن جیل لندن میں اقوام متحدہ کا نیا نقشہ ملا۔ اس میں بھارتیوں نے نہایت چالاکی سے آبادی سے متعلق فٹ نوٹ میں ایک تبدیلی کے ذریعہ کشمیر سے متعلق اقوام متحدہ کے درج بالا مؤقف کو مشکوک

بنایا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں جیل سے ہی اقوام متحدہ میں پاکستان کے مشن اور پاکستان کی وزارت خارجہ کو خط لکھے لیکن کسی نے خط کی رسیدگی کی اطلاع تک دینا بھی گوارا نہیں کیا۔

حکومت پاکستان کے کارندوں کے ایسی ہی غافلانہ اور غیرذمہ دارانہ طرز عمل کی وجہ سے مسئلہ کشمیر پر ہمارے اور خود پاکستان کے مؤقف کو نقصان پہنچتا رہا ہے اس کی ایک اور واضح اور انتہائی تکلیف دہ مثال ملاحظہ ہو -

اقوام متحدہ کے بک شاپ میں ہی مجھے قوموں کے حق خود ارادیت کے بارے میں اقوام متحدہ کے سپیشل رپور چار (میکسیکو کے ڈاکٹر گراس ہاسپیل ـــ (Dr . Gros Haspiel) کی تیار کردہ اور اقوام متحدہ کی طرف سے شائع شدہ ایک دستاویزی رپورٹ ملی جس میں دنیا کی ان قوموں اور ان سے متعلق مسئلوں کی تفصیل بتائی گئی تھی جن کے حق خودارادیت کو اقوام متحدہ نے تسلیم کیا ہے لیکن وہ ابھی تک اس سے محروم ہیں۔ اس فہرست میں ریاست جموں کشمیر بھی شامل تھی اور فہرست میں اس کا نمبربارہواں تھا۔ کشمیر سے متعلق باب میں مسئلہ کشمیر اور اسے حل کرانے کے لئے اقوام متحدہ کی کوششوں کا ذکر تھا - سپیشل رپور چار نے تجویز پیش کی تھی کہ ان تمام قوموں کے مسائل کو جنرل اسمبلی کے آئندہ اجلاس کے ایجنڈے میں شامل کیا جائے۔ میں نے اس رپورٹ کی چند کاپیاں خریدیں اور برطانیہ واپس آکر مسئلہ کشمیر پر اپنے نقطہ نظر سے متعلق ایک تفصیلی رپورٹ تیار کر کے اس کی کاپیاں اقوام متحدہ میں تمام سفارت کاروں اور سیکرٹری جنرل کو بھیج دیں تاکہ جنرل اسمبلی میں سپیشل رپور چار کی رپورٹ پر بحث کے دوران یہ لوگ مسئلہ کشمیر کے بارے میں بھارت اور پاکستان کے علاوہ کشمیریوں کے مؤقف کو بھی مد نظر رکھیں۔

دوسرے سال میں اس سلسلے میں پوری تیاری کے ساتھ نیو یارک گیا اور اپنے ساتھ مسئلہ کشمیر کے بارے میں ہمارے مؤقف کی تائید کرنے والی بہت سی دستاویزات بھی لے گیا تاکہ جنرل اسمبلی میں اس مسئلے پر بحث سے پہلے ہی سفیروں سے مل کرانہیں مسئلہ کشمیر کے بارے میں اصل حقائق سے آگاہ کروں۔ نیو یارک پہنچنے کے دوسرے دن اقوام متحدہ کے بک شاپ میں گیا تاکہ رپورٹ کی کچھ اور کاپیاں خریدوں لیکن وہاں مجھے گزشتہ سال کی رپورٹ کی بجائے اس کا دوسرا اور مختصر سا ایڈیشن ملا۔ میں نے اس کی دو کاپیاں خریدیں اور بریف کیس میں ڈال کر اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ دوران سفر میں نے ایک کاپی نکال کر اس پر نظرڈالی تو مجھے ریاست جموں کشمیر سے متعلق باب کہیں نظر نہیں آیا۔ رپورٹ کی کئی بار ورق گردانی کی لیکن کشمیر سے متعلق باب کہیں نظر نہیں آیا۔ آخر رپورٹ میں ایک جگہ ایک چھوٹے سے نوٹ پر

نظر پڑی جس میں لکھا گیا تھا کہ ریاست جموں کشمیر کو اس لئے شامل نہیں کیا جا رہا ہے کہ بھارتی سفیر نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا تھا۔ نوٹ کے آخر میں بھارتی سفیر کے خط کا متن بھی درج تھا جس میں اس نے ریاست جموں کشمیر کو بھارت کا آئینی حصہ قرار دے کر اس فہرست میں اس کی شمولیت پر سخت احتجاج کیا تھا۔ مجھے یہ صورت حال دیکھ کر انتہائی افسوس ہوا۔ چوہدری سلیم صاحب کے ہاں پہنچتے ہی میں نے پاکستان کے سفیر نیاز نائیک کو فون کیا لیکن ان سے بات نہ ہو سکی اور مجھے افسوس اور صدمے سے رات بھر نیند نہیں آئی اور دوسرے دن صبح ہی اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کی طرف چل دیا جو میری قیام گاہ سے کوئی چالیس میل دور تھا۔ راستے میں رابطہ عالم اسلامی کا دفتر تھا وہاں پہنچ کر میں نے اس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ہمدانی صاحب کو اس صورت حال سے آگاہ کیا تو انہیں بھی سخت افسوس ہوا۔ انہوں نے پاکستان مشن فون کیا تو وہاں سے اس مسئلے کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا گیا۔ اس صورت حال کا انتہائی حیران کن اور قابل افسوس پہلو یہ تھا کہ ترمیم شدہ رپورٹ فروری 1980ء میں شائع ہوئی اور اب ستمبر کا مہینہ تھا اور پاکستان مشن سات ماہ تک اس سے بے خبر تھا۔ میں نے بعد میں آغا شاہی اور نیاز نائیک سے بات کی تو دونوں نے گول مول جواب دیا میں نے سپیشل رپور چار گراس ہا سپیل کو تلاش کیا تو پتہ چلا کہ وہ میکسیکو چلا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے اسے میکسیکو کے ایڈریس پر ایک انتہائی سخت خط لکھا جس کی نقول تمام سفارت خانوں کو بھیجیں لیکن ہمارے کاز کو جو نقصان ہونا تھا بھارتی سفیر کی چالاکی، سپیشل رپور چار کی بد دیانتی اور پاکستان مشن کی مجرمانہ غفلت کی وجہ سے ہو گیا تھا۔ کچھ مدت بعد مجھے نیاز نائیک نے بتایا کہ سیکرٹری جنرل کے دفتر سے یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ رپورٹ کے آئندہ ایڈیشن میں (جو غالباً آج تک شائع نہیں ہوا) کشمیر کو پھر سے فہرست میں شامل کیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔ بہر حال بین الاقوامی سطح پر مسئلہ کشمیر کا جو حلیہ بگڑ گیا ہے اس میں حکومت پاکستان کے کارندوں کی درج بالا قسم کی غفلتوں اور بار بار کی حماقتوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

میں نے اس صدمے سے سنبھلتے ہی اپنے کتابچے (The Tragic Story of Kashmir) (کشمیر کی المناک کہانی) کی پانچ سو کاپیاں چھپوائیں اور کورنگ لیٹر کے ساتھ تمام سفارت کاروں اور ذرائع ابلاغ کو بھیجیں۔ اس کے علاوہ اپنے نظریات اور مطالبات پر مبنی رنگ برنگے سٹیکر اقوام متحدہ کی عمارت، مختلف ممالک بشمول بھارت کے سفارت خانوں اور دوسری اہم جگہوں پر چسپاں کرائے۔ جنرل اسمبلی میں بھارتی وزیر خارجہ کی تقریر سے دو دن قبل سیکرٹریٹ کے سامنے ایک زبردست مظاہرہ کیا اس مظاہرے کی خصوصیت یہ تھی کہ مظاہرین ایک تابوت بھی اٹھائے ہوئے تھے۔ جس پر چڑھے کالے کپڑے پر سفید حروف میں "کشمیر میں بھارتی سامراج" لکھا ہوا تھا اور ہم لوگ اسے اٹھائے آزادی کے نعرے لگاتے ہوئے اور اپنا لٹریچر تقسیم کرتے ہوئے سیکرٹریٹ سے بھارتی مشن تک گئے۔ راستے میں لوگ تابوت کو بڑے غور سے دیکھتے

رہے۔

تاریخی کارنامہ

میں شروع سے ہی اس تاک میں تھا کہ کوئی ایسا قدم اٹھایا جائے جس سے نیویارک میں جمع دنیا بھر کے وزرائے خارجہ ، سینئر سفارت کاروں سیاستدانوں (جو ہر ملک سے جنرل اسمبلی کے اجلاس کے دوران اپنے ملک کے وفد کے ساتھ نیو یارک آتے ہیں) اور عالمی ذرائع ابلاغ کی توجہ مسئلہ کشمیر کی طرف مبذول ہو - ایک سیکورٹی آفیسر سے میری واقفیت ہو گئی تھی - ایک دن باتوں باتوں میں اس نے کہا کہ 1971ء میں کچھ بنگالی جنرل اسمبلی کی وزیٹرز گیلریز میں جا بیٹھے اور وہاں سے بنگلہ دیش کے حق میں اور پاکستان کے خلاف خوب نعرے بازی کی - فوراً میرے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ ہم بھی ایسا ہی کریں۔ میں نے وزیٹرز گیلری کا ٹکٹ لیا اور اوپر جا کر گیلری اور جنرل اسمبلی کے ہال کا جائزہ لیا اور منصوبہ تیار کیا۔ شام کو بروک لین جا کر احباب سے منصوبے کا ذکر کیا تو جاوید بھٹی ، مشتاق خان ، یاسین جنجوعہ اور محمود احمد (یہ سب لبریشن فرنٹ کے سرگرم رکن تھے) اس منصوبے میں عملی کردار ادا کرنے پر تیار ہو گئے چنانچہ میں نے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں شروع کیں۔ چھوٹے پمفلٹ تیار کئے اور ان چاروں مجاہدوں کی مناسب بریفنگ کی۔ میرا خیال تھا کہ منصوبے میں میں خود بھی عملی حصہ لوں لیکن احباب نے خدشہ ظاہر کیا کہ ممکن ہے اس کے نتیجے میں آپ پر آئندہ اقوام متحدہ کی عمارت میں داخلے پر پابندی لگ جائے جس سے تحریک کو نقصان ہو گا۔ چنانچہ اتفاق رائے سے فیصلہ ہوا کہ مجھے منصوبے کے عملی حصے سے الگ رہ کر دوسرے کام کرنے چاہئیں۔

3 اکتوبر 1980ء کو بھارتی وزیر خارجہ نے جنرل اسمبلی سے خطاب کرنا تھا میں نے پہلے ہی وزیٹرز گیلری کے پانچ ٹکٹ لئے اور چاروں کو لے کر اوپر پہنچ گیا اور حسب پروگرام ان کو گیلری کے چار کونوں میں نشستوں پر بٹھایا اور چاروں کو الگ الگ ایک بار پھر بریف کیا۔ میں چاروں کو مناسب ہدایت دے کر نیچے جنرل اسمبلی ہال ہی میں پریس گیلری میں بیٹھ گیا۔

بھارتی وزیر خارجہ کی تقریر شروع ہوئے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ جاوید بھٹی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے کھڑے ہو کر انگریزی میں "بھارتی غاصبو کشمیر سے نکل جاؤ ہم کشمیر کی مکمل خود مختاری چاہتے ہیں"- "بھارتی غاصبو اقوام متحدہ میں کشمیر کے بارے میں کئے گئے وعدے پوری کرو"- وغیرہ کے نعرے لگانے شروع کئے اس کے نعرے سن کر جنرل اسمبلی ہال میں بیٹھے ہوئے ڈیڑھ سو سے زیادہ وزرائے خارجہ اور سینکڑوں سفارت کار کھڑے ہو کر پیچھے وزیٹرز گیلری کی طرف دیکھنے لگے۔ اُدھر بھارتی وزیر خارجہ اس صورت حال کی وجہ سے پریشان ہو گئے

اور منہ کھول کر گیلری کی طرف دیکھنے لگے اسی دوران اقوام متحدہ کے سیکورٹی آفیسرز جاوید بھٹی کو گیلری سے باہر لے گئے۔

ان کے دروازے سے باہر جاتے ہی دوسرے کونے سے محمود احمد نے نعرے بازی شروع کی اور لیفلیٹس کا ایک چھوٹا سا بنڈل جنرل اسمبلی ہال کی طرف پھینک دیا - وہ بنڈل نیچے جانے کی بجائے ایک سیکورٹی آفیسر کے سر پر لگ گیا۔ دو تین منٹ کے بعد محمود کو بھی باہر لے جایا گیا۔ اس کے بعد تیسرے کونے سے مشتاق خان نے اپنی کارروائی شروع کی اور ساتھ ہی لیفلیٹس کا بنڈل نیچے پھینک دیا جو ہال کے اوپر ہی ہوا میں بکھر کر پورے جنرل اسمبلی ہال میں پھیل گئے۔ سیکورٹی والے پانچ دس نعروں کے بعد مشتاق خان کو بھی باہر لے گئے تو چوتھے کونے سے یاسین جنجوعہ شروع ہو گئے۔ اس دوران سیکورٹی کی ساری نفری پہلے تین مجاہدوں کے ساتھ مصروف ہو گئی تھی۔ چنانچہ یاسین کو خاصا وقت ملا اور اس نے خوب نعرے بازی کی یہاں تک کہ جب اس کی انگریزی ختم ہو گئی تو اس نے اردو اور پنجابی میں نعرے لگائے اور بھارتی وزیر خارجہ کی شان میں گستاخی بھی کی۔ اس کے بعد سیکورٹی اسٹاف انہیں بھی باہر لے گیا -

پندرہ بیس منٹ تک ہمارے ان مجاہدوں کی نعرہ بازی کے دوران بھارتی وزیر خارجہ انتہائی پریشانی کی حالت میں تھرتھراتے ہوئے راسٹرم پر کھڑا رہا اور ہال میں بیٹھے ہوئے ڈیڑھ سو وزرائے خارجہ ، سات سو سے زیادہ سفارت کار اور سینکڑوں نمائندگان ذرائع ابلاغ مسکراتے ہوئے یہ تماشہ دیکھتے رہے -

یہ سارا نظارہ میں جنرل اسمبلی ہال کے پچھلے حصے میں بنی پریس گیلری میں بیٹھے دیکھتا رہا - جنرل اسمبلی کا وہ سیشن ختم ہوتے ہی میں جلدی سے باہر لاؤنج میں آ گیا۔ آگے سے مراکو کے وزیر خارجہ آ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بڑے جذباتی انداز میں کہنے لگے برادر آج اندر اسمبلی ہال میں تمہارے کشمیریوں نے خوب ہنگامہ کیا - تھوڑی دیر کے بعد جنرل اسمبلی کے صدر (مغربی جرمنی کے سفیر) باہر آئے تو میں نے پریس کے نمائندے کی حیثیت سے ان سے پوچھا سنا ہے آج اندر کوئی ہنگامہ تھا کہنے لگے ہاں کچھ کشمیری آزادی کے نعرے لگا رہے تھے - میں سمجھ گیا کہ ہمارا پیغام سبھوں تک پہنچا ہے - میں پریس گیلری سے ہی بھارتی وفد اور اس کے ہمدردوں کے اترے ہوئے چہرے دیکھتا رہا تھا - وہ سب ایک دوسرے کی طرف حیرانگی اور انتہائی بے چارگی سے دیکھ رہے تھے -

جنرل اسمبلی کی لابی سے نکل کر میں اقوام متحدہ کے حوالات کی طرف گیا - سیکورٹی والوں نے روکا تو میں نے انہیں پریس پاس دکھا کر کہا کہ میں ان چاروں افراد کے انٹرویو لینا چاہتا ہوں جنہیں سیکورٹی والے وزیٹر گیلری سے پکڑ لائے ہیں - مجھے وہاں ہی بٹھایا گیا - تھوڑی دیر کے بعد ایک سیکورٹی آفیسر نے آ کر کہا کہ انہیں نیو یارک پولیس کے حوالے کیا گیا ہے۔ رات چھ بجے

کے قریب جاوید بھٹی نے مقررہ ٹیلیفون پر مجھے اطلاع دی کہ انہیں یہ تنبیہہ کر کے کہ وہ دوبارہ جنرل اسمبلی کے احاطے کے اندر نہیں آئیں گے رہا کر دیا گیا ہے۔

ہمارے اس کارنامے کی وجہ سے دنیا بھر کے وزرائے خارجہ، سفارت کاروں اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے سامنے بھارتی حکومت کی جو تذلیل ہوئی اور ہماری آواز جس طرح دنیا بھر کے ان اکابرین تک براہ راست پہنچی، مسئلہ کشمیر کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور اس کامیابی کا سہرا ہمارے ان مجاہدوں کے سر ہے۔ گو ان میں سے دو چند سال بعد ہم سے الگ ہو کر غیر متحرک ہو گئے لیکن لبریشن فرنٹ کے ممبروں کی حیثیت سے ان چاروں نے جو کارنامہ انجام دیا وہ تحریک آزادیٔ کشمیر کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔

ہم نے 1983ء میں ایک بار پھر اپنے اس کارنامے کو دہرانے کی کوشش کی لیکن سخت سیکورٹی کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔

حوالات کی یاترا

ایک دن میں نے جنرل اسمبلی کے صدر کے نام ایک مراسلہ لکھا اور خود اس کی سیکرٹری کے حوالے کرنے کیلئے اس کے دفتر کی طرف چل دیا۔ مراسلہ رابطہ کے رضوی صاحب نے ٹائپ کیا تھا اور لفافے کے اوپر بھی منجانب جموں کشمیر لبریشن فرنٹ لکھ دیا تھا۔ میں ایک ہاتھ میں لفافہ اور دوسرے ہاتھ میں بریف کیس لئے صدر کے دفتر کے دروازے پر پہنچا تو سیکورٹی آفیسر نے روک کر پوچھا آپ کہاں جا رہے ہیں اور کیا آپ کے پاس اس احاطے میں آنے کے لئے پاس ہے۔ میں نے کہا مجھے صدر کی سیکرٹری کو یہ خط دینا ہے میرے پاس پاس نہیں ہے۔ (میں اپنا پاس دکھانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ پریس پاس والوں کو سیاسی سرگرمیوں کی اجازت نہیں ہوتی) سیکورٹی آفیسر نے مجھ سے خط مانگا جو میں نے اسے دیدیا۔ اس نے لفافے پر لبریشن فرنٹ کا نام پڑھتے ہی سیٹیاں بجائیں اور چشم زدن میں سیکورٹی آفیسرز کی ایک فوج وہاں پہنچ گئی اور مجھے پکڑ کر حوالات کی طرف لے گئی میں چیختا چلاتا رہا کہ میں کوئی تخریب کار نہیں ہوں لیکن انہوں نے میری ایک نہیں سنی اور مجھے لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد ڈیوٹی پر ایک سیاہ فام آفیسر آگیا۔ میں نے اس سے پوچھا آپ افریقہ کے کس ملک کے رہنے والے ہیں۔ اس کے جواب پر میں نے اسے کہا کہ جس طرح آج سے دو ڈھائی عشرے قبل آپ کا ملک غلام تھا اسی طرح آج میرا وطن کشمیر بھی غلام ہے۔ میں اپنے وطن کی آزادی کے سلسلے میں جنرل اسمبلی کے صدر کو ایک مراسلہ دینے آیا تھا کہ سیکورٹی والوں نے یہاں پہنچا دیا۔ اس نے خط مجھ سے لے کر پڑھا اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا میرے ساتھ آئیں وہ مجھے عقبی دروازے

سے باہر لے آیا اور کہنے لگا اب آپ جائیں آئندہ احتیاط کرنا - مراسلہ میں خود صدر تک پہنچا دوں گا۔ اس طرح مظلومیت اور محکومیت کے اس رشتے نے مجھے رہائی دلائی۔

روسی صحافی کی ذہنی اختراع

ایک دن میں اپنے ایک صحافی دوست کے ساتھ چائے پینے اقوام متحدہ کے کیفے ٹیریا کی طرف گیا وہاں خاصی بھیڑ تھی۔ ایک میز پر ایک صاحب اکیلے ہی بیٹھے تھے چنانچہ اس سے اجازت لے کر ہم دونوں بھی بیٹھ گئے۔ میں نے ان صاحب سے پوچھا کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں جواب ملا روس کا - میں نے پوچھا کیا روسی وفد کے ممبر ہیں کہنے لگے نہیں صحافی ہوں -

میرا معمول تھا کہ میں لوگوں سے اسی طرح کی علیک سلیک کے بعد موضوع مسئلہ کشمیر کی طرف لے جاتا - میں نے اپنے بریف کیس سے اپنے کتابچے "کشمیر کی المناک کہانی" کی ایک کاپی نکال کر اسے دے دی۔ وہ ورق گردانی کرتے ہوئے اس صفحے پر رک گیا جہاں مسئلہ کشمیر کے بین الاقوامی سیاست کا شکار ہونے کا ذکر ہے - اس میں روس ، چین ، امریکہ ، برطانیہ وغیرہ کے کشمیر کے بارے میں رویئے کی تفصیلات ہیں ، کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی حمایت کرنے پر چین کا شکریہ ادا کیا گیا ہے - جبکہ کشمیر کے متعلق اقوام متحدہ کی قرار دادوں کو ویٹو کرنے پر روس سے شکوہ کیا گیا ہے۔ روسی نے جلدی جلدی سارا باب پڑھ ڈالا اور پھر مجھ سے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگا اس کا مطلب ہے آپ لوگوں کو چین کی حمایت حاصل ہے میں نے کہا عملی تو نہیں البتہ چین والے ہمارے حق خود ارادیت کی حمایت کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ صاحب چلے گئے -

کوئی ایک ہفتہ بعد میں سیکرٹریٹ کے پریس سیکشن میں سفارت کاروں کے اعلانات دیکھ رہا تھا کہ اے پی پی کے افتخار چوہدری وہاں سے گزرے اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے بھئی امان صاحب میں دو دن سے آپکو ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں ان کے ساتھ ان کے دفتر گیا وہاں انہوں نے مجھے بین الاقوامی معاملات سے متعلق برطانیہ سے نکلنے والے ایک جریدے ایٹ ڈیز (8 Days) کا ایک پرچہ تھما دیا جس میں ایک بڑی سرخی یہ تھی کہ چین کشمیر لبریشن فرنٹ کی مدد سے کشمیر میں ایک پیپلز ریپبلک قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جریدے نے یہ خبر روسی اخبار "پراودا" سے لی تھی - بھارت کے تمام قومی اخبارات نے بھی شائع کیا تھا یہ خبر اسی روسی نے بھیجی تھی جو ہمیں کیفے ٹیریا میں ملا تھا۔ خبر میں مجھ سے ملاقات کا حوالہ بھی دیا گیا تھا اور مجھ سے بہت سی غلط باتیں بھی منسوب کی گئی تھیں۔

حکومت پاکستان کی طرف سے وارننگ

دسمبر 1980ء میں ایک دن میں جنرل اسمبلی کی لاؤنج میں بیٹھے ٹیلیفون پر کسی سے بات کر رہا تھا کہ پاکستان کے وزیر خارجہ آغا شاہی وہاں سے گزرے اور مجھ سے کہنے لگے امان صاحب آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے آپ شام چھ بجے مجھے یہاں ملیں - میں نے کہا شام کو میں کہیں مصروف ہوں - البتہ کل ہفتے کو مجھے یہاں آنا ہے کہنے لگے مجھے بھی آنا ہے اس لئے کل گیارہ بجے ملاقات ہو گی - دوسرے دن دس بجے اسلامیڈیا والوں کی طرف سے میرا انٹرویو ہونا تھا چنانچہ میں دس بجے انڈونیشیا لاؤنج میں پہنچا اور میرا پندرہ منٹ کا انٹرویو ہوا۔ گیارہ بجے آغا شاہی صاحب پہنچے ان کا ایک گھنٹے کا انٹرویو ہوا اس کے بعد ہم دونوں ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ آغا شاہی نے اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد انتہائی سنجیدہ ہو کر کہنا شروع کیا کہ پاکستان نے کشمیر کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں بھارت سے ہماری دشمنی کشمیر ہی کی وجہ رہی ہے - اس ہی کی وجہ سے ہمیں تین جنگیں لڑنی پڑیں اور اسی دوران پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔ اب آپ خود مختار کشمیر کی باتیں کرتے ہیں اور اس سلسلے میں حکومت پاکستان کی مرضی کے خلاف یہاں وزرائے خارجہ ' سفیروں ' وفود کے ممبروں اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں سے ملتے رہتے ہیں۔ خود مختاری کے مطالبے پر مبنی لٹریچر تقسیم کرتے رہتے ہیں اور مظاہروں کے دوران خود مختار کشمیر کے نعرے لگاتے ہیں۔ آپ کی سرگرمیوں کو حکومت پاکستان پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی۔ آپ کی طرف سے خود مختار کشمیر کے نظریئے کے پرچار کے نتیجے میں یہاں سفارت کار اب ہمیں کہہ رہے ہیں کہ آپ لوگ کشمیریوں کو خود مختاری کیوں نہیں دیتے۔ آغا شاہی نے یہ بھی کہا کہ انہیں مرکزی حکومت کی طرف سے ہدایت ملی ہے کہ وہ مجھے اس بارے میں تنبیہہ کریں۔ میں خاصی دیر تک ان کی باتیں سنتا رہا آخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے بھی انتہائی جارحانہ انداز میں کہا۔ آغا شاہی صاحب کیا آپ مجھے اپنے سفارت خانے کا کوئی ملازم یا کوئی سرکاری اہلکار سمجھتے ہیں جو مجھ پر حکم چلا رہے ہیں اور وہ بھی اس لہجے میں۔ میں نے کہا میں حکومت پاکستان کا ملازم نہیں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کا سیکرٹری جنرل ہوں۔ اپنی تنظیم کے پروگرام کے تحت اور اپنے خرچ پر یہاں آیا ہوں اور اپنی تنظیم کے نظریات اور اغراض و مقاصد کے لئے کام کر رہا ہوں۔ میں نے ابتداء میں پوری کوشش کی تھی کہ مجھے پاکستانی سفارت خانے کا کچھ تعاون حاصل ہو لیکن آپ کے مشن نے میری مدد کرنے کی بجائے ہر مرحلے پر میرے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ میں نے کہا ریاست جموں کشمیر کی مکمل خود مختاری ہماری تنظیم کے نظریئے کا بنیادی ستون ہے - اس کے لئے کام کرنا میرا منصبی ہی نہیں قومی فرض بھی ہے - کافی دیر تک خاصے تلخ لہجے میں بحث و تکرار کے بعد ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ میں نے آغا شاہی

کو پہلی بار اس جارحانہ انداز میں بات کرتے ہوئے دیکھا یا سنا تھا آغا شاہی آگے چل دیئے میں نے بریف کیس سنبھالا اور دوسری طرف نکل گیا۔ میں گیٹ کے پاس پہنچا تو دیکھا آغا شاہی میرا انتظار کر رہے ہیں ۔ کہنے لگے امان اللہ صاحب آپ ناراض ہو گئے یہ میرا منصبی فرض تھا اور اسلام آباد سے تاکیدی ہدایت تھی - ذاتی طور پر میں آپکے نظریات کے خلاف نہیں۔

سکھوں کا مظاہرہ اور ہندوؤں کی پٹائی

ایک دن سیکرٹریٹ کے باہر سکھوں کا مظاہرہ تھا - مظاہرین کے منتظمین میں سے ایک مجھے جانتے تھے چنانچہ انہوں نے مجھے تقریر کرنے کی دعوت دی اور اسٹیج پر پہنچا دیا مجھ سے پہلے اکثر سکھ مقررین نے اپنی تقریروں میں بھارتی پنجاب کے لئے اندرونی خود مختاری کا مطالبہ کیا تھا میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اندرونی خود مختاری ایک بے معنی اور غیرپائیدار سی چیز ہے اس سلسلے میں میں نے بھارتی مقبوضہ کشمیر کو 1951ء میں دی جانے والی مکمل اندرونی خود مختاری کے حشر کی تفصیلات بتاتے ہوئے سکھوں کو مشورہ دیا کہ وہ آزاد و خود مختار خالصتان سے کم کوئی چیز قبول نہ کریں۔ اس پر سکھ نوجوانوں نے خالصتان کے حق میں خوب نعرے لگائے میری تقریر جاری تھی کہ باہر فٹ پاتھ پر کھڑے بھارتی ہندوؤں کے ایک ٹولے نے مجھ پر ہوٹنگ شروع کی اور مظاہرے کے منتظمین کو پاکستان کے ایجنٹ کہا اس پر نوجوان سکھ ان ہندوؤں پر ٹوٹ پڑے اور ان کی خوب پٹائی کی جس کے بعد ہندو وہاں سے بھاگ گئے۔

اندرا گاندھی سے دلچسپ آمنا سامنا

ستمبر 1983ء میں بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی غیر جانبدار تحریک کی سربراہ کی حیثیت سے تحریک کے ایک اجلاس کی صدارت کرنے اور جنرل اسمبلی سے خطاب کرنے نیویارک آئی تھیں۔ ایک دن اسلامیڈیا کے جناب اکرم زادے جنرل اسمبلی کے ایک کونے میں میرا ریڈیو انٹرویو کر رہے تھے۔ میں نے مسز گاندھی اور ان کے ساتھ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ لوگ ذرا نزدیک پہنچے تو میں نے دیکھا کہ اقوام متحدہ میں بھارتی سفیر میری طرف اشارہ کر کے مسز گاندھی کو کچھ کہہ رہا ہے۔ یکدم میرے ذہن میں بھی ایک خیال آیا۔ جب مسز گاندھی میرے نزدیک سے گزرنے لگیں تو میں نے یہ تاثر دیتے ہوئے کہ میں عرب صحافی کے سال کا جواب دے رہا ہوں۔ خاصی اونچی آواز میں کہا " بھارتیوں کا یہ کہنا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے نری بکواس (Utter Non-sense) ہے - کشمیر کشمیریوں کا ہے اور

اس مسئلے کا واحد حل پوری ریاست کی مکمل خود مختاری ہے"۔

مسز گاندھی اور اسکے حواریوں نے میری طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا لیکن کچھ کہے بغیر آگے نکل گئے۔

اعلانات کے سسٹم سے دلچسپ استفادہ

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے لاؤنج میں ملاقاتوں اور ٹیلیفون پر بات کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی وزیر خارجہ، کسی سفارت کار یا کسی اور شخص سے ملاقات کرنے لاؤنج میں آتا ہے یا کسی کے لئے باہر سے فون آتا ہے تو اس کا اعلان لاؤڈ اسپیکر پر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز سنتے ہی وسیع و عریض لاؤنج میں بیٹھا ہر شخص اس طرف متوجہ ہو جاتا ہے ایک دن میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں اس طریقہ کار کو اپنی تنظیم اور تحریک کے تعارف کے لئے استعمال کروں۔ چنانچہ میں کونٹر والی لڑکی کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ مجھے جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے مسٹر امان اللہ خان سے ملنا ہے۔ وہ یہاں کہیں لاؤنج میں ہیں چنانچہ لڑکی نے وقفے وقفے سے تین بار لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے مسٹر امان اللہ خان جہاں کہیں بھی ہوں آکر لاؤنج کے دروازے پر اپنے دوست سے ملیں - میں نے یہ عمل دوسرے دن بھی دہرایا لیکن تیسرے دن لڑکی نے یہ کہہ کہ انکار کر دیا کہ چونکہ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کو اقوام متحدہ میں مبصر کا درجہ حاصل نہیں (یہ درجہ صرف پی ایل او اور سواپو کو حاصل ہے) اس لئے اس کے بارے میں اعلان نہیں ہو سکتا - دراصل میری اس گوریلا کاروائی سے سینکڑوں وزرائے خارجہ اور سفارت کار جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے وجود سے آگاہ ہو گئے تھے اس لئے یہ صورت حال بھارتیوں کے لئے ناقابل برداشت تھی - چنانچہ انہوں نے حکام سے شکایت کر کے اس سلسلے میں لڑکی کو ہدایت دلوائی تھیں۔

میں لاؤنج میں رکھے ہوئے ٹیلیفون (جو وزرائے خارجہ اور سفارت کاروں کے لئے ہوتے ہیں اور بغیر چارجز کے ہوتے ہیں) بھی خوب استعمال کرتا رہا۔ ان ہی ٹیلیفونوں سے وزرائے خارجہ اور سفیروں سے ملاقات کا وقت مقرر کرتا اور دوستوں سے بھی گپ شپ کرتا۔

گو میرا یہ طرز عمل اخلاقی طور پر ناجائز تھا لیکن میری یہ سرگرمیاں جنگ آزادی کا حصہ تھیں اور کہتے ہیں جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔

ایک سفارت کار کا قیمتی مشورہ

ایک بار جنرل اسمبلی کی لاؤنج میں ایک چھوٹے سے ملک کے سفیر سے گپ شپ ہو رہی تھی - ان سے میری واقفیت 1979ء سے تھی اور ہماری کئی تفصیلی ملاقاتوں کے نتیجے میں وہ مسئلہ کشمیر سے پوری طرح واقف ہو گئے تھے اور ہمارے نظریات سے بھی واقف تھے۔ یہاں تک کہ جب بھی مجھے اقوام متحدہ کے آفیشل ریکارڈ سے کسی دستاویز کی ضرورت پڑتی یہ سفیر صاحب یا تو اپنے کسی کارندے کے ذریعہ منگواتے یا مجھے اپنے سفارت خانے کی طرف سے اتھارٹی لیٹر دیتے اور میں خود یہ نقل حاصل کرتا۔

گپ شپ کے دوران انہوں نے کہا کہ آپ جنرل اسمبلی کے اجلاس کے دوران یہاں آتے ہیں جب وزرائے خارجہ اور سفیر بہت مصروف ہوتے ہیں لیکن اگر آپ جنرل اسمبلی کے اجلاس سے پہلے یا بعد میں آئیں تو وزرائے خارجہ سے ملاقات نہیں ہو گی - آپ یوں کریں کہ اپنے لٹریچر اور سیکرٹری جنرل سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی کی مختلف کمیٹیوں کے سربراہوں کو لکھے گئے خطوط کی نقلوں کے ڈیڑھ سو سیٹ بنائیں اور ہر سفارت خانے کو ایک ایک سیٹ بھیج دیں - یہ لوگ ان کی الگ فائل بنا کر رکھدیں گے اور جنرل اسمبلی کے اجلاس سے فارغ ہونے کے بعد فرصت سے ان پر نظر ڈالیں گے - چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ واقعی اکثر سفارت خانوں نے میرے اس سیٹ کی الگ فائل بنائی ہے۔چند سفیروں نے تو ملاقات کے وقت میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے انہیں مسئلہ کشمیر کے بارے میں کشمیریوں کے مؤقف اور استدلال سے آگاہ کیا جبکہ اس سے پہلے وہ اس مسئلے پر بھارت اور پاکستان کے مؤقف ہی سنتے آئے تھے۔

سیکرٹری جنرل کے دفتر سے خط و کتابت اور ملاقاتیں

میں نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو برطانیہ سے بھی اور نیویارک میں اپنے قیام کے دوران بھی درجنوں خط لکھے - مجھے بھی سیکرٹری جنرل کے دفتر سے درجن بھر خط آئے (جن میں سے کچھ کے عکس کتاب کے آخر میں شامل کئے گئے ہیں) جن میں مسئلہ کشمیر اور متعلقہ معاملات کے بارے میں اقوام متحدہ کے نقطہ نظر کی وضاحت کی گئی تھی۔ میں نے کئی بار اکیلے اور دو بار لبریشن فرنٹ کے ممبروں (ایک بار چوہدری محمد اکرم صاحب' چوہدری سلیم صاحب' جاوید بھٹی صاحب اور سلیم دت صاحب کے ساتھ اور دوسری بار چوہدری افتخار علی) کے ساتھ اقوام متحدہ کے مختلف افسروں سے تفصیلی ملاقاتیں بھی کیں۔

ڈپلومیسی - مہذب دروغ گوئی

بین الاقوامی سطح پر خاص کر نیویارک میں اپنی سرگرمیوں کے دوران مجھے ڈپلومیسی کا بھی انتہائی تلخ تجربہ ہوا۔ سیاست کاروں (اعلیٰ درجے کے سیاست دانوں نہیں) کی طرح سفارت کاروں کے ظاہر و باطن میں بھی زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے اور ان پر انگریزی کا یہ مقولہ سو فیصد فٹ آتا ہے کہ (They do not say what they mean and they do not mean what they say.) (یعنی ان کا مطلب وہ نہیں ہوتا جو وہ کہتے ہیں اور وہ کچھ نہیں کہتے جو ان کا مطلب ہوتا ہے)

سفارت کار اپنا مؤقف انتہائی مہارت سے بیان کرتے ہیں۔ مخالف فریق کے خلاف اور اپنے حق میں جانے والے حقائق کو بہت ہی بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور اپنے خلاف اور مخالفین کے حق میں جانے والے حقائق کا یا تو ذکر ہی نہیں کرتے یا بہت ہی گھٹا کر پیش کرتے ہیں۔ فلسطینیوں پر انسانیت سوز مظالم ڈھانا' فلسطین پر غاصبانہ قبضہ کرنا' عالمی رائے عامہ اور اقوام متحدہ کی قرار دادوں کی دھجیاں اڑانا اور دوسرے ملکوں کے خلاف ننگی جارحیت اسرائیل کا دوسرا نام ہے لیکن اقوام متحدہ میں اسرائیل کا نمائندہ بول رہا ہو تو اس کی تقریر سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں اسرائیل سے زیادہ مظلوم کوئی نہیں۔ یہ ہے ڈپلومیسی۔

دنیا بھر کی تحاریک آزادی کی مشترکہ تنظیم بنانے کی تجویز

1980ء میں اپنے قیام نیو یارک کے دوران اقوام متحدہ میں دنیا بھر کی تحاریک آزادی کے نمائندوں سے ملتا رہا ان میں پی ایل او' پولیساریو' سواپو' مورو نیشنل لبریشن فرنٹ' افریقی نیشنل کانگریس' فرنٹ سیولیما' پورٹوریکو کا محاذ آزادی' پٹانی کا محاذ آزادی' افغان مجاہدین' خالصتان تحریک اور تامل تحریک وغیرہ کے نمائندے شامل تھے۔

اس دوران مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ دنیا بھر کی تحاریک آزادی کی ایک مشترکہ تنظیم قائم کی جائے تاکہ ہم اپنی تحاریک آزادی کے لئے انفرادی جدوجہد کے علاوہ مشترکہ طور پر بھی جدوجہد کریں - اس سلسلے میں میں نے دوسری تحاریک آزادی کے نمائندوں سے فرداً" فرداً" بات کی - کچھ نے تو اسے خاصا سراہا اور اس کے لئے تیار بھی ہو گئے لیکن جب ہم نے اس تجویز کے عملی پہلوؤں پر غور کیا تو یہ تجویز ناقابل عمل دکھائی دی۔ کیونکہ ایک تحریک کے دشمن دوسری تحریک کے حامی تھے - مثلاً روس بہت سی تحاریک آزادی کی حمایت کرتا ہے جبکہ افغان مجاہدین

اس کے خلاف بر سرپیکار ہیں۔ اس طرح روس خالصتان تحریک اور کشمیریوں کی تحریک کے دشمن بھارت کا زبردست حامی ہے۔ پی ایل او اور سواپو امریکہ کو اپنا بدترین دشمن تصور کرتے ہیں جبکہ افغان مجاہدین کی سرگرمیاں ہی امریکی امداد کی مرہون منت تھیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر میری اس تجویز کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ ویسے مظلومیت کے ناطے تمام تحاریک آزادی کے نمائندے ایک دوسرے سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں۔

بھارت کی مسلم دشمنی

بھارت کی خارجہ پالیسی ہو یا داخلی پالیسی، ریا کاری اور منافقت اس کی بنیاد ہے بھارتی حکومتیں دنیا خاص کر عالم اسلام کو دکھانے کے لئے ایک مسلمان کو صدارت کچھ کو سفارت اور کچھ کو وزارت کے عہدے دیتی رہی ہیں۔ جبکہ باقی کروڑوں مسلمانوں سے تیسرے درجے کا سلوک ہوتا رہا ہے۔ یہی حال بھارت کی دوسری بڑی اقلیت سکھوں کا بھی ہے۔

بھارتی حکومتیں اسلامی ممالک کے ساتھ منافع بخش تجارت کرنے اور بین الاقوامی معاملات میں ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ظاہراً تو مسلمانوں سے متعلق اہم بین الاقوامی مسائل خاص کر مسئلہ فلسطین کے بارے میں ان کی واضح حمایت کرتی رہی ہیں لیکن درپردہ اس کے اسرائیل کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں۔ بھارت میں بھارت اسرائیل فرینڈ شپ سوسائٹی قائم ہے۔ بمبئی میں اسرائیل کا ٹریڈ مشن قائم ہے اور اسرائیل کا ایک وزیراعظم اور ایک وزیر خارجہ بھارت کے خفیہ دورے کر چکے ہیں۔ مسلم پاکستان کو بھارت اپنا ازلی دشمن سمجھتا ہے اور اسے دو ٹکڑے کرنے کے لئے بھارت نے کیا کیا پاپڑ نہ بیلے۔ کہتے ہیں بھارتی وزیراعظم مسز گاندھی نے اپنے مشیر ڈی پی دھر کو سپین بھیجا تاکہ وہ سپین سے سات سو سالہ مسلم اقتدار کے خاتمے کے اسباب کا خاموشی سے مطالعہ کرے۔ اسی مطالعے کے بعد ڈی پی دھر نے مشرقی پاکستان کو مغرب سے الگ کرنے کا منصوبہ تیار کیا اور دسمبر 1971ء میں مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے سے ایک سال پہلے سے اس منصوبے پر عمل ہوتا رہا۔

لیکن دسمبر 1980ء میں میں نے خود اپنی آنکھوں سے نیویارک میں بھارت کی مسلم دوستی کے بلند بانگ دعوؤں کا پردہ چاک ہوتے اور بھارتیوں کی مکاری اور منافقت کا اصل چہرہ سامنے آتے دیکھا۔

10 دسمبر 1980ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک قرارداد پیش ہوئی جس میں اسلامی کانفرنس (دنیا بھر کے مسلم ممالک کی مرکزی تنظیم) کی کارکردگی اور امن عالم کے لئے اس کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اس تنظیم اور اقوام متحدہ کے درمیان زیادہ سے زیادہ تعاون پر زور

دیا گیا تھا ۔ اس قرارداد کی مخالفت جنرل اسمبلی کے ایک سو پچپن ممالک میں سے صرف تین ممالک یعنی روس ، اسرائیل اور مسلم دنیا کی خیر خواہی کے ڈھنڈورے پیٹنے والے بھارت نے کی۔ روس اور اسرائیل کی طرف سے مخالفت تو قابل فہم تھی اس لئے کہ روس مذہب پر مبنی تنظیموں اور معاملات کو تسلیم ہی نہیں کرتا اور اسرائیل عالم اسلام کا بد ترین اور اعلانیہ دشمن ہے لیکن بھارت تو عالم اسلام کی خیر خواہی کے بلند بانگ دعوے کرتا رہتا ہے۔ بھارت کی منافقت کی انتہا اس وقت ہوئی جب اقوام متحدہ میں بھارت کے ہندو سفیر نے حسب قاعدہ خود سٹیج پر آکر اپنے ملک کا مؤقف بیان کرنے کی بجائے اسلامی کانفرنس کی مذمت کرنے کے لئے اپنے وفد کے ایک کٹھ پتلی مسلمان ممبر شمشیر خان کو سٹیج پر بھیجا اور اس بے ضمیر انسان نے وہاں میں اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے اسلامی کانفرنس پر خاصا کیچڑ اچھالا۔

میں اس وقت جنرل اسمبلی ہال کی پریس گیلری میں بیٹھا تھا چنانچہ میں نے بھارتی منافقت کا یہ نظارہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

احباب جنہوں نے میری مدد کی

میں 1979ء سے 1984ء تک چار بار نیویارک گیا ۔میرے وہاں قیام کے دوران نیویارک میں مقیم کشمیریوں خاص کر سلطان محمود (جاوید بھٹی)، چوہدری محمد اکرم ، چوہدری افتخار احمد ، چوہدری محمد صابر ، چوہدری سلیم ، چوہدری ناصر، محمد حلیم خان، اشرف گلشن، یاسین جنجوعہ ، مشتاق خان ، محمود احمد ، محمد محفوظ، چوہدری حکمداد ، محمد رمضان ، چوہدری محمد اعظم، سلیم وت، فضل حسین، صوفی عبدالغنی، محمد صدیق خان ، غلام قادر ، راسب علی ، اللہ دتہ ، حاجی محمد نذیر، طارق محمود، محمد اسحاق، سکندر حیات، راشد محمود، قربان علی، محمد افسر، محمد رشید، رشید سکندر، امین خان، محمد مقصود وغیرہ شامل ہیں نے بڑی مدد کی۔ گو 1982ء کے بعد ان میں سے کچھ ہم سے الگ ہو کر غیر متحرک ہو گئے اس کے باوجود 1979ء سے 1980ء کے دوران ان کی سرگرمیاں قابل تعریف تھیں ۔ جن احباب نے لبریشن فرنٹ کا بھرپور ساتھ دیا ان میں جاوید بھٹی ، چوہدری افتخار احمد چوہدری محمد اکرم ، چوہدری محمد صابر، محمد رمضان، سکندر حیات پیش پیش تھے ان کے علاوہ ڈاکٹر سلیم میر، محمد فاروق، محمد یوسف میر، غلام نبی، محمد بشیر نے بھی مختلف طریقوں سے تعاون کیا ۔ میں اپنے غیر کشمیری دوستوں خاص کر انے پی پی کے چوہدری افتخار "جنگ" کی گل افشاں خلیل، رابطہ عالم اسلامی کے ڈاکٹر ہمدانی صاحب ، رضوی صاحب، داؤد صاحب، ریڈیو وائس آف اسلام کے غازی خاقان صاحب، اسلامیڈیا کے اکرم زادے، علامہ مشرقی کے صاحبزادے پاپا نیوگنی کے سفیر (Mr.Matane) کولمبیا کے سفیر (Dr .Indaleciao Lievando) فلسطین کے محمود احمد ،

اسلامی کانفرنس کے سفیر ' اقوام متحدہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل مسٹر پکو (Mr . Picco) اسلامی کانفرنس کے مسٹر طرزی اور ترکی ' مصر اور سینیگال سے تعلق رکھنے والے کچھ احباب (مجھے افسوس ہے اب مجھے ان کے نام یاد نہیں) کا انتہائی مشکور ہوں کہ انہوں نے میری رہنمائی کی ۔ میں چوہدری سلیم ' چوہدری ناصر' بیگم سلیم' جاوید بھٹی' بیگم جاوید بھٹی' جاوید بھٹی کے چچا' چوہدری افتخار اور چوہدری صابر کا خاص طور پر مشکور ہوں جنہوں نے میرے نیویارک میں قیام کے دوران میری میزبانی کی اور مجھے ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی۔

ان احباب کے علاوہ بھی بہت سے احباب نے میری کسی نہ کسی طرح مدد کی لیکن ان کے نام یاد نہیں آ رہے جس کے لئے میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔

محکومی کا بدترین احساس

ایک حساس کشمیری کو اپنی محکومی کا سب سے زیادہ احساس اقوام متحدہ میں ہوتا ہے ۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کے سامنے ایک سو ساٹھ آزاد و خودمختار ملکوں کے قومی پرچم انتہائی شان سے لہراتے ہیں ۔ ان ایک سو ساٹھ میں سے ایک سو دو ملکوں کی انفرادی آبادی کشمیر سے کم ہے۔ کئی ملکوں کی آبادی تو کشمیر کی ایک تحصیل سے بھی کم ہے ۔ ستر ملک رقبے میں کشمیر سے چھوٹے ہیں۔ اسّی کے قریب ملک معاشی لحاظ سے کشمیر سے کمزور ہیں اور اتنے ہی تعلیم اور سیاسی شعور میں کشمیر سے پیچھے۔ ان تمام ملکوں کے پرچم وہاں لہراتے ہیں ۔ اسی طرح جنرل اسمبلی ہال اور مختلف کمیٹیوں کے بڑے کمروں میں ہر ملک کے لئے نشستیں مختص ہیں ۔ آپ کسی آزاد ملک کے ممبر ہوں تو اقوام متحدہ کے گیٹ پر سیکورٹی آفیسر آپ کو سلوٹ کرے گا لیکن ایک لکھے پڑھے کشمیری کو اسی سیکورٹی آفیسر کی طرف سے بریف کیس کی تلاشی ' جامہ تلاشی ' سوال و جواب اور پاس کے حصول کے لئے لائن میں کھڑے ہونے کے کرب ناک مراحل سے گزرنا پڑتا ہے سب سے اہم بات یہ کہ بین الاقوامی سطح پر کشمیریوں کے قومی تشخص نام کی کسی چیز کا وجود نہیں یہ ساری صورت حال ایک حساس کشمیری کو ایک انتہائی تکلیف دہ ذہنی کرب میں مبتلا کر دیتی ہے ۔ کاش اہل کشمیر کو اپنی اس انتہائی اہم محرومی کا بخوبی احساس ہوتا اور جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے مناسب جدوجہد کرتے ۔

بین الاقوامی کانفرنسوں میں کشمیر کی نمائندگی

کشمیری پارٹیوں میں سے یہ فخر لبریشن فرنٹ کو ہی حاصل ہے کہ اس نے اب تک نصف

درجن بھر نیم سرکاری اور 3 غیر سرکاری بین الاقوامی کانفرنسوں میں تحریک آزادئ کشمیر کی نمائندگی کرکے ان میں شریک ہونے والے مندوبین کو مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادئ کشمیر کے اہم پہلوؤں سے روشناس کرانے کے علاوہ ان کانفرنسوں میں کشمیریوں کے حق خودارادیت کے حق میں قراردادیں بھی منظور کرائی ہیں۔

ہمیں کسی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا موقع پہلی بار 78ء میں ملا جب اس سال 20 سے 25 نومبر تک برطانیہ کی نیو کاسل یونیورسٹی کی طرف سے ہفتۂ بین الاقوامی عوامی اتحاد منایا گیا۔ اس دوران دنیا بھر کی تحاریکِ آزادی اور آمر حکمرانوں کے خلاف عوامی جدوجہد پر تقریریں اور مباحثے ہوئے اور اس پر دنیا بھر کی تحاریک آزادی اور عوامی تحریکوں کے نمائندوں کے علاوہ بہت سے سفارتی نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ یونیورسٹی کی طرف سے تحریک آزادئ کشمیر کی نمائندگی کے لئے لبریشن فرنٹ کو دعوت دی گئی تھی چنانچہ میں نے کانفرنس میں لبریشن فرنٹ کی نمائندگی کی۔ کسی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا میرا بھی یہ پہلا موقع تھا 21 نومبر کو فلسطین، ایران (ان دنوں شاہ ایران کے خلاف تحریک زوروں پر تھی) کشمیر اور ترک قبرص کے مسائل پر تقاریر اور سوال و جواب کا سیشن ہونا تھا۔ میں نے اپنے تقریر میں مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادئ کشمیر سے متعلق تمام امور کی تفصیلی وضاحت کی۔ دوسرا سیشن سوال و جواب کا تھا جس میں تمام مندوبین نے حصہ لیا اور میری باری پر مجھ سے مسئلہ کشمیر تحریک آزادئ کشمیر اور لبریشن فرنٹ کے بارے میں سوال کئے گئے جن کے میں نے تفصیلی جواب دیئے۔ چنانچہ اس کانفرنس میں میری شرکت کے نتیجے میں دنیا بھر سے آئے ہوئے مندوبین کو مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادئ کشمیر سے متعلق حقائق سے آگاہی ہوئی۔ کانفرنس کے دوران ہمارا لٹریچر بھی بڑی مقدار میں تقسیم ہوا۔

اپریل 1979ء میں لندن میں اسلامک کونسل آف یورپ کے زیر اہتمام اور عرب جمہوریہ لیبیا کے مالی تعاون سے مقبوضہ مسلم علاقوں کی آزادی کے لئے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی اس کانفرنس میں سوڈان اور شام کے سابق وزرائے اعظم بہت سے ملکوں کے وزیروں اور سابق وزیروں اور پی ایل او سمیت جملہ مسلم تحاریک آزادی کے سینئر لیڈروں نے شرکت کی۔ اس اہم بین الاقوامی کانفرنس میں بھی تحریک آزادئ کشمیر کی نمائندگی لبریشن فرنٹ نے کی۔ ہمارے وفد میں میرے علاوہ کرنل ظفر اقبال قریشی مرحوم، عبدالجبار بٹ، نذیر الحق ناز‌ش اور محمود نظامی صاحب شامل تھے۔ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں میں نے اپنے وفد کے سربراہ کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ کانفرنس نشستند و گفتند و برخاستند تک ہی محدود نہیں رہنی چاہئے بلکہ جس مقصد کے لئے یہ کانفرنس ہو رہی ہے اس کے لئے ایک مستقل تنظیم قائم کی جانی چاہئے اور اسی کانفرنس کے دوران کی جانی چاہئے۔ میری اس تجویز کو شرکائے کانفرنس

نے ڈیسک بجا کر سراہا - چنانچہ دوسرے ہی دن "محکوم مسلمان ملکوں کی آزادی کے لئے بین الاقوامی تنظیم" کے نام سے مجوزہ تنظیم قائم ہوئی اور اسلامک کونسل کے سیکرٹری جنرل سالم عزام صاحب کو اس کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد کانفرنس کے شرکاء کو مختلف کمیٹیوں میں تقسیم کیا گیا مجھے سب سے اہم کمیٹی یعنی سیاسی کمیٹی میں شامل کیا گیا جس کے چیئرمین سوڈان کے سابق (اور موجودہ) وزیراعظم جناب صادق المہدی (مشہور مسلم مجاہد مہدی سوڈانی کے پوتے) تھے بعد میں صادق المہدی کی تجویز پر مجھے اس کمیٹی کا غیر سرکاری سیکرٹری چنا گیا - کمیٹی کے دوسرے ممبروں میں ترکی کے سابق وزیر داخلہ ڈاکٹر کور کوت اوزل - لیبیا کے موجودہ نائب وزیر خارجہ مفتاح مہدی ترک قبرص کے لندن میں نمائندے - اردن کے وزیر اوقاف' مورو نیشنل لبریشن فرنٹ کے ڈاکٹر فاورق کے علاوہ کچھ اور ممبر بھی شامل تھے ہمارے وفد کے کرنل ظفر اقبال اور جبار بٹ نے بھی کمیٹی کے ایک اجلاس میں شرکت کی۔

کمیٹی کے اجلاس کے بعد رات کو میں نے اور صادق المہدی نے عالم اسلام سے متعلق جملہ سیاسی معاملات کے بارے میں قراردادوں کے مسودے تیار کئے اور دوسرے دن اپنی کمیٹی سے منظور کرا کے ڈرافٹ کمیٹی کے حوالہ کر دیئے میں نے کشمیر سے متعلق قرارداد میں ریاست کی مکمل خود مختاری کا مطالبہ کر کے اسے اپنی کمیٹی سے بھی منظور کروایا تھا لیکن ڈرافٹ کمیٹی میں پاکستان کے معظم علی (جو اسلامک کونسل کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل بھی تھے) کے پر زور مطالبے پر خود مختاری کی جگہ حق خود ارادیت کے الفاظ درج کئے گئے بعد میں اسلامک کونسل کی طرف سے ان قراردادوں کی کاپیاں دنیا بھر میں تقسیم کی گئیں۔

کانفرنس کا اختتام ایک کھلے جلسہ عام سے ہوا جس میں لندن میں متعین مسلمان ملکوں کے سفیروں اور برطانیہ کی اہم مسلم سماجی اور سیاسی شخصیتوں کے علاوہ لبریشن فرنٹ کے تقریباً ایک سو افراد نے شرکت کی ۔ جلسے میں میں نے ایک انتہائی جذباتی تقریر کی جس پر بار بار تالیاں بجتی رہیں - میری تقریر کا روزنامہ نوائے وقت کے لندن کے نمائندے نے کانفرنس سے متعلق اپنی تفصیلی رپورٹ میں خاص طور پر ذکر کرتے ہوئے اسے کانفرنس کی تین بہترین اور مؤثر ترین تقریروں میں سے ایک قرار دیا۔ یہ رپورٹ نوائے وقت میں تفصیل سے شائع ہوئی۔ اسی رات لندن کے ایک بڑے ہوٹل میں کانفرنس کے مندوبین کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا گیا۔ کانفرنس ہال سے ہوٹل تک مندوبین کو کوچ میں لے جایا گیا اور اس سفر کے دوران مختلف وفود کے ممبروں خاص کر یوگوسلاویہ کے مفتی اعظم جناب محمدی یوسف سبا ہتیش نے انتہائی جذباتی اور مؤثر انداز میں کانفرنس کے شرکاء کے ضمیروں کو جھنجھوڑنے پر مجھے مبارک باد دی۔ کھانے سے پہلے پی ایل او کے نمائندے (ایران میں پی ایل او کے مشن کے سربراہ) نے میرے پاس آکر

میرا خاص طور پر شکریہ ادا کیا کیونکہ میں نے اپنی تقریر میں فلسطینیوں پر انسانیت سوز مظالم ڈھانے اور مسجد اقصیٰ پر قبضے کے سلسلے میں اسرائیل کے خلاف کوئی منظم اور متحدہ کارروائی نہ کرنے پر مسلمان ملکوں کی حکومتوں پر بڑے جذباتی انداز میں کڑی تنقید کی تھی۔

یہ کانفرنس تین دن جاری رہی اور اس دوران صادق المہدی صاحب کی تجویز پر مجھے بھی برطانیہ سے باہر سے آنے والی مندوبین کی طرح ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا چنانچہ میں فرصت کے اوقات کے دوران ان مندوبین سے فرداً فرداً ملتا اور ان سے مسئلہ کشمیر پر تبادلہ خیال کرتا رہا۔ ان میں سے کئی احباب کے ساتھ کئی سال تک میری خط و کتابت رہی۔

اسلامک کونسل آف یورپ ہی کے ذریعے لندن میں دسمبر 1979ء میں یروشلم کانفرنس اور اپریل 1980ء میں مسلم اقلیتوں کے بارے میں بین الاقوامی کانفرنس ہوئیں۔ میں نے کونسل کی طرف سے خصوصی دعوت پر دونوں کانفرنسوں میں شرکت کی۔ دوسری کانفرنس میں کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے حق میں ایک مفصل قرارداد بھی منظور ہوئی۔

ستمبر 1980ء میں نیو یارک میں مسلم تحاریک آزادی اور امریکی مسلمانوں کی تنظیموں کی ایک مشترکہ کانفرنس ہوئی جس میں میں نے تحریک آزادیٔ کشمیر کی نمائندگی کی۔ مجھے اس کی ڈرافٹ کمیٹی کا ممبر چنا گیا۔ اس کانفرنس میں بھی کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے حق میں ایک تفصیلی قرار داد منظور ہوئی اور اس کی کاپیاں کانفرنس کی طرف سے اقوام متحدہ میں دنیا کے تمام ملکوں کے سفارت خانوں کو بھیجی گئیں۔

1983ء میں فرنٹ سیوالیما کی طرف سے ہالینڈ میں ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی جس میں تحریک آزادیٔ کشمیر کی نمائندگی کے لئے ہمیں دعوت نامہ بھیجا گیا چنانچہ اس کانفرنس میں لبریشن فرنٹ کی نمائندگی ہمارے اس وقت کے سیکرٹری جنرل زبیر الحق انصاری نے کی۔ اس کانفرنس میں بھی ہمارے حق خود ارادیت کے حق میں قرار داد منظور ہوئی۔

ان کانفرنسوں میں شرکت کے علاوہ میں سرکاری بین الاقوامی کانفرنسوں کے غیر رسمی اجتماعات میں بھی شرکت کرتا رہا۔ مئی 1980ء میں اسلام آباد میں ہونے والی مسلم وزرائے خارجہ کی کانفرنس کے دوران ان وزرائے خارجہ کے اعزاز میں دیئے گئے ایک عصرانے میں شرکت کی اور اس دوران تقریباً بیس وزرائے خارجہ کے ساتھ مسئلہ کشمیر پر تبادلہ خیال کیا۔ اسی طرح ستمبر 1980ء میں نیویارک میں اسلامی کانفرنس کے اقوام متحدہ میں متعین نمائندے کی طرف سے وزرائے خارجہ کے اعزاز میں دیئے گئے عصرانے کے دوران بھی متعدد وزرائے خارجہ سے مسئلہ کشمیر پر تبادلہ خیال کیا۔

علاوہ ازیں میں نیو یارک میں اپنے قیام کے دوران ایک صحافی کی حیثیت سے مختلف سفارت خانوں کی طرف سے ان کے قومی دن کے سلسلے میں دیئے جانے والے عصرانوں اور

عشائیوں میں بھی شرکت کرتا رہا جن کا واحد مقصد اس دوران وہاں موجود وزرائے خارجہ اور سفارت کاروں تک کسی نہ کسی طرح مسئلہ کشمیر پر اپنا موقف پہنچانا ہوتا تھا۔

ستمبر 1986ء میں برمنگھم برطانیہ میں تحریکِ کشمیر کے زیر اہتمام اور مولانا محمود احمد میرپوری مرحوم اور مولانا منور حسین مشہدی کی کوششوں سے انٹرنیشنل کشمیر کانفرنس ہوئی جس میں لبریشن فرنٹ نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ میں ان دنوں برطانیہ میں قید تھا کانفرنس کے سلسلے میں میرا بہت پہلے سے مولانا میرپوری سے رابطہ تھا اور میں انہیں خطوط کے ذریعے تجاویز بھی بھیجتا رہا تھا۔ اس کانفرنس میں لبریشن فرنٹ کی نمائندگی ہمارے نیشنل زون کے صدر سردار رشید حسرت برطانیہ زون کے صدر محمد افضل جاتلوی، شبیر چوہدری، ملک لطیف، چوہدری عبدالرحمٰن، راجہ ظفر خان اور عظمت خان نے کی۔ اس کانفرنس میں دوسری کشمیری سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں یا نمائندوں نے بھی شرکت کی جن میں لبریشن لیگ کے سربراہ کے ایچ خورشید تحریک عمل کے سربراہ جنرل محمد حیات خان، جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے امیر کرنل محمد رشید عباسی، تحریک کشمیر کے سید منور حسن، جمعیت اہل حدیث آزاد کشمیر کے مولانا یونس اثری، جمعیت علمائے آزاد کشمیر کے مولانا بوستان قادری۔ آزاد کشمیر کے پیپلز پارٹی کے جاوید نظامی۔ محاذ رائے شماری کے محمد شفیع وت، مسلم کانفرنس کے فاضل چوہدری، کشمیر انقلابی کونسل کے محمد منیر چوہدری اور آزاد مسلم کانفرنس کے چوہدری سلطان محمود شامل تھے۔ کانفرنس نے ایک چھ نکاتی مشترکہ اعلان بھی جاری کیا۔

ہم نے جن بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی ان کی کارکردگی (مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادئ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنے کے سلسلے میں) خاصی مؤثر رہی کیونکہ ان کانفرنسوں کے منتظمین کی طرف سے کانفرنسوں میں منظور ہونے والی قرار دادوں (جن میں کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے حق میں منظور کی گئی قرار دادیں بھی شامل ہیں) کی بین الاقوامی سطح پر وسیع تشہیر کی گئی۔ علاوہ ازیں ان کانفرنسوں کے دوران ہم کانفرنسوں کے شرکاء کو بھی مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادئ کشمیر سے روشناس کراتے رہے۔

بین الاقوامی سطح پر خط و کتابت

گذشتہ دس سال کے دوران لبریشن فرنٹ کی طرف سے میں نے اور کبھی کبھار زبیر الحق انصاری، شبیر چوہدری، ظفر خان، عظمت خان اور محمود حسین نے بھی عالم اسلام غیر جانبدار تحریک سے وابستہ ملکوں اور مغربی یورپ اور لاطینی امریکہ کے ممالک کے وزرائے خارجہ کے نام مسئلہ کشمیر، تحریکِ آزادئ کشمیر، کشمیر میں بھارتی مظالم اور مقبول بٹ صاحب کو دی جانے والی سزائے

موت اور دیگر متعلقہ امور کے بارے میں درجنوں خط لکھے۔ اسی طرح ہم نے بین الاقوامی تنظیموں خاص کر اقوام متحدہ ، غیر جانبدار تحریک ، اسلامی کانفرنس ، افریقی اتحاد کی تنظیم ، عرب لیگ، امریکی ریاستوں کی تنظیم، رابطہ عالم اسلامی ، ایمنسٹی انٹرنیشنل ، انسانی حقوق کے بین الاقوامی کمیشن، اسلامک کونسل آف یورپ اور انسانی حقوق کے اسلامی کمیشن وغیرہ کو بھی مراسلے بھیجے۔ علاوہ ازیں مغربی ممالک کے ممبران پارلیمنٹ کو بھی خطوط لکھے جن میں سے اکثر کی طرف سے جوابی خطوط میں کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی حمایت کی گئی۔

ٹی وی ریڈیو اور اخبارات کو انٹرویو

انٹرویو:-

میرا سب سے پہلا ٹی وی انٹرویو 8 نومبر 1980ء کو نیویارک کے تھرڈ ورلڈ براڈکاسٹنگ نے ٹیلی کاسٹ کیا جس میں میں نے مسئلہ کشمیر ، تحریک آزادیٔ کشمیر اور مقبول بٹ کی سزائے موت کی تفصیلات بیان کیں - اس کے کچھ مدت بعد نیویارک میں اسلامیڈیا والوں نے میرا ٹی وی انٹرویو کیا اسلامیڈیا ایک نشریاتی کمپنی ہے جو عالم اسلام کی اہم شخصیتوں کے انٹرویوز اور اسلامی دنیا سے متعلق معاملات کے بارے میں اہم غیر مسلم شخصیتوں کے انٹرویو لے کر عالم اسلام کے نشریاتی اداروں کو بھیجتی ہے - اس ادارے کے سربراہ ایک ایران نژاد عراقی جناب اکرم زادے ہیں اور کشمیر کی آزادی سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں انہوں نے 1984ء میں بھی میرا آدھے گھنٹے سے زیادہ کا انٹرویو کیا جس میں میں نے مسئلہ کشمیر سے متعلق عالم اسلام کے اخلاقی فرائض کی نشاندہی کی۔ فروری 1984ء میں مقبول بٹ کی شہادت پر لندن کے آئی ٹی وی کے چینل فور نے آدھ گھنٹے کا پروگرام نشر کیا جس میں دوسروں کے علاوہ میرا تفصیلی انٹرویو بھی شامل تھا۔ میں نے مقبول بٹ شہید کو دی جانے والی سزائے موت کے بارے میں بھارتی حکومت کی طرف سے انہیں قاتل قرار دیئے جانے پر کہا تھا کہ اگر مقبول بٹ قاتل تھا تو گاندھی نہرو اور سبھاش چندر بوس تیسرے درجے کے قاتل تھے۔ میرے اس ریمارک کو برطانوی ٹی وی سے ٹیلی کاسٹ کرنے پر بھارتی وزیر خارجہ نے برطانوی حکومت سے سخت احتجاج کیا 1985ء میں چینل فور نے بھارت پر ایک مذاکرے میں سکھوں ، تاملوں کے علاوہ لبریشن فرنٹ کو بھی دعوت دی جس میں میں نے اور ظفر خان نے شرکت کی اور نظریۂ خود مختار کشمیر کی وضاحت کی -

ریڈیو

بین الاقوامی سطح پر میرا پہلا ریڈیو انٹرویو 21 ستمبر 1979ء کو ریڈیو وائس آف اسلام نیویارک نے نشر کیا جس کا ذکر اقوام متحدہ میں میری سرگرمیوں کے سلسلے میں آیا ہے۔ میرا دوسرا انٹرویو نومبر 1982ء میں ریڈیو ڈنمارک سے نشر ہوا جس میں میں نے مسئلہ کشمیر اور نظریۂ خود مختار کشمیر کی وضاحت کی اسلامیڈیا نیویارک نے 1980ء اور 1983ء میں بھی میرے انٹرویوز ریکارڈ کیے۔

فروری 1984ء میں بی بی سی ورلڈ سروس اور اردو سروس نے میرے چار انٹرویوز نشر کیے۔ علاوہ ازیں چلڈرن ریڈیو لیوشن ' بی بی سی ریڈیو بیڈ فورڈ ' بی بی سی ریڈیو برمنگھم اور بی آر ایم بی برمنگھم سے بھی میرے انٹرویو نشر ہوئے - ستمبر 1985ء میں میری برطانیہ میں گرفتاری سے دسمبر 1986ء میں برطانیہ بدری کے پندرہ ماہ کے دوران بھی بی بی سی لیسٹر' لندن اور بیڈ فورڈ' بی بی سی ورلڈ سروس اور بی بی سی اردو سروس سے میرے کیس سے متعلق خبریں اور تبصرے نشر ہوتے رہے۔

اخبارات

آزاد کشمیر اور پاکستان سے باہر جن اخبارات اور جرائد نے میرے انٹرویو شائع کیے ہیں ان میں بھارت کے ٹائمز آف انڈیا - ہندوستان ٹائمز' انڈین ایکسپریس' دھرم یوگ' بلٹز' ٹیلیگراف اور انڈیا ٹوڈے ' لندن کے جنگ ' اخبار وطن ' اوبزرور ' عربیہ ' کویت کے البلاغ' المجتمع اور سعودی عرب کے المدینہ شامل ہیں۔ کویت میں عرب دنیا کے اہم ترین اخبار مصر کے الاہرام کے نمائندے نے بھی میرا تفصیلی انٹرویو کیا تھا لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ شائع ہوا یا نہیں۔

ماہنامہ عربیہ لندن نے 1982ء میں کشمیر نمبر شائع کیا اس کا زیادہ تر مواد بھی میں نے ہی فراہم کیا تھا 1984ء میں پندرہ روزہ انڈیا ٹوڈے نے میری اور لبریشن فرنٹ کی سرگرمیوں کی ایک مفصل رپورٹ شائع کی۔

علاوہ ازیں اب تک میرے درجنوں مضامین اور مراسلے عالمی اخبارات کے علاوہ آزاد کشمیر پاکستان اور مقبوضہ کشمیر کے اخبارات اور جرائد میں شائع ہوئے ہیں جن کی تفصیلات میری تصانیف کے باب میں دی گئی ہیں۔

پریس کانفرنسیں

میں محاذ رائے شماری سے اپنی وابستگی کے دوران اس کے سیکرٹری جنرل اور چیئرمین پبلسٹی بورڈ اور این ایل ایف کے سیاسی شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے بھی آزاد کشمیر اور پاکستان میں پریس کانفرنسوں سے خطاب کرتا رہا لیکن میری اہم پریس کانفرنسیں لبریشن فرنٹ کے سیکرٹری جنرل ، صدر اور چیئرمین کی حیثیت سے ہوئیں ان حیثیتوں میں میں نے اب تک لندن کے فارن پریس ایسوسی ایشن میں پانچ۔ لیوٹن میں اپنی رہائش گاہ کشمیرہاؤس میں دو۔ نیویارک میں اقوام متحدہ کے پریس روم میں ایک ، کوپن ہیگن ڈنمارک میں ایک ، کویت میں ایک ، مظفر آباد آزاد کشمیر میں سات ، میرپور آزاد کشمیر میں پانچ ، راولپنڈی میں چھ اور کراچی میں تین بار پریس کانفرنسوں سے خطاب کیا ہے - برطانیہ میں ہونے والی پریس کانفرنسوں میں برطانوی' امریکی پاکستانی صحافیوں کے علاوہ بھارتی صحافیوں کی ایک بڑی تعداد بھی حاضر ہوتی تھی۔

اخبارات میں مضامین

گذشتہ تین عشروں سے زائد مدت کے دوران مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر برطانیہ ، امریکہ ، کینیڈا' سعودی عرب ، کویت ، پاکستان ، بھارت ، آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے روزناموں ، ہفت روزوں اور رسائل میں میرے سینکڑوں مضامین اور خط (مع کھلے خط) اردو' انگریزی اور عربی زبانوں میں شائع ہوئے ہیں ان کے علاوہ اپنے ماہنامے وائس آف کشمیر (کراچی) اور وائس آف کشمیر انٹرنیشنل (برطانیہ) کے اداریئے اور اکثر مضامین بھی میں ہی لکھتا رہا اور یہ بھی تعداد میں سینکڑوں تک پہنچتے ہیں۔

میرے بارے میں کالم مضامین اور بیانات

میرے نظریات میری سرگرمیوں ' میری اسیریوں اور میری برطانیہ بدری کے بارے میں آزاد کشمیر اور پاکستان کے علاوہ بیرونی ممالک کے اخبارات میں بھی کالم ' مضامین اور بیانات شائع ہوتے رہے ہیں ۔ روزنامہ جنگ کے تمام ایڈیشنوں میں مشہور کالم نویس ارشاد احمد حقانی کے دو اور پروفیسر وارث میر مرحوم کا ایک کالم شائع ہوا ' ہفت روزہ انصاف راولپنڈی کے مشہور کالم "اشارے" اور کشمیر کے کالم "انکشافات" میں بھی مجھ پر تبصرے ہوتے رہے ۔ برطانوی' عرب' پاکستانی اور کشمیری اخبارات اور جرائد میں افضل جاتکوی' شبیر چوہدری' ملک لطیف' عظمت خان'

ایم ایچ محبوب' مزمل حسین جعفری' مجید امجد بٹ' ہاشم قریشی' عباس احمد آزاد' ڈاکٹر فاروق حیدر' راجہ مظفر' رؤف کاشمیری' جی ایم مفتی' میر عبدالعزیز کے مضمون شائع ہوتے رہے علاوہ ازیں برطانیہ میں میری اسیری کے دوران برطانیہ کی متعدد پاکستانی اور کشمیری سیاسی پارٹیوں اور سماجی مذہبی تنظیموں کے علاوہ سینکڑوں افراد نے اخبارات کے ذریعے میرے حق میں آواز اٹھائی۔ برطانوی پارلیمنٹ کے درجن بھر ممبروں ایمنسٹی انٹرنیشنل' کونسل فار سول لبرٹیز برطانیہ اور برطانیہ کی نیشنل یونین آف جرنلسٹس نے بھی بھرپور آواز اٹھائی۔ ستمبر 1986ء میں برمنگھم میں منعقد ہونے والی انٹرنیشنل کشمیر کانفرنس نے میرے حق میں ایک قرار داد منظور کی اور اس کے بعد کانفرنس کے اہم ممبروں نے لندن میں اپنی پریس کانفرنس کے دوران بھی میرے حق میں آواز بلند کی۔ برطانیہ کی لیبر پارٹی کی متعدد شاخوں نے بھی میرے حق میں قرار دادیں منظور کیں۔

میرے بارے میں اخبارات کے اداریئے

میری سرگرمیوں' میرے نظریات' میری اسیری اور میری برطانیہ بدری کے بارے میں روزنامہ گارڈین لندن' ہفت روزہ البلاغ' کویت' ہفت روزہ المجتمع کویت' روزنامہ ٹائمز آف انڈیا بمبئی' روزنامہ مسلم اسلام آباد' روزنامہ حیدر راولپنڈی' روزنامہ جنگ لندن' روزنامہ وطن لندن اور اخبارِ وطن کے علاوہ کشمیری ہفت روزہ انصاف' ولر' قائد اور کشیر نے اداریئے لکھے۔

میں کھٹکتا تھا دلِ بھارت میں کانٹے کی طرح

برطانیہ میں میرے دس سالہ قیام کے دوران لبریشن فرنٹ کی اور خاص کر میری سرگرمیوں کی وجہ سے بھارتی حکومت خاصی پریشان تھی۔ ہماری طرف سے بین الاقوامی تنظیموں اور دنیا بھر کے وزرائے خارجہ اور اقوام متحدہ کے علاوہ لندن اسلام آباد اور نئی دہلی میں دنیا بھر کے سفیروں اور ذرائع ابلاغ کو بھیجے گئے سینکڑوں خطوط (جن میں ٹھوس دلائل اور تاریخی حوالوں کی مدد سے کشمیر پر بھارت کے سامراجی مؤقف اور جابرانہ قبضے کی قلعی کھول دی جاتی تھی) لندن' نیویارک' کوپن ہیگن' ایمسٹرڈم' دی ہیگ' بون' مغربی برلن اور پیرس میں ہماری طرف سے ہونے والے متعدد مظاہروں اکتوبر 1980ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ہال کے اندر ہمارے ممبروں کی بھارت کے خلاف نعرے بازی 1984ء میں لندن میں مسز گاندھی کے خلاف مظاہرے اور اس کی برطانوی ٹی وی پر پہلی خبر کی حیثیت سے دکھائے جانے' ڈنمارک میں ہمارے زبردست مظاہرے کے نتیجے میں مسز گاندھی کو ائرپورٹ سے سرکاری مہمان خانے تک ٹینکوں کی

حفاظت میں لے جانے' فروری 1982ء میں لیوٹن میں بھارتی یوم جمہوریہ کے سلسلے میں ہونے والے جلسے میں ہمارے ممبروں کی طرف سے گڑ بڑ - 1981ء میں دہلی میں ہونے والی غیر جانبدار تحریک کے ممبر ممالک کے وزرائے خارجہ کانفرنس کے دوران وہاں ہماری سرگرمیاں - 1981ء میں دی ہیگ اور برسلز میں بھارتی سفارت خانوں پر ہمارے ممبروں کی کارروائی - میری طرف سے پریس کانفرنسوں' ریڈیو اور ٹی وی انٹرویوز اور مضامین کے ذریعہ کشمیر میں بھارت کے سامراجی چہرے کے بے نقاب کرنے' وائس آف کشمیر انٹرنیشنل کے اداریوں اور مضامین' نیویارک میں جگہ جگہ چسپاں ہونے والے سٹیکرز' مقبول بٹ کو بھارتی حکومت کی طرف سے سنائی جانے والی سزائے موت کی عالمی سطح پر وسیع پبلسٹی' ہماری کوششوں سے انسانی حقوق کے عالمی کمیشن' ایمنسٹی انٹرنیشنل' برطانیہ کی نیشنل یونین آف جرنلسٹس' اسلامک کونسل آف یورپ' انسانی حقوق کے اسلامی کمیشن' لیبیا کے صدر قذافی اور پی ایل او کے سربراہ یاسر عرفات کی طرف سے بھارتی حکومت کو بھیجے گئے مراسلوں' ٹیلیگراموں' نیویارک سے لے کر یورپ اور مشرق وسطیٰ' پاکستان اور آزاد کشمیر تک پھیلی ہوئی ہماری تنظیم کے ممبروں کی طرف سے بھیجے گئے مراسلات' غیر سرکاری اور نیم سرکاری بین الاقوامی کانفرنسوں میں ہماری طرف سے کشمیر میں بھارت کے سامراجی کردار اور کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضے کو بے نقاب کرنے اور کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے حق میں قراردادیں منظور کرانے' اور ہماری اسی قسم کی دوسری بھارت خلاف سرگرمیوں نے بھارتی حکومت کو خاصا پریشان کر دیا تھا اور بھارتی حکومت یہ بھی جانتی تھی کہ لبریشن فرنٹ کی ان کارروائیوں میں کلیدی کردار میرا تھا - چنانچہ بھارتی حکومت نے 1980ء سے ہی مجھے برطانیہ سے نکلوانے کی کوششیں شروع کیں اور آخر 1985ء میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ میری 1985ء میں برطانیہ میں گرفتاری اور 1986ء میں عدالت سے بری ہو جانے کے باوجود برطانیہ بدری کے پیچھے واضح طور پر بھارتی حکومت کا ہاتھ تھا اور مندرجہ ذیل حقائق اس کی واضح طور پر تصدیق کرتے ہیں۔

1- 5 ستمبر 1985ء کو برطانیہ میں میری اور میرے ساتھیوں کی گرفتاری کے دوسرے دن برطانیہ کی حکمران پارٹی کے حامی اخبار ڈیلی ٹیلیگراف نے صفحہ اول پر خبر دی کہ یہ گرفتاریاں بھارتی حکومت کے اشارے پر عمل میں آئی ہیں۔

2- دسمبر 1985ء میں بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی نے دہلی میں بیان دیا کہ وہ علیحدگی پسندوں (خالصتان کے حامیوں اور کشمیر لبریشن فرنٹ) کو ملک کے اندر اور ملک سے باہر بھی کچل دیں گے۔ ملک سے باہر وہ متعلقہ حکومت کے تعاون سے کچل سکتے تھے۔

3- دسمبر 1985ء میں ہی بھارتی وزیر خارجہ نے بھارتی پارلیمنٹ میں اس سے کئے گئے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ بھارتی حکومت' سکھ اور کشمیری علیحدگی پسندوں کے خلاف اقدامات کر

رہی ہے جس کے نتیجے میں اس وقت چار سکھ اور ایک کشمیری علیحدگی پسند برطانیہ کی جیلوں میں ہیں۔ اس وقت برطانیہ کی جیل میں "علیحدگی پسند" کشمیری میں ہی تھا۔

4 - میری گرفتاری کے بعد جب پولیس مجھ سے بیان لے رہی تھی تو ایک بار پولیس افسر نے مجھ سے غیر رسمی طور پر پوچھا کہ اگر حکومت آپ پر کیس چلانے کی بجائے آپ کو برطانیہ بدر کرنے کا فیصلہ کرے تو کیا اس پر آپ راضی ہو جائیں گے - میرے انکار پر وہ خاموش ہو گیا۔ اس سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ برطانوی حکومت شروع سے ہی مجھے سزا دینے یا ملک بدر کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

5 - برطانوی عدالت میں مجھ پر چلنے والے کیس کے دوران واضح طور پر معلوم ہوتا تھا کہ سرکاری وکیل کی بریفنگ بھارتی ہائی کمیشن کر رہا ہے۔

6 - عدالت سے بری ہو جانے کے باوجود مجھے برطانیہ بدر کرنے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے برطانوی وزیر داخلہ نے اپنے خط میں واضح طور پر لکھا ہے کہ امان اللہ خان ماضی میں بھارت کے خلاف مسلح جدوجہد میں مصروف رہا ہے اور یہ کہ اس کی برطانیہ میں موجودگی برطانیہ کے قومی مفاد کے خلاف ہے (یعنی اس سے برطانیہ کے بھارت کے ساتھ تعلقات خراب ہوتے ہیں) یہی جواب برطانوی وزیر داخلہ نے ان متعدد ممبران پارلیمنٹ کو بھی دیا جنہوں نے میری برطانیہ بدری کے خلاف احتجاج کیا تھا۔

7 - بھارت کے مشہور اور حکومت کے حامی اخبار ٹائمز آف انڈیا نے بھی اپنی 25 ستمبر 1986ء کی اشاعت میں لکھا کہ امان اللہ خان کو برطانیہ بدر کرنے کے فیصلے کے بعد بھارت اور برطانیہ کے درمیان کئی ارب روپے کی مالیت کی تجارت کے معاہدے ہوئے ہیں۔ اسی خبر میں یہ بھی لکھا گیا کہ امان اللہ کی برطانیہ بدری کے برطانوی فیصلے سے بھارتی حکومت نے اطمینان کا سانس لیا ہے۔ اخبار نے اپنے یکم اکتوبر کے اداریے میں بھی میری برطانیہ بدری پر تبصرہ کیا۔

بہر حال اس حقیقت کے حق میں اور بھی واقعاتی ثبوت موجود ہیں کہ مجھے بھارتی حکومت کے دباؤ کے تحت (عدالت سے بری ہونے کے باوجود) برطانیہ بدر کیا گیا برطانوی حکومت کی طرف سے بھارتی دباؤ قبول کرنے کا پس منظر یہ ہے کہ برطانوی حکومت اپنی دم توڑتی ہوئی ہیلی کاپٹر انڈسٹری میں جان ڈالنے کے لئے بھارت کو اپنے تیار کردہ ہیلی کاپٹر فروخت کرنا چاہتی تھی لیکن بھارتی حکومت نے برطانیہ کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اسے بلیک میل کرتے ہوئے برطانوی ہیلی کاپٹر خریدنے کے لئے یہ شرط رکھی کہ برطانوی حکومت برطانیہ میں سرگرم تحریک خالصتان اور کشمیر لبریشن فرنٹ کو کچل دے چنانچہ اپنی ہیلی کاپٹر انڈسٹری کو بچانے کے لئے برطانوی حکومت نے میرے خلاف یہ غیر معمولی قدم اٹھایا۔

بھارتی حکومت ہم سے کتنی الرجک (Alergic) ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا

جاسکتا ہے کہ 1984ء میں اس نے بھارتی مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو جن الزامات کی بنا پر اس کے عہدے سے ہٹایا ان میں یہ الزام بھی شامل تھا کہ فاروق عبداللہ کا لبریشن فرنٹ اور اس کے سربراہ امان اللہ خان سے رابطہ تھا۔

اگرچہ بھارتی حکومت اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ امان اللہ خان کی برطانیہ بدری کے بعد وہاں لبریشن فرنٹ مفلوج ہو جائے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری برطانیہ بدری سے مجموعی طور پر تحریکِ آزادیٔ کو نقصان سے کہیں زیادہ فائدہ ہی پہنچا۔

آزاد کشمیر و گلگت بلتستان سے متعلق معاملات

ہم تحریکِ آزادی کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر اور گلگت و بلتستان کے عوام کے روزمرہ کے سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کی طرف بھی مناسب توجہ دیتے رہے ہیں چنانچہ ہم خط و کتابت، ٹیلیگراموں، اخباری بیانات، پریس کانفرنسوں، قراردادوں، جلسوں اور احتجاجی مظاہروں کے ذریعے اور وائس آف کشمیر میں شائع ہونے والے مضامین، اداریوں اور طنز و مزاح کے کالموں کے ذریعہ آزاد کشمیر کے عوامی مسائل، آزاد کشمیر میں جمہوریت کی بحالی گلگت بلتستان کے عوامی مسائل اور آئینی حقوق کے بارے میں بھرپور آواز اٹھاتے رہے ہیں۔

بھارتی مقبوضہ کشمیر کے معاملات

ہم بھارتی مقبوضہ کشمیر کی صورت حال خاص کر وہاں پر ہونے والی جمہوریت کشی محب وطن کشمیریوں کی قید و بند، دوران اسیری انہیں دی جانے والی انسانیت سوز جسمانی اور ذہنی اذیتوں، ان کے آئینی سیاسی اور قانونی حقوق کی پامالی۔ بھارتی قابض فوج کے مظالم، کشمیر میں بھارت کے پٹھوؤں کی جمہوریت کشی اور ظالمانہ سرگرمیوں اور کشمیر کی آئینی حیثیت کے بارے میں بھارت کے بے بنیاد دعوؤں کے خلاف بھرپور اور مسلسل آواز اٹھاتے رہے اور اس سلسلے میں بین الاقوامی تنظیموں خاص کر اقوام متحدہ، انسانی حقوق کے بین الاقوامی کمیشن، غیر جانبدار تحریک، اسلامی کانفرنس اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کو خطوط، تاروں اور ذاتی ملاقاتوں کے ذریعہ آگاہ کرتے رہے۔

علاوہ ازیں ان معاملات کے بارے میں ہم نے جلسوں، مظاہروں اور لٹریچر کے ذریعہ بھی بھرپور آواز اٹھائی۔ 26 جولائی 1980ء کو سری نگر میں بھارتی فوج کی طرف سے نہتے کشمیریوں پر فائرنگ اور تشدد کے خلاف ہم نے لندن، ڈنمارک، ہالینڈ مغربی جرمنی اور نیویارک

میں بھارتی سفارت خانوں پر زبردست احتجاجی مظاہرے کرائے ۔ میں نے شیخ محمد عبداللہ اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے علاوہ کشمیر اسمبلی کے ممبروں کے نام کھلے خطوں میں ان کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ۔

لبریشن فرنٹ کی کارکردگی کا مجموعی جائزہ

گو ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ اپنی اب تک کی کارکردگی کی بنیاد پر الجزائر کے ایف ایل این ، ویٹ نام کے این ایل ایف ، فلسطین کے پی ایل او یا جنوب مغربی افریقہ کے سواپو کے معیار کی کوئی تنظیم ہے لیکن میں یہ دعویٰ پورے اعتماد کے ساتھ کر سکتا ہوں اور پچھلے صفحوں میں درج فرنٹ کی سرگرمیوں سے متعلق حقائق اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ جدوجہدِ آزادی کے تینوں یعنی سیاسی ، سفارتی اور عسکری محاذوں پر جتنا کام ہم نے گذشتہ دس سالوں کے دوران کیا ہے اتنا کسی دوسری کشمیری تنظیم نے نہیں کیا ، بلکہ تحریکِ آزادی کے متعلق کچھ شعبے تو ایسے ہیں جہاں ہماری گذشتہ دس سال کی کارکردگی دوسری تمام کشمیری سیاسی پارٹیوں کی 1948ء کے بعد کی مجموعی کارکردگی سے بھی کہیں زیادہ ہے - میرے اس دعوے کو ممکن ہے کچھ لوگ چھوٹا منہ بڑی بات قرار دیں لیکن کیا ایسا کہنے والے لبریشن فرنٹ کی کارکردگی سے متعلق مندرجہ ذیل حقائق کا دوسری کشمیری تنظیموں کی کارکردگی سے موازنہ کرنے کے بعد بھی میرے اس دعوے کو جھٹلا سکتے ہیں؟

1 - جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ واحد کشمیری تنظیم ہے جس نے اپنی شاخیں ریاست کے تینوں حصوں یعنی آزاد کشمیر ، گلگت ، بلتستان اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کے علاوہ پاکستان مشرق وسطیٰ اور یورپ کے متعدد ملکوں اور امریکہ میں بھی قائم کی ہیں۔

2 - لبریشن فرنٹ واحد کشمیری تنظیم ہے جو جدوجہدِ آزادی کے تینوں محاذوں پر سرگرم عمل ہے۔

3 - لبریشن فرنٹ واحد کشمیری تنظیم ہے جس کا مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادئ کشمیر سے متعلق نصف درجن سے زیادہ کتابچوں ، درجنوں یادداشتوں اور پمفلٹس (Pamphlets) پر مشتمل لٹریچر بھاری مقدار میں اندرون ریاست کے علاوہ دنیا کے کونے کونے میں تقسیم ہوتا رہا ہے۔

4 - لبریشن فرنٹ واحد کشمیری تنظیم ہے جو مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادئ کشمیر کے بارے میں اہم بین الاقوامی تنظیموں اور اداروں خاص کر اقوام متحدہ ، غیر جانبدار تحریک ، اسلامی کانفرنس ، رابطہ عالم اسلامی ، انسانی حقوق کے بین الاقوامی کمیشن اور ایمنسٹی انٹرنیشنل سے مسلسل خط وکتابت کرتی رہی ہے اور ان میں سے اکثر تنظیموں کی طرف سے فرنٹ کو خطوط بھی ملتے رہے

ہیں۔
5 - لبریشن فرنٹ واحد کشمیری تنظیم ہے جس نے اب تک نصف درجن سے زیادہ نیم سرکاری اور غیر سرکاری بین الاقوامی کانفرنسوں میں کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی نمائندگی کر کے ان کانفرنسوں میں کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے حق میں قراردادیں منظور کرائیں جن کی نقول دنیا بھر میں تقسیم ہوتی رہی ہیں۔
6 - لبریشن فرنٹ واحد کشمیری تنظیم ہے جس نے اب تک یورپ کے نصف درجن بھر دارالحکومتوں امریکہ اور پاکستان میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں درجنوں مظاہرے کرائے ہیں۔
7 - لبریشن فرنٹ واحد کشمیری تنظیم ہے جس کے ممبروں نے اکتوبر 1980ء میں نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ہال کے اندر ڈیڑھ سو سے زائد ممالک کے وزرائے خارجہ اور سینئر سفارت کاروں اور دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کی موجودگی میں پندرہ بیس منٹ تک آزادیٔ کشمیر کے حق میں نعرے لگا کر عالمی رائے عامہ کو مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے وجود کی یاددہانی کرائی۔
8 - لبریشن فرنٹ ہی کی کوششوں سے امریکہ یورپ اور عرب ممالک کے اخبارات اور جرائد میں مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے بارے میں مضامین شائع ہوئے۔
9 - لبریشن فرنٹ واحد کشمیری تنظیم ہے جس کے ممبر جدوجہد آزادی کے سلسلے میں مقبوضہ کشمیر آزاد کشمیر پاکستان اور برطانیہ میں پابند سلاسل رہے ہیں یہی نہیں بلکہ اس تنظیم کے سربراہ کو برطانیہ کی حکومت نے پندرہ ماہ قید رکھنے کے بعد بھارتی دباؤ کے تحت برطانیہ بدر کر دیا۔
10 - اور سب سے اہم بات یہ کہ لبریشن فرنٹ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کا نوجوان سابقہ مدافعتی جدوجہد ترک کر کے مسلح جدوجہد کی راہ اپنا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہاں ریاست کی مکمل خود مختاری کا نظریہ بھی بڑی تیزی سے مقبول ہو رہا ہے اور اس کی اہم ترین وجہ بھی ہمارا لٹریچر ہے۔

لبریشن فرنٹ کی اس کارکردگی اور ان کاوشوں کے باوجود مجھے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ہم ابھی نہ تو بین الاقوامی رائے عامہ خاص کر دنیا کی حکومتوں کی اعلانیہ حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں نہ ہی ریاستی عوام کی اکثریت واضح طور پر ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ ان دونوں تلخ حقائق کے پس منظر میں ایسے عوامل کارفرما ہیں جن پر ہمارا کنٹرول نہیں۔ ہمیں بین الاقوامی رائے عامہ کی واضح حمایت حاصل نہ ہونے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ کم از کم تین عشروں کے دوران مختلف وجوہات کی بنا پر بین الاقوامی سطح پر یہ تاثر ابھرا ہے بلکہ قصداً" ابھارا گیا ہے کہ مسئلہ کشمیر بھارت اور پاکستان کے مابین ایک قطعہ زمین کی ملکیت سے متعلق ایک تنازعہ ہے اور عالمی رائے عامہ مختلف ممالک کے مابین علاقائی

تنازعات سے لاتعلق رہتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بھارت نے دنیا بھر میں مختلف طریقوں سے یہ تاثر بھی پیدا کیا ہے کہ مسئلہ کشمیر کا کوئی وجود نہیں اور یہ کہ کشمیری عوام کی بھاری اکثریت ریاست کے بھارت سے الحاق کو حتمی سمجھتی ہے اور اس سے مطمئن ہے اس سلسلے میں بھارت اقتدار پرست کشمیری لیڈروں خاص کر شیخ محمد عبداللہ اور فاروق عبداللہ کے بھارت موافق بیانات خاص کر 1975ء کے دہلی ایکارڈ کی عالمی سطح پر وسیع تشہیر کرتا رہا ہے ۔ ادھر اندرون کشمیر کوئی منظم تحریکِ آزادی نہیں تھی اور بھارت مخالف عناصر کی طرف سے آزادی کی بجائے پاکستان موافق نعرے لگتے تھے ، بھارت دنیا کو ان کے بارے میں یہ تاثر دیتا رہا کہ یہ نعرے پاکستان کے تنخواہ دار ایجنٹ لگا رہے ہیں ۔ چنانچہ دنیا کشمیریوں کے اصل جذبات سے بے خبر رہی۔ تیسری اور غالباً اہم ترین وجہ یہ ہے کہ تحاریک آزادی کی حامی ہونے کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود دنیا کی ہر حکومت اپنے قومی مفاد کو ہر دوسرے مسئلے پر فوقیت دیتی ہے ۔ بھارت تیسری دنیا کے ایک اہم ملک کی حیثیت سے بین الاقوامی سطح پر گہرے اثر و رسوخ کا مالک ہے جس کی ناراضگی مول لینے کی جرأت بہت کم ملک کرتے ہیں۔ خاص کر جبکہ اندرون کشمیر کسی بڑی تحریکِ آزادی کا وجود بھی نہیں تھا۔ کچھ ممالک پاکستان سے قریبی تعلقات کی وجہ سے بھی واضح طور پر ہماری حمایت کرنے سے ہچکچاتے ہیں کیونکہ بین الاقوامی سطح پر یہ تاثر ابھارا گیا ہے کہ پاکستان خود مختار کشمیر کے نظریئے کے خلاف ہے۔ چنانچہ ان تمام عوامل کی وجہ سے ہمیں عالمی رائے عامہ کی خاطر خواہ اور اعلانیہ حمایت ابھی تک حاصل نہیں ہو سکی ہے گو کئی ممالک کے وزرائے خارجہ اور سفیروں نے مجھ سے ملاقاتوں کے دوران میرے اس استدلال سے پوری طرح اتفاق کیا کہ مسئلہ کشمیر کا بہترین حل پوری ریاست کی مکمل خود مختاری ہے لیکن جب ان سے اس نظریئے کی اعلانیہ حمایت کرنے کے لئے کہا گیا تو مختلف بہانوں سے معذرت کرتے رہے۔

یہ قابل افسوس صورت حال اسی صورت میں بدل سکتی ہے کہ اندرون کشمیر (بھارتی مقبوضہ کشمیر میں) مکمل خود مختاری کا نظریہ پوری طرح مقبول ہو اور اس کے حصول کے لئے مسلح جدوجہد کی جائے اور دونوں کی بین الاقوامی سطح پر وسیع تشہیر ہو ۔ ہم ان ہی کوششوں میں مصروف ہیں اور اس سلسلے میں مکمل کامیابی کب حاصل ہو گی اس کا جواب وقت ہی دے سکتا ہے۔

1958ء میں کراچی میں کشمیریوں کے ایک احتجاجی جلوس کے ساتھ (کالی پٹی باندھے)

1965ء میں سیالکوٹ میں محاذ رائے شماری کے عہدہ داروں کے ساتھ
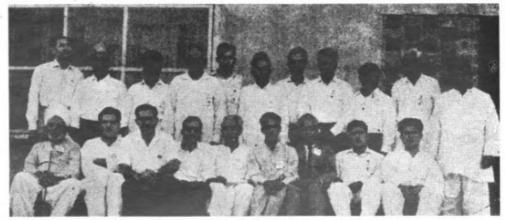
1966ء میں میرپور میں محاذ رائے شماری کنونشن کے دوران کچھ مندوبین کے ساتھ

1972ء میں میرپور میں ایک جلسے کے دوران آزاد کشمیر کے دو سابق صدور کے ایچ خورشید اور سردار محمد

مئی 1965ء میں کراچی میں گرفتاری

کراچی جیل سے رہائی کے بعد کے ایچ خورشید اور دوسرے احباب کے ساتھ
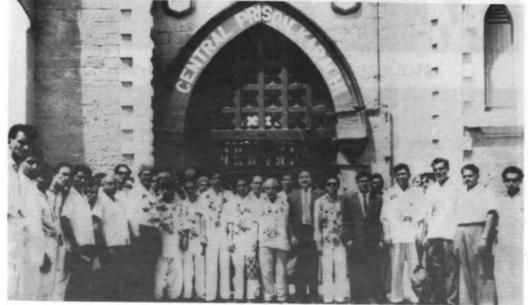
1966ء میں محاذ رائے شماری کے کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے
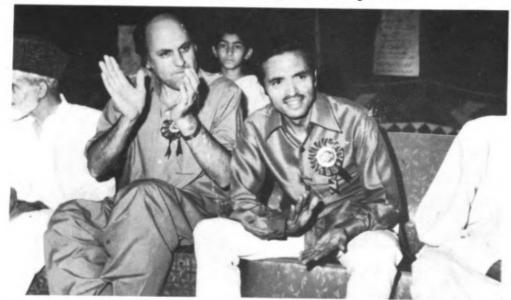
1974ء میں میرپور آزاد کشمیر میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ساتھ

1968ء میں میرپور میں پرچم کشائی کرتے ہوئے

مقبول احمد بٹ

جی ایم لون

میر عبدالقیوم

امان اللہ خان

میجر امان اللہ

مقبول بٹ شہید رہائی کے بعد احباب کے ساتھ (مارچ 1969ء)

گنگا ہائی جیکنگ کیس کے ملزم عدالت کے باہر احباب کے ساتھ (1973ء)
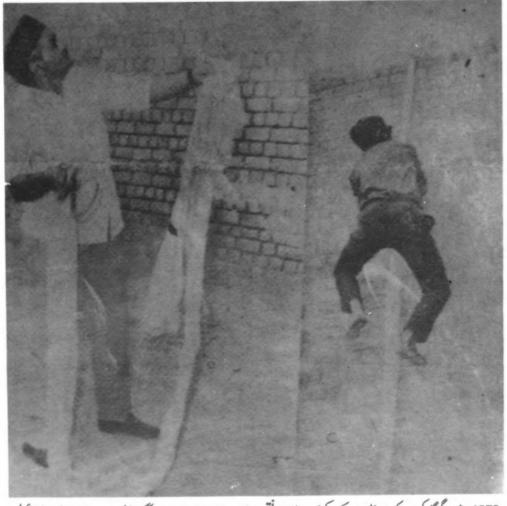
1972ء میں گنگا کیس کی عدالت کے کہنے پر غلام نقی صاحب 1948ء میں سرینگر جیل سے اپنے فرار کا عملی
مظاہرہ بشیر لون کی مدد سے کر رہے ہیں
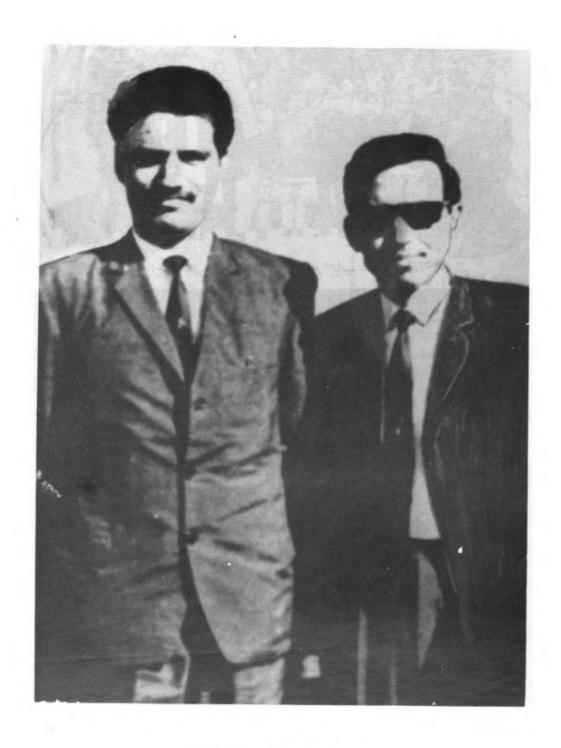
1974ء میں شہید مقبول بٹ کے ساتھ

1976ء میں پہلی بار لندن ائرپورٹ پہنچنے پر کشمیری نوجوانوں کے ساتھ

1978ء میں لبریشن فرنٹ کے عہدہ داروں کی حلف وفاداری (برمنگھم)
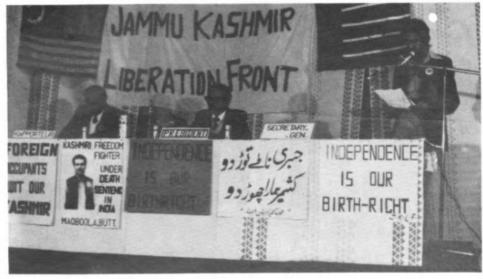
لیوٹن میں لبریشن فرنٹ کے کونشن میں زبیرالحق قرار دادیں پیش کر رہے ہیں

لبریشن فرنٹ کی سنٹرل کمیٹی اور ممبران کا گروپ فوٹو (برمنگھم 1984ء)

لبریشن فرنٹ کے عہدہ داروں سے
حلف وفاداری لیتے ہوئے (لیوٹن 1982ء)

فرنٹ کی ہالینڈ برانچ کے عہدہ داروں سے حلف وفاداری لیتے ہوئے

ابو ظہبی میں تنظیم کے ممبروں کے ساتھ (1984ء)

ڈنمارک میں لبریشن فرنٹ کے ممبروں کے ساتھ (1981ء)

1984ء میں راولپنڈی میں لبریشن فرنٹ کے ممبروں کے ساتھ

مغربی برلن میں لبریشن فرنٹ کے عہدہ داروں سے حلف لیتے ہوئے (1981ء)

لیوٹن (برطانیہ) میں اپنی رہائش گاہ کشمیر ہاؤس کے باہر

1980ء میں جدہ شاخ کے ممبروں کے ساتھ

خالصتان کی جلا وطن حکومت کے صدر ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان کے ساتھ (برمنگھم 1984ء)

1977ء میں لندن میں مظاہرہ کرتے ہوئے

کویت میں مشہور مصری روزنامہ الاہرام کے نمائندے
کو انٹرویو دیتے ہوئے (جنوری 1985ء)

پریس کانفرنس کے دوران لئے گئے میرے اس
فوٹو کو ذرائع ابلاغ بہت استعمال کرتے رہے

برمنگھم میں ایک سماجی تقریب کے موقع پر (1979ء)

ہائیڈ پارک لندن سے بھارتی ہائی کمیشن روانگی سے پہلے مظاہرین سے خطاب

ڈنمارک میں لبریشن فرنٹ کا مظاہرہ اور احتجاجی مارچ

ہائیڈ پارک لندن میں مظاہرین کی قیادت کرتے ہوئے (فروری 1984ء)

مغربی جرمنی میں لبریشن فرنٹ کا مظاہرہ

کشمیر میں بھارتی سامراج کا تابوت ہائیڈ پارک لندن میں

کشمیر میں بھارتی سامراج کا تابوت لئے بھارتی ہائی کمیشن لندن کی طرف مارچ

جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خلاف لندن میں ہونے والے مظاہرے میں (1984ء)

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اندر گھس کر آزادی کشمیر کے نعرے لگانے والے مجاہد

جاوید بھٹی

یاسین جنجوعہ

مشتاق خان

محمود احمد

نیویارک میں اقوام متحدہ کے سامنے مظاہرہ (1979ء)

لندن میں جنگ آزادی الجزائر کے ہیرو احمد بن بیلا کے ساتھ (1982ء)

نیو یارک میں مسلم سفارت کاروں کے ساتھ (1980ء)

حِصّہ سوم

اسیریاں

میری اسیریاں (قید و بند)

جدوجہد آزادی میں مصروف افراد کے لئے جیل، حوالات اور تفتیشی مراکز کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتے۔ بالفاظ دیگر جدوجہد آزادی اور اسیری عام طور پر لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی وقفے وقفے سے جیل یاترا کرتا رہا اور ان اسیریوں کے دوران دلچسپ اور سبق آموز واقعات پیش آتے رہے۔

اپنی اسیریوں سے متعلق تفصیلات بیان کرنے کا اہم مقصد یہ ہے کہ قارئین خاص کر حال اور مستقبل کا نوجوان طبقہ ان اسیریوں سے متعلق واقعات سے مناسب سبق اور معلومات حاصل کرے۔ علاوہ ازیں چونکہ ان اسیریوں کے دوران کے واقعات میری زندگی کے اہم اور یادگار واقعات میں سے ہیں اس لئے اپنی داستان حیات میں ان کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلی اسیری

48-1947ء میں کشمیر کی جنگ آزادی کے دوران میں مقبوضہ کشمیر کے ہندواڑہ ہائی سکول میں زیر تعلیم تھا۔ ہمارے کچھ مسلمان اساتذہ جنگ آزادی میں عملی حصہ لینے والوں سے قریبی تعلق رکھے ہوئے تھے اور وہ کچھ طلباء سے بھی جن میں میں بھی شامل تھا' چھوٹے موٹے کام لیتے۔ ایک دن ہمارے یہ اساتذہ گرفتار ہو گئے ۔ میں اتوار منانے کے لئے ہمشیرہ کے ہاں ہانی ہامہ گیا ہوا تھا وہاں سے پیر کو سکول آیا تو سکول سے ہی مجھے پولیس پکڑ کر تھانے لے گئی۔ رات کو مجھ سے پوچھا گیا کہ آیا میں بھی سکول کے اساتذہ کے خفیہ اجلاسوں میں شرکت کرتا تھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا جو کہ حقیقت تھی۔ بہرحال زیادہ پوچھ گچھ نہیں ہوئی نہ ہی کوئی تشدد ہوا۔ غالباً تھانے کا انچارج بھی آزادئ کشمیر سے دلچسپی رکھتا تھا چنانچہ اس نے مجھے کیس سے بچا لیا۔ اور دوسری صبح کو مجھے چھوڑ دیا گیا۔
یہ تھی میری پہلی اور مختصر ترین اسیری۔

کراچی مئی 1965ء

دوسری بار میری گرفتاری مئی 1965ء میں کراچی میں ہوئی۔ 9 مئی 1965ء کو شیخ محمد عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کو سعودی عرب سے واپسی پر دہلی ایئرپورٹ پر گرفتار کیا گیا۔ جب ہم نے یہ خبر سنی تو اس گرفتاری کے خلاف کراچی میں احتجاجی جلوس نکالنے کا پروگرام بنایا۔ لیکن اس پروگرام پر عمل ہونے سے پہلے ہی ہمیں گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں میرے علاوہ میر عبدالقیوم' غلام حسن پنجابی' غلام محی الدین بانکا' ملک عبدالرشید' غلام رسول شاہ' محمد ممتاز عباسی اور عبدالغفار لون شامل تھے۔ رات کو ہمیں مختلف پولیس سٹیشنوں میں رکھ کر دوسرے دن سنٹرل جیل کراچی بھیجا گیا۔ جہاں ہم تقریباً ایک ہفتہ رہے۔ جس کے بعد ہمیں رہا کر دیا گیا۔
یہ میری دوسری اسیری تھی۔

کراچی ستمبر 1965ء

ستمبر 1965ء میں پاک بھارت جنگ ہوئی۔ پاکستانی اخبارات اور خبروں سے پتہ چلتا تھا کہ جنگ میں پاکستان کا پلہ واضح طور پر بھاری ہے۔ لیکن 20 ستمبر کو اچانک خبر آئی کہ حکومت پاکستان

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرار داد کو منظور کرتے ہوئے جنگ بندی پر راضی ہو گئی ہے جس کا پاکستانیوں کے علاوہ ہم کشمیریوں کو بھی سخت افسوس ہوا چنانچہ ہم نے جنگ بندی کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے لاؤڈ سپیکر پر مظاہرے کا اعلان کرنے کی ذمہ داری لے لی اور ملک عبدالرشید کو ساتھ لے کر ایک ٹیکسی میں لاؤڈ اسپیکر نصب کر کے شہر میں احتجاجی مظاہرے کا اعلان کیا۔ ہمارے انتہائی جوشیلے اعلان سے لوگوں کے جذبات اور بھی بھڑک اٹھے چنانچہ دوسرے دن کراچی کی تاریخ کا سب سے بڑا احتجاجی جلوس نکلا۔ شہر کے مختلف حصوں سے چھوٹے چھوٹے جلوس آ کر بندر روڈ پر جمع ہوئے اور وہاں سے ایک بہت بڑے جلوس کی شکل میں امریکی سفارت خانے کی طرف چل پڑے۔ میں اب بھی ایک ٹیکسی میں بیٹھا نعرے لگا رہا تھا جس کا جواب مظاہرین کی طرف سے فلک شگاف نعروں کی صورت میں ملتا رہا۔ ہم میٹروپول ہوٹل کے پاس پہنچے تو آگے پولیس نے راستہ روکا ہوا تھا۔ جلوس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اس پر آنسو گیس پھینکی گئی۔ چنانچہ مظاہرین کو واپس جانا پڑا۔ میری ٹیکسی کے اندر بھی آنسو گیس جمع ہوئی تو میں باہر نکل کر آنکھیں بند کر کے ایک طرف بھاگا۔ اس طرح جلوس منتشر ہو گیا۔ رات کو ایک بجے مجھے لی مارکیٹ میں اپنی رہائش گاہ سے گرفتار کر کے نیپئر تھانے میں اور دوسرے دن فیریئر تھانے میں بند کیا گیا اور تیسرے یا چوتھے دن رہا کر دیا گیا۔

گلگت جیل میں سات ماہ

اکتوبر 1970ء میں آزاد کشمیر میں عام انتخابات ہونے تھے۔ میں ان دنوں محاذ رائے شماری کا چیئرمین پبلسٹی بورڈ تھا۔ ہمارا مطالبہ تھا کہ انتخابات قانون ساز اسمبلی کی بجائے آئین ساز اسمبلی کے لئے ہوں اور اس میں گلگت بلتستان کو بھی نمائندگی دی جائے۔ چونکہ یہ مطالبات منظور نہیں ہوئے اس لئے ہم نے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کے علاوہ ہفتہ گلگت بلتستان منانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں محاذ کے لیڈروں عبدالخالق انصاری، مقبول احمد بٹ، میر عبدالمنان اور دوسرے عہدیداروں نے اکتوبر کے اوائل میں آزاد کشمیر اور پاکستان کے مختلف شہروں کے دورے کئے اور وہاں عام جلسوں میں عوام کو گلگت بلتستان سے متعلق حقائق سے آگاہ کیا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اسی ماہ کا اواخر میں محاذ کے عہدیداروں کا ایک گروپ گلگت بلتستان کا دورہ بھی کرے۔

ہم نے 28 اکتوبر کو گلگت جانے کا پروگرام بنایا لیکن اس دن موسم کی خرابی کی وجہ سے اسلام آباد سے گلگت کی ہوائی جہاز کی فلائٹ نہیں ہوئی اس لئے ہم گلگت نہیں جا سکے۔ دوسرے دن ہم (عبدالخالق انصاری، مقبول بٹ، میر عبدالمنان اور میں) جہاز میں سوار ہو کر گلگت روانہ

ہو گئے اور گلگت ایئرپورٹ سے سیدھے انڈس ہوٹل پہنچے۔ خیال تھا دوسرے دن مقامی لوگوں سے ملیں گے اور ممکن ہوا تو وہاں ایک جلسہ عام بھی کریں گے۔ دن کو ہم لوگوں سے ملتے رہے لوگوں میں خوف و ہراس تھا اور وہ ہم سے ملنے سے ہچکچا رہے تھے۔ 28 اکتوبر کو مقامی انتظامیہ نے اپنے کچھ کٹھ پتلیوں کے ذریعہ ہمارے خلاف مظاہرہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور اس مقصد سے کچھ کٹھ پتلی ٹھیکیداروں کے مزدوروں کو سیاہ جھنڈیاں دے کر ایئرپورٹ پہنچایا گیا تھا تاکہ وہ ہماری آمد پر ہمارا استقبال سیاہ جھنڈیوں سے کریں لیکن اس دن موسم کی خرابی کی وجہ سے ہم گلگت نہ پہنچ سکے تھے چنانچہ ان کرائے کے مظاہرین کو واپس جانا پڑا۔ مقامی انتظامیہ کے اس اقدام کی وجہ سے کچھ باشعور مقامی افراد خاص کر کچھ نوجوانوں کے دلوں میں ہمارے لئے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ عبدالحمید، امیر حمزہ، یوسف جمال وغیرہ پر مشتمل نوجوانوں کے ایک گروپ نے پروگرام بنایا کہ اگر حکومت نے ہمارے خلاف دوسرے دن بھی مظاہرے کرانے کی کوشش کی تو وہ (نوجوان) پوری مزاحمت کریں گے۔ جب حکام کو نوجوانوں کے ان جذبات کا پتہ چل گیا تو دوسرے دن ہمارا کالی جھنڈیوں سے استقبال کرنے کا پروگرام منسوخ کر دیا گیا۔

شام کو میں گلگت میں مقیم اپنے کچھ عزیزوں سے ملنے گیا۔ رات نو بجے کے قریب چند افراد وہاں آئے اور مجھے کہا کہ اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس محمد بابر خان صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں مجھے کہا گیا کہ بابر صاحب اپنے دفتر میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ اس طرح مجھے پولیس سٹیشن پہنچایا گیا جہاں بابر صاحب کی بجائے میرے ساتھی بیٹھے تھے۔ میرے ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ انہیں پولیس شام کو ہی ہوٹل سے اٹھا لائی تھی اور یہ کہ ہمیں واپس راولپنڈی بھیجا جا رہا ہے اور اس کی تصدیق مقامی ایس ایچ او نے بھی کی۔ اسی دوران مجھے بتایا گیا کہ امیر حمزہ کو گرفتار کیا گیا ہے اور وہ ساتھ والے حوالات میں ہے۔ میں حوالات میں امیر حمزہ سے ملا۔ امیر حمزہ استور کا ایک انتہائی جوشیلا نوجوان اور گلگت بلتستان جمہوری محاذ کا متحرک ممبر اور گلگت بلتستان کو آزاد کشمیر کے ساتھ ملانے کا پرزور حامی تھا۔ وہ حسب عادت بڑی جوشیلی باتیں کر رہا تھا۔ ہم نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ رات بارہ بجے ہم چاروں کو ہمارے سامان سمیت بھیڑ بکریوں کی طرح ایک جیپ میں سوار کیا گیا اور ساتھ پولیس گارد بھی سوار ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد شہر کے باہر یعنی کونودو اس والے راستے سے ہمیں پاکستان کی طرف روانہ کیا گیا۔ دوسرے دن راستے میں ہم نے ریڈیو پر خبر سنی کہ سردار عبدالقیوم آزاد کشمیر کے صدر منتخب ہو گئے ہیں وہ رات ہم نے راستے میں ایک فوجی کیمپ میں گزاری اور دوسرے دن دوپہر کو کومیلا پہنچے جہاں سے گلگت پولیس واپس ہو گئی اور ہم لکڑی سے بھرے ایک ٹرک پر سوار ہو کر سوات کی طرف روانہ ہو گئے۔ انصاری صاحب کو فرنٹ سیٹ پر بٹھایا اور ہم تینوں ٹرک پر لدی ہوئی خاردار لکڑی پر بیٹھ گئے۔ ٹرک کو لگنے والے جھٹکوں سے ہم اچھل کر کھاردار لکڑی پر گرتے جس سے انتہائی تکلیف

ہوتی۔ سڑک بھی ایسی تھی کہ نیچے دیکھو تو تقریباً ہزار گز کے عمودی فاصلے پر رواں دواں دریائے سندھ پر نظر پڑتے ہی سر چکرانے لگتا۔ انصاری صاحب تو پورے سفر کے دوران ڈر کے مارے قرآنی آیات پڑھتے رہے۔ بہرحال خدا خدا کر کے ہم دوسرے دن سوات پہنچے اور تیسرے دن راولپنڈی۔

ہم 27 نومبر کو پھر گلگت روانہ ہوئے۔ اب کے گروپ میں میرے علاوہ مقبول بٹ صاحب ، میر عبدالمنان صاحب ، غلام مصطفیٰ علوی صاحب اور جی ایم میر صاحب تھے۔ سابقہ تجربے سے استفادہ کرتے ہوئے اب کے ہم لاؤڈ اسپیکر بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے اور ساتھ ہی شینا زبان کی کچھ نظمیں خاص کر فضل الرحمٰن کی مشہور زمانہ نظم "سوہنی وطن گلیت" (میرا سنہرا وطن گلگت) بونجی کے حشمت اللہ اور ریڈیو پاکستان کے شینا پروگرام والے مسٹر بہرام آف بلتیین گلگت کی آوازوں میں ٹیپ کر کے لے گئے تھے۔

گلگت ایئرپورٹ پر اے آئی جی پولیس بابر صاحب ایک نوٹس لئے ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے ہمیں نوٹس تھما دیا۔ نوٹس میں کہا گیا تھا کہ چونکہ محاذ رائے شماری والوں کی گلگت آمد کی خبر سے یہاں کی مقامی آبادی میں ان کے خلاف غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی ہے اور محاذ والوں اور مقامی لوگوں کے مابین شدید تصادم کا خطرہ ہے اس لئے سارے گلگت بلتستان میں دفعہ 144 نافذ کی جاتی ہے۔ ہم نے بابر صاحب سے نوٹس لیا اور ان سے کہا کہ اس پر عمل کرنا نہ کرنا ہمارا کام ہے۔

ہم ایئرپورٹ سے شہر پہنچے۔ ہوٹل میں سامان رکھتے ہی ہم نے فیصلہ کیا کہ چونکہ اب جلسۂ عام کرنے کا کوئی امکان نہیں اس لئے ہمیں وقت ضائع کئے بغیر کوئی جیپ لے کر اور اس میں لاؤڈ اسپیکر فٹ کر کے موبائل جلسے کرنے چاہئیں یعنی تقریر کرتے ہوئے شہر کے چکر لگائے جائیں۔ چنانچہ میں جیپ کی تلاش میں نکلا لیکن کوئی مجھے جیپ دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ میرے بہت سے ذاتی دوستوں نے کہا کہ ہم کرایہ دیں گے آپ کسی اور سے جیپ لیں کیونکہ اگر ہم نے اپنی جیپ آپ کو دی تو افسر شاہی کی طرف سے ہم پر عتاب نازل ہو گا۔ مجھے کسی دوست کی طرف سے یا کرایہ پر تو جیپ نہیں ملی البتہ ہنزہ کا ایک نوجوان تیار ہوا۔ چنانچہ ہم نے اس کی جیپ پر لاؤڈ اسپیکر فٹ کیا۔ اور سوہنی وطن گلیت کا ٹیپ چلایا۔ لوگ جیپ کے گرد جمع ہونے لگے تو میں نے تقریر شروع کر دی اور لوگوں کو ان کے سیاسی، سماجی اور معاشی حقوق سے آگاہ کیا۔ اس طرح تقریر کرتے اور ریکارڈ بجاتے ہوئے ہم نے قصبے کے کئی چکر لگائے۔ اس دن جمعہ تھا اور لوگ جمعہ کے لئے مضافات سے بھی آ کر بازار میں جمع ہوئے تھے۔ کبھی کبھی میر منان صاحب اور بٹ صاحب بھی تقریر کرتے اور کبھی میں اردو کے علاوہ شینا زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا۔ ہم دوسری بار صدر بازار سے گزرے تو وہاں لوگوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو گئی۔ میں

نے وہاں ایک انتہائی جو شیلی تقریر کی اور عوام کو ان کے آئینی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی حقوق سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ریذیڈنٹ پولٹیکل ایجنٹ اور دوسرے حکام عوام کے آقا نہیں بلکہ نوکر ہیں۔ میں تقریر کر ہی رہا تھا کہ ایک عمر رسیدہ شخص جیپ کے نزدیک آیا اور میرے ہاتھ اور ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہنے لگا "آفرین ہے اس شخص کو جس کے تم بیٹے ہو۔ ہم واقعی ان حقوق سے محروم ہیں اور یہاں کے حاکم ہمیں زر خرید غلام سمجھتے ہیں۔ یہاں آج تک کسی کو ایسی باتیں کرنے کی جرأت نہیں ہوئی جو تم کر رہے ہو'

صدر بازار میں تقریباً آدھے گھنٹے کی تقریر کے بعد ہم شہر کا ایک اور راونڈ لگانے نکلے۔ اب کے بونجی کے ڈاکٹر رحمت اللہ جو ان دنوں طالب علم تھے بھی ہمارے ساتھ جیپ میں بیٹھ گئے۔ میری تقریر کے ساتھ وقفے وقفے سے سوہنی وطن گلیت کا ولولہ انگیز ترانہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا۔ ہم ایئرپورٹ کے نزدیک پہنچے تو پیچھے سے پولیس کی جیپوں نے آکر ہمیں گھیرے میں لے لیا اور گرفتار کر کے تھانے لے آئے۔ میرے ساتھیوں کو ایئرپورٹ لے جایا گیا تاکہ جہاز سے راولپنڈی بھیجا جائے لیکن اس وقت تک جہاز جا چکا تھا۔ اس لئے انہیں لا کر گلگت سکاؤٹس کے کوارٹر گارڈ میں رکھا گیا اور دوسرے دن صبح کی فلائٹ سے راولپنڈی بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر رحمت اللہ کو بھی رہا کر دیا گیا۔

گلگت کی جامع مسجد صدر تھانے کے ساتھ ہی ہے۔ میں تھانے میں تھا کہ نماز جمعہ سے فارغ ہو کر لوگ باہر نکلے اور اسی کے ساتھ کچھ شور سنائی دیا اور ساتھ ہی کچھ پتھر بھی تھانے کے دروازے پر آ لگے۔ باہر میرے عزیز قدم خان اور ڈاکٹر رحمت اللہ سمیت کچھ نوجوان تھانے پر حملہ کر کے مجھے رہا کرانا چاہتے تھے لیکن دوسرے لوگ متذبذب تھے اسی دوران تھانیدار نے باہر نکل کر اور خود کو ہمارا ہمدرد گردان کر لوگوں کو منتشر کر دیا۔

دوسرے دن مجھے ڈسٹرکٹ جیل لے جایا گیا۔ امیر حمزہ بھی جیل میں تھا۔ اسی دوران گلگت بلتستان کے لئے بننے والی مشاورتی کونسل کے انتخابات کے لئے دسمبر کی کوئی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ میں نے امیر حمزہ کو مشورہ دیا کہ وہ انتخاب لڑے - وہ شاید پہلے ہی ان خطوط پر سوچ رہا تھا چنانچہ اس نے استور کے حلقہ نمبر1 سے اپنی امیدواری کا اعلان کیا اور حکام کو اس کی تحریری اطلاع دے دی۔ حکام بھی نہیں چاہتے تھے کہ ہم دونوں جیل میں اکٹھے رہیں چنانچہ امیر حمزہ کو رہا کیا گیا۔ اس نے استور کے راجہ خاندان کے راجہ (کاچو) محمد شاہ کے مقابلے میں انتخاب لڑا۔ میں نے اپنے تمام دوستوں اور رشتہ داروں کو خط لکھے کہ وہ امیر حمزہ کی پرزور حمایت کریں اور اسے ووٹ دیں۔ میں نے اپنے بزرگ ٹھیکہ دار مراد خان اور دوست عبدالرحمٰن لون کو خط لکھے کہ وہ الیکشن سے امیر حمزہ کے حق میں دستبردار ہو جائیں۔ اور دونوں امیر حمزہ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ چنانچہ امیر حمزہ جیت گیا۔ راجہ محمد شاہ صاحب استور کے شاہی خاندان سے

تعلق رکھنے کے علاوہ 1947ء تک کشمیر اسمبلی کے ممبر بھی رہے تھے۔ چنانچہ محمد شاہ کے مقابلے میں ایک انتہائی غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والے امیر حمزہ کی جیت ایک ذہنی انقلاب سے کم نہ تھی۔

ان انتخابات سے پہلے استور کے معززین کا ایک وفد گلگت آ کر پولٹیکل ایجنٹ سے ملا اور اسے میری رہائی کے لئے کہا۔ پولٹیکل ایجنٹ نے ان سے کہا کہ وہ مجھے اسی دن رہا کرنے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ میں رہا ہو کر خاموشی سے کراچی چلا جاؤں۔ وہ لوگ خوش ہو کر میرے پاس آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں کسی قسم کی مشروط رہائی کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے وہ ناامید ہو کر استور واپس چلے گئے۔

میری گرفتاری کے کچھ مدت بعد عید آنے والی تھی چنانچہ میرے کچھ دوستوں نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی میری ضمانت کے لئے درخواست دی، ایس ڈی ایم نے پہلے تو ان سے غالباً ڈھائی لاکھ روپے کی شخصی ضمانت طلب کی پھر ڈھائی لاکھ روپے کی مالیت کا مطالبہ اور اس کے بعد ڈھائی لاکھ روپے نقد طلب کئے جس پر ضمانت دینے والے اصحاب حبیب اللہ میر، عبدالسلام میر احمد میر، ٹھیکیدار فضل احمد وغیرہ نے یہ رقم بھی عدالت میں پیش کی تو ایس ڈی ایم نے کہا کہ امان اللہ کو میں صرف پابند ضمانت کر کے یعنی اس کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا کر ہی رہا کر سکتا ہوں۔ جب مجھے اس کی اطلاع ملی تو میں نے پابند ہو کر رہا ہونے سے ہی انکار کر دیا۔

5 دسمبر کو مجھے ایک سرکاری جیپ میں پولٹیکل ایجنٹ کے دفتر لے جایا گیا۔ پولٹیکل ایجنٹ نے مجھے دفتر میں بٹھا کر میری خاصی خاطر تواضع کی۔ پاکستان کے سیاسی حالات اور مسئلہ کشمیر پر بڑے دوستانہ ماحول میں تبادلہ خیال کیا۔ آخر میں کہنے لگا کہ اگر آپ صرف زبانی مجھے یہ یقین دلائیں کہ رہائی کے بعد آپ یہاں کا ماحول خراب نہیں کریں گے تو میں آپ کو آج ہی رہا کرتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ اگر آپ کی اس شرط کا مطلب یہاں کے عوام کے حقوق کے حق میں آواز اٹھانے سے دستبرداری ہے تو میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اس علاقے کا (لکھا پڑھا اور سیاسی سوجھ بوجھ کا مالک) ایک فرزند ہوں۔ یہاں کے عوامی حقوق کے لئے آواز اٹھانا میرا فرض ہے اور میں اس فرض سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ اس نے کہا آپ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ کر ایک دو دن میں مجھے جواب دے دیں۔ میں نے کہا میرا جواب ہمیشہ یہی ہو گا۔ اس کے بعد اس نے مجھے رخصت کیا اور پولیس نے مجھے واپس جیل پہنچایا۔ میں نے دوسرے دن ہی اسے اپنا متذکرہ بالا جواب تحریری طور پر بھی بھیج دیا۔

جنوری 1971ء کے اوائل میں مقامی وکلا شیر ولی پونیالی، شیرولی جنگلوٹی، الطاف حسین سعید احمد اور محمد عیسیٰ (غالباً محمد خورشید خان بھی) مجھ سے ملنے جیل آئے۔ ہم نے ملاقات کے دوران پاکستان کی سیاست، مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور گلگت بلتستان کی صورتحال پر

تفصیلی تبادلہ خیال کیا۔ مجھے ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ میری اور محاذ رائے شماری کے دوسرے ساتھیوں کی تقاریر اور انتظامیہ کی طرف سے ہمارے ساتھ ہونے والے برتاؤ کا مقامی آبادی پر بڑا اثر پڑا ہے اور اندر ہی اندر ایک لاوا سا پک رہا ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ گلگت میں تنظیم ملت نام کی ایک تنظیم بنی ہے۔

جب لوگوں نے جیل توڑ کر ہمیں نکالا

10 جنوری 71ء کو مجھے جیل کے کچھ وارڈروں نے بتایا کہ شہر میں خاصی گڑ بڑ ہے۔ دو دن قبل پولٹیکل ایجنٹ نے مقامی لڑکیوں کے سکول کی ہیڈ مسٹریس کے ساتھ بدسلوکی کی تھی اس لئے عوام میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی ہے شہر میں احتجاجی جلسے ہو رہے ہیں اور مقامی وکیل اس میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ شام کو خبر آئی کہ بہت سے وکیلوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اسی رات دیر سے وکیلوں (سعید احمد' الطاف حسین' محمد عیسیٰ' شیرولی پونیالی) انجینئر محمد علی اور کریم خان کو جیل لایا گیا اور سبوں کو میری کوٹھری میں رکھا گیا۔ ہم رات دیر تک حالات پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔

دوسری صبح یعنی 11 جنوری 1971ء کو ہم ناشتہ ہی کر رہے تھے کہ باہر شور سنائی دیا جیل حکام کی دوڑ دھوپ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی بڑی گڑ بڑ ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جیل کی عمارت پر پتھراؤ شروع ہو گیا۔ کچھ پتھر جیل کے اندر بھی گرنے لگے۔ اس کے بعد جیل کے بڑے دروازے پر کلہاڑے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد جیل کا بڑا دروازہ ٹوٹ گیا اور ہجوم جیل کے اندر گھس آیا۔ ہماری کوٹھری جیل کے بڑے دروازے کے ساتھ ہی تھی۔ لوگوں نے ہمیں دیکھ کر اس کا لوہے کا دروازہ توڑنے کی کوشش کی۔ اتنے میں کسی نے ساتھ کھڑے جیل وارڈر سے ہماری کوٹھری کی چابی چھین لی اور دروازہ کھول دیا۔ ہجوم وکلاء کو کھینچ کر باہر لئے آیا۔ میں نے باہر نکلنے میں ذرا تذبذب سے کام لیا تو ایک صاحب نے مجھے شینا زبان میں کہا امان صاحب اس قسم کے مسئلے قانونی نکتوں سے حل نہیں ہوتے یہ کہہ کر وہ مجھے کھینچ کر باہر لایا۔ باہر ہزاروں کا ہجوم لاٹھیاں' کلہاڑیاں' ہاکیاں لئے کھڑا نعرے لگا رہا تھا ہم سب کو کاندھوں پر اٹھایا گیا اور ہجوم شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس دوران کسی نے گلگت کے کچھ نوجوانوں کو کہا کہ جیل والوں نے دروازہ ٹوٹنے سے پہلے ہی امان صاحب کو کسی اور کوٹھری میں منتقل کیا تھا۔ اس لئے وہ اندر ہی رہ گئے۔ یہ سن کر یہ نوجوان دوبارہ جیل میں داخل ہو گئے اور مناور کے عبدالحمید نے ایک وارڈر سے بندوق چھین کر اس کے سینے پر رکھی اور اس سے پوچھا بتاؤ امان صاحب کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ اس نے کہا

انہیں تو ہجوم اپنے ساتھ لے گیا عبدالحمید نے باہر نکل کر جب دیکھا کہ میں کسی کے کاندھے پر سوار ہجوم کے ساتھ جا رہا ہوں تو وہ لوگ بھی دوڑ کر آئے اور ہجوم میں شامل ہو گئے۔

اب جلوس شہر کی طرف جا رہا تھا۔ ایئرپورٹ کے آخری کونے پر رک گیا اور میں نے اور شیر ولی پونیالی نے مظاہرین سے خطاب کیا۔ اس کے بعد جلوس ہمیں کاندھوں پر اٹھائے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ذرا آگے بڑھے تو دیکھا کہ سڑک پر ایک فیتہ ڈالا گیا ہے اور آگے گلگت سکاؤٹس مسلح کھڑے ہیں۔ ادھر حکام نے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیا کہ اگر ہجوم نے فیتے کو عبور کیا تو اس پر گولی چلائی جائے گی لیکن ہجوم نے نعرے لگاتے ہوئے اسے عبور کیا اور آگے بڑھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد سڑک پر فیتہ پھر پھیلایا گیا حکام کی طرف سے آخری وارننگ دی گئی کہ اگر ہجوم سرخ فیتے سے آگے بڑھا تو اس پر یقیناً گولی چلائی جائے گی لیکن ہجوم اسے بھی پار کر گیا۔ اس پر پولٹیکل ایجنٹ مسٹر اے آر صدیقی نے گلگت سکاؤٹس کو فائر کرنے کا آرڈر دے دیا۔ لیکن سکاؤٹس نے صرف ہوائی فائر کئے اور ہجوم آگے بڑھتا گیا۔ اتنے میں مسٹر صدیقی نے ایک سپاہی سے رائفل چھین کر ہجوم پر اندھا دھند گولیاں برسائیں۔ ایک گولی میرے سر سے صرف چند انچ دور سے گزر کر دیوار پر لگ گئی۔ اتنے میں ہجوم منتشر ہو گیا اور مسٹر صدیقی بھی دفتر کی طرف بھاگ نکلا۔

میں نے ساتھ والے کھیت پر نظر ڈالی تو اس میں کچھ لوگ گرے ہوئے نظر آئے ایک کے سینے سے خون کے فوارے نکل رہے تھے۔ میں اس کی طرف لپکا۔ یہ رجب علی تھا جس نے جیل کا دروازہ توڑا تھا اور مجھے بھی کھینچ کر کوٹھری سے باہر لے آیا تھا۔ اس کے سینے میں گولی لگی تھی۔ میں نے اس کا سر اٹھا کر اپنے گھٹنوں پر رکھا۔ اتنے میں محمد علی انجینئر بھی میرے پاس آیا۔ رجب علی نے مجھ پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی اور آخری ہچکی لے کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ میں نے اور محمد علی نے اپنے گلے میں پڑے ہار اتار کر رجب علی شہید کے جسد خاکی پر ڈال دیئے۔ میرے کپڑے شہید کے خون سے بھر گئے تھے۔ اس اثناء میں بہت سے لوگ بھی جمع ہو گئے اور ہم نے شہید کی لاش پر ایک چادر ڈال دی۔ کھیت میں چھ سات اور بھی زخمی پڑے ہوئے تھے جن میں سے استور کے عبدالرحمٰن لون کی ٹانگ گولیوں سے فریکچر ہو گئی تھی۔ دوسرے زخمیوں میں استور ہی کے وزیر مظفر کا بیٹا محمد اقبال، بگروٹ کا ایک لڑکا اور بلتستان کے ایک لڑکا اور چند دوسرے افراد بھی شامل تھے۔ ہم نے فوراً ہی جیپوں کا انتظام کر کے زخمیوں کو ہسپتال بھیج دیا اور تھانے میں پولٹیکل ایجنٹ کی فائرنگ سے ایک شخص کی ہلاکت اور سات افراد کے زخمی ہونے کی رپورٹ درج کرانے کی کوشش کی لیکن پولیس نے رپورٹ درج کرنے سے انکار کیا۔ لوگوں نے رجب علی شہید کا پوسٹ مارٹم کرانے کی میری تجویز پہلے رد کر دی لیکن جب میں نے اس کے قانونی پہلوؤں کی وضاحت کی تو مان گئے۔ چنانچہ میں

اور شیر ولی پونیالی شہید کا جسد خاکی ہسپتال لے گئے۔ ہسپتال والوں نے پولٹیکل ایجنٹ کی ہدایت کے تحت پوسٹ مارٹم کرنے سے انکار کیا۔ چنانچہ اسے واپس شہر لا کر ڈاکٹر اعجاز سے اس کا پوسٹ مارٹم کرایا اور تجہیز و تکفین کی جس میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ تجہیز و تکفین کے وقت میں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں مرحوم کے پسماندگان کی کچھ مالی مدد کرنی چاہئے جس کے لئے کچھ افراد کی ذمہ داری لگائی گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ رجب علی مرحوم ایک ہوٹل والے کا خاصا مقروض ہے۔ وہ ہوٹل والا وہاں موجود نہیں تھا کہ اس سے یہ قرضہ بخشواتے۔ چنانچہ اس قرضے کی ادائیگی میں نے اپنے ذمے لے لی اور اسی دن کراچی خط لکھا کہ وہ رقم ہوٹل والے کو بھیجی جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بعد میں گلگت میں یہ باتیں سننے میں آئیں کہ رجب علی شہید کے پسماندگان کی مالی مدد کے لئے خاصی رقم جمع ہوئی تھی لیکن انہیں پوری رقم نہیں دی گئی۔ واللہ اعلم۔

ہم اگلے دو دن قومی دواخانہ راجہ بازار کے مالک غلام مصطفیٰ کے گھر میں رہے۔ تیسرے دن افواہ پھیل گئی کہ شہر کو فوج کے حوالے کیا گیا ہے جو لوگوں کے گھروں میں گھس گھس کر ہمیں تلاش کرے گی۔ چونکہ اس قسم کی صورت حال کے نتیجے میں خون خرابے کا احتمال ہوتا ہے اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں غلام مصطفیٰ کا گھر چھوڑ کر کہیں اور جانا چاہئے۔ چنانچہ ہم سب (جیل سے نکالے جانے والے اور جوہر علی ایڈووکیٹ جن کے بارے میں افواہ تھی کہ ان کے بھی ورانٹ گرفتاری جاری ہوئے ہیں) گھر سے نکل کر اوپر برمس کی طرف چل دیئے ہمارے ساتھ مقامی نوجوان دیدار علی، محمد نگین، لطیف حسن، عبدالحمید وغیرہ بھی تھے۔ راستے میں جوہر علی نے تجویز پیش کی کہ ہمیں ساتھ والی پہاڑی کے غار میں رات گذارنی چاہئے میں نے تجویز سے اختلاف کیا۔ چنانچہ یہ اختلاف کچھ تلخی پیدا کرنے لگا اور ہم دو گروپوں میں تقسیم ہو گئے اس سے پہلے غلام مصطفیٰ کے گھر پر بھی ہم دونوں کے درمیان کئی باتوں پر اختلاف ہوا تھا۔ بہرحال آخر میں جوہر علی، محمد علی انجینئر اور محمد عیسیٰ غار کی طرف چلے گئے اور میں الطاف حسین سعید احمد اور شیر ولی پونیالی برمس گاؤں کی طرف۔ نوجوان بھی کچھ ادھر اور کچھ ادھر ہو گئے۔ رات بارہ بجے ہم برمس کے ماسٹر عادل خان صاحب کے گھر پہنچے۔ انہوں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ہم رات کو وہاں رہے۔ ہم دوسرے دن بھی وہاں ہی رہے اور انہوں نے دن کو ہمیں جو دیسی کھانا کھلایا اس جیسا لذیذ کھانا میں نے زندگی بھر نہیں کھایا۔ شاید اس لذت میں زیادہ حصہ ماسٹر صاحب کے خلوص اور جذبۂ ایثار و قربانی کا تھا کیونکہ انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں رکھ کر اپنے آپ اور خاص کر اپنی سرکاری ملازمت کو داؤ پر لگایا تھا۔ ہم دن کو برمس کی اونچائی سے شہر میں فوجی گاڑیوں کی نقل و حرکت دیکھتے رہے شام چھ بجے کے قریب ہم نے لاؤڈ اسپیکر پر ایک اعلان ہوتے سنا۔ یہ اعلان ایک جیپ سے کیا جا رہا تھا۔ جیپ ذرا نزدیک سے گزری تو ہم نے اعلان

سن لیا۔ بار بار یہ اعلان ہو رہا تھا کہ جو لوگ امان اللہ اور جیل سے مفرور ہونے والے دوسرے لوگوں (سبوں کے نام لئے جا رہے تھے) کو پناہ دیں یا ان کی جائے پناہ معلوم ہونے کے باوجود حکام کو اس کی اطلاع نہ دیں۔ انہیں دس سال کی قید بامشقت کی سزا دی جائے گی۔ اس اعلان کی عبارت سے ایک لطیفہ بھی ہوا جس سے ہم وقتی طور پر خاصے محظوظ ہوئے۔ اس کے بعد ہم نے نئی صورتحال پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ ہمیں واپس غلام مصطفیٰ کے گھر جانا چاہئے تاکہ سب بیٹھ کر کوئی متفقہ فیصلہ کریں۔ چنانچہ ہم رات کو واپس غلام مصطفیٰ صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ جوہر علی وغیرہ پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ وہاں افواہ گرم تھی کہ شہر میں مارشل لاء لگایا گیا ہے اور فوج ہماری تلاش میں لوگوں کے گھروں میں گھسنے والی ہے۔ میرا ذہن 1954ء میں پلندری آزاد کشمیر میں وقوع پذیر ہونے والی ایسی ہی صورت حال کی طرف گیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ فوج کے گھروں میں گھسنے سے خواتین کی بے حرمتی ہو گی جس کا نتیجہ قتل خون کی صورت میں ہی نکل سکتا ہے کیونکہ لوگ بھی انتہائی جذبات میں تھے۔ چنانچہ میں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں اپنے آپ کو خود ہی فوج کے حوالے کرنا چاہئے۔ ادھر مجھے مقامی انتظامیہ - مرکزی حکومت اور فوج کے تیوروں کا بھی علم تھا کیونکہ ایک دن پہلے مجھے اپنے ایک عزیز علی احمد جان مرحوم غلام مصطفیٰ کے گھر سے بلا کر اپنے ساتھ ایک مکان میں لے گئے تھے جہاں میرے ماموں زاد بھائی محمد اسماعیل خان اور ریذیڈنٹ کے سیکرٹری ہمایوں بیگ میرے منتظر تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ صدر پاکستان (جنرل یحییٰ خان) کی طرف سے حکم آیا ہے کہ اس بغاوت کو پوری قوت سے کچل دیا جائے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ حکومت اس صورتحال کی سب سے زیادہ ذمہ داری تم پر ہی ڈال رہی ہے کیونکہ تم نے ہی جیپ پر لاؤڈ سپیکر لگا کر تقریریں کر کے لوگوں کو بغاوت پر اکسایا۔ انہوں نے مجھے پیش کش کی کہ وہ مجھے بحفاظت گلگت سے باہر پہنچا سکتے ہیں بلکہ اگر جیل سے نکالے جانے والوں میں سے اور کوئی بھی جانا چاہئے تو اسے بھی لے جائیں گے میں نے کہا میرا اس طرح فرار گلگت کے لوگوں کے ساتھ غداری کے مترادف ہو گا جو میں کسی صورت میں نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا تھا۔

جب غلام مصطفیٰ کے ہاں آئندہ لائحہ عمل پر غور ہو رہا تھا تو میری ایک بار پھر جوہر علی سے جھڑپ ہوئی۔ اکثریت نے میرا ساتھ دیا اور فیصلہ ہوا کہ ہمیں اپنے آپ کو فوج کے حوالے کرنا چاہئے اور اس فیصلے کے مطابق ہم نے فون پر فوج کے مقامی کمانڈر کو اطلاع دے دی کہ ہم اپنے آپ کو (سول حکام کے نہیں بلکہ) فوج کے حوالے کرنا چاہتے ہیں چنانچہ ہم (میں شیر والی پونیالی' الطاف حسین' کریم خان' سعید احمد' محمد عیسیٰ اور محمد علی انجینئر) ناردرن سکاؤٹس کے ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے ہمیں الوداع کہا۔ فوج کے کمانڈر نے ہمیں آفیسرز میس کے ہال میں رکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جوہر علی کو بھی گرفتار کر کے لایا گیا اور رات بارہ

بجے کے قریب ہمیں دو دو کر کے ہتھکڑیوں میں باندھ کر فوجی اور پولیس گارڈ میں گلگت جیل پہنچایا گیا۔ میری مرضی کے خلاف مجھے جوہر علی کے ساتھ ہتھکڑی لگائی گئی۔ رات کو بھی اسی طرح دو دو کر کے ہتھکڑیوں میں بندھے رہے۔ صبح کسی بات پر ایک بار پھر میری جوہر علی سے جھڑپ ہو گئی جس سے فضا خاصی تلخ ہو گئی۔ لیکن اسی دن سہ پہر کو جوہر صاحب کو وہاں سے باہر جٹیال لے جایا گیا اور باقی ہم بہت اچھے دوستانہ ماحول میں رہے۔

ہمیں 27 دن تک دن رات ہتھکڑیوں میں بند رکھا گیا۔ مجھے سعید احمد کے ساتھ ہتھکڑی لگی تھی۔ کچھ دن کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا ہاتھ ہتھکڑی میں سے نکل سکتا ہے چنانچہ رات کو سوتے ہوئے میں ہتھکڑی سے ہاتھ نکال کر آرام سے سوتا اور سعید بھی۔ باقی ساتھی خاصی تکلیف میں رہے۔ رات کو نیند میں ایک کروٹ بدلنے کی کوشش کرے تو دوسرے کی چیخ نکلتی' شیر ولی' محمد عیسیٰ اور محمد علی تو ویسے بھی خاصے موٹے تھے۔ اس دوران ہمیں کسی قیدی یا وارڈر سے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ البتہ پندرہ بیس دن کے بعد اس پابندی میں کچھ نرمی ہوئی جس کے بعد ہمارا کھانا عام طور پر سعید احمد ایڈووکیٹ کے گھر سے آتا رہا۔

ہماری جیل واپسی کے ساتھ ہی گرفتاریوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ جیل میں ان کے لئے جگہ بنانے کے لئے عمر قید اور لمبی مدت کی سزا پانی والی تمام زنانہ قیدیوں اور بہت سے حوالاتی مردوں کو بھی رہا کر دیا گیا۔ ہمارے بعد گرفتار ہونے والوں کے نام یہ ہیں۔

امیر حمزہ اور غلام مصطفیٰ ممبران مشاورتی کونسل ، صوبیدار صفی اللہ بیگ' عبدالحمید' ذوالفقار علی' عبدالرحیم' لطیف حسن' غلام رسول' سلمان بیگ' خوشحال خان' قربان محمد ، محمد نگین دیدار علی ، صوبیدار محمد ایوب ، غلام محمد بٹ ، محمد یونس ، سرزمان ، دیار محمد ، غلام مرتضیٰ' عباس علی شاہ' عبدالقیوم' گل علی خان' طیفور شاہ اپھری' طیفور شاہ مجن محلّہ' نثار ولی خان' عرب شاہ' غلام مصطفیٰ مجن محلّہ' غلام اکبر' ناد علی اور سلطان میر۔ ان میں سے امیر حمزہ اور غلام مصطفیٰ کو چند دن کے بعد رہا کر دیا گیا۔ نثار ولی اور طیفور شاہ آف مجن محلّہ بھی چند دن ہی جیل میں رہے۔

جن لوگوں نے اس تحریک کے دوران پاکستان میں رہ کر خاصا کام کیا ان میں فضل الرحمٰن پونیالی' شیرولی ایڈووکیٹ آف جنگلوٹ' غلام مصطفیٰ مالک قومی دواخانہ گلگت (غلام مصطفیٰ صاحب راولپنڈی سے واپسی پر کچھ مدت جیل میں بھی رہے) خلیل الرحمٰن پونیالی ، مالک شاہ' متولی خان اور گلگت بلتستان اسٹوڈنٹس سنٹرل آرگنائزیشن کے ممبران خاص کر حشمت اللہ خان ، محبوب علی خان ، حسن خان ، محمد عیسیٰ وغیرہ شامل ہیں۔

جن لوگوں نے گلگت میں جیل سے باہر رہ کر کام کیا ان میں سرفہرست کشروٹ کے چاچا گلباز تھے۔ وہ ہمارے اور بیرونی دنیا کے درمیان رابطہ تھے۔ ہمارے خط اور پیغامات یہاں تک کہ

اخباری بیانات تک باہر لے جاتے اور جہاز سے راولپنڈی جانے والوں کے ساتھ وہاں بھیج دیتے اور باہر کے خط اور خبریں ہمیں پہنچاتے۔ ان کے علاوہ شکور محمد' یوسف جمال' ٹھیکہ دار فضل احمد' ٹھیکیدار فقیر محمد' علی احمد جان نے بھی خاصا کام کیا۔ ممبران مشاورتی کونسل میں سے امیر حمزہ' غلام مصطفیٰ اور خاصی حد تک محمد خورشید بھی سرگرم تھے۔

حکام نے مجھ پر اور دوسرے وکلاء پر شدید قسم کے الزامات عائد کر کے ہمارے خلاف کیس رجسٹر کئے تھے۔ مجھ پر جتنی دفعات کے تحت کیس رجسٹر ہوا تھا ان کے تحت کل سزا تین سزائے موت اور 191 سال کی قید بنتی تھی۔ میں نے 14 دسمبر 1970ء کو اپنا عدالتی بیان لکھ کر عدالت میں پیش کیا جس میں میں نے مقامی انتظامیہ اور مرکزی حکومت پر بڑی سخت تنقید کی تھی چنانچہ حکام نے میرے اس بیان کو بھی میری طرف سے بغاوت کے ثبوت کی حیثیت دے دی۔

فروری 1971ء میں مقامی انتظامیہ نے ایف سی آر کے تحت ایک شاہی جرگہ ترتیب دیا جس کو ہمارے بارے میں فیصلہ دینے کا حکم ملا۔ اس دوران جوہر علی وغیرہ کو بھی جیل لایا گیا تھا' میں نے اور وکلاء نے ایک تحریری معاہدہ کیا تھا کہ ہم متحد اور منظم رہیں گے اور تمام فیصلے اجتماعی طور پر اور ایک دوسرے سے صلح مشورے سے کریں گے اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ حکومت نسلی ، فرقہ وارانہ اور علاقائی بنیادوں پر ہم میں نفاق ڈالنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

جب جرگہ دار ہمارے بیانات لینے جیل آئے تو ہم نے اپنے فیصلے کے مطابق ان کے سامنے جا کر بیان دینے سے انکار کر دیا دوسرے دن صبح سویرے ہیڈ وارڈر غلام عباس نے مجھے باہر نکالا اور دھوکے سے لے جا کر دور ایک کوٹھری میں بند کر دیا اور وکلاء کے سوا دوسرے ملزموں کو جرگے کے سامنے بیان دینے کے لئے لے جایا گیا۔ میں کوٹھری سے چیختا چلاتا رہا لیکن یہ لوگ چلے گئے۔ وہاں بھی جوہر صاحب نے ایک بڑی غلطی کی۔ نقل اپنے پاس رکھے بغیر ہی ایک اہم دستاویز جرگہ والوں کے حوالے کر دی۔

کچھ دن کے بعد جرگے کے فیصلے کے مطابق جوہر علی' صفی اللہ بیگ' عبدالرحیم' عبدالحمید' صوبیدار ایوب' ناد علی' عباس علی شاہ' دیار محمد' غلام اکبر' گل علی خان' محمد یونس' غلام مرتضیٰ شاہ اور عرب شاہ کو بھی سزائیں دے کر سنٹرل جیل ہری پور بھیجا گیا۔ وکلاء سعید احمد ، محمد عیسیٰ ، الطاف حسین اور شیرولی پونیالی ، کے علاوہ محمد علی انجینئر ، غلام محمد بٹ ، کریم خان اور لطیف حسن کو گوپس قلعے بھیجا گیا۔ میں اور باقی ملزم گلگت میں ہی رہے۔ چونکہ میں جرگے کے سامنے پیش نہیں ہوا تھا اس لئے اس نے میرے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دیا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے ملزموں کے کیس عام عدالت کے سپرد کر دیئے گئے۔

گلگت کے حکام نے مجھے عوام کے سامنے ذلیل کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں

دیا۔ اس کا ایک موثر طریقہ انہوں نے یہ نکالا کہ عدالت میں ریمانڈ کے لئے پیشی پر مجھے وہ جیل سے عدالت تک ہتھکڑی پہنا کر پیدل لے جاتے۔ میں بیمار بھی تھا اور ڈاکٹر نے اس سلسلے میں میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی دیا تھا جسے پولٹیکل ایجنٹ نے منسوخ کرا دیا۔ چنانچہ میں نے پیدل عدالت جانے سے ہی انکار کیا اس طرح تین ماہ تک میری عدالت میں حاضری کے بغیر ہی میرا ریمانڈ لیا جاتا رہا جو کہ حکومت کی طرف سے ایک سنگین قانون شکنی تھی۔ اس سے قبل جب میں ریمانڈ کے لئے عدالت میں پیش ہوتا تو ایس ڈی ایم (جو کہ ایک لمبی داڑھی والے احمد سعید نامی ایک مولوی صاحب تھے اور میں نے اپنے عدالتی بیان میں لکھا تھا کہ اگر لمبی داڑھی والا جج انصاف نہیں کرتا تو اس میں اور کھڑک سنگھ میں کوئی فرق نہیں) بار بار مجھے کہتا کہ تم نے اپنے بیان میں مجھے کھڑک سنگھ کہا ہے۔ کبھی کبھی میرے اور اس کے درمیان سوال و جواب بیت بازی کی شکل اختیار کرتا۔ مولوی صاحب بھی نہیں چاہتے تھے کہ میں عدالت میں پیش ہو کر اس کے ماتحتوں کی موجودگی میں اس کی تضحیک کروں چنانچہ وہ میری غیر حاضری میں ہی میرا جوڈیشنل ریمانڈ دیتے رہے۔

فروری 71ء کے اوائل میں (جب ہمیں کسی سے ملنے یا بات کرنے کی اجازت نہیں تھی) ایک دن میں اپنی کوٹھری میں دوسرے وکلاء کے ساتھ بیٹھا تھا کہ ہنزہ کے ایک لکھے پڑھے قیدی سو جنگ (جس نے اپنا نام میر آف ہنزہ کے نام پر جمال شاہ رکھا تھا اور بڑا پیسے والا آدمی تھا) نے ہماری کوٹھری کے سامنے سے گذرتے ہوئے کھڑکی سے ایک چٹ اندر پھینک دی جس میں لکھا تھا کہ کشمیری حریت پسند ایک بھارتی جہاز اغوا کر کے لاہور لائے تھے جسے جلا بھی دیا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ہاشم قریشی کا کارنامہ ہے جسے ہم نے ہائی جیکنگ کی تربیت دے کر مقبوضہ کشمیر بھیجا تھا۔ چند دن کے بعد ہم پر عائد پابندیوں میں کچھ نرمی ہوئی تو میں نے پرانے اخبارات منگوائے اور ان سے تفصیلات معلوم ہوئیں۔ پھر وسط اپریل میں خبر آئی کہ بھارتی جہاز کو اغوا کرنے والوں سمیت این - ایل - ایف اور محاذ رائے شماری کے سینکڑوں کارکنوں کو بھارتی ایجنٹ ہونے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔

شاہی قلعہ میں سات ہفتے

برصغیر میں انگریز راج کے دوران بہت سے انتہائی سخت جیلوں (جہاں انتہائی خطرناک مجرموں اور جوشیلے حریت پسند سزا یافتہ قیدیوں کو رکھا جاتا تھا) کے علاوہ کچھ ایسے تفتیشی مراکز بھی تھے جہاں سول اور ملٹری حکام انتہائی خطرناک مجرموں، تخریب کاروں اور جوشیلے سیاسی کارکنوں کو انسانیت سوز جسمانی اور ذہنی اذیتیں دیتے تھے۔ ان تفتیشی مراکز میں لاہور کے شاہی

قلعے کے ایک حصے میں قائم تفتیشی مرکز بھی شامل تھا۔ اس مرکز میں پاکستان کے ترقی پسند لیڈر حسن ناصر سمیت سینکڑوں افراد وحشیانہ تشدد کا شکار ہو کر ہلاک ہو گئے تھے۔

بھارتی جہاز گنگا کے اغواء کے سلسلے میں گرفتار ہونے والے میرے سینکڑوں ساتھیوں میں سے مقبول بٹ، ہاشم قریشی، اشرف قریشی، جی ایم لون، میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان، ڈاکٹر فاروق حیدر، جاوید ساغر، نصیر محمود وانی اور سعید شاہ ناز کی وغیرہ کے علاوہ لاہور میں زیر تعلیم کشمیری نوجوان کوٹلی کے ملک اعجاز مرحوم، عزیز قیصر، عمر فاروق، ملک صدیق اور ملک نواز وغیرہ بھی شاہی قلعہ لاہور میں تختۂ مشق بنے۔ ان میں سے اولذکر دس افراد کے ساتھ تو انتہائی انسانیت سوز سلوک ہوا۔

میں نے بھی گنگا ہائی جیکنگ کے سلسلے میں 10 جولائی سے اواخر اگست 1971ء تک کے تقریباً سات ہفتے شاہی قلعے میں گزارے۔ اس دوران کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات کی مختصر سی روداد پیش خدمت ہے۔

10 جولائی 1971ء کو مجھے عدالت لے جانے کے بہانے دھوکے سے گلگت جیل سے نکال کر پولیس گارڈ کے ساتھ ہوائی جہاز میں راولپنڈی پہنچایا گیا جہاں ایئرپورٹ پر شاہی قلعہ لاہور کا ایک پولیس دستہ ایک بند پولیس گاڑی سمیت ہمارا منتظر تھا چنانچہ اس میں ہم لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات آٹھ بجے کے قریب ہم شاہی قلعہ لاہور پہنچے۔ مجھے نیچے گیٹ کے پاس رکھا گیا اور تردی بیگ اور لاہور کا پولیس آفیسر اوپر چلے گئے۔ شدید گرمی کی وجہ سے پیاس سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی ایک گندا سا مٹکا تھا اور اس پر ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پانی پینا چاہا تو شاہی قلعے کے ایک سپاہی نے مجھے انتہائی تحکمانہ انداز میں منع کیا۔ میری خودداری پر شاہی قلعہ کا یہ پہلا حملہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے اوپر دفتر لے جایا گیا۔ وہاں ایک انسپکٹر نے دوچار سنائیں۔ اس کے بعد مجھے ایک ہال میں لے جایا گیا۔ گلگت پولیس کا سپاہی عبدالرحمٰن اب بھی میری ہتھکڑی پکڑے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے رخصت کیا گیا۔ اس کے جاتے ہی ایک سپاہی نے مجھے تھپڑ مارا تو میری ٹوپی گر گئی۔ مجھے کپڑے اتارنے کے لئے کہا گیا تو میں نے بش شرٹ اور پتلون اتاری۔ ایک افسر نے گندی سی گالی دے کر مجھے ہال میں رکھے ہوئے جسمانی اذیتیں دینے کے وہ اوزار دکھائے جن سے بقول اس کے وہ مدافعت کی فولادی قوت رکھنے والوں سے بھی سچ اگلواتے ہیں۔ میں پہلے تو ان اوزاروں کو دیکھ کر خاصا گھبرا گیا پھر دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو مجھے اس صورتحال کا مقابلہ مردانہ وار کرنا چاہئے کیونکہ یہی اس کا واحد علاج تھا۔ خاصی دیر کے بعد مجھے بڑی عمارت سے الگ بنی ہوئی ایک لمبی عمارت کی ایک کوٹھری میں ڈالا گیا جو دو آہنی دروازوں کے اندر تھی۔ سونے کے لئے سیمنٹ کا بنا ایک دیوان جس پر انگریزوں کے زمانے کا ایک پھٹا پرانا کمبل تھا اور اس پر جوئیں اور پسو پیرپڑ

کرتے نظر آرہے تھے۔ کونے میں رفع حاجت کے لئے ایک چھوٹی سی جگہ بنی ہوئی تھی جس پر باہر ڈیوٹی دینے والے چار سپاہیوں کی نظر براہ راست پڑتی تھی۔ کوٹھری میں تیز روشنی تھی چنانچہ رفع حاجت کے سلسلے میں بڑی بے شرمی سے کام لینا پڑتا تھا۔ مجھے رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ اس کوٹھری میں قیام پاکستان سے پہلے یکے بعد دیگرے کانگریسی لیڈروں پنڈت جواہر لعل نہو' مولانا ابو الکلام آزاد اور جے پرکاش نارائن وغیرہ کو رکھا گیا تھا۔

شاہی قلعہ پہنچنے کے کوئی ایک ہفتہ بعد ایک دن مجھے دفتر میں ایک پولیس افسر کے پاس لے جایا گیا۔ جس نے میرا استقبال انتہائی گندی گالیوں کی بوچھاڑ سے کیا۔ میں نے اس پر احتجاج کیا کیونکہ میں نہ کسی کو گالی دیتا ہوں نہ ہی کسی کی طرف سے گالی مجھ سے برداشت ہوتی ہے۔ پولیس افسر (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ڈی ایس پی ملک صدیق تھا) کو جب میری یہ کمزوری معلوم ہوئی تو اس نے گالیوں کی مزید بوچھاڑ کردی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کھڑے سپاہی نے مجھے دو تین تھپڑ اور لاتیں رسید کیں۔ اس کے بعد ملک صدیق ایک کاغذ سے پڑھ کر مجھ سے سوالات کرنے لگا۔ میرے ہر جواب پر میرے ساتھ کھڑا سپاہی مجھے تھپڑ یا لات رسید کرکے اور گندی سی گالی دے کر کہتا۔ صاف صاف کیوں نہیں بکتے ہو کہ تم بھارت کے تنخواہ دار ایجنٹ ہو۔ کوئی دو گھنٹے کے اس سوال و جواب کے بعد مجھے اپنی کوٹھری کی طرف لے جایا گیا اور جاتے جاتے ملک صدیق نے کہا اگر تم نے صاف صاف اقرار نہیں کیا کہ تم بھارت کے تنخواہ دار ایجنٹ ہو تو آنے والا کل تیری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ کوٹھری میں پہنچا تو گالیوں کے نتیجے میں پہنچنے والی ذہنی اذیت کے علاوہ تھپڑوں اور لاتوں کی وجہ سے میرا چہرہ اور بدن بری طرح دُکھ رہا تھا۔

دوسرے دن ملک صدیق کے دفتر میں میرا استقبال پھر انتہائی فحش قسم کی گالیوں سے ہوا۔ اس کے بعد ڈیڑھ گھنٹے تک مرغا بنائے رکھا گیا۔ میں ذرا ستانے لگتا تو ساتھ والا سپاہی لات رسید کردیتا۔ آخر جب میں تقریباً بے ہوش ہونے لگا تو مجھے بینچ پر بیٹھنے کے لئے کہا گیا اور ساتھ ہی یہ حکم بھی صادر ہوا کہ اب سچ بتاؤ کہ بھارت کی جاسوسی تمہارے علاوہ اور کون کون کر رہا ہے۔ میں نے پھر کہا کہ نہ میں بھارت کا جاسوس ہوں نہ میرا کوئی ساتھی۔ اس پر مجھے ڈنڈ پیلنے کے لئے کہا گیا۔ ڈنڈ پیلنے کے دوران بھی لاتیں ماری گئیں۔ آخر میں تھک کر زمین پر ہی لیٹ گیا تو مزید ڈنڈ پیلنے کی طاقت ہی نہیں تھی اس کے بعد مجھے تھوڑی دیر بینچ پر بٹھانے کے بعد کوٹھری کی طرف لے جایا گیا اور ساتھ ہی گزشتہ دن والی وارننگ پھر دی گئی۔ میں درد کی وجہ سے چل بھی نہیں سکتا تھا چنانچہ تقریباً گھسیٹ کر مجھے کوٹھری تک پہنچایا گیا اور جاتے ہی میں مسہری پر گر گیا۔ رات عجیب سے ذہنی اور جسمانی کرب میں گزری۔

تیسرے دن ملک صدیق کے دفتر پہنچایا گیا تو حسب معمول فحش گالیوں سے استقبال کے بعد میرے ہاتھ اور پیر رسی سے باندھے گئے اور ایک ڈنڈا میرے بازوؤں کے آگے اور گردن

کے پیچھے سے گزارا گیا جس سے انتہائی شدید تکلیف ہوئی اس کے بعد ملک صدیق نے بجلی کے دو تار ہاتھ میں لئے اور میرے بدن کو چھوتا رہا۔ تاروں کے بدن سے چھو جانے کے ساتھ ہی میرے سارے بدن میں بجلی دوڑتی اور میں اچھل جاتا اس کے بعد مجھ سے کہا جاتا کہ میں تسلیم کروں کہ میں بھارت کا ایجنٹ ہوں۔ میرے انکار پر پھر بجلی کا جھٹکا لگایا جاتا۔ یہ سلسلہ میرے پیروں سے شروع ہوا تھا اور گردن تک پہنچا تھا اور اب سر کی باری تھی۔ تقریباً چالیس جھٹکے لگ چکے ہونگے مجھے معلوم تھا کہ جو شخص ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے اسے بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے ہیں اور عموماً وہ ان جھٹکوں سے ٹھیک ہو جاتا ہے اس لئے اگر صحیح ذہن والے کو بجلی کے جھٹکے دیئے جائیں تو ظاہر ہے وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے گا' یہ خیال آتے ہی میں لرز اٹھا اور ساتھ ہی میں نے اپنے آپ میں ایک عجیب سی قوت محسوس کی چنانچہ میں نے یا اللہ کہہ کر ڈنڈے پر اپنی پوری قوت صرف کی اور ساتھ ہی گر کر بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو اپنی کوٹھری میں فرش پر پڑا تھا اور دن ڈھل چکا تھا۔

اگلے دو دن مجھے "چھٹی" دی گئی۔ ان میں سے پہلا دن تو میں نے ذہنی اور جسمانی کرب میں گزارا۔ لیکن شام کو مجھے اچانک یاد آیا کہ میں نے ایک بار مادر وطن کی مٹی ہاتھ میں لے کر' ایک بار اپنے خون سے اور کئی بار ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھ کر اور اپنے ضمیر کو گواہ رکھ کر حلف اٹھایا ہے کہ میں قومی آزادی کے حصول کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ یہ خیال آتے ہی کہ مجھے یہ اذیتیں اپنے مشن کی تکمیل اور اپنے حلف کی تعمیل کے سلسلے میں اٹھانی پڑ رہی ہیں۔ میرے بدن میں سکون قلب کی ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی۔ میرا ذہنی کرب اور جسمانی درد عجیب سے لذت آمیز سکون میں تبدیل ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے چند منٹ پہلے والا پژمردہ امان اللہ ایک ہشاش بشاش انسان میں تبدیل ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ حصول آزادی اور اس سلسلے میں ملنی والی اذیتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا میرا عزم بھی کئی گنا بڑھ گیا۔

دوسرے دن میں ایک نئے انسان کے روپ میں اور ہر اذیت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے عزم کے ساتھ ملک صدیق کے دفتر پہنچا۔ مجھے وہاں لے جانے والے سپاہی بھی میری طرف بار بار دیکھتے۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے تین دن کی اذیتوں کی وجہ سے میں حوصلہ ہار چکا ہوں گا۔ لیکن میں ایک نیا عزم لئے ہوئے تھا۔ ملک صدیق نے میری طرف گھور کے دیکھنے کے بعد مجھ سے پوچھا آیا میں اب سچ بولوں گا۔ میں نے کہا میں گزشتہ چار پانچ دن سے سچ بول رہا ہوں اور آخری دم تک یہی سچ بولوں گا۔ اس پر اس نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد مجھے ایک سوال نامہ تھما دیا کہ ان سوالوں کے جواب تفصیل سے لکھ کر لاؤ اور مجھے کچھ کاغذ اور قلم تھما کر کوٹھری کی طرف بھیج دیا۔ غالباً میری "چھٹی" کے دو دنوں کے دوران فیصلہ ہوا تھا کہ مجھ پر مزید تشدد کرنے

کی بجائے مجھ سے تحریری بیان لیا جائے کوٹھری میں پہنچ کر میں نے سوالنامہ پڑھا۔ غالباً اٹھارہ سوال تھے اس میں محاذ رائے شماری اور این ایل ایف کے قیام کے پس منظر اور مقصد۔ نظریہ خود مختار کشمیر کا نظریہ پاکستان کے منافی ہونے' ہاشم قریشی اور مقبول بٹ کے بھارتی ایجنٹ ہونے محاذ اور این ایل ایف کو بھارت کی طرف سے مالی امداد ملنے' بھارتی جہاز گنگا کا بھارت کے ایما پر اغوا کرانے۔ میرے اپنے بھارتی سفارت خانے سے رابطے جیسے مفروضوں کے بارے میں سوال تھے۔ میں نے ہر سوال کا مفصل' مدلل اور واقعاتی ثبوتوں کی مدد سے جواب دیتے ہوئے ثابت کیا کہ این ایل ایف اور محاذ رائے شماری محب وطن تنظیمیں ہیں اور بھارت کو اپنی آزادی کے غاصب کی حیثیت سے اپنا دشمن سمجھتی ہیں۔ مقبول بٹ اور ہاشم کشمیری حریت پسند ہیں۔ بھارت کی طرف سے ہمیں مالی امداد ملنے کا الزام سراسر بہتان ہے۔ جہاز کے اغوا میں بھارت کا کوئی ہاتھ نہیں۔ میرا بھارتی سفارت خانے سے کوئی رابطہ نہیں اور خود مختار کشمیر کا نظریہ نظریۂ پاکستان کے منافی نہیں نہ ہی یہ پاکستان کے قومی مفاد کے خلاف ہے۔

56 بڑے صفحوں پر لکھے گئے یہ جواب میں نے دوسرے دن ملک صدیق کو بھیج دیئے۔ یہ جواب میں نے انگریزی میں لکھے تھے۔ میں پورے دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ دستاویز ادبی معیار' زبان اور ٹھوس دلائل کے لحاظ سے میری زندگی کی بہترین تحریر تھی اور اس وقت بھی مجھے اس کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے شاہی قلعہ کے حکام سے مزید کاغذ مانگا تاکہ میں اس کی نقل بنا کر اپنے پاس رکھ سکوں لیکن کاغذ دینے سے انکار کیا گیا۔ اس کے بعد میں نے شاہی قلعہ والوں سے کہا کہ میرے ذاتی پیسے ان کے پاس ہیں ان میں سے مطلوبہ پیسے لے کر مجھے دستاویز کی فوٹو سٹیٹ کاپی بنا کر دی جائے لیکن میری یہ درخواست بھی نامنظور ہوئی (رہائی کے بعد میں نے ہائی جیکنگ کیس کے دوران وکلاء صفائی کے ذریعہ عدالت سے درخواست کی کہ شاہی قلعہ میں دیا ہوا میرا یہ بیان عدالت میں پیش کیا جائے لیکن پولیس نے مختلف بہانے بنا کر ایسا کرنے سے انکار کیا۔ دراصل اس میں درج ٹھوس دلائل اور ناقابل تردید واقعات پولیس کے لئے پریشان کن تھے اس لئے اس نے یہ دستاویز عدالت میں پیش ہی نہیں کی) اس طرح میں اپنی زندگی کی بہترین تحریر کی کاپی اپنے پاس رکھنے سے محروم رہا۔ اس کے بعد کئی دن تک کوئی نہیں آیا۔ ایک شام میں کوٹھری میں بیٹھا تھا کہ سپاہی آ کر مجھے بڑی عمارت کے پچھلے دروازے سے اوپر لے گئے۔ اوپر ایک کمرے میں انسپکٹر احمد خان تہبند باندھے ایک چارپائی پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے مجھے بھی (کچھ شریفانہ لہجے میں) دوسری چارپائی پر بیٹھنے کے لئے کہا جس سے مجھے خاصی حیرانگی ہوئی کیونکہ شاہی قلعے میں کسی قیدی کو انسان سمجھا جانا ایک انہونی سی بات تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے ایک کپ چائے بھی دی گئی۔ یہ بھی ایک غیر متوقع بات تھی۔ اس کے بعد احمد خان نے ایک اخبار اٹھایا اور مجھ سے افسوس کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میر عبدالقیوم کا پولیس تشدد

سے انتقال ہو گیا ہے اور ساتھ ہی اخبار سے خبر پڑھنے لگا۔ میں نے اخبار مانگا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ اس میں اور بھی بہت سی خبریں ہیں اور تم وہ خبریں نہیں پڑھ سکتے۔ احمد خان کی بات سنتے ہی مجھے سکتہ سا ہو گیا اور میری نظروں کے سامنے میر قیوم صاحب کی جوان بیٹیاں اور اکلوتا بیٹا آ گئے اور میں سوچنے لگا اب ان کا کیا ہو گا۔ میں خاصی دیر ان خیالوں میں گم رہا' اس کے بعد احمد خان نے ایک بار پھر مجھ سے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا مسٹر امان اللہ میر قیوم تو اس دنیا سے چلے گئے۔ اب تم ساری ذمہ داری ان پر ڈال کر اپنے آپ کو کیس سے فارغ کیوں نہیں ہوتے ویسے بھی میر نے اقبال جرم کیا تھا۔ میں نے کہا میں میر قیوم کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کسی صورت میں بھی بھارتی ایجنٹ نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے آپ کو رہا کرانے کے لئے اپنے ایک ساتھی پر جو اس تحریک پر قربان ہو گیا ہے اور اب اس دنیا میں نہیں ' ایسا بے بنیاد الزام کیسے لگا سکتا ہوں۔ نہیں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اس پر احمد خان نے کہا اچھا تمہاری مرضی۔ لیکن یاد رکھو اپنی اس حماقت پر عمر بھر پچھتاؤ گے کیونکہ اب جو تمہارا حشر ہو گا تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ کہہ کر اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور وہ مجھے اپنی کوٹھری میں لے گئے (پانچ ماہ بعد گلگت جیل میں مجھے پتہ چلا کہ میر قیوم صاحب زندہ ہیں اور ان لوگوں کے خلاف ایک خصوصی عدالت میں مقدمہ شروع ہوا ہے۔ احمد خان مجھ سے میر صاحب کے خلاف بیان لینے اور ساتھ ہی مجھے ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کے لئے یہ چال چلا تھا)

میری کوٹھری کے عقب میں واقع کوٹھری سے عموماً کسی نوجوان کی دل ہلا دینے والی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ میں نے ایک دن موقعہ پا کر ڈیوٹی والے سپاہی شمشیر خان سے اس بارے میں پوچھا (یہ ملک صدیق کی طرف سے مجھ پر تشدد سے پہلے کی بات ہے) شمشیر خان گارڈ والوں میں سے واحد اردو بولنے والا تھا۔ باقی سب پنجابی تھے۔ چونکہ میں بھی اردو بولتا تھا ' اس لئے مجھے کچھ اندازہ سا ہو گیا تھا کہ شمشیر خان کو مجھ سے کچھ ہمدردی ہے ۔ اس نے کہا آپ کے ساتھ والی کوٹھری میں ایک نوجوان ہے جسے خصی کر دیا گیا ہے یعنی نامرد بنایا گیا ہے اس لئے درد سے ایسی چیخیں مار رہا ہے۔ یہ سن کر میرے رونگٹھے کھڑے ہو گئے۔

ایک دن احمد خان کا میری کوٹھری کے سامنے سے گذر ہوا۔ اس نے بڑے طنزیہ انداز میں میری خیریت پوچھی اور ساتھ ہی کہا کہ تمہارا دوست میر منان تمہارے ساتھ والی کوٹھری میں ہے۔ اس کے بعد ساتھ والی کوٹھری سے کسی عمر رسیدہ انسان کی چیخیں سنائی دینے لگیں اور میں یہ سمجھ کر یہ چیخیں میر منان صاحب کی ہیں ' لرز اٹھتا۔ اس دوران تقریباً روزانہ سپاہی آ کر مجھ سے پوچھتے کہ آیا میں اقبالی بیان دینا چاہتا ہوں میرے انکار پر وہ مجھے گالیاں دیتے واپس چلے جاتے۔

مجھے بعد میں یعنی رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ دونوں کہانیاں مجھے ڈرا کر مجھ سے اقبالی

بیان لینے کے لئے گڑھی گئی تھیں اور دونوں صورتوں میں ساتھ والی کوٹھری میں ریکارڈ کی ہوئی چیخوں' رونے اور آہ وزاری کے ریکارڈ بجائے جاتے تھے تاکہ میں ان سے ڈر کر اقبال جرم کروں۔

ملک صدیق کی طرف سے تشدد اور سوالنامے کے جواب کی صورت میں اپنا بیان اس کے حوالے کرنے کے بعد مجھے جو ذہنی سکون ملا تھا اس کے نتیجے میں میرا حافظ تازہ۔ میری آواز انتہائی سریلی اور میرا حوصلہ بہت بلند ہو گیا تھا۔ دراصل صحیح نوعیت کا ذہنی سکون انسان کو بڑی خوبیاں عطا کرتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ذہنی سکون انسان کی سب سے بڑی دولت ہے اور یہ دولت انسان کو عظیم مقاصد کے حصول کے لئے دی جانے والی قربانیوں سے ہی ملتی ہے۔

اس سکون کے دوران میرا حافظ اتنا تیز ہو گیا کہ عمر بھر کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے علاوہ اقبال کے اشعار بھی میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔ ادھر آواز بھی انتہائی سریلی ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں دن بھر علامہ اقبال کے شعر گنگناتا رہتا۔ تشدد کے بارے میں افسوس صرف اتنا تھا کہ جس اذیت کی ہمیں بھارتیوں سے توقع تھی وہ پاکستانیوں کی طرف سے مل رہی تھی۔

میں جب اقبالیات گنگناتا تھا تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میں لاؤڈ اسپیکر کے سامنے گنگنا رہا ہوں۔ میں عموماً نیند میں باتیں کرتا ہوں اور یہاں بھی کرتا تھا۔ دراصل انسان نیند میں سچی باتیں کرتا ہے۔ چنانچہ شاہی قلعے والوں نے کوٹھری کی دیوار میں باہر کی طرف سے ٹیپ ریکارڈ فٹ کر دیا تھا تاکہ نیند میں ہونے والی باتیں ٹیپ ہو جائیں۔ یہ انتظام غالباً شاہی قلعے کے تمام مکینوں کے لئے ہوتا تھا۔ مجھے رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ جب میری نیند والی باتوں اور اقبالیات کے ٹیپ پولیس اور ملٹری افسروں کی ایک ٹیم کو سنائی گئیں تو ایک اعلیٰ فوجی افسر نے کہا کہ جو شخص اقبال اور اس کے نظریۂ خودی کا اتنا شیدائی ہو اور پرسوز اور پردرد آواز میں اقبالیات گنگناتا ہو وہ ہندو کا ایجنٹ ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھے شاہی قلعے میں تین ہفتوں سے زیادہ ہو گئے تھے ۔ گرمی بھی غضب کی تھی اس سارے عرصے میں ایک ہی جوڑہ کپڑے (بش شرٹ اور پتلون) پہنے رہا تھا جس کی وجہ سے جسم اور کپڑوں سے ناقابل برداشت بدبو آ رہی تھی۔ جوئیں بھی درجنوں کے حساب سے کپڑوں پر رینگتی رہتی تھیں۔ اس دوران میرے بار بار کے مطالبے کے باوجود نہ نہانے کے لئے پانی ملا تھا نہ کپڑے دھونے کے لئے۔ ایک دن میری کوٹھری کے سامنے سے ایک فوجی ڈاکٹر کا گزر ہوا تو میں نے اسے آواز دے کر کہا ڈاکٹر صاحب آپ لوگوں کا پیشہ تو دشمن کے زخمیوں کا بھی بہترین علاج کرنے کا متقاضی ہے۔ میں تو صرف ایک ملزم ہوں۔ مجھ پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوا ہے دیکھیں میرے جسم اور کپڑوں سے کتنی بدبو آ رہی ہے۔ میں نے یہ باتیں انگریزی میں کیں۔ ڈاکٹر چونک سا گیا پھر کہنے لگا کہ ان باتوں کا اتنا خیال ہے تو ایسے کام کیوں کرتے ہو جس کے نتیجے

میں یہاں پہنچے ہو۔ میں نے کہا میں نے کوئی غلط کام کیا ہے یا نہیں اس کا فیصلہ تو عدالت کرے گی۔ بہرحال اس نے ساتھ والے پولیس افسر سے کہا کہ مجھے نہانے اور کپڑے دھونے کے لئے پانی اور صابن دی جائے۔

تھوڑی دیر کے بعد شوقا (بھنگی) ایک بالٹی پانی اور ایک ٹکیہ کپڑے دھونے کی صابن لے آیا۔ میں نے کوٹھری میں ہی نہایا اور کپڑے دھوئے۔ صابن والا پانی کوٹھری کے نشیبی حصے میں جمع ہو گیا۔ اتنے میں شوقا آیا اور کہنے لگا پانی جلدی سے باہر نکال دو۔ میں پیروں سے چکنا پانی باہر نکالتے ہوئے پھسل کر گر گیا اور میرے سر کا پچھلا حصہ دیوان کے کونے سے ٹکرا گیا اور میں تقریباً نیم بے ہوش ہو کر پانی میں خاصی دیر تک پڑا رہا۔ اس نیم بے ہوشی میں میں شوقے کی انتہائی غلیظ گالیاں سن رہا تھا جو لوہے کی سلاخوں کے باہر کھڑا مجھے پانی جلدی نکالنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ ذرا حواس بحال ہوئے تو میں نے کھڑے ہو کر ہاتھوں اور پیروں سے پانی باہر نکال دیا اور شوقے کی گالیوں سے نجات حاصل کی۔

میں شروع سے ہی کم خوراک واقع ہوا ہوں چنانچہ شاہی قلعے کی دو روٹیوں میں سے ایک ہی کھاتا تھا اور ایک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے چڑیوں کو پھینکتا تھا۔ میرا کھانا آتے ہی سینکڑوں چڑیاں میری کوٹھری کے پاس آ جاتیں اور روٹی کے ٹکڑے اٹھا کر لے جاتیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اندر کوٹھری میں بھی آنے لگیں یہاں تک کہ کچھ میرے دیوان تک بھی پہنچ جاتیں کیونکہ ان کے دلوں سے ڈر نکل گیا تھا۔ ایک چڑیا لنگڑی تھی۔ ایک دن میں نے روٹی کے ٹکڑے دیوان پر ہی پھیلائے تو وہ چڑیا بھی آ گئی اور میں نے اسے پکڑ لیا۔ اس کی ٹانگ کا جوڑ ہل گیا تھا۔ میں نے اسے ذرا کھینچ کر ٹھیک کر دیا اور اس کی گردن پر اپنی کمبل کا ایک دھاگہ باندھ دیا تاکہ پہچانی جا سکے۔ دوسرے دن دیکھا تو وہ ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

اس کوٹھری میں مجھے کوئی ایک مہینہ ہوا تھا۔ ایک دن اچانک مجھے وہاں سے نکال کر باہر کی طرف بنی کوٹھریوں کی قطار میں سے ایک میں ڈال دیا گیا (رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ میرے بعد میری کوٹھری میں بنگال کے شیخ مجیب الرحمٰن کو رکھا گیا) باہر والی قطار کی دوسری یا تیسری کوٹھری میں جی ایم لون صاحب تھے جنہوں نے مجھے وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھ کر آواز دی اور کہنے لگے کیا تم بھی یہاں ہو؟ میری اور ان کی کوٹھری کے درمیان ایک کوٹھری تھی سو ہم ایک دوسرے کی آواز سن سکتے تھے لیکن بات کرنے کی اجازت نہیں تھی اس کا علاج میں نے یہ نکالا کہ میں گانے کے طرز پر کشمیری زبان میں ان کی حوصلہ افزائی کرتا۔ دوسری طرف تیسری کوٹھری میں سعید شاہ ناز کی صاحب تھے جن کی باتوں سے ہی میں نے انہیں پہچان لیا۔ وہ سپاہیوں سے اونچی آواز میں بات کرتے تھے۔ چند دن کے بعد انہیں وہاں سے نکال کر اور کہیں لے جایا گیا۔ میں نے انہیں اپنی کوٹھری کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا ان کا حلیہ عجیب سا ہو گیا تھا جسے

دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نے انہیں آواز دی سلام کیا، خیریت پوچھی اور حوصلہ افزائی کی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتے تھے لیکن سپاہی انہیں کھینچ کر آگے لے گئے۔

میری ساتھ والی کوٹھری میں کوئی نوجوان تھا۔ اس کی آواز ہمارے ایک ساتھی نصیر محمود وانی کی سی تھی چنانچہ میں اسے نصیروانی ہی سمجھا اور کشمیری زبان میں اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ نصیروانی نہیں بلکہ جموں کا کوئی ڈوگرہ نوجوان تھا۔

اگست کے اواخر میں ایک دن صبح سویرے ہی سپاہی آئے اور مجھے نکال کر ملک صدیق کے دفتر لے گئے۔ ملک نے حسب معمول چند غلیظ گالیوں سے میرا استقبال کیا اور کہا تمہیں باہر لے جایا جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ہتھکڑیوں میں جکڑا بند پولیس گاڑی میں جی ٹی روڈ پر راولپنڈی کی طرف جا رہا تھا۔ انچارج سب انسپکٹر فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا اور تین سپاہی پیچھے میرے ساتھ۔ راستے میں سب انسپکٹر نے مجھے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ مجھے پھانسی دینے کے لئے لے جایا جا رہا ہے۔ سپاہیوں میں سے ایک شریف سا نوجوان تھا جو سب انسپکٹر کی باتیں سن کر مسکرایا (غالباً قصداً اور میں سمجھ گیا کہ سب انسپکٹر مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے) میں سارے راستے بالکل خاموش رہا۔ رات آٹھ بجے ہم راولپنڈی کے بی ڈویژن تھانے کے پاس پہنچے تو وہاں گلگت کا سب انسپکٹر (جو اب غالباً انسپکٹر بن گیا تھا) تردی بیگ ہمارا منتظر تھا۔ اس نے لاہور والوں کو چائے پلائی - مجھے پوچھا تک نہیں۔ اس کے بعد وہ اور لاہور کا سب انسپکٹر اندر تھانے میں چلے گئے۔ مجھے بھی تھانے کے مین گیٹ سے اندر لے جایا گیا۔ حوالاتوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک طرف کے حوالات میں درجن بھر طوائفیں بیٹھی ہنسی مذاق کر رہی ہیں اور دوسری طرف کا حوالات مردوں سے بھرا ہے جن کی حرکتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ طوائفوں کے دلال ہیں اور پولیس والے مجھے رات کو ان کے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے سپاہی سے کہا کہ وہ مجھے اندر تھانے کے انچارج کے پاس لے جائے چنانچہ تھوڑے سے تذبذب کے بعد وہ شریف نوجوان مجھے اندر لے گیا۔ ہمیں دیکھتے ہی تردی بیگ اور لاہور والے سب انسپکٹر نے سپاہی کو بری طرح ڈانٹ دیا کہ وہ مجھے کیوں اندر لایا ہے۔ میں ان کی اس ڈانٹ ڈپٹ کو نظرانداز کر کے سامنے بیٹھے مقامی تھانے کے انچارج سے مخاطب ہوا اور انگریزی میں اس سے کہا کہ میں ایک لاگریجویٹ ہوں مجھ پر ابھی تک کوئی الزام بھی ثابت نہیں ہوا ہے۔ کیا آپ کا ضمیر آپ کو اجازت دیتا ہے کہ آپ مجھے رات کو ان طوائفوں یا ان کے دلالوں کے ساتھ رکھیں۔ انچارج نے مجھ پر اوپر سے نیچے تک ایک نظر ڈالی اور مجھے باہر کھڑا ہونے کو کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد تردی بیگ اور لاہور والا افسر باہر نکلے اور مجھے گاڑی میں بٹھایا۔ غالباً میری باتوں سے متاثر ہو کر پنڈی والے تھانیدار نے مجھے دلالوں کے ساتھ رکھنے سے انکار

کیا تھا اس کے بعد مجھے سول لائنز تھانے لے جایا گیا وہاں بھی جگہ نہیں تھی۔ آخر رات دیر سے ہم چکلالہ تھانے پہنچے جس کا ایک حوالات خالی تھا اور مجھے اس میں ڈالا گیا۔ حوالات کا تین چوتھائی حصہ پیشاب سے تالاب بنا ہوا تھا۔ بدبو بھی ناقابل برداشت تھی۔ بہرحال میں نے ایک کونے میں سمٹ کر رات گزاری - دوسرے دن میں نے مقامی ایس ایچ او سے کہا کہ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ اس نے کہا کہ آپ کے خوراک کی ذمہ داری آپ کو یہاں لانے والوں پر ہے۔ میں نے کہا میرے پیسے ان کے پاس ہیں۔ اگر حکومت مجھے کھانا نہیں دے سکتی ہے تو ان پیسوں سے مجھے کھانا منگوا دیں۔ ایس ایچ او نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد باہر ہوٹل سے ایک لڑکے کو بلایا اور اسے کہا کہ مجھے کھانا دے دے میں بعد میں پولیس والوں سے پیسے لے کر دوں گا۔ لڑکے نے کہا جناب اگر مجھے پیسے نہیں ملے تو میرا ایک ہفتے کا کمیشن چلا جائے گا۔ بہرحال میں نے لڑکے کو مطمئن کیا کہ اسے پیسے ضرور ملیں گے چنانچہ وہ جا کر میرے لئے کھانا سگریٹ اور اخبار بھی لایا۔ اخبار کی شکل میں نے تقریباً دو ماہ سے نہیں دیکھی تھی چنانچہ کھانا کھاتے ہوئے میں اخبار بھی پڑھتا رہا۔ اتنے میں لاہور والا سب انسپکٹر وہاں سے گزرا اور مجھے اخبار پڑھتے دیکھ کر شور مچانے لگا کہ اس کو اخبار کس نے دیا ہے۔ چنانچہ اخبار مجھ سے چھین لیا گیا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد تردی بیگ سامنے سے گزرا۔ میں نے اسے آواز دی اور سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر اس کا گلا پکڑا اور اس سے پوچھا کہ اس نے مجھے کھانے کے بغیر کیوں رکھا۔ اس نے شور مچایا۔ چنانچہ دوسرے سپاہی آکر اسے مجھ سے چھڑا لے گئے۔

موسم کی خرابی کی وجہ سے جہاز گلگت نہیں جاتا تھا اس لئے مجھے پنڈی میں رکھا گیا تھا۔ چوتھے دن فلائٹ ہوئی تو مجھے حوالات سے نکال کر گاڑی میں بٹھایا گیا۔ اتنے میں مجھے یاد آیا کہ ہوٹل والے لڑکے کو پیسے دینے ہیں۔ میں نے لاہور والے سب انسپکٹر سے کہا کہ وہ میرے پیسوں میں سے میرے کھانے سگریٹوں اور اخبار کے پیسے ہوٹل والے کو دے دیں۔ اس نے مجھے گندی سی گالی دے کر وین کا دروازہ بند کرنا چاہا تو میں نے اسے روکا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ لڑکا دور کھڑا دیکھ رہا ہے۔ قبل اس کے کہ سب انسپکٹر گاڑی کا دروازہ بند کرے۔ میں نے دو سو روپے کی اپنی نئی کراکلی ٹوپی لڑکے کی طرف پھینک دی اور اسے کہا کہ میں اسے یہ ٹوپی ہی دے سکتا ہوں۔ اتنے میں گاڑی کا دروازہ بند کر دیا گیا اور ہم ایئرپورٹ کی طرف چل دئے اور جہاز میں گلگت روانہ ہو گئے۔

شاہی قلعے کے یہ سات ہفتے میری زندگی کے بدترین دن بھی تھے۔ اور بہترین بھی۔ بدترین اس لئے کہ جو ذہنی اور جسمانی اذیت مجھے یہاں ملی اس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا خاص کر افسروں اور سپاہیوں سے لے کر بھنگی تک کی طرف سے ملنے والی انتہائی گندی اور ذلیل گالیاں اور وہ بھی تقریباً مسلسل میرے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ مجھے زندگی میں کبھی بھی اس

قسم کی ذہنی اور جسمانی اذیت کا سامنا کرنا نہیں پڑا تھا۔ اس اذیت میں مزید اضافہ اس لئے بھی ہوتا تھا کہ یہ مجھے پاکستانیوں کی طرف سے مل رہی تھی جبکہ مملکت پاکستان کے خلاف کوئی بات کبھی ہمارے ذہن میں بھی نہیں آئی تھی۔

یہ سات ہفتے میری زندگی کے بہترین دن اس لئے تھے کہ مجھے ذہنی اور جسمانی اذیتیں برداشت کرنے کے بعد یہ سوچ کر کہ میں یہ اذیتیں قومی آزادی کے اپنے عظیم مشن کی تکمیل اور کئی بار اٹھائے ہوئے اپنے حلف کی تعمیل کے سلسلے میں برداشت کر رہا ہوں' جو سکون قلب حاصل ہوتا تھا اس کی وضاحت کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ یہ سکون ایک ناقابل بیان اور ناقابل تصور روحانی لذت کا حامل تھا۔ اس سکون کی روح پرور لذت کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو عظیم مقاصد کے حصول کی جدوجہد کے دوران ملنے والی ذہنی اور جسمانی اذیتوں کو اپنے فرائض کی ادائیگی کا حصہ سمجھ کر خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوں۔

ملٹری کوارٹر گارڈ گلگت میں چار ماہ

راولپنڈی سے ہوائی جہاز میں گلگت پہنچانے کے بعد مجھے سول جیل کی بجائے گلگت سکاؤٹس کے کوارٹر گارڈ (فوجی حوالات) میں رکھا گیا۔ جہاں میں چار ماہ رہا۔ اس دوران بجز میرے بھتیجے قدم خان کے کسی کو مجھ سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیٹرین کوارٹر گارڈ سے تقریباً ایک فرلانگ دور دریا کے کنارے تھی۔ چنانچہ جب مجھے رفع حاجت کے لئے باہر لے جایا جاتا تو چھ سپاہی بندوقوں پر سنگین چڑھائے (دو دو بائیں دائیں اور ایک ایک آگے پیچھے) میرے ساتھ ہوتے۔ رات کو جلانے کے لئے ابتدا میں لالٹین بھی نہیں تھی۔ کوئی ایک ماہ بعد لالٹین دی گئی۔ کھانا شروع میں گلگت سکاؤٹس کے سپاہیوں کے لنگر سے آتا تھا بعد میں جونیئر کمیشنڈ آفیسرز (JCO's) کے میس سے آنے لگا۔ مجھے رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ کچھ مقامی جے سی اوز نے ایک وفد کی صورت میں کمانڈنٹ سے ملاقات کرکے استدعا کی تھی کہ مجھے کھانا جے سی او میس سے بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ گلگت سکاؤٹس کے جے سی اوز خاص کر نائب صوبیدار عبدالرحمٰن اور صوبیدار میجر شریف اللہ بیگ نے میرا بہت خیال رکھا۔ اکثر سپاہیوں خاص کر ہگلو حاصل مراد آف گوجال ہنزہ نے میری بڑی خدمت کی۔ میری کوٹھری کے ساتھ دن رات بارہ سپاہیوں کی گارد ہوتی تھی جو ہر تین گھنٹے کے بعد بدلتی تھی۔ نومبر کی ابتداء سے مجھے ہر روز ایک گھنٹے کے لئے باہر دھوپ میں بیٹھنے کی بھی اجازت دی گئی اور دسمبر سے کمرے میں جلانے کے لئے لکڑی بھی ملنے لگی۔

میری کوارٹر گارڈ کی اسیری کے دوران ہی 1971ء کی پاک بھارت جنگ چھڑ گئی۔ کچھ دنوں

کے بعد گلگت پر بھارتی فضائیہ کے حملے کا خطرہ محسوس کیا گیا تو سکاؤٹس نے میرے لئے کوارٹر گارڈ کے سامنے ہی ایک بنکر (مورچہ) بنایا اور کئی دن تک روزانہ کئی کئی گھنٹے مجھے وہاں رکھا جاتا رہا۔ اس دوران گلگت سکاؤٹس کی کئی کمپنیوں کو محاذ جنگ پر بھیجا گیا۔ دسمبر کی اس غضب کی سردی میں ان کو عام وردی (قمیض شلوار جرسی) میں انتہائی اونچے پہاڑوں پر واقع محاذوں پر بھیجا گیا۔ میں کوارٹر گارڈ سے ان کی روانگی کا منظر دیکھ کر ایک طرف ان کی بہادری اور جذبہ قربانی کی داد دیتا اور دوسری طرف حکومت کی اس مجرمانہ غفلت پر حیرت ہوتی جو ان جوانوں کو بہترین گرم وردی اور دوسری آسائشوں کے علاوہ جدید ترین اسلحہ سے لیس بھارتی افواج سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک رائفل لئے اور قمیض شلوار میں ملبوس اس حالت میں بھیج رہی تھی۔ اس حالت میں بھی ان جوانوں نے بھارتیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بھارتیوں کا سارے گلگت بلتستان پر قبضہ کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ چند سال بعد گلگت سکاؤٹس ، ناردرن سکاؤٹس اور قراقرم سکاؤٹس کو ملا کر ناردرن لائٹ انفنٹری (این ایل آئی) بنائی گئی جس کے نتیجے میں انہیں کچھ آسائشیں میسر آئیں گو ان فرائض کی نوعیت اور علاقے کی جغرافیائی اہمیت کے لحاظ سے یہ آسائشیں بھی ناکافی ہیں۔

16 دسمبر 1971ء کو پاکستان آرمی نے مشرقی پاکستان میں بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ اس دن میں نہ کھانا کھا سکا نہ سو سکا اور رات بھر آنسو بہاتا رہا۔

گلگت جیل میں مزید دو ماہ

گلگت سکاؤٹس کوارٹر گارڈ میں تقریباً چار ماہ گزارنے کے بعد اواخر دسمبر میں مجھے گلگت جیل منتقل کیا گیا۔ جیل میں داخلے کے بعد ہی مجھے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل (جو میر آف نگر کے چچا تھے) نے کہا کہ انہوں نے میرے لئے زنان خانے کا کمرہ رکھا ہے۔ جہاں بخاری بھی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہاں اس وقت کچھ قیدی ہیں جو باہر والان میں رہیں گے۔ میں زنان خانے پہنچا تو دیکھا کہ کمرے میں نگر سٹیٹ کے وہ لوگ ہیں جنہیں میر آف نگر کے خلاف بغاوت کے الزام میں قید کیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر 80 سال سے زیادہ عمر کے تھے۔ دراصل ڈپٹی صاحب مجھ پر احسان جتانے کے علاوہ میرے ذریعہ نگر کے ان عمر رسید لوگوں کو اس گرم کوٹھری سے نکلوانا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں بخاری کے ارد گرد بیٹھے دیکھا تو سوچا کہ ان بزرگوں کو یہاں سے باہر سردی میں پھینک کر خود یہاں گرم کمرے میں رہنا انتہائی بے ضمیری ہو گی۔ چنانچہ میں نے اپنا سامان باہر والان میں رکھا اور دو ماہ وہاں ہی اس غضب کی سردی میں رہا۔ نگر والے بزرگ مجھے

دعائیں دیتے رہے۔

غالباً جنوری کے اواخر یا فروری کے اوائل میں مسٹر نصراً من اللہ ریذیڈنٹ بنکر گلگت آئے تو میں نے انہیں خط لکھا کہ مجھے بتایا جائے کہ مجھے کس جرم میں قید رکھا گیا ہے کیونکہ گزشتہ پانچ ماہ سے مجھے کسی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا ہے نہ ہی مجھے کوئی سزا سنائی گئی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ میرے شاہی قلعہ لاہور جانے کے بعد تمام سیاسی قیدی ایک ایک کر کے ضمانتوں پر رہا ہو گئے تھے۔ کچھ نے تو حکام سے تحریری معافی بھی مانگی تھی۔ آخر میں شیر ولی پونیالی اور محمد علی انجینئر رہ گئے تھے جنہوں نے مشروط رہائی سے انکار کیا تھا۔ میری گلگت جیل منتقلی سے کچھ دن پہلے انہیں بھی غالباً غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا تھا اور اسی دوران میرے سمیت تمام کے خلاف کیس واپس لئے گئے تھے اس طرح گلگت کی وہ عوامی تحریک فوری طور پر علاقے کو بغیر کوئی فائدہ پہنچائے ختم ہو گئی البتہ حکام عوام سے برتاؤ کے سلسلے میں کچھ محتاط ضرور ہو گئے۔ اسی دوران ہری پور جیل والوں (جوہر علی، صفی اللہ بیگ، عبدالحمید آف مناور، حیدر، صوبیدار ایوب اور عبدالرحیم وغیرہ) کو بھی رہا کر دیا گیا۔ میں نے جیل سے جوہر علی اور وکلاء کو خط لکھے جن میں آئندہ کے لئے لائحہ عمل کے بارے میں کچھ تجاویز پیش کیں۔ لیکن کسی کی طرف سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں آیا۔

ایک دن میں زنانہ خانے کے دالان میں لیٹا ہوا تھا کی ریذیڈنٹ نصراً من اللہ وہاں پہنچا۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد کہنے لگا کہ اسے میرا خط ملا ہے اور اس نے میرے بارے میں مرکزی حکومت سے احکامات طلب کئے ہیں کیونکہ ریکارڈ میں میرے خلاف کوئی کیس نہیں۔ مجھے وزارت امور کشمیر کے کسی افسر کی طرف سے ٹیلی فون پر ملنے والی ایک ہدایت کے تحت جیل میں رکھا گیا ہے۔ (دراصل وزارت امور کشمیر والے اور بھارتی جہاز گنگا کے سلسلے میں عدالت میں چلنے والے کیس میں استغاثہ کے افسر چاہتے تھے کہ کیس کے دوران میں جیل میں ہی رہوں تاکہ صفائی کے گواہ کی حیثیت سے یا کسی اور طریقے سے میں اپنے ملزم دوستوں مقبول بٹ وغیرہ کی کوئی مدد نہ کر سکوں) نصراً من اللہ نے مجھے بتایا کہ جونہی اسلام آباد سے جواب آئے گا میں آپ کو مطلع کروں گا۔ اس نے جیل کے حکام کو یہ ہدایت بھی دی کہ مجھے سنٹرل لائبریری جا کر وہاں سے کتابیں لانے کی بھی سہولت دی جائے چنانچہ دوسرے دن میں لائبریری جا کر کچھ کتابیں لے آیا۔

سقوط مشرقی پاکستان کے بعد یحییٰ خان نے اقتدار پاکستان پیپلزپارٹی کے سربراہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے حوالہ کر دیا اور بھٹو صاحب نے مرکز میں اپنی حکومت بنا لی۔ پیپلزپارٹی کے کچھ اہم لیڈروں سے میرے ذاتی مراسم تھے۔ جن میں سے معراج محمد خان مرکز میں وزیر مملکت بن گئے تھے۔ جب انہیں گلگت کے فضل الرحمٰن، خلیل الرحمٰن، متولی خان اور حشمت اللہ وغیرہ کی زبانی

معلوم ہوا کہ میں ابھی قید ہوں تو انہوں نے وزارت امور کشمیر سے وضاحت طلب کی۔ وزارت انہیں مطمئن نہ کر سکی تو معراج محمد خان نے کہا کہ مجھے فوراً رہا کیا جائے چنانچہ 24 فروری 1972ء کو ریذیڈنٹ نصراًمن اللہ کو میری غیر مشروط رہائی کے احکامات ملے اور انہوں نے فوراً ہی جیل حکام کو میری رہائی کا حکم دے دیا اور مجھے اسی شام رہا کیا گیا۔ میری رہائی کی خبر سن کر ہنزہ کے غلام رسول سمیت کچھ دوست جیپیں لے کر جیل پہنچے اور مجھے شہر لے آئے۔ میرے دوستوں مقبول بٹ وغیرہ پر لاہور میں مقدمہ چل رہا تھا چنانچہ میں استور جا کر والدہ اور دوسرے بزرگوں اور عزیزوں سے ملاقات کئے بغیر ہی دوسرے دن گلگت سے لاہور آ گیا اور اپنے دوستوں کی مدد میں مصروف ہو گیا۔

گلگت جیل میں مجموعی طور پر نو ماہ سے زیادہ کی اسیری کے دوران کچھ لوگوں نے میری بڑی خدمت کی - ابتدا میں عام قیدی غلام محمد اور اس کے بھائی غلام سرور نے بڑی خدمت کی۔ ان سے بھی زیادہ ان کے والد کشروٹ گلگت کے محمد رفیق مرحوم نے کی جو روزانہ میرے لئے گھر سے دودھ اور بعد میں کھانا بھی لے آتے تھے۔ ان کی اہلیہ بھی ایک عظیم خاتون ہیں۔ ٹھیکیدار شکور محمد نے بھی میرا بڑا خیال رکھا۔ جنوری 1971ء کے واقعات کے بعد میرا سب سے زیادہ خیال ہنزہ کے غلام رسول نے رکھا وہ سگے چھوٹے بھائی کی طرح میری دیکھ بھال کرتا رہا۔ اس کے علاوہ مرتضیٰ آباد شاپ گلگت کے مالک ذوالفقار علی نے بھی میرا بڑا خیال رکھا۔ دوسرے قیدی بھی میرا بڑا خیال رکھتے تھے۔ میرے کپڑے تک دھوتے۔ وارڈوں میں سے سب سے زیادہ خدمت علی نومسلم نے کی۔ ہیڈ وارڈر غلام عباس اسسٹنٹ سپرانٹنڈنٹ غلام قادر بھی میرے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرتے تھے ڈپٹی سپرانٹنڈنٹ راجہ مظفر الدین مرحوم بھی میرا پورا احترام کرتے تھے اور اپنے مخصوص نگری لہجے میں مجھے کاکو (بھائی صاحب) کہہ کر پکارتے تھے۔ اکثر قیدی اپنے ملاقاتیوں کے ذریعہ میرے لئے گوشت، گھی، راجماش اور میوے وغیرہ منگاتے تھے۔ خود مجھ سے ملنے آنے والے بھی اشیاء خوردنی لاتے الغرض بجز ان ستائیس دنوں کے جب ہمیں ہتھکڑیوں میں بند رکھا جاتا رہا میں نے مجموعی طور پر گلگت جیل میں اچھے دن گزارے۔ وارڈر اور قیدی سب عزت کرتے تھے۔ قیدیوں کی طرف سے احترام کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک دن ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے کہا کہ ندی کا پانی گرم ہے میں چاہتا ہوں کہ پینے کے پانی کے لئے جیل کے اندر کنواں کھودا جائے تاکہ ٹھنڈا پانی ملے۔ گزشتہ سال بھی کھودا تھا جو سردیوں میں مٹی سے بھر گیا ہے۔ قیدی میرا نہیں مانتے۔ آپ انہیں کہیں شاید مان جائیں۔ یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔ میں نے سوچا ممکن ہے قیدی میرا کہنا بھی نہ مانیں اس لئے میں قیدیوں سے کہنے کے بجائے سٹور سے ایک گینتی بیلچہ نکال کر خود کنواں کھودنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد قیدی جمع ہو گئے۔ اور کہنے لگے کیا ہم سب مر گئے ہیں کہ آپ خود کنواں کھود رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے گینتی

چھین لی اور دو دن میں کنواں تیار کیا۔ الغرض گلگت جیل میں نو ماہ کی اسیری کے دوران مجھے مجموعی طور پر جیل حکام اور قیدیوں کی طرف سے پورا احترام ملا جس کے لئے میں ان سب کا مشکور ہوں۔

جنوری 1971ء گلگت کی عوامی تحریک کا فوری فائدہ تو یہ ہوا تھا کہ اس نے گلگت کے معاشرے کی چار انتہائی خطرناک بیماریوں (یعنی فرقہ وارانہ، نسلی اور علاقائی تعصبات اور مراعات یافتہ ایک ٹولے کی طرف سے حکام کی بے جا چاپلوسی) میں سے اولذکر تین کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور عوام کو پوری طرح متحد کر دیا تھا لیکن چوتھی بیماری بدستور قائم رہی تھی البتہ تحریک کے دوران چاپلوسوں کا یہ ٹولہ جنہیں عوام سرکاری چمچے کے نام سے پکارتے تھے، بھی خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ دراصل یہ چاروں بیماریاں حکام کی طرف سے 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی پر مستقلاً" عمل پیرا ہونے اور ان علاقوں کے عوام کو آئینی حقوق اور سیاسی سرگرمیوں سے محروم رکھنے کے نتیجے میں پیدا ہو گئی تھیں۔ میں نے اور وکلاء نے پوری کوشش کی کہ یہ عوامی اتحاد قائم رہے لیکن حکام ہم سے کہیں زیادہ ہوشیار نکلے ،انہوں نے پہلے وکلاء کو گلگت جیل سے گوپس قلعے منتقل کر دیا اور اس طرح مجھ سے اور عوام سے ان کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد مجھے شاہی قلعہ لاہور لے جایا گیا۔ چنانچہ عوام کو کہیں سے رہبری نہیں ملی اور اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر حکام نے عوامی اتحاد کو ختم دیا۔ ادھر وکلاء حضرات بھی حالات کا صحیح تجزیہ نہ کر سکے اور ایک ایک کر کے جیل سے رہائی حاصل کرتے رہے۔ چنانچہ جس تیزی سے عوام میں اتحاد پیدا ہو گیا تھا تقریباً اسی تیزی سے ختم ہو گیا اور نتیجتاً" علاقہ پھر سے پرانی بیماریوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ یہی نہیں بلکہ یہ بیماریاں شدید سے شدید تر ہوتی گئیں اور اگر وہاں کے عوام کو ان کے آئینی حقوق اور سیاسی آزادی سے اسی طرح محروم رکھا گیا تو بعید نہیں کہ مستقبل قریب میں کوئی بڑا سانحہ پیش آئے۔ اگر ایسا ہوا تو اس کی ذمہ داری بھی حکام اور ان نام نہاد کوتاہ نظر لیڈروں پر عائد ہوگی جو ذاتی مفاد کے لئے عوام کے فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکاتے رہتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے حوالات میں ایک گھنٹہ

1980ء میں اپنے قیام نیویارک کے دوران مجھے اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کے ایک ممنوعہ علاقے میں جانے کی پاداش میں ایک گھنٹہ اقوام متحدہ کے حوالات میں گزارنا پڑا۔ تفصیلات "اقوام متحدہ میں میری سرگرمیاں" کے باب میں درج ہیں۔

برمنگھم پولیس سٹیشن میں 72 گھنٹے

3 فروری 1984ء کی رات کو برمنگھم (برطانیہ) میں بھارت کے اسسٹنٹ ہائی کمشنر راوندرا مہاترے کو "کشمیر لبریشن آرمی" نام کی ایک تنظیم نے اغوا کر لیا۔ میری رہائش ان دنوں لندن کے نزدیک ایک شہر لیوٹن میں تھی، پاکستان سے ہاشم قریشی اور سعودی عرب سے افضل طاہر بھی آئے تھے اور میرے ہاں قیام پذیر تھے 5 فروری کو مجھے اور ہاشم قریشی کو پولیس گرفتار کر کے لیوٹن پولیس اسٹیشن لے گئی۔ جہاں ہم دونوں سے الگ الگ کمروں میں دو گھنٹے تک بیان لئے گئے۔ اس اثناء میں پولیس نے میرے گھر (جس کے نیچے والے چار کمروں میں لبریشن فرنٹ کا مرکزی دفتر تھا) کی پوری تلاشی لی اور سارا ریکارڈ ضبط کر کے لیوٹن اور بعد میں برمنگھم پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا۔ چار بجے کے قریب ہمیں کہا گیا کہ برمنگھم میں قائم مہاترے کے اغوا کی تفتیشی ٹیم کا سربراہ ہم سے بات کرنا چاہتا ہے اس لئے ہمیں برمنگھم لے جایا جا رہا ہے۔ چنانچہ ہمیں دو الگ الگ کاروں میں بٹھا کر اور بھاری گارد میں پولیس برمنگھم روانہ ہو گئی۔

شام کو ہم برمنگھم پہنچے اور مجھے سنٹرل پولیس لائنز جہاں مہاترے اغوا کیس کی تفتیشی ٹیم نے اپنا مرکز قائم کیا تھا' کے ایک کمرے میں رکھا گیا اور ایک پولیس آفیسر نے مجھ سے پوچھ گچھ کی۔ اس کے بعد وہ باہر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آ کر کہنے لگا مسٹر خان آپ کو ہم جلدی ہی چھوڑ رہے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ پھر باہر چلا گیا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد واپس آیا اور انتہائی ترش لہجے میں کہنے لگا۔ مسٹر خان ہمیں ابھی ابھی آپ کے ریکارڈ سے ایسی دستاویزات ملی ہیں جن سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مہاترے کے اغوا کی پوری منصوبہ بندی آپ نے کی ہے۔ اس لئے ہم آپ کو باقاعدہ گرفتار کر رہے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ مجھے اندر دفتر میں لے گیا۔ جہاں میرے فوٹو اور انگوٹھے کے نشانات وغیرہ لینے کے بعد مجھے ایک سیل (Cell) میں بند کر دیا گیا۔ رات گیارہ بجے کے قریب دُور ایک سیل سے ہاشم قریشی کی آواز سنائی دی جو اونچی آواز اور دیسی انگریزی میں کسی پولیس والے سے بات کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ہاشم کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔

دوسری صبح کو پولیس والے آئے اور انہوں نے مجھے ایک لمبا سا کوٹ پہننے کو دیا اور میرے سارے کپڑے کیمیائی تجزیئے کے لئے لے گئے (یہ کپڑے مجھے چار پانچ ماہ بعد واپس ملے) شام کو ایک بار میں نے سگریٹ پینے کے لئے ایک پولیس والے سے ماچس مانگی تو اس نے فحش سی نسلی گالی دیتے ہوئے کہا کہ تم تیس سال تک جیل میں سڑو گے۔

7 فروری کی شام کو مجھے صرف لمبا کوٹ پہنے اور ننگے پاؤں ایک دفتر میں لے جایا گیا جہاں بیٹھے دو پولیس افسروں نے مجھے بتایا کہ مہاترے کو کشمیر لبریشن آرمی والوں نے قتل کیا ہے

اور اس کی لاش لیسٹر کے پاس ملی ہے یہ بات کہہ کر دونوں آفسر ٹکٹکی باندھ کر میرے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کا جائزہ لیتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے وہ تمام سوال ایک بار پھر دہرائے جو مجھ سے لیوٹن اور برمنگھم میں پوچھے گئے تھے۔ میں نے بھی وہی جواب دہرائے۔ اس کے بعد انہوں نے مختلف نفسیاتی ہتھکنڈے استعمال کر کے مجھ سے ہاشم کے خلاف باتیں اگلوانے کی ناکام کوشش کی۔

دوسری صبح کو تقریباً نو بجے مجھے ملزموں سے بیان لینے کے کمرے میں لے جایا گیا۔ جہاں دو افسروں نے مجھ سے پوچھ گچھ شروع کی۔ انہوں نے ایک فوٹو مجھے تھماتے ہوئے مجھ سے پوچھا کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں میں نے فوٹو کو غور سے دیکھا اور جواب دیا میں اس شخص کو نہیں جانتا۔ کہنے لگے آپ جھوٹ بولتے ہیں آپ اسے جانتے ہیں اور اس بارے میں ہمارے پاس ثبوت ہے میں نے کہا یہ کون ہے کہنے لگے بھارتی سفارت کار مہاترے جسے آپ نے اغوا اور پھر قتل کروایا۔ میں نے کہا میں نے نہ مہاترے کو کبھی دیکھا ہے نہ اغوا کروایا ہے اور نہ قتل کروایا ہے۔ اس پر انہوں نے بریف کیس سے میری ڈائری نکال کر مجھے دکھائی اور مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ ڈائری آپ کی ہے میں نے کہا ہاں یہ میری ڈائری ہے۔ پھر کہنے لگے کہ یہ ڈائری ثابت کرتی ہے کہ تم مہاترے کو جانتے تھے اور تم نے ہی اس کے اغوا کا منصوبہ بنایا تھا اس لئے کہ اس ڈائری میں دو جگہ تمہاری تحریر میں مہاترے کا نام لکھا ہے یہ کہہ کر انہوں نے مجھے وہ صفحہ دکھایا جہاں میں نے دو جگہ مہاترے لکھا تھا میں نے کہا میں نے مہاترے کا نام اس کے اغوا کی خبر آنے کے بعد لکھا ہے۔ خبر آنے کے بعد میں نے بھارتی صحافیوں سے فون پر اغوا ہونے والے سفارت کار کا نام پوچھا تھا۔ دونوں نے مہاترے کے دو مختلف ہجے (Spelling) بتائے اور میں نے دونوں اپنے سامنے رکھی اس ڈائری پر نوٹ کئے کیونکہ میں اس مسئلے کو حل کرنے میں مصروف تھا جس کا پورا علم برطانیہ کے ذرائع ابلاغ خاص کر بھارتی صحافیوں کو ہے جن کے ذریعہ میں بھارتی ہائی کمیشن سے رابطہ پیدا کرنے کی ناکام کوششیں کرتا رہا۔ اس کے بعد میں نے ڈائری ہی سے دونوں صحافیوں کے فون نمبر پولیس آفیسر کو دے دیئے اور اسے کہا کہ وہ ان سے میرے بیان کے بارے میں پوچھ سکتے ہیں۔ سینئر افسر دونوں فون نمبر لے کر باہر چلا گیا اور آدھ گھنٹے کے بعد واپس آیا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں بھارتی صحافیوں نے میرے بیان کی تصدیق کی ہے۔

اس کے بعد اس نے مجھے اسلحہ کی ایک فہرست دکھائی اور کہنے لگا یہ فہرست آپ کے ہاں سے ملی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اس ملک میں باہر سے جدید اسلحہ اسمگل کرتے رہے ہیں۔ میں نے کہا اس فہرست کے ساتھ ایک کورنگ لیٹر بھی تھا جو آپ مجھے نہیں دکھا رہے ہیں اس کورنگ لیٹر میں اس فہرست کی پوری وضاحت ہے اس کے علاوہ یہ فہرست میں

نے نہیں بتائی کسی نے مجھے بھیجی ہے۔ میں نے فہرست سے متعلق معاملات کی وضاحت بھی کی۔ اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔مجھے اپنے سیل میں بند کر دیا گیا - مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرے خلاف کیس رجسٹر کرنے کے لئے پولیس کو مطلوبہ مواد نہیں مل رہا۔

پونے ایک بجے کے قریب ایک پولیس آفیسر آ گیا اور مجھے سیل سے باہر لے آیا۔ باہر ہاشم بھی کھڑا تھا۔ ہمیں کہا گیا کہ ہم اب آزاد ہیں۔ ہم نے کہا ہمیں ہمارے کپڑے دیئے جائیں ہم اس عجیب حلئے میں اور ننگے پیر اس وقت کہاں جائیں ہماری رہائش ایک سو میل دور لیوٹن میں ہے چنانچہ ہمیں اسی حلئے میں کاروں میں بٹھا کر لیوٹن پہنچایا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لبریشن فرنٹ کے سیکرٹری جنرل زبیر الحق انصاری نے ہائی کورٹ میں ہمارے بارے میں ہیبس کارپس (Habeas Corpus) کی رٹ دائر کی تھی اور ہائی کورٹ نے پولیس کو حکم دیا تھا کہ اگر امان اللہ اور ہاشم کے خلاف کیس رجسٹر نہیں کیا گیا ہے تو انہیں اس دن ایک بجے تک رہا کیا جائے کیونکہ ایک بجے ان کو زیر حراست 72 گھنٹے ہو جائیں گے اور قانون کسی کو اس کے خلاف کیس رجسٹر کئے بغیر 72 گھنٹے سے زیادہ مدت کے لئے زیر حراست رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اس طرح ہماری یہ مختصر سی اسیری ختم ہو گئی۔

برطانیہ کے مختلف جیلوں میں پندرہ ماہ دس دن

ہر سال ستمبر کے دوسرے منگل سے نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہوتا ہے۔میں اوائل ستمبر 1985ء سے ہی نیویارک جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا اور وہاں تقسیم کرنے کے لئے مسئلہ کشمیر پر ایک نئے کتابچے کو آخری شکل دینے کے لئے 4 ستمبر کی رات دو ڈھائی بجے تک اپنے دفتر میں رہا۔ ڈھائی بجے رات تھک ہار کر اوپر چلا گیا اور بسترے پر لیٹ گیا۔ میں گہری نیند میں تھا کہ شور نے مجھے جگا دیا اور مجھے محسوس ہوا جیسے زلزلہ آیا ہے۔ سارا مکان ہلتا معلوم ہو رہا تھا میں کھڑا ہو گیا تاکہ دوسرے کمرے میں جا کر دیکھوں کہ میری بیوی، بچی اور دوسری عزیزہ خیریت سے ہیں۔ اندھیرے میں ہی دروازے کی طرف جانے لگا تو باہر سیڑھیوں پر سے باتیں سنائی دیں۔ میں سمجھا گھر پر ڈاکہ پڑا ہے یا نسل پرست انگریز گھس آئے ہیں۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا باہر سیڑھیوں پر درجن بھر پولیس والے کھڑے ہیں۔ جونہی دروازہ کھلا ایک پولیس والے نے بندوق سے میرے سینے کا نشانہ لیتے ہوئے مجھ سے پوچھا امان اللہ خان کہاں ہے۔ میں نے کہا کیا بات ہے۔ اس نے انتہائی ترش لہجے میں پھر پوچھا امان اللہ خان کہاں ہے۔ میں نے کہا کیا بات ہے امان اللہ میں ہی ہوں۔ اس پر فوراً ہی تین چار پولیس والے میری طرف لپکے اور مجھے نیچے گرا کر میرے جیبوں کی تلاشی لینے لگے۔ دوسرے بھی اندر

گھس آئے اور کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ یہ سب پولیس والے پوری طرح مسلح اور بلٹ پروف جیکٹ (Bullet Proof Jackets) پہنے ہوئے تھے۔ ایک کتا بھی ساتھ تھا۔ تلاشی کے بعد میں نے انچارج سے کہا کہ میں دوسرے کمرے میں جا کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ میری بیوی بچے خیریت سے ہیں۔ جواب ملا وہ خیریت سے ہیں لیکن آپ وہاں نہیں جا سکتے۔ اس نے مجھے نیچے ڈرائنگ روم میں چلنے کے لئے کہا۔ میں نے جوتا پہننا چاہا تو اجازت نہیں ملی۔ میں ننگے پاؤں نیچے کی طرف چل دیا تو پتہ چلا کہ سیڑھیوں پر شیشوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں۔ پولیس بڑے دروازے کا شیشہ توڑ کر اندر گھس آئی تھی۔ بہرحال میں نیچے جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔چھاپہ مار ٹیم کا سربراہ بھی میرے ساتھ بیٹھ گیا اور کچھ سپاہی بندوقیں میری طرف تان کر سامنے کھڑے رہے باقی سپاہی جو تعداد میں چالیس کے قریب تھے اور کتا مکان اور پیچھے باغیچے کی تلاشی میں مصروف رہے۔ مجھے یہ صورت حال دیکھ کر ایسا ہی وہ منظر یاد آیا جب 1947ء میں مقبوضہ کشمیر میں ہندواڑہ کے نزدیک موضع براری پورہ میں بھارتی فوج صدوانی صاحب کے گھر میں گھس آئی تھی جہاں طالب علم کی حیثیت سے میرا بھی قیام تھا۔

صبح ہوئی تو میں نے دیکھا کہ سارے علاقے کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا ہے اور ساتھ والی سڑک پر ٹریفک بھی بند کر دی گئی ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ پولیس نے ساتھ والی مسجد کے امام مولانا عبدالعزیز چشتی کو نماز پڑھانے کے لئے مسجد بھی جانے نہیں دیا تھا۔

بہرحال چار گھنٹے تک مکان کی تلاشی ہوتی رہی اور پولیس نے لبریشن فرنٹ کا سارا ریکارڈ معہ ٹائپ رائٹر اپنے قبضے میں لے لیا۔ (بعد میں پولیس نے میرے وکیل کو بتایا کہ یہ ریکارڈ چھ ہزار دستاویزات پر مشتمل تھا جن کی چھان بین پر پولیس کو سات مہینے صرف کرنے پڑے) نو بجے مجھے کہا گیا کہ پولیس مجھے پولیس سٹیشن لے جا رہی ہے۔ میں نے بچوں سے ملنا چاہا چنانچہ مجھے انچارج کی موجودگی میں اور صرف انگریزی میں بات کرنے کی شرط پر اپنی بیوی اور بچی سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ میں اوپر گیا تو میری بیوی، بیٹی اور دوسری عزیزہ کے پاس ایک لیڈی پولیس آفیسر بیٹھی تھی۔

مجھے بیوی اور بچی سے چند باتیں کرنے کی اجازت ملی اور اس کے بعد نیچے لایا گیا اور باہر نکال کر کار میں بٹھایا گیا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے میں نے اپنے گھر اور دفتر (کشمیر ہاؤس) پر ایک نظر ڈالی۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اپنے اس مکان کو آخری بار دیکھ رہا ہوں۔ گھر میں سرسری سوال و جواب کے دوران انچارج نے مجھے کہا تھا کہ ہماری اطلاع کے مطابق آپ کے مکان میں غیر قانونی طور پر اسلحہ رکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا میرے گھر میں یا دفتر میں کوئی اسلحہ نہیں۔ دیکھ کر اطمینان کر لو۔

پولیس سٹیشن پر دن بھر مجھ سے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ میں

بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی جو کچھ مدت بعد برطانیہ کا دورہ کرنے والے تھے' کو قتل کرنے یا کرانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ میں الزام کی پوری شدت سے تردید کرتا رہا۔ اس دوران میرا وکیل مسٹر جیف سلومن (Jeff Solomon) جو میرا دوست بھی تھا مجھ سے ملنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اسے اس کی اجازت نہیں ملی کیونکہ بقول پولیس یہ کیس قومی سلامتی سے متعلق تھا۔ عام حالات میں پولیس ملزم کے وکیل کی غیر موجودگی میں ملزم سے بیان بھی نہیں لے سکتی ہے۔ چھ تاریخ کی دوپہر کو وکیل مجھ سے ملاقات کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے مجھے بتایا کہ پولیس خاصی پریشان ہے اس لئے کہ اسے تمہارے خلاف کوئی مواد نہیں مل رہا۔ معلوم ہوتا ہے پولیس پر اوپر سے خاصا دباؤ ہے کہ کسی طرح امان اللہ کے خلاف کیس بناؤ۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ پریس نے تمہاری اور تمہارے دوسرے دوستوں کی گرفتاری کو وسیع کوریج دی ہے اور یہ بھی کہ تمہاری بیوی بچی کو تم سے ملاقات کی اجازت ملی ہے۔ شام کو میرا وکیل پھر آیا اور مجھے اطلاع دی کہ میرے خلاف غیر قانونی طور پر آتش گیر کیمیائی مواد گھر میں رکھنے کے الزام میں کیس رجسٹر کیا گیا ہے اور صبح عدالت میں پیش کر کے میرا ریمانڈ حاصل کیا جائے گا۔ رات آٹھ بجے کے قریب میری بیوی اور بچی مجھ سے ملنے آئیں اور اخبارات بھی ساتھ لائیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے خلاف کیس رجسٹر ہوا ہے اور اب مجھے کچھ مدت تک جیل میں رہنا ہو گا ان کے جانے کے بعد میں نے حوالات میں جا کر اخبار پڑھے۔ برطانیہ کے ہر قومی اخبار نے ہماری ڈرامائی گرفتاری کی خبر نمایاں طور پر دی تھی۔ حکومت کے حامی اخبار ڈیلی ٹیلی گراف نے صفحہ اول پر دی ہوئی خبر میں سرکاری ذرائع کے حوالے سے لکھا تھا کہ لبریشن فرنٹ والوں کو بھارتی حکومت کے ایما پر گرفتار کیا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے علاوہ برمنگھم سے چوہدری عبدالمجید اس کا بیٹا جاوید اور معصوم انصاری اور بلیک برن سے چوہدری محمد صدیق کو بھی گرفتار کیا ہے لندن کے اردو روزناموں "جنگ" اور "وطن" نے ہماری گرفتاری کی خبر شہ سرخیوں میں دی تھی۔

7 ستمبر کی صبح کو مجھے پولیس سٹیشن سے زیر زمین راستے سے ساتھ والی عدالت میں لے جایا گیا۔ عدالت کشمیریوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی بعد میں پتہ چلا کہ اندر جگہ نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد باہر ہی رہی۔ عدالت میں "وطن" لندن کے ایڈیٹر علی کیانی معہ فوٹو گرافر مسٹر فاروقی بھی موجود تھے۔

دس پندرہ منٹ کی رسمی سی کارروائی کے بعد پولیس نے میرا ریمانڈ حاصل کیا اور میں خود مختار کشمیر زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہوئے اور ہاتھ سے (V) کا نشان بناتے ہوئے باہر نکل آیا جہاں سے مجھے زیر زمین راستے سے ہی واپس تھانے لے جایا گیا۔

تھانے میں پھر سے رسمی سی پوچھ گچھ ہوئی اس کے بعد مجھے کہا گیا کہ مجھے بیڈ فورڈ جیل

لے جایا جا رہا ہے۔ سہ پہر کو مجھے ایک کار میں بٹھا کر اور مزید دو پولیس کاروں کی گارد میں تقریباً تیس کلو میٹر دور بیڈ فورڈ جیل پہنچایا گیا۔ جیل والوں کو شاید پہلے ہی اطلاع دی گئی تھی کہ ایک خطرناک قیدی آ رہا ہے اس لئے جیل کا سربراہ (جسے گورنر کہا جاتا ہے) بھی وہاں استقبالیہ کے پاس ہی کھڑا تھا۔ پولیس گاڑی میں میرے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک شکل سے آئرش نظر آ رہا تھا۔ جس نے دورانِ سفر مجھ سے کچھ ہمدردانہ سے لہجے میں باتیں کی تھیں۔ استقبالیہ پر متعین آفیسر نے مجھ سے دوسرے کوائف پوچھنے کے بعد میری قومیت پوچھی۔ میں نے کہا کشمیری۔ اس نے کہا کشمیری کوئی قوم نہیں ہے۔ تم یا پاکستانی ہو سکتے ہو یا بھارتی۔ میں نے کہا میں نہ پاکستانی ہوں نہ ہندوستانی میں صرف کشمیری ہوں۔ اس پر ہماری بحث خاصی طول پکڑ گئی تو میرے ساتھ میری ہتھکڑی پکڑے ہوئے کھڑے اس آئرش پولیس والے نے استقبالیہ آفیسر سے مخاطب ہو کر کہا آفیسر! آپ ضد کیوں کر رہے ہیں۔ مسٹر خان تو اپنا قومی تشخص منوانے کی کوششوں کی پاداش میں ہی یہاں جیل پہنچا ہے یہ کیسے تسلیم کرے گا کہ اس کا اپنا کوئی قومی تشخص نہیں یا وہ بھارتی یا پاکستانی ہے۔ اس پر جیل کے افسر نے مجھ سے پوچھا تمھارے پاس کس ملک کا پاسپورٹ ہے میں نے کہا پاکستانی - چنانچہ اس نے متعلقہ کالم میں پاکستانی پاسپورٹ ہولڈر کشمیری لکھ دیا۔ اس کاغذی کارروائی کے بعد مجھے اوپر لے جایا گیا جہاں کچھ اور کاغذی کارروائی کے بعد مجھے میرا جیل نمبر جو N 40837 تھا الاٹ کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ میں اپنی خط و کتابت میں یہ نمبر ضرور درج کروں (یہ نمبر مجھے 23 ستمبر 1986ء کو عدالت سے میری بریّت تک الاٹ رہا) نمبر الاٹ کرنے کے بعد مجھے جیل کے کپڑے اور صابن تولیہ دے کر کہا گیا کہ میں غسل خانے میں جا کر نہاؤں اور جیل کے کپڑے پہنوں۔ اس کے بعد مجھے لے جا کر ایک سیل میں ڈالا گیا سیل میں دیواروں پر بالکل ننگی عورتوں کی تصویریں اور الماری میں فحش رسالے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک وارڈر جسے وہاں پرزن آفیسر (Prison officer) کہتے ہیں کو بلا کر کہا کہ وہ ان تصویروں اور رسالوں کو وہاں سے لے جائے۔ وہ میری طرف حیرانگی سے دیکھنے لگا اور عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ تصویریں اور رسالے لے کر باہر چلا گیا۔ دراصل وہاں اس قسم کی چیزیں پاس رکھنا معیوب نہیں بلکہ ایسی چیزیں اپنے پاس رکھنے والوں کو زندہ دل کہا جاتا ہے۔

میری گرفتاری کی خبر مقامی ریڈیو سٹیشن سے کئی بار نشر ہوئی تھی اور جیل میں ہر قیدی کے پاس ریڈیو ہوتا ہے۔ کسی پرزن آفیسر نے کسی قیدی سے کہا کہ دہشت پسند خان یہاں اور اس سیل میں ہے چنانچہ کھانا کھانے کے بعد پیشاب وغیرہ کے لئے باہر نکلنے کے دوران میرے سیل کے سامنے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو گئی اور مجھ پر طرح طرح کے تبصرے ہونے لگے۔ کسی نے کہا یہ تو دہشت پسند معلوم ہی نہیں ہوتا۔ کسی نے مجھے شاباش دیتے ہوئے (V) کا نشان بنایا۔ وغیرہ وغیرہ

دوسرے دن صبح ہی جیل کا پادری آیا۔ میرے ساتھ سرسری سی گپ شپ کے بعد کہنے لگا آپ ایک لکھے پڑھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میں آپ سے اسلام کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا میں کوئی مذہبی عالم تو نہیں البتہ جو کچھ مجھے معلوم ہے مجھے آپ کو بتانے میں خوشی ہو گی۔ اس کے بعد میں نے اسے اسلام کی بنیادی تعلیمات ' عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات میں یکسانیت والے پہلوؤں' اور اختلافات والے پہلوؤں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظریہ' واحدانیت' اسلام کے معاشی اور سماجی نظام اور اسلام کے نظریہ سزا وجزا وغیرہ کے بارے میں چیدہ چیدہ باتیں بتائیں۔ وہ غور سے سنتا رہا۔ آخر میں کہنے لگا میں جیل کے مولوی سے بھی کبھی کبھی اسلام کے بارے پوچھتا رہا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے اس کی معلومات انتہائی محدود ہیں۔ اس نے اسلام کی وضاحت اس طرح کبھی نہیں کی۔ میں نے کہا بدقسمتی سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین مسلسل ٹکراؤ رہا ہے۔ ایک زمانے میں اسلام انڈونیشیا سے مشرقی یورپ اور سپین تک چھایا ہوا تھا۔ اس کے بعد عیسائی غالب آگئے اور انہوں نے تقریباً پورے عالم اسلام پر قبضہ کر لیا اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں عیسائی حکمرانوں اور مذہبی لیڈروں نے اپنے عوام میں اسلام کو وحشیوں ' قاتلوں ' ظالموں اور احمقوں کے مذہب کے طور پر پیش کیا جس کا اثر مغرب میں اب بھی موجود ہے چنانچہ مغرب کا عام انسان آج بھی اسلام اور مسلمانوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ پادری نے میرے موقف سے اتفاق کیا اور پھر مل کر مزید تبادلہ خیال کرنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں پائے جانے والے اس غلط تاثر کو اپنے طرز عمل ' کردار ' اخلاق اور تبادلہ خیال کے ذریعہ ختم کرنے کی مقدور بھر کوشش کروں۔ چنانچہ اپنی پندرہ ماہ کی اسیری کے دوران میں نے اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے بلکہ نمایاں کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس طرز عمل سے مجھے سکون قلب ملنے کے علاوہ اپنی انفرادیت کا بھی احساس ہوا۔

میں نے گشت پر آئے ہوئے گورنر کو بتایا کہ میں مسلمان ہوں۔ سور کا گوشت اور اس کی چربی میں پکے ہوئے سالن نہیں کھاتا اس لئے میرے لئے یا تو باہر سے کھانا منگانے کی اجازت دی جائے یا جیل میں ہی الگ کھانا بنایا جائے۔ چنانچہ اس نے اسی وقت وارڈر سے کہا کہ خان کو خالی ابلی ہوئی سبزی اور ڈبل روٹی دی جائے۔ میں نے نماز پڑھنے کے لئے بھی کچھ سہولتیں حاصل کیں حالانکہ میں جیل سے باہر باقاعدگی سے نماز نہیں پڑھتا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جیل میں لکھنے پڑھنے کی بھی اجازت ہے چنانچہ میں نے دوسرے دن باہر سے کاغذ قلم منگوائے اور لکھنا شروع کیا۔

بیڈ فورڈ جیل میں میرا غالباً چوتھا دن تھا کہ ایک وارڈر نے آکر مجھے کہا کہ میں اپنا سامان

ساتھ لے کر باہر آؤں۔ وہ مجھے دفتر لے گیا جہاں مجھے بتایا گیا کہ مجھے بیڈ فورڈ جیل سے باہر لے جایا جا رہا ہے۔ باہر تین پولیس گاڑیاں کھڑی تھیں چنانچہ وہ مجھے لے کر بڑی شاہراہ (M1) کی طرف روانہ ہو گئیں۔ میں سمجھا شاید مجھے ملک بدر کرنے کے لئے ایئرپورٹ لے جایا جا رہا ہے۔ مجھے یہ خیال اس لئے آیا کہ لیوٹن پولیس سٹیشن پر پوچھ گچھ کے دوران ایک بار ایک افسر نے غیر رسمی طور پر مجھ سے پوچھا تھا کہ اگر تم پر مقدمہ چلانے کی بجائے تمہیں ملک بدر کیا جائے تو کیا تم اس پر راضی ہو جاؤ گے میں نے جواب دیا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ میں عدالت سے بری ہو جاؤں گا۔ اس لئے ملک بدری قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بہرحال جب ہم ایم ون پر پہنچے اور پولیس گاڑیاں جنوب کی بجائے شمال کی طرف مڑیں تو میں سمجھ گیا کہ مجھے لندن ایئرپورٹ نہیں کہیں اور لے جایا جا رہا ہے۔ کوئی دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لیسٹر جیل پہنچے۔ لیسٹر کا ہائی سیکیورٹی (High Security) جیل برطانیہ کے سخت ترین جیلوں میں سے ایک ہے اور یہاں انتہائی خطرناک قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔ اس کے حفاظتی انتظامات دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے مجھے استقبالیہ کے ساتھ ہی ایک سیل میں ڈالا گیا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد ایک وارڈر کھانا لے آیا۔ میں نے اسے کہا میں مسلمان ہوں یہ کھانا نہیں کھاتا۔ اس نے گندی سی نسلی گالی دے کر کہا میں اس قسم کی کوئی بکواس سننے کے لئے تیار نہیں اور کھانا وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور وارڈر آیا اس نے بھی انتہائی کرخت انداز میں پوچھا کہ کھانا کیوں نہیں کھایا۔ میں نے کہا میں مسلمان ہوں یہ کھانا نہیں کھاتا۔ وہ بھی دوچار سنا کر چلا گیا۔ (ابتدا ہی میں قیدیوں سے یہ برتاؤ وہاں قصداً کیا جاتا ہے تاکہ اس پر نفسیاتی اثر پڑے۔) اس کے بعد دو اور وارڈر آ گئے اور مجھے ایک راہداری میں لے گئے اور سارے کپڑے اتارنے کے لئے کہا۔ میں نے کہا میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کہنے لگے یہ یہاں کا قانون ہے۔ میں نے کہا یہ اخلاقی قدروں کے خلاف ہے دونوں کچھ شریف سے انسان نظر آتے تھے کہنے لگے خود ہمیں قیدیوں سے ایسا کرنے کے لئے کہتے ہوئے کوفت ہوتی ہے لیکن یہ ایک ہائی سیکیورٹی جیل ہے۔ یہاں ایسا کرنا ضروری ہے۔ اس دوران ایک انگریز قیدی بھی دوسری راہداری کی طرف گیا اور سارے کپڑے اتار کر بالکل ننگا کھڑا ہو گیا اور اس کے بعد پھر کپڑے پہنے۔ بہرحال مجبوراً مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑا لیکن مجھے اس بے شرمی سے شدید کوفت ہوئی۔ اس کارروائی کے بعد وارڈروں نے ریڈیو پر کسی سے بات کی اور باہر کی طرف چل دیئے۔ دروازے پر ایک وارڈر شیر کی قد کا ایک کتا ساتھ لئے کھڑا تھا۔ میں کتے کو دیکھ کر ہی ڈر گیا لیکن ذاتی خودداری نے مجھے اس کے اظہار کی اجازت نہیں دی بہرحال کتے والا کتے کو لے کر ہمارے ساتھ چلتا رہا۔ یہ انتظام میری طرف سے کسی قسم کے تشدد کے احتمال کے علاج کے طور پر کیا گیا تھا۔ مجھے ان شریف وارڈروں نے بتایا کہ مجھے اے کیٹیگری (A-Catagory) یعنی انتہائی خطرناک دہشت پسندوں

کے لئے مخصوص کلاس الاٹ کی گئی ہے چنانچہ جب بھی میں اپنی سیل سے نکل کر باہر چہل قدمی (ورزش) کروں۔ کپڑے بدلنے جاؤں۔ نہانے جاؤں۔ استقبالیہ کی طرف جاؤں یا ہسپتال کی طرف جاؤں کتا میرے ساتھ ساتھ رہے گا اور اگلے پورے تیرہ ماہ تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ بلکہ جب میری بیوی اور بچی ملاقات کے لئے آتیں تو وہ بھی کتے کو دیکھ کر ڈر جاتیں مجھے جس سیل میں ڈالا گیا وہاں بھی فحش رسالے اور عورتوں کی ننگی تصویریں تھیں جو میں نے باہر دالان کی طرف پھینک دیں۔ شام کا کھانا پانچ بجے ملتا تھا۔ چنانچہ مجھے سیل سے باہر نکالا گیا اور دس بارہ افراد کی ایک لائن میں کھڑا کر دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب اے کیٹیگری والے ہیں۔ میں نے وارڈر سے کہا کہ میں مسلمان ہوں یہ کھانا نہیں کھاتا۔ اس نے کہا کہ اس کے لئے تم کل صبح گورنر کو درخواست دو۔ چنانچہ میں نے شام کو بھی کھانا نہیں کھایا رات کو درخواست لکھ کر صبح وارڈر کو دے دی تو اس نے کہا اس درخواست کے لئے ایک فارم ملتا ہے اور فارم والا آفیسر صبح سویرے آکر چلا گیا اب تمھیں کل صبح تک صبر کرنا ہو گا۔ میں نے کہا میں نے تو کل صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ اس نے کہا اس بارے میں میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تم اگر کھانا نہیں کھاتے تو بن لے کر کھاؤ۔ کھانے کے ساتھ چھوٹا سا ایک بن بھی ملتا ہے۔ چنانچہ میں نے بن لے کر پانی کے ساتھ کھایا۔ دوسری صبح کو میں نے فارم والے آفیسر کو آواز دی۔ اس نے آکر میری بات نوٹ تو کی لیکن کہنے لگا سبزی خوروں کے کھانے کی منظوری میں دو تین دن لگ جائیں گے۔ میں نے کہا میں دو دن سے صرف ایک بن کھا رہا ہوں۔ اس نے کہا میں کچھ نہیں کر سکتا اور چلا گیا چنانچہ میرا تیسرا دن بھی ایسے ہی گزرا۔ اگلی صبح تک میں بھوک سے نڈھال ہو گیا تھا۔ جا کر لائن میں کھڑا ہو گیا اور قیدیوں کا عام کھانا لے کر آگے بن والے کے پاس گیا اور اس سے کہا میں یہ کھانا نہیں کھاتا اس کے بدلے تم مجھے دو بن دے دو۔ اس نے ڈانٹنے کے انداز میں انکار کیا تو میں نے شور مچایا کہ تم لوگ انسان ہو یا جانور۔ میں چار دن سے صرف ایک بن اور وہ بھی پانی کے ساتھ کھا رہا ہوں اور تم مجھے دوسرا بن دینے سے انکار کرتے ہو اور وہ بھی اس لہجے میں۔ اس نے پھر بدتمیزی کی تو میں نے بھی اونچی آواز میں اس کا جواب دیا۔ شور سُن کر دو وارڈر مجھے پکڑ کر سیل میں لے گئے۔ اتنے میں ونگ انچارج بھی پہنچ گیا۔ اس نے مجھ سے شور کی وجہ پوچھی۔ میں نے تفصیلات بتائیں چنانچہ اس نے اسی وقت میرے لئے سبزی خوروں کے کھانے کی منظوری دے دی۔ اس طرح چوتھے دن مجھے کھانا ملا۔

برطانیہ میں عام قیدیوں کا کھانا برصغیر کے اونچے متوسط درجے کے لوگوں کے کھانے سے بھی اونچے معیار کا ہوتا ہے۔ سات آئٹمز (Items) میں سے کوئی سے چار چننے ہوتے ہیں۔ گوشت (سور کا) ہفتے میں پانچ دن اور مچھلی دو دن ملتی ہے۔ فروٹ اور سلاد ہفتے میں دو دو دن اور پوڈنگ تین دن۔ لیکن سبزی خوروں کو سبزی اور پھلوں پر ہی قناعت کرنی ہوتی ہے۔ سبزی

خور یہودی ہندو اور مسلمان ہوتے ہیں۔ یہودی تو کوئی بھی سور کا گوشت نہیں کھاتا۔ اکثر ہندو اور بہت سے مسلمان (خاص کر ترک اور عرب) سور کا گوشت مزے سے کھاتے ہیں۔ میں نے برصغیر کے کچھ مسلمانوں کو بھی سور کا گوشت اور سور کی چربی میں پکے ہوئے سالن کھاتے دیکھا تو بڑا دکھ ہوا۔ بہرحال برصغیر کے اکثر مسلمان اس سے پرہیز ہی کرتے تھے۔

مجھے لیسٹر جیل آئے کوئی ایک ہفتہ ہوا تھا کہ ایک دن میں نے کسی کام کے لئے کال بیل (Call-bell) بجائی۔ کافی دیر کے بعد ایک وارڈر آیا۔ اس وارڈر کے بارے میں مجھے پہلے ہی اندازہ ہوا تھا کہ سخت قسم کا نسل پرست ہے اور ایشیائیوں سے سخت نفرت کرتا ہے۔ اس نے دروازے کی کھڑکی سے اندر جھانکتے ہوئے ایک نسلی گالی دے کر مجھ سے پوچھا کیا بات ہے۔ میں نے اسے کہا شٹ - اپ (Shut-up) تم نے مجھے گالی کیوں دی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آیا اور مجھے مارنے کے انداز میں کھڑا ہو گیا قد میں وہ بھی چھوٹا سا تھا۔ میں نے بھی مکا تانتے ہوئے کہا تم نے مجھے یہ نسلی گالی کیوں دی (برطانیہ میں نسلی گالی دینا قانوناً منع ہے) میں نے اس سے یہ بات اونچی آواز میں کی۔ باہر سے ایک سینئر آفیسر کا گذر ہوا تو شور سن کر اس نے اندر جھانکا۔ مجھ سے پوچھنے لگا کیا بات ہے۔ میں نے کہا اس نے مجھے نسلی گالی دی ہے۔ اس نے وارڈر کو باہر جانے کے لئے کہا اور مجھ سے کہنے لگا۔ اب اس مسئلے کو بھول جائیں۔ میں نے کہا میں آج ہی ہوم سیکرٹری کو خط لکھ رہا ہوں۔ اس نے کہا آپ کو خط لکھنے کا پورا حق حاصل ہے لیکن اس سے یہاں کی فضا آپ کے خلاف ہو جائے گی جو خود آپ کے لئے اچھا نہیں بہرحال اس نے بڑی ڈپلومیسی سے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ چند ماہ بعد اس وارڈر نے ایک اور وارڈر سے مل کر مجھ سے پھر بدتمیزی کی بلکہ اب کے میری بڑی تضحیک کی تو میں نے اونچی آواز میں اسے خوب سنائیں۔ اتفاق سے جیل کا گورنر سامنے والی لائن میں تھا۔ اس نے میرا شور سنا تو ادھر چلا آیا۔ ان چند ماہ کے دوران بہت سی وجوہات کی بنا پر مجھے جیل میں خاصی اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور ان میں سب سے بڑی وجہ ممبران پارلیمنٹ کی طرف سے مجھے ملنے والے خطوط تھے۔ علاوہ ازیں میں نے جیل میں کتاب لکھی تھی اس کا بھی خاصا چرچا ہوا۔ پریس میں مجھ سے متعلق خبریں شائع ہوتی تھیں اور ایک اہم وجہ خود میرا طرز عمل تھا۔ میں نے دوسرے قیدیوں کی طرح کبھی چھچھورے پن کا مظاہرہ نہیں کیا تھا نہ ہی بلاوجہ کسی سے لڑتا تھا۔ میری گفتگو بھی خود وہاں کے افسروں کے بقول بڑی مہذب تھی۔ چنانچہ بجز چند نسل پرست وارڈروں کے سب میرا احترام کرتے تھے۔

میں نے جب گورنر کو اپنے شور کی وجہ بتائی تو اس نے معافی مانگی میرے سامنے تو ان وارڈروں کو کچھ نہیں کہا لیکن اس کے بعد ان دو وارڈروں کی ڈیوٹی میرے علاقے میں کبھی نہیں لگی۔

مجھے لیسٹر جیل میں آئے چند دن ہوئے تھے کہ ورزش کے دوران ایک قیدی نے مجھے

بتایا کہ جیل کی لائبریری میں اچھی کتابیں ہیں۔ چنانچہ دوسرے دن میری درخواست پر مجھے لائبریری لے جایا گیا۔ میں نے وہاں دیکھا کہ بھارت سے متعلق وہاں درجنوں کتابیں ہیں ان میں ہندی کتابیں بھی تھیں اور انگریزی بھی۔ مہاتماگاندھی جی کی انگریزی زبان میں تین سوانح عمریاں تھیں۔ پاکستان سے متعلق ایک کتاب بھی نہیں تھی۔ اردو میں بھی چند ناولوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے عظیم ہستیوں کی سوانح عمریاں لے لیں اور ایک ہفتے میں سب پڑھ ڈالیں۔ لیسٹر جیل میں آٹھ ماہ کی اسیری کے دوران میں نے درجنوں اچھی کتابیں پڑھیں - کچھ کتابیں گورنر کے کہنے پر لائبریرین نے شہر کی بڑی لائبریری سے منگا کر مجھے دیں۔ چنانچہ اسیری کے دوران عظیم ہستیوں - تاریخ اور بین الاقوامی تعلقات (جو میرے پسندیدہ مضامین رہے ہیں) کے بارے میں میری معلومات میں خاصا اضافہ ہو گیا۔

میں نے 1983ء میں نظریۂ خود مختار کشمیر کے عنوان سے سوال جواب کی شکل میں ایک کتاب لکھی تھی۔ بعد میں میں نے محسوس کیا کہ اس میں سب سے اہم سوال (خود مختار کشمیر سے خود کشمیریوں کو کیا فائدہ ہو گا) کا جواب بہت ہی مختصر دیا تھا۔ چنانچہ میں نے تہیہ کیا تھا کہ فرصت ملتے ہی صرف اس عنوان پر ایک کتاب لکھوں۔ لیکن دو سوا دو سال تک لبریشن فرنٹ سے متعلق معاملات خاص کر اندرونی بحرانوں نے مجھے ایسا کرنے نہیں دیا۔ اور اب میں' بدترین حالات سے بہترین استفادہ کرو' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اس 'فرصت' سے استفادہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے بیڈ فورڈ جیل میں ہی کتاب لکھنی شروع کی۔ لیکن وہاں سے چند دن بعد ہی لیسٹر جیل لایا گیا۔ لیسٹر جیل پہنچنے کے ہفتہ دس دن بعد ہی میں نے کتاب لکھنی شروع کی۔ موڈ بھی مناسب تھا۔ چنانچہ تقریباً تین ہفتوں میں کتاب کا مسودہ تیار ہو گیا۔ گورنر راؤنڈ پر آیا تو میں نے اس سے کہا کہ میں نے کتاب لکھی ہے اور اسے شائع کرانا ہے اس سلسلے میں آپ کے ہاں طریقہ کیا ہے۔ اس نے کہا کم از کم میری ملازمت کے دوران کسی قیدی نے کتاب نہیں لکھی اس لئے مجھے طریقہ کار کا علم نہیں۔ میں ہوم آفس سے پوچھ لوں گا۔ دوسرے دن اس نے آ کر مجھے بتایا کہ آپ مسودہ مجھے دے دیں ہم اس کا انگریزی میں ترجمہ کرا کر فیصلہ کریں گے کہ اسے شائع کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ میں نے گورنر ہی کی تجویز پر مسودے کی تین فوٹو سٹیٹ کاپیاں کرائیں اور ایک اسے دے دی۔ تین ماہ بعد مجھے اطلاع دی گئی کہ اسے شائع کیا جا سکتا ہے چنانچہ میں نے مسودہ گورنر ہی کے ذریعہ باہر افضل جاتلوی صاحب کو بھیج دیا اور کتابچہ "خود مختار کشمیر کیوں" کے عنوان سے اگست 1986ء میں حکایت پریس لاہور سے شائع ہوا۔ اور اس نے نظریۂ خود مختار کشمیر کو کشمیری نوجوان میں مقبول کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

لیسٹر میں کوئی ایک ماہ کے قریب ہوا تھا۔ ایک دن شام کو پیشاب وغیرہ کے لئے سیل

سے باہر آیا تو دیکھا وہاں چار سکھ کھڑے ہیں۔ مجھے اخبار سے معلوم ہوا تھا کہ راجیو گاندھی کی برطانیہ آمد سے پہلے خالصتان تحریک کے حامی کچھ سکھ گرفتار ہوئے ہیں۔ میں نے ان کے نزدیک پہنچ کر مسکراتے ہوئے خالصتان زندہ باد' کہا تو وہ حیران سے ہوئے۔ ایک نے مجھ سے پوچھا آپ کشمیر لبریشن فرنٹ کے امان اللہ خان تو نہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ اس پر چاروں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہ کچھ پریشان سے تھے میں نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ دوسرے دن دوپہر کو ایک سینئر آفیسر میرے پاس آیا اس نے کہا مسٹر خان اگر آپ برا نہ مانیں تو سردار صاحبان کو جیل رولز کے بارے میں ذرا تفصیلات بتائیں۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ چنانچہ ان چاروں کو ایک ہی سیل میں جمع کیا گیا۔ اور میں نے تھوڑی دیر تو انہیں جیل رولز بتائے اس کے بعد ہم دیر تک خالصتان اور خود مختار کشمیر پر بحث کرتے رہے۔ ان میں سے ایک تو عام سا انسان تھا جو چند دن کے بعد ضمانت پر رہا ہو گیا البتہ تین بہت جذباتی اور کٹر خالصتانی تھے۔ چند دن کے بعد ان لوگوں کو دوسرے ونگ میں شفٹ کیا گیا۔ غالباً ان کو میرے والے ونگ میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ البتہ ورزش کے وقت ہم ملتے اور گپ شپ ہوتی۔ میری لیسٹر جیل سے منتقلی کے چند ماہ بعد میں نے اخبار میں پڑھا کہ تینوں کو لمبی سزائیں دی گئیں۔

جیل میں پشاور کا ایک نوجوان شہزاد اورکزئی اور آزاد کشمیر کا محمد رؤف بھی تھے۔ دونوں عام کلاس میں تھے گو دونوں پر قتل کا الزام تھا۔ ان دونوں نے ابتدائی دنوں میں اور بعد میں بھی بڑی حوصلہ افزائی اور مدد کی۔ دونوں کو بعد میں عمر قید کی سزا ہوئی۔

ایک دن صبح سویرے میں نے محسوس کیا کہ میری نبض ہر دو سیکنڈ کے بعد ایک سیکنڈ کے لئے بند ہو جاتی ہے میں نے اس کی اطلاع ڈیوٹی آفیسر کو دے دی تو وہ مجھے نیچے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے میری نبض دیکھنے کے بعد چیف میڈیکل آفیسر کو فون کیا اور مجھے جیل کے ہسپتال بھیج دیا۔ ہسپتال کی چیف میڈیکل آفیسر ایک لیڈی ڈاکٹر (Dr Penta) نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی ایکسرے والے کو ہدایات دی تھیں چنانچہ فوراً ہی میرا ایکسرے لیا گیا اور مجھے ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ دوسرے دن صبح مجھے ڈاکٹر پینٹا نے بتایا کہ باہر سے ایک ماہر ڈاکٹر (Consultant) میرے تفصیلی معائنے کے لئے آ رہا ہے۔ ماہر نے میرا تفصیلی معائنہ کیا اور مجھے سگریٹ کم کرنے کی ہدایت کرنے کے علاوہ ڈاکٹر پینٹا کو تحریری رپورٹ بھی دی چند دن کے بعد مجھے ڈاکٹر پینٹا نے بتایا کہ میرے مزید اور تفصیلی طبی معائنے کے لئے مجھے باہر شہر کے جدید ترین ہسپتال بھیجا جا رہا ہے۔ چنانچہ مجھے ایک پولیس گاڑی میں جس کے آگے پیچھے پولیس کی ایک ایک کار بھی تھی باہر لے جایا گیا۔ حسب معمول سائرن بجتا رہا۔ ہسپتال پہنچے تو دیکھا سارے ہسپتال کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا ہے اور لوگوں کو استقبالیہ اور راہداری سے بھی ہٹا دیا گیا ہے۔ مجھے گاڑی سے اتارتے ہی پولیس نے اپنے گھیرے میں لے کر دوڑتے ہوئے اندر ایک

کمرے میں پہنچایا جہاں دو نرسیں انجکشن لئے تیار کھڑی تھیں۔ وہ پولیس کے اس انتظام دوڑ دھوپ - سائرن وغیرہ کی وجہ سے بہت نروس (Nervous) ہو گئی تھیں اور تھرا رہی تھیں۔ غالباً وہ مجھے ایک غیر معمولی دہشت گرد تصور کرتی تھیں۔ انجکشن لگاتے ہوئے بھی نرس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا سسٹر میں کوئی جن نہیں انسان ہوں اور وہ بھی مہذب قسم کا میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا۔ آرام سے انجکشن لگاؤ ایسا نہ ہو کہ سوئی میرے جسم کے اندر ہی ٹوٹ جائے۔ میں نے اس سے چند مذاق بھی کئے اور اس کی خوبصورتی کی بھی تعریف کی (واقعی وہ بہت خوبصورت تھی) تب جا کر اس کے اوسان بحال ہوئے اور اس نے انجکشن لگایا۔
اس انجکشن کے تین گھنٹے کے بعد میری سکیننگ (Scanning) ہونی تھی۔ چنانچہ انجکشن لگنے کے بعد مجھے جیل واپس لایا گیا اور تین گھنٹے بعد اسی طرح کے پولیس انتظامات کے تحت ہسپتال لے جایا گیا جہاں میری سکیننگ ہوئی۔ یہ سکیننگ شاید اطمینان بخش نہیں تھی چنانچہ ایک ہفتہ بعد پھر ہوئی۔ اس کے ایک ہفتہ بعد مجھے گرابی روڈ ہسپتال بھیجا گیا جہاں دل اور پھیپھڑوں کے آپریشن ہوتے ہیں۔ وہاں مجھے بے ہوش کر کے میرے منہ میں ایک نالی ڈال کر میرے پھیپھڑے کا ایک ٹکڑا نکالا گیا اور اسے کیمیائی تجزیے کے لئے بھیجا گیا۔ اس دوران جیل کے ہسپتال میں مریضوں کی تعداد گنجائش سے زیادہ ہو گئی تھی اس لئے مجھے واپس میری کوٹھری میں بھیجا گیا۔

ایک دن صبح سویرے میرے منہ سے خون آیا میں نے وارڈر کو بلایا جو مجھے نیچے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس وقت ڈیوٹی پر ایک بھارتی نژاد ڈاکٹر تھا۔ اسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم تھا اور اکثر مجھ سے الجھ جاتا تھا۔ میں نے اسے کہا میرے منہ سے خون آیا ہے۔ اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا کیوں بہانے بناتے ہو دانت سے آیا ہو گا۔ جاؤ کوٹھڑی میں جا کر آرام کرو۔ میں نے کہا ڈاکٹر! خون میرے دانتوں سے نہیں اندر سے آیا ہے۔ وہ پھر بھی منہ بنائے ٹال مٹول کرتا رہا۔ اتنے میں اُدھر سے دوسرے (انگریز) ڈاکٹر کا گزر ہوا۔ میں نے اسے آواز دی اور کہا کہ میرے منہ سے خون آ رہا ہے اور یہ ڈاکٹر توجہ نہیں دے رہا۔ اس نے مجھے کھانسنے کو کہا۔ میں زور سے کھانسا تو خون سے میرے ہاتھ میں رکھا ہوا ٹیشو پیپر سرخ ہو گیا۔ انگریز ڈاکٹر نے بھارتی ڈاکٹر کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ اس سے میری فائل لے لی۔ اور مجھے ساتھ لے کر اپنے دفتر کی طرف گیا۔ جہاں سے اس نے ہسپتال فون کر کے مجھے ہسپتال منتقل کر دیا۔ لیسٹر جیل میں اپنے قیام کا باقی عرصہ میں نے ہسپتال میں ہی گزارا۔

گرابی روڈ ہسپتال والوں نے میری رپورٹ کوئی دو ہفتے بعد بھیجی۔ ایک دن ڈاکٹر مہیشا نے مجھے اپنے دفتر بلایا۔ میری خیریت پوچھی اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد نگاہیں نیچی کر کے کہنے لگی۔ مسٹر خان مجھے افسوس ہے کہ آپ کی میڈیکل رپورٹ کوئی حوصلہ افزا نہیں ہے۔ اس نے میڈیکل کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کوئی بات کی جو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کہا

ڈاکٹر آپ ذرا عام فہم زبان میں بات کریں کیا مجھے پھیپھڑے کا کینسر ہے۔ ڈاکٹر نے نظریں نیچی کئے ہوئے کہا مسٹر خان مجھے انتہائی افسوس ہے میں آپ کے اس سوال کا جواب اثبات میں دینے پر مجبور ہوں۔ مجھے ایک لمحے کے لئے تو بڑا شاک ہوا لیکن فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اُدھر ڈاکٹر پیشا نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر ہی مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ میں نے کہا ڈاکٹر پیشا آپ نے میرے لئے اب تک جو کچھ کیا ہے اس کے لئے آپ کا انتہائی مشکور ہوں۔ بہرحال انسان کو کسی نہ کسی دن مرنا ہے۔ دیر سے نہ سہی جلدی سہی۔ مجھے آپ صرف یہ بتائیں کہ یہ کینسر ناقابل علاج مرحلے پر تو نہیں پہنچا ہے۔ کہنے لگی خوش قسمتی سے نہیں۔ ہاں اگر اس کا فوراً آپریشن نہ ہوا تو چند ماہ میں یہ ناقابل علاج ہو سکتا ہے۔ بہرحال میں نے پورا انتظام کیا ہے۔ کیا آپ آپریشن کے لئے تیار ہیں۔ میں نے کہا بالکل - اس کے بعد اس نے مجھ سے ایک دستاویز پر دستخط لئے اور دروازے تک آ کر مجھے اوپر سیل کی طرف بھیج دیا۔ میں نے سیل میں جا کر خاصے سوچ بچار کے بعد وصیت ناموں کی صورت میں لبریشن فرنٹ کے قائم مقام سربراہ افضل جاتلوی۔ اپنے بھانجے ڈاکٹر محبوب عالم - اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کے نام خط لکھے۔ ڈاکٹر محبوب کے نام خط غلطی سے پوسٹ ہو گیا۔ باقی خط اپنے پاس رکھے۔

دوسرے دن افضل جاتلوی صاحب ملاقات کے لئے آ گئے تو میں نے اس صورت حال سے انہیں آگاہ کیا اور ساتھ ہی تاکید کی کہ فی الحال وہ میری اہلیہ کو اس بارے میں کچھ نہ بتائے۔ افضل صاحب نے بے صبری سے میری بیوی کو فون کیا اور ساری صورت حال بتا دی۔ دوسری صبح کو میری اہلیہ انتہائی پریشانی کی حالت میں جیل پہنچ گئی۔ میں نے اسے دلاسا دیا کہ کوئی قابل تشویش بات نہیں اگلے دن ملک لطیف، راجہ ظفر اور غالباً حاجی منظور پہنچے اور ملاقات کے دوران ہی مجھ سے لپٹ کر بچوں کی طرح رونے لگے۔ میں نے انہیں بھی دلاسہ دیا۔ اگلے دن شبیر چوہدری، چوہدری صدیق اور غالباً چوہدری رحمان بھی پہنچے۔

27 فروری 1986ء کو مجھے حسب معمول بھاری گارد میں گرابی روڈ ہسپتال پہنچایا گیا۔ ہسپتال میں بھی مجھ پر جیل والوں اور عام پولیس کا مشترکہ پہرہ تھا۔ دوسرے دن یعنی 28 فروری 1986ء کو صبح سویرے مجھے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ میں نے باہر ایک نظر ڈالی کیونکہ یہ میری زندگی کا آخری دن بھی ہو سکتا تھا بہرحال حوصلہ نہیں ہارا۔ اور ہشاش بشاش رہا۔ آپریشن ٹیبل پر لٹائے جانے کے بعد بھی میں ڈاکٹر اور نرسوں سے ہنس کر بات کرتا رہا میرا آپریشن برطانیہ کے مشہور سرجن ڈاکٹر بیلی کر رہے تھے۔ جیل کا ایک آفیسر آپریشن روم میں بھی موجود تھا۔ یہ سب میرے اس حوصلے پر خاصے حیران تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے انجکشن دیا گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو ہسپتال کے کمرے میں مشنری سے جکڑا ہوا تھا۔ مجھے ہوش آتے ہی ڈیوٹی والی جونیئر ڈاکٹر (اس کا نام بھی بیلی، مس بیلی تھا) نے مبارکباد دی۔ کہ آپریشن کامیاب ہو گیا اور یہ

آپریشن کوئی چار گھنٹے کا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر غنودگی چھا گئی۔ خاصی دیر کے بعد ہوش آیا تو مس بیلی نے کہا۔ شبیر چوہدری پہلے آپریشن روم کے باہر، پھر یہاں باہر دن بھر بیٹھا رہا۔ چار بجے کے قریب میری بیوی آئی - بچی بھی ساتھ تھی لیکن میں نے اسے کہا کہ بچی کو اندر مت لاؤ - مجھے اس حالت میں دیکھ کر شائد گھبرا جائے۔ بہرحال نرسوں نے بھی اسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔

میری بیوی کے جانے کے کوئی ایک گھنٹہ بعد میں نے محسوس کیا کہ میری نبض ست ہو گئی ہے۔ پیشاب بھی بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سانس بھی اکھڑنے لگی اور ہچکی لگنے لگی جیسے مرتے وقت لگتی ہے تو میں نے مس بیلی کو اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرا آخری وقت آگیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن پر میری موت کے تحریک آزادی، تنظیم اور میری بیوی اور بچی پر پڑنے والے ممکنہ اثرات چھا گئے اور دونوں آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ ساتھ ہی میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو ڈاکٹر مس بیلی سر پر کھڑی تھی۔ اس نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا مسٹر خان تم اب خطرے سے باہر ہو۔

دوسری صبح کو جیل کا ڈپٹی گورنر اور ایک سینئر افسر مجھے دیکھنے آئے میں نے مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا تو دونوں حیران ہو گئے۔ آفیسر نے کہا خان ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ آہ آہ کرتے ہوں گے اور آپ مسکرا رہے ہیں۔ مبارک ہو، سنا ہے آپریشن کامیاب ہو گیا ہے میں نے دونوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس دن میرے بے شمار کشمیری دوست مجھ سے ملنے دور دور شہروں سے آئے لیکن کسی کو ملنے کی اجازت نہیں ملی بلکہ میدان کی طرف والی کھڑکیوں پر کالے پردے ڈالے گئے۔ البتہ تیسرے دن نظامی صاحب اور عظمت خان جیل افسروں کی منتیں کر کے دو دو منٹ کے لئے اندر آنے میں کامیاب ہو گئے۔ شبیر چوہدری کو میرے پاس کافی دیر تک بیٹھنے کی اجازت ملی۔ چوتھے روز مجھے جیل منتقل کر دیا گیا۔ جہاں دس دن بعد ٹانکے کھولے گئے۔ اس دوران ایک فزیو تھراپسٹ (Physiothrapist) روز آکر مجھ سے ورزش کراتا رہا۔ ڈاکٹر بیلی بھی ایک بار آیا۔ گورنر اور دوسرے سینئر آفیسر آکر میری خیریت پوچھتے رہے۔ ڈاکٹر بیشا تو روز آکر کہتی مسٹر خان مجھے ایک مسکراہٹ دے دو - پھر کہتی پرواہ مت کرو تمہارا کشمیر ایک دن ضرور آزاد ہو جائے گا۔ یہ سب مجھے خوش رکھنے کے لئے اس کے نفسیاتی اقدامات تھے۔ ہسپتال کے دوسرے اسٹاف نے بھی میرا بہت خیال رکھا میں نے گرابی روڈ ہسپتال جانے سے پہلے اپنے وصیت نامے جیل کے ہسپتال کے آفس انچارج کو یہ کہہ کر دیئے تھے کہ اگر میں آپریشن کے دوران مرگیا تو انہیں پوسٹ کر دینا۔ واپس آیا تو واپس لے لوں گا۔ چنانچہ واپسی پر میں نے اس سے وہ خط واپس لے لئے۔

جیل میں ابتدائی تین ماہ تک بجز میری بیوی اور بچی کے کسی کو مجھ سے ملاقات کی

اجازت نہیں تھی۔ یہ اجازت وزیر داخلہ دیتا تھا جسے میں نے تقریباً پچاس افراد کے نام بھیجے تھے کہ انہیں مجھ سے ملنے کی اجازت دی جائے۔ تین ماہ بعد صرف بارہ افراد کو اجازت دی گئی۔ ابتدائی دور میں ہی ایک دن مجھے ملاقاتوں کے کمرے میں لایا گیا جہاں ایک صاحب بیٹھے تھے جنہیں میں نہیں جانتا تھا۔ انہوں نے اپنا تعارف ایم۔ ایچ۔ بٹ صدر پاکستان ایسوسی ایشن لیسٹر کی حیثیت سے کرایا۔ بعد میں کچھ دن میرے لئے کھانا بھی بھیجتے رہے۔ ایک دن پھر ملنے آئے اور مجھ سے سیاسی سوالات کرنے لگے۔ میں نے جواب دیئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ دوسری بار وہ بھارت کے ایک مشہور قومی اخبار کے نمائندے کے ایماء پر آئے تھے اور جب انہوں نے واپس جا کر میرے جوابوں کا خلاصہ بتایا تو اخبار والے نے اسے انٹرویو کی شکل دے کر اپنے اخبار میں شائع کرایا۔

مجھے ریمانڈ کے لئے ہر جمعرات کو جیل سے عدالت لے جایا جاتا تھا۔ عدالت جیل سے کوئی تین کلو میٹر دور تھی۔ اپنی سیل سے نکال کر مجھے استقبالیہ میں لایا جاتا۔ جہاں میرے ذاتی کپڑے پہننے کو دیئے جاتے۔ اس کے بعد دوسرے کچھ لوازمات کے بعد کتے کے زیر حفاظت جیل کے بڑے دروازے پر لایا جاتا وہاں ایک بڑی وین، دو کاریں اور ایک موٹر سائیکل میرے منتظر ہوتے مجھے ہتھکڑیاں لگا کر وین میں بٹھایا جاتا جس میں چھ وارڈر اور افسر بلیٹ پروف جیکٹ پہنے بیٹھ جاتے۔ ایک کار وین کے آگے اور ایک پیچھے ہوتی اور دونوں میں بلیٹ پروف جیکٹ پہنے پولیس والے ہوتے۔ موٹر سائیکل پر تیز پیلے رنگ کی جیکٹ پہنے ایک پولیس والا ہوتا جو آگے آگے ہوتا اور جیل کے بڑے دروازے سے نکلتے ہی سائرن بجانے لگتا۔ سائرن سے راستے کی ساری ٹریفک ایک طرف ہو جاتی اور ہماری یہ کانوائے ٹریفک سگنل توڑتی ہوئی تیزی سے عدالت کی طرف بھاگتی۔ پانچ سات منٹ کی اس "شاہی سواری" سے میں بہت محظوظ ہوتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی دوسرے ملک کا سربراہ حکومت جا رہا ہے۔ عدالت پہنچ کر مجھے چور دروازے سے اندر لے جایا جاتا۔ عدالت کی عمارت پر بھی مسلح پولیس پہرہ دیتی تھی۔ عدالت کی کارروائی صرف چند منٹ کی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود ہربار عدالت میں کشمیریوں خاص کر لبریشن فرنٹ کے ممبروں کی ایک کثیر تعداد موجود ہوتی۔ یہ لوگ دور دور سے آتے تھے۔ انہیں جامہ تلاشی کے بعد کمرہ عدالت میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی۔ میں ریمانڈ ملتے ہی واپسی پر اپنے ہموطنوں کو السلام علیکم کہنے کے بعد (V) کا نشان بنا کر انگریزی میں خود مختار کشمیر زندہ باد کا نعرہ لگاتا۔

جیل واپسی پر بھی میری "شاہی سواری" اسی شان سے جاتی۔

دراصل یہ سارے حفاظتی انتظامات آئی آر اے (شمالی آئرلینڈ کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کی جدوجہد کرنے والی تنظیم آئرش ریپبلکن آرمی) کے لئے ہوتے ہیں اور چونکہ مجھ

پر بھی دہشت گردی کا الزام لگایا گیا تھا اس لئے آئی اے آر والوں کے لئے مخصوص حفاظتی اقدامات کا اطلاق مجھ پر بھی ہوتا تھا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ نامناسب نہیں کہ اتنے سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود آئی آر اے والے کبھی جیل توڑ کر کے، کبھی جیل حکام پر قابو پا کر اور کبھی عدالت جاتے ہوئے فرار ہوتے رہے ہیں۔

غالبًا حکومت کی طرف سے پولیس پر مجھے ہر قیمت پر پھنسانے کا دباؤ تھا (اور مسز تھیچر کی حکومت اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے پولیس سے غلط کام لینے کے لئے مشہور تھی) چنانچہ برطانوی پولیس نے میرے بارے میں اپنی اعلیٰ روایات سے ہٹ کر برصغیر کی پولیس کے سے ہتھکنڈے بھی استعمال کئے۔ مثلاً اس نے برمنگھم میں چوہدری عبدالمجید کے ہاں سے ملنے والے دو پرانے پاکستانی پاسپورٹ اور ایک برٹش پاسپورٹ اور کہیں اور سے ملا ہوا ایک ہندوستانی پاسپورٹ میرے سامان میں ڈال دیئے اور میری بار بار تردید کے باوجود یہی کہتی رہی کہ یہ پاسپورٹ تمہارے ہاں سے ملے ہیں اور تم جعلی پاسپورٹوں کا کاروبار بھی کرتے ہو۔ یہاں تک کہ اس نے ابتداً مجسٹریٹ کی عدالت میں بھی یہی موقف اختیار کر کے میری ضمانت کی درخواست مسترد کرا دی۔ آخر سات ماہ بعد اس نے (کیوں کہ یہ مسئلہ برطانوی پارلیمنٹ میں اٹھنے والا تھا) تسلیم کیا کہ پاسپورٹ میرے ہاں سے نہیں چوہدری مجید کے ہاں سے ملے تھے۔

16 ستمبر کو مجھے لیسٹر جیل سے لیوٹن پولیس اسٹیشن (مزید پوچھ گچھ کے لئے) لایا گیا حسب معمول حفاظتی انتظامات بڑے سخت تھے۔ لیوٹن پولیس اسٹیشن کے گرد بھی بھاری تعداد میں پولیس کھڑی تھی۔ ہماری گاڑی چند منٹ کے لئے پولیس اسٹیشن کے باہر کھڑی رہی۔ اس اثناء میں گاڑی میں میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تین وارڈروں میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا۔ خان تم تو شریف سے آدمی معلوم ہوتے ہو، یہ کیا کام کیا ہے کہ تمہارے بارے میں اتنے سخت انتظامات ہیں۔ میں نے کہا مجھ پر الزام ہے کہ میں راجیو گاندھی کو قتل کرنا یا کرانا چاہتا تھا' وارڈوں نے اس کا ذکر پولیس والوں سے کیا تو پولیس نے میرے اس جواب کو توڑ مروڑ کر مجھ سے یہ بات منسوب کی کہ میں نے وارڈروں کے سامنے اقرار کیا تھا کہ میں راجیو گاندھی کو قتل کرنا یا کرانا چاہتا تھا اور تینوں وارڈروں کو استغاثہ کے گواہ بنا کر بعد میں عدالت میں پیش کیا تینوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ خان نے ان کے سامنے اقرار کیا تھا کہ وہ راجیو گاندھی کو قتل کرنا یا کروانا چاہتا تھا۔ لیکن عدالت میں میرے بیرسٹر نے اور میں نے ان کے اس سفید جھوٹ کے پرخچے اڑائے۔ میرے بیرسٹر نے ان سے ایسے ایسے سوال کئے جن کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ چنانچہ جیوری والے بھی پوری طرح سمجھ گئے کہ ساری کہانی گھڑی گئی ہے اور یہ جھوٹے لوگ عدالت میں بھی تماشا بن گئے۔

مجھ سے پوچھ گچھ کرنے والی پولیس ٹیم کا سربراہ مسٹر رابرٹ ولیم ڈارلس (Robert

(William Darts) ایک بہت اچھا آفیسر اور اچھا انسان تھا جب کہ اس کا نائب ما لکم والزورتھ (Malcom Wallsworth) اس کے بالکل برعکس۔ والز ورتھ مجھ سے بڑے طنزیہ سوال بھی کرتا رہا۔ ایک دن مجھے سنانے کے لئے مسٹر ڈارٹس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ڈارٹس کیا تمہیں معلوم ہے ہم انگریزوں نے ان کشمیریوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح چالیس پنس فی کس کے حساب سے بیچا تھا۔ (اس کا اشارہ معاہدۂ امرتسر کی طرف تھا) اس پر ڈارٹس نے اسے کہا کیا یہ تمہارے لئے کوئی فخر کی بات ہے کہ تمہاری قوم بردہ فروشی کرتی رہی ہے۔ اسی طرح ایک بار والزورتھ نے مجھے بڑے طنزیہ انداز میں کہا۔ خان تم گنگا ہائی جیکنگ اور مہاترے کے اغوا اور قتل کی تفتیشی ٹیموں کے ہاتھوں سے مچھلی کی طرح نکل گئے لیکن ہمارے ہاتھوں سے نہیں نکل سکو گے۔ میں نے کہا دیکھا جائے گا۔ انشاء اللہ تمہیں بھی منہ کی کھانی پڑے گی۔ اور جب ایک سال بعد میں عدالت سے بری ہوا اور والز ورتھ مجھے لیوٹن سے بیڈ فورڈ جیل لے جا رہا تھا تو میں نے اسے اس کا ایک سال پہلے کا ریمارک اور میرا جواب یاد دلایا۔ وہ خاصا کھسیانہ ہو گیا اور کہنے لگا دراصل ہمارا بیرسٹر نکما تھا اس نے ہمارے بجائے تمہیں فائدہ پہنچایا۔

11 اپریل 1986ء کی صبح کو ڈاکٹر میٹا نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں کسی دوسری جیل منتقل ہونے کے لئے تیار ہو جاؤں۔ چنانچہ آدھ گھنٹے بعد افسروں نے آ کر مجھے ہسپتال سے نکالا۔ ڈاکٹر میٹا اور دوسرے افسروں نے مجھے نیک دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا اور میں حسب معمول پوری طرح مسلح افسروں کی گارد میں ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ تین گھنٹے بعد مجھے برکسٹن جیل کے میڈیکل ونگ میں پہنچایا گیا۔ برکسٹن جیل میں بھی مجھے ابتدا میں جیل افسروں کی تضحیک آمیز باتیں سننی پڑیں۔ وہ ہر بات پر ایک فحش گالی دیتے (بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ان کا تکیہ کلام ہے)۔ میں اپنے حقوق کا مطالبہ کیا کرتا تھا مجھے گندی گالیاں سننی پڑتیں۔ میں نے جیل کی گورنر کے راؤنڈ کے دوران وارڈروں کے رویہ کے خلاف احتجاج کیا تو اس نے تھوڑی دیر کے بعد مجھے ونگ کے دفتر میں بلایا میں نے اسے پوری صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ میں نے کوئی اخلاقی جرم نہیں کیا سیاسی قیدی ہوں اور ایک لکھا پڑھا انسان ہوں۔ اس نے یقین دلایا کہ آئندہ میرے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں ہو گا۔ دوسرے دن جیل کے چیف آفیسر نے مجھے اپنے دفتر بلایا اور کہنے لگا مسٹر خان مجھے افسوس ہے کہ میرے کچھ افسروں کے طرز تکلم سے آپ کو ذہنی تکلیف پہنچی ہے۔ دراصل اس میں ان کا بھی کوئی بڑا قصور نہیں اس لئے کہ ہمارے جیل کے اکثر ایشیائی قیدی عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں اس لئے وہ اس برتاؤ کے مستحق ہیں (میں نے بعد میں محسوس کیا کہ چیف آفیسر ٹھیک کہتا تھا۔ میں نے بہت سے ایشیائی قیدیوں کو انتہائی غیر مہذب حرکتیں کرتے دیکھا) بہرحال آپ ایک لکھے پڑھے شریف انسان معلوم ہوتے ہیں اس لئے آئندہ کوئی آپ سے غیر مہذبانہ برتاؤ نہیں کرے گا۔ کچھ مدت بعد ایک افسر نے جو

غالباً نیا تھا اور اسے میرے بارے میں ہدایات نہیں ملی تھیں مجھ سے بدزبانی کی۔ میں نے احتجاج کیا تو اس نے مجھے دھکا دیا جس کی وجہ سے میں پھسل کر گر گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ قانون کے تحت کوئی افسر کسی قیدی کو دھکا دینے کا مجاز نہیں۔ چنانچہ میں نے اونچی آواز میں احتجاج کیا کہ تم نے مجھے کس قانون کے تحت دھکا دیا ہے۔ اس نے کہا تم قاتل ہو (میری سیل والی قطار میں سب قاتل قیدی تھے وہ سمجھا میں بھی قاتل ہوں) میں نے احتجاجاً کہا میں قاتل نہیں سیاسی قیدی ہوں۔ تم میرے ساتھ یہ غیر انسانی سلوک کیوں کر رہے ہو۔ چونکہ اس وقت صفائی کے لئے سب قیدی باہر نکلے ہوئے تھے اور میرا شور سن رہے تھے۔ ان میں سے سب قیدیوں نے اونچی آواز میں کہا شاباش خان شاباش تم سچ کہتے ہو یہ لوگ ہمیں انسان ہی نہیں سمجھتے۔ بگڑی ہوئی صورت حال کو دیکھ کر مجھے لے جا کر سیل میں بند کر دیا گیا اور صفائی کا وقفہ بھی ختم کر دیا گیا۔ دوسرے دن اس افسر نے آکر مجھ سے معذرت کی۔ غالباً گورنر کی ہدایات کے تحت۔

برکسٹن جیل میں گورنر مس کنگسلے (Miss Kingsley) جو برطانیہ کی پہلی خاتون جیل گورنر تھیں) سمیت اکثر افسر بہت اچھے تھے البتہ ایک چھوٹی سی تعداد انتہائی نسل پرست۔ اور یہ لوگ اپنے نسل پرستانہ جذبات کا عملی مظاہرہ کرتے رہتے تھے۔ ایک بار رات کو میرے سینے میں شدید درد اٹھا۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ آدھ گھنٹہ تک کوئی نہیں آیا۔ دوسری بار گھنٹی بجائی تو کوئی پندرہ منٹ بعد ایک افسر آیا اور انتہائی تحکمانہ انداز میں پوچھنے لگا تمہیں کیا تکلیف ہے کیوں بار بار گھنٹی بجاتے ہو۔ میں نے کہا میں پونے گھنٹے سے گھنٹی بجا رہا ہوں اور تم لوگوں کو پرواہ ہی نہیں میرے سینے میں درد ہے اگر میں مرگیا تو اس کی ذمہ داری تم پر عاید ہو گی۔ اس پر اس نے گندی سی گالی دے کر کہا اگر تم مرگئے تو ہماری ذمہ داری صرف یہ ہو گی کہ مردہ خانہ سے سٹریچر منگا کر تمہاری پلید لاش کو مردہ خانہ بھیج دیں۔ اب بکواس بند کرو اور سو جاؤ - یہ کہہ کر اس نے چند اور گندی گالیاں دیں اور چلا گیا۔ کوئی دس منٹ بعد ایک سینئر افسر آیا مجھ سے تکلیف کی نوعیت پوچھی اور ونگ کے دواخانہ سے وقتی طور پر درد کم کرنے کی دوا دی اور پہلے افسر کے رویہ پر معذرت بھی کی۔

برکسٹن جیل میں بھی بہت سے ایشیائی ڈاکٹر تھے۔ میری میڈیکل فائل ایک بھارتی لیڈی ڈاکٹر کے حصے میں آئی تھی جس نے مجھے ذہنی اذیت دینے اور میرے علاج کے سلسلے میں غیر انسانی رویہ اختیار کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

17 جولائی 1986ء کو (گرفتاری کے تقریباً ساڑھے دس ماہ بعد) لندن سے کوئی بیس میل باہر سینٹ آلبنز (St. Albans) کے کراؤن کورٹ (کراؤن کورٹ سیشن کورٹ کے ہم مرتبہ ہوتی ہے) میں ہائی کورٹ کے ایک اسپیشل جج کے پاس میرے کیس کی سماعت شروع ہوئی - عدالت جج اور اس کے اسٹاف کے علاوہ بارہ ممبران جیوری (جرگہ) پر مشتمل تھی۔ جیوری میں سات مرد اور

پانچ عورتیں تھیں۔ جیوری کے ممبر قانون دان نہیں، بلکہ عام لوگ ہوتے ہیں۔ جج کا کام جیوری کے سامنے الزام کی نوعیت اور متعلقہ قانون کی وضاحت کرنا ہوتا ہے جب کہ جیوری شہادتوں اور وکلاء کے دلائل کی روشنی میں ملزم کو مجرم یا بے گناہ قرار دیتی ہے۔ فیصلے کے حق میں جیوری کے بارہ ممبروں میں سے کم سے کم دس ووٹ آنا ضروری ہوتے ہیں ورنہ کیس دوبارہ شروع کیا جاتا ہے۔ ملزم کو مجرم قرار دیئے جانے کی صورت میں اس کی سزا کا تعین جج کرتا ہے۔

مجھ پر دو متبادل الزام لگائے گئے تھے۔ ایک یہ کہ کیمیائی مواد جو پولیس کو میرے گھر (لیوٹن) سے ملا تھا۔ اس سے میں برطانیہ میں دہشت گردی کے اقدامات کرنا چاہتا تھا اور بصورت دیگر یہ مواد برطانیہ سے باہر (بھارتی مقبوضہ کشمیر میں) دہشت گردی کے لئے استعمال ہونا تھا۔

میرا قانونی دفاع برطانیہ کے ہاؤس آف لارڈز کے رکن بیرسٹر لارڈ جیفورڈ (Lord Gifford) ان کے معاون بیرسٹر سپونر (Spooner) (کچھ دن سپونر کی جگہ بیرسٹر مس ایزابیلا (Miss Isabela) بھی کام کرتی رہیں) وکیل مس لوئس کرسچن (Luis Christian) اور اس کی معاون مس ٹرویلا (Miss Tervilla) نے کیا۔

استغاثہ کی طرف سے ایک بیرسٹر اور اس کی ایک بڑی ٹیم تھی۔ استغاثہ کی طرف سے بہت سے پولیس آفیسر، تربیت یافتہ کتے کا انچارج، ایک ایشیائی مترجم، آتش گیر مادے کے تین ماہرین، کیمیاوی تجزیہ کی لیبارٹری کے انچارج، لیسٹر جیل کے تین افسر اور دو کیمسٹ بطور گواہ پیش ہوئے اور میرے دفاع میں یعنی صفائی کی طرف سے برمنگھم کے ممبر پارلیمنٹ ٹیری ڈیوس (Terry Davis) ماہنامہ صراط مستقیم کے ایڈیٹر اور تحریک کشمیر کے رہنما مولانا محمود احمد میرپوری مرحوم اور لبریشن فرنٹ کے شبیر چوہدری، راجہ ظفر خان اور حاجی منظور احمد صاحب پیش ہوئے۔ بہت سے دوسرے پاکستانیوں، کشمیریوں اور انگریزوں نے صفائی کے گواہوں کی حیثیت سے پیش ہونے کی پیشکش کی تھی لیکن لارڈ جیفورڈ نے ان کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھ پر سات گھنٹے تک (دو دن) جرح ہوئی۔ لارڈ جیفورڈ نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں جرح کے دوران سیاسی معاملات کو زیر بحث لانے سے احتراز کروں۔ کیوں کہ برطانیہ کی جیوری فوجداری معاملات میں سیاست کو زیر بحث لانا پسند نہیں کرتی۔ لیکن میں نے جہاں جہاں مناسب اور ضروری سمجھا تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور مسئلہ کشمیر کے متعلقہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی کیوں کہ میں اس مقدمے کو بھی تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے حق میں اور اس کی تشہیر کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ استغاثہ کے بیرسٹر کی طرف سے مجھ سے کئے جانے والے سوالات سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ بھارتی ہائی کمیشن اس کی پوری بریفنگ کرتا ہے۔ کیس پانچ دن چلا اور 21 جولائی کو جیوری نے ایک کے مقابلے میں گیارہ ووٹوں سے مجھے پہلے الزام سے بری کر دیا البتہ دوسرے الزام کے سلسلے میں میرے حق میں مطلوبہ کم از کم دس ووٹ نہیں آئے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ دوسرے الزام کے

سلسلے میں کیس کی سماعت دوبارہ ہو جائے اور اس دوران میں جیل میں رہوں۔

مجھے برکسٹن جیل سے صبح سویرے سینٹ آلبنز لایا جاتا تھا کیوں کہ بعد میں ٹریفک بڑھ جانے کی وجہ سے میرے بارے میں حفاظتی انتظامات میں خلل پڑنے کا احتمال ہوتا تھا۔ عدالت میں سماعت شروع ہونے تک مجھے عدالت کے نیچے بنے حوالات کے کمروں میں سے کسی ایک میں رکھا جاتا تھا۔ مردوں کے حوالات کی دیواروں پر انتہائی فحش عبارت لکھی ہوئی تھی۔ یہ عبارت قیدی لکھتے تھے۔ دو دفعہ مردانہ حوالات میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے مجھے زنانہ حوالات میں رکھا گیا۔ میں نے وہاں عورتوں کے ہاتھ کی لکھی جو فحش عبارتیں دیکھیں اس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے - میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اپنے آپ کو انتہائی مہذب گردانے والے مغربی معاشرے کی خواتین حیوانیت کی اس سطح پر پہنچ سکتی ہیں۔

دوسری دفعہ کیس کی سماعت 19 ستمبر کو شروع ہوئی استغاثہ نے وہی گواہ پیش کئے اور ہماری طرف سے بھی تقریباً وہی گواہ پیش ہوئے۔ میرا بیان اور کراس ایگزامینیشن اب کے چھ گھنٹے تک ہوا۔ جج بھی دوسرا تھا اور جیوری بھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیوری کی اکثریت مجھ سے ہمدردانہ جذبات رکھتی ہے جو ان کے چہروں سے عیاں تھے اس میں لارڈ جیفورڈ کی طرف سے استغاثہ اور صفائی کے گواہوں پر کی جانے والی جرح اور بعد میں دلائل کا بڑا ہاتھ تھا۔ میں نے اب کے تحریکِ آزادی کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور وضاحت کی۔ جب میں نے نومبر 1947ء میں جموں میں مسلمانوں کے قتل عام کی منظر کشی انتہائی جذباتی انداز میں کی تو میں دیکھ رہا تھا کہ جیوری کی چند خواتین آنسو پونچھ رہی تھیں۔

اگرچہ مجھے پورا یقین تھا کہ میں کیس میں بری ہو جاؤں گا لیکن میں نے شروع سے ہی اپنے آپ کو ذہنی طور پر عمر قید کی سزا اور بصورت دیگر برطانیہ بدری کے لئے تیار کر رکھا تھا اور دونوں کو تحریکِ آزادی کے لئے اپنی قربانی تصور کرتا تھا۔ مجھے پوچھ گچھ کے دوران پولیس افسروں کی باتوں سے بھی اندازہ ہوا تھا کہ برطانیہ کی حکومت بھارتی حکومت کی طرف سے شدید دباؤ کے نتیجے میں مجھے کسی نہ کسی قسم کی سزا دینے پر تلی ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے وکلاء سے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ مجھے کسی نہ کسی قسم کی سزا ضرور دی جائے گی۔

23 ستمبر کو بارہ بجے وکلاء کے دلائل ختم ہو گئے تو جج نے جیوری کو مناسب ہدایات دیں اور جیوری کیس پر آپس میں بحث کر کے نتیجہ اخذ کرنے اور فیصلے پر پہنچنے کے لئے اپنے مخصوص کمرے میں چلی گئی اور مجھے حوالات میں لے جایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے وکلاء نے مجھے وکلاء کے کمرے میں بلایا اور ہم وہاں گپ شپ کرتے رہے دونوں بار کیس کی سماعت کے دوران عدالت کی گیلری کشمیریوں سے بھری ہوتی تھی 23 ستمبر کو تو گیلری کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ عدالت کی کارروائی ختم ہونے کے بعد وہ لوگ بھی باہر لان میں فیصلے کا انتظار کرتے رہے۔ پریس

والے بھی تھے۔

جیوری کبھی تو فیصلہ چند گھنٹوں میں دیتی ہے اور کبھی کئی کئی دن لگ جاتے ہیں۔ یہ وقت ملزموں کی قسمت کے فیصلے کا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس دوران ملزم عام طور پر بہت پریشان رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ بے ہوش بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر بڑی سے بڑی سزا کے لئے تیار رکھا تھا۔ اس لئے میں مطمئن تھا اور اپنے وکلاء سے ہنسی مذاق کرتا رہا۔ بلکہ اس دن کچھ زیادہ ہی مذاق کرتا رہا۔ اس پر مس کر یچن نے کہا بھی کہ حیرانگی ہے کہ تجھے کیس کی فکر ہی نہیں جب کہ دوسرے ملزم اس موقع پر عموماً روتے یا تھرتھراتے رہتے ہیں اور دعائیں مانگتے رہتے ہیں میں نے کہا کہ مجھے اس لئے فکر نہیں کہ اگر مجھے قید کی سزا ہوئی بھی تو میں یہ سزا اپنے وطن کی آزادی کے لئے قربانی کے طور پر کاٹوں گا۔ اور وطن کی آزادی کے لئے قربانی دینا میرا قومی فرض ہے۔ ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک افسر لارڈ جیفورڈ کو باہر لے گیا وہ آدھ گھنٹے کے بعد لوٹے تو خاصے پریشان نظر آتے تھے۔ اپنی کرسی میرے نزدیک لا کر بیٹھ گئے اور انتہائی مغموم انداز میں کہنے لگے۔ مسٹر خان مجھے انتہائی افسوس ہے کہ ہم آپ کو نہ بچا سکے۔ ہوم سیکرٹری (وزیر داخلہ) کی طرف سے آپ کے کیس میں بری ہونے کی صورت میں آپ کے برطانیہ بدری کے احکامات جاری ہوئے ہیں۔ میں نے لارڈ جیفورڈ سے کہا میرے لئے یہ صورت حال غیر متوقع نہیں۔ میں شروع سے ہی کہتا رہا ہوں کہ مجھے کسی نہ کسی قسم کی سزا ضرور دی جائے گی۔ اس لئے کہ برطانوی حکومت پر اس سلسلے میں بھارتی حکومت کا دباؤ ہے بلکہ بھارتی حکومت اس سلسلے میں برطانوی حکومت کو بلیک میل کر رہی ہے۔ لارڈ جیفورڈ کی بات سنتے ہی مس کر یچن نے رونا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اسے دلاسا دیا تو وہ اور بھی اونچی آواز میں رونے لگی اور کہنے لگی مسٹر خان ہمیں انتہائی افسوس ہے کہ ہم آپ کو نہ بچا سکے۔ میں نے کہا مس کر یچن آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ آپ لوگوں نے ضرورت اور توقع سے کہیں زیادہ محنت کی۔ اس سے زیادہ آپ لوگ کیا کر سکتے تھے۔

کوئی ایک گھنٹہ کے بعد مجھے عدالت میں لے جایا گیا اور جیوری کے لیڈر (Foreman) نے میری بریت کا اعلان کیا۔ اس کے بعد جج نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مسٹر خان جہاں تک اس عدالت کا تعلق ہے آپ اب آزاد ہیں"۔ جج کے چہرے پر بھی خاصی پریشانی نظر آتی تھی۔ مجھ سے مخاطب ہونے کے ساتھ ہی وہ اپنے چیمبر کی طرف چلے گئے۔ اس اثناء میں شاید جیوری والوں کو بھی نئی صورت حال کا علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ عدالت سے باہر نکلتے وقت جیوری کے ممبر خاص کر خواتین میری طرف انتہائی ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ جیوری والوں کے جانے کے بعد پولیس والوں نے مجھ سے کہا آپ نیچے جا کر اپنا سامان لے لیں۔ میں نیچے گیا تو نیچے پورے علاقے کو پولیس نے گھیر رکھا تھا۔ والزورتھ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ مسٹر خان میں

آپ کو گرفتار کر رہا ہوں۔ میں نے کہا تم مجھے عدالت کے احاطے میں گرفتار نہیں کر سکتے۔ مقامی حوالات کے انچارج نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے مجھے میرا سامان تھما دیا اور کہا آپ جلدی سے یہاں سے اوپر چلے جائیں اور عدالتی کمرے سے ہو کر باہر نکل جائیں۔ چنانچہ میں اوپر عدالت کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ پولیس باہر جانے والے دروازے پر کھڑی ہے (مجھے لارڈ جیفورڈ نے فیصلے سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ عدالت کے باہر سینکڑوں کی تعداد میں پولیس کھڑی ہے اور آپ کے پارٹی ممبر اور دوسرے ہمدرد بھی سینکڑوں کی تعداد میں ہیں) دروازے پر پولیس آفیسر نے مجھے ہوم سیکرٹری کا حکم نامہ تھمانے کی کوشش کی تو میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر دوسرے افسر نے حکمنامہ میری جیب میں ٹھونسا تو میں نے اسے نیچے پھینک کر پیر سے مسل دیا اور پولیس افسروں سے کہا کہ وہ مجھے عدالت کے کمرے میں گرفتار نہیں کر سکتے۔ اسی دوران مسٹر ڈارلس وہاں پہنچا اور اس نے کہا آپ کے باہر نکلنے کی صورت میں نقص امن کا خطرہ ہے اس لئے ہم نے پہلے ہی آپ کو عدالت کے کمرے میں ہی گرفتار کرنے کی اجازت حاصل کی ہے۔ اگر آپ نے گرفتاری نہیں دی تو ہمیں جبر سے کام لینا پڑے گا۔ جو کم از کم میں نہیں چاہتا کیوں کہ میرے دل میں آپ کے لئے بڑا احترام ہے۔ اتنے میں کہیں سے مس کرچن بھی ہانپتی کانپتی وہاں پہنچ گئی اور اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں حکم نامہ وصول کروں اور گرفتاری دے دوں۔ چنانچہ میں نے حکمنامہ وصول کیا۔ اسے پڑھا اور اس کی نقل پر اصل کاپی وصول کرنے کی تصدیق کرتے ہوئے دستخط کر کے نقل مسٹر ڈارلس کو لوٹا دی۔ حکمنامہ میں کہا گیا تھا کہ چونکہ مسٹر امان اللہ خان کی برطانیہ میں موجودگی برطانیہ کی قومی سلامتی کے منافی ہے اس لئے میں فلاں قانون کی فلاں دفعہ کے تحت مجھے حاصل اختیارات استعمال کرتے ہوئے مسٹر خان کی برطانوی بدر کے احکامات جاری کر رہا ہوں۔ مسٹر خان چاہیں تو میرے فیصلے کے خلاف ایک اسپیشل ٹریبونل سے اپیل کر سکتے ہیں۔ نیچے ڈوگلس ہرڈ ہوم سیکرٹری (مرکزی وزیر داخلہ) کے دستخط تھے اور حکمنامے کے اجرا کا وقت 23 ستمبر چار بج کر 23 منٹ بعد دوپہر ڈالا گیا تھا عدالت میں میری بریت کا فیصلہ چار بج کر بیس منٹ پر ہوا تھا۔ مس کرچن کے مشورے کے تحت میں نے حکمنامے کی نقل پر بھی لکھ دیا کہ میں اس فیصلے کے خلاف ٹریبونل کے سامنے اپیل کروں گا۔

مجھے سینٹ آلبنز پولیس اسٹیشن لے جا کر ایک دفتر کے کمرے میں رکھا گیا۔ میں وہاں سگریٹ پینے لگا تو مسٹر ڈارلس نے آ کر کہا۔ مسٹر خان خدا کے لئے اپنی تحریک اپنے ساتھیوں اپنی بیوی اور اپنی اکلوتی بیٹی پر رحم کریں اور سگریٹ نوشی چھوڑ دیں کیونکہ آپ ہر سگریٹ کے ساتھ اپنی زندگی کو گھٹا رہے ہیں۔ ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ لارڈ جیفورڈ اندر آئے اور مجھ سے کہنے لگے آپ کی ملک بدری کا حکمنامہ اور اسے جاری کرنے کا طریقہ ایک بہت بڑا فراڈ ہے میں اس

کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ کروں گا (لارڈ جیفورڈ نے چند دن بعد یہ رٹ کی لیکن ہائی کورٹ نے یہ مؤقف اختیار کرتے ہوئے کہ قومی مفاد اور قومی سلامتی سے متعلق معاملات میں قانون اور ضابطوں کے ہر لفظ پر عمل کرنا ضروری نہیں اور وزیر داخلہ ایسے معاملات میں عام ضابطوں سے انحراف کرنے کا مجاز ہے۔ رٹ رد کر دی۔)

لارڈ جیفورڈ کے چلے جانے کے بعد میں نے باہر شور سنا۔ معلوم ہوا مس کرمین مجھ سے ملنا چاہتی ہیں لیکن پولیس والے اس کو اجازت نہیں دے رہے اس لئے وہ چلا رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مس کرمین اندر آنے میں کامیاب ہو گئی اور آتے ہی پھر رونے لگی کہ ہم آپ کو بچانے میں ناکام ہو گئے۔ میں نے اسے دلاسہ دیا اور خاموش کرا دیا۔ اس کے بعد وہ جیل آ کر ملنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ مس کرمین ایک آزادی پسند ' انتہائی مخلص اور جذباتی خاتون ہیں۔

شام کو مجھے بھاری گارد میں لیوٹن پولیس اسٹیشن لے جایا گیا اور دوسری صبح بیڈ فورڈ جیل۔ وہاں مجھے دوسرا جیل نمبر(N 43373) الاٹ کیا گیا دو تین دن بعد مجھے دوبارہ برکسٹن جیل منتقل کیا گیا۔ بیڈ فورڈ جیل کے قیدی اور افسر میری ایک جھلک دیکھنے میرے سیل کے سامنے سے گزرتے۔ اسی دوران لیوٹن کے کشمیریوں پاکستانیوں اور لیبر پارٹی کے ممبروں نے میری برطانیہ بدری کے احکامات کے خلاف ایک زبردست احتجاجی مظاہرہ بھی کیا۔ اس سے قبل لندن میں ہوم آفس کے سامنے بھی ایک تاریخی مظاہرہ ہوا تھا۔

اب کے برکسٹن جیل میں مجھے اے A کیٹگری کی بجائے عام قیدی کے طور پر رکھا گیا۔ لیکن پابندیاں اور کچھ سہولتیں اے کیٹگری کی جاری رہیں۔ میرے کیس کی سماعت کے دوران بیڈفورڈ ریڈیو اور لندن لوکل ریڈیو میرے کیس کی خبریں مسلسل دیتے رہے۔ ہائی کورٹ کی رٹ اپیل کی بھی ریڈیو اور اخباروں میں بڑی تشہیر ہوئی۔ یکم دسمبر کو لندن کے مشہور روزنامہ گارڈین نے تو میری برطانیہ بدری کے احکامات کے خلاف ایک زور دار اداریہ بھی لکھا۔ لندن کے اردو اخبارات جنگ اور وطن ' ہفت روزہ اخبار وطن میرے کیس کی خبریں کئی کئی کالموں میں شائع کرتے رہے۔ میں جیل میں ریڈیو بھی سنتا تھا اور اخبارات بھی منگواتا تھا۔ بی بی سی اردو سروس لندن میں سنائی نہیں دیتی۔ بعد میں کراچی پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ بی بی سی اردو سروس بھی میرے بارے میں خبریں اور تبصرے مسلسل نشر کرتی رہی تھی۔

13 نومبر کو میں ٹریبونل کے سامنے پیش ہوا۔ یہ ٹریبونل ہاؤس آف لارڈز کے دو ممبروں اور امیگریشن سے متعلق ایک اہم شخصیت پر مشتمل تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر ٹریبونل برطانیہ بدری کے احکامات واپس لینے کی سفارش کرے بھی تو ہوم سیکریٹری اس سفارش پر عمل کرنے کا پابند نہیں۔ اس کے باوجود میں ٹریبونل کے سامنے اس لئے پیش ہوا کہ برطانوی سوسائٹی کے ان

اہم افراد کو مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر سے متعلق حقائق سے آگاہ کروں۔ ٹریبونل کے سامنے وکیل کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ مس کریچن باہر انتظار کرتی رہیں اور میں راجہ ظفر خان کو ساتھ لے کر ٹریبونل کے سامنے پیش ہوا۔ میری اس پیشی کے دوران بھی باہر سڑک پر لبریشن فرنٹ کے ممبر اور دوسرے کشمیری ایک بڑی تعداد میں میری برطانیہ بدری کے احکامات کے خلاف مظاہرہ کرتے رہے۔

میں دو گھنٹے تک ٹریبونل کے سامنے بولتا رہا۔ وہ کیس کے بارے میں پوچھتے رہے اور میں ان کے سوالوں کے مختصر جواب دینے کے بعد مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے بارے میں بتاتا رہا۔ میں نے ان پر واضح کیا کہ کشمیری گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے جن مصائب کا شکار ہیں ان کی سب سے بڑی ذمہ داری برطانیہ والوں پر عاید ہوتی ہے۔ برطانیہ نے 1846ء میں کشمیریوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح پچھتر لاکھ روپے میں گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچا جو اور جس کے جانشین پوری ایک صدی تک ہمیں پیستے رہے۔ اس کے بعد 1947ء میں لارڈ مونٹ بیٹن اور باؤنڈری کمیشن کے چیئرمین ریڈ کلف نے ہمیں بھارت کی غلامی میں دینے میں اہم کردار ادا کیا اور اب بھارت کو خوش کرنے اور اس کے ہاتھ اپنے ہیلی کاپٹر بیچنے کے لئے آپ کی حکومت مجھے برطانیہ بدر کر کے تحریکِ آزادیٔ کشمیر پر ایک اور وار کر رہی ہے۔ ٹریبونل کے ممبران میری باتوں اور میری پیش کردہ دستاویزات کو بغور سنتے اور دیکھتے رہے۔ بہرحال مجھے یقین تھا کہ ان لوگوں کے میری باتوں سے متاثر ہونے کے باوجود ہوم سیکرٹری اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مجھے نومبر کے اواخر میں ہوم آفس نے اطلاع دی کہ ہوم سیکرٹری کا فیصلہ قائم ہے اور میری برطانیہ بدری دسمبر کے وسط میں عمل میں آئے گی۔

وسط نومبر کے بعد مجھ سے ملاقات کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک دن میں (دو افراد سے) ایک ہی ملاقات ہو سکتی تھی۔ چنانچہ احباب دور دور سے آ کر ناکام لوٹتے تھے۔ جو لوگ ملاقات کرتے رخصت ہوتے ہوئے لپٹ کر روتے۔ ناٹنگھم کے لالہ عبدالرحمٰن ملتے ہی (اپنی پیرانہ سالی کے باوجود) لپٹ کر بچوں کی طرح روتے رہے اور کہتے رہے اب تحریک کا کیا ہو گا۔ میں نے کہا لالہ تحریکیں افراد پر انحصار نہیں کرتیں۔ انشاء اللہ تحریک یہاں بھی زندہ رہے گی۔ اپنی وکیل مس کریچن سے میری آخری ملاقات کا منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا۔

مجھے 15 دسمبر کی شام کو کہا گیا کہ میں دوسری صبح سویرے جیل سے رخصت ہونے کے لئے تیار رہوں اور 16 دسمبر کو صبح سویرے ہی بہت ساری رسمی کاغذی کارروائی کے بعد دو پولیس گاڑیوں کی گارد میں ایئرپورٹ کی طرف لے جایا گیا۔ اپنے ونگ سے رخصت ہوتے وقت قیدی اپنی کھڑکیوں سے مجھے الوداع کہتے رہے۔ مسٹر فلپسن سمیت قیدیوں سے میں ان کی سیل کی کھڑکی پر جا کر ملا۔ فلپسن میرا بڑا ہمدرد تھا۔

جیل سے نکلتے ہی میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھے ہوئے پولیس افسر نے خاصی کرختگی سے کہا۔ مسٹر خان اگر راستے میں آپ نے یا آپ کے حامیوں نے کوئی گڑبڑ کی تو آپ کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ میں نے کہا مجھے معلوم ہے لیکن میں آپ کے لہجے اور طرز تکلم کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔ اس پر میری دوسری طرف بیٹھے ہوئے افسر نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو یہ وارننگ دینا ہمارے فرض میں شامل ہے۔ بہرحال کرخت لہجے کے لئے معافی مانگتا ہوں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ملک لطیف اور ظفر خان لیوٹن سے آپ کا ذاتی سامان لے کر آ رہے ہیں اور ایئرپورٹ پر آپ سے وہی دو ملاقات کر سکیں گے کسی اور کو اجازت نہیں۔ میں دوران سفر لندن پر آخری نظر ڈالتا رہا۔ آخر ہم ایئرپورٹ پہنچے تو مجھ سے کرخت لہجے میں بات کرنے والا افسر ملک لطیف اور ظفر صاحب کو ڈھونڈنے نکلا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ عظمت خان پریشانی کی حالت میں اِدھر اُدھر دوڑ رہا ہے۔ میں نے اپنے ساتھ والے افسر سے کہا وہ نوجوان مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔ مہربانی کر کے اسے یہاں بلائیں۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے دوسری گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایک افسر کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ عظمت خان کو بلا لائے۔ عظمت خان نے مجھے دیکھتے ہی کہا امان صاحب اندر بہت لوگ جمع ہیں اور آپ کو نہ پا کر پریشان ہیں میں ان کو یہاں بلاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف بھاگا اور تھوڑی دیر میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد میرے حق میں اور میری برطانیہ بدری کے خلاف فلک شگاف نعرے لگاتی ہوئی وہاں پہنچی۔ ہر ایک مجھ سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ گاڑی سے باہر نکل کر ان سبھوں سے ملوں اور ان سے چند باتیں کروں لیکن پولیس نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اتنے میں ملک لطیف اور ظفر خان کی تلاش میں جانے والا افسر نعرے اور شور سن کر دوڑتا ہوا واپس آیا اور آتے ہی لوگوں کو منتشر ہونے کے لئے کہا تو کچھ لوگوں خاص کر برمنگھم کے راجہ حبیب خان نے نعرے بازی شروع کی تو پولیس افسر گاڑی میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور کو گاڑی آگے لے جانے کے لئے کہا چنانچہ ڈرائیور پوری رفتار سے گاڑی وہاں سے دو تین فرلانگ دور عمارت کے عقب میں لے گیا جہاں لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس طرح سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے مجھے الوداع کہنے لندن ایئرپورٹ آنے والے احباب سے میں اچھی طرح رخصت بھی نہ ہو سکا۔

پولیس گاڑی ایک جہاز کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ سینئر افسر پھر ملک لطیف اور ظفر صاحب کی تلاش میں نکلا۔ اتنے میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹی وی والے بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ میرا انٹرویو کرنا چاہتے تھے لیکن پولیس نے اس کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ وہ کیمرے لے کر ذرا دور کھڑے ہو گئے پولیس نے گاڑی کے شیشے چڑھا دیئے لیکن ٹی وی والوں نے فلڈ لائٹ (Flood-light) ڈال کر میری تصویریں لیں۔میں نے گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے (v) کے نشان بنائے۔ آدھے گھنٹے کے بعد مجھے گاڑی سے باہر لایا گیا اور ساتھ کھڑے برٹش

ایئرویز کے جہاز پر سیڑھی لگا کر مجھے اوپر لے جایا گیا۔ پولیس کوشش کرتی رہی کہ میں ٹی وی کیمرے کی زد میں نہ آؤں لیکن میں نے سیڑھیاں چڑھتے ایک طرف ہو کر پھر وکٹری (v) کا نشان بنایا۔ ٹی وی والوں نے سیڑھیاں چڑھنے کا منظر پورا فلمایا (بعد میں معلوم ہوا کہ یہ منظر اسی شام لندن ٹی وی کی مقامی خبروں میں میری برطانیہ بدری کی خبر کے ساتھ دکھایا گیا)

میں جب اوپر جہاز میں پہنچا تو جہاز ابھی خالی تھا۔ مجھے لے جا کر آخری قطار میں درمیان والی نشست پر بٹھایا گیا اور دو پولیس آفیسر میری دونوں طرف بیٹھ گئے۔ اتنے میں سینئر افسر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ میرا سامان پہنچ گیا۔ دراصل راستے میں ٹریفک جام کی وجہ سے ملک لطیف وغیرہ کی دو گاڑیاں جن میں لیوٹن کے میرے دوست سوار تھے، دیر سے پہنچیں۔

جہاز روانہ ہوا اور میں نے لندن پر آخری نظر ڈالی۔ جہاز میں بہت سے پاکستانی بھی سوار تھے۔ کسی طرح انھیں معلوم ہوا تھا کہ میں اس جہاز سے سفر کر رہا ہوں۔ مجھے دو پولیس افسروں کے درمیان بیٹھے دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ میں ہی امان اللہ ہوں۔ چنانچہ بہتوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی لیکن پولیس والوں نے بجز دو اصحاب کے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دی۔

کراچی پہنچنے سے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ قبل جہاز کا چیف سیکورٹی افسر میرے ساتھ والے سینئر افسر کو بلا کر ذرا دور لے گیا اور دونوں میں کچھ کھسر پھسر ہونے لگی جس کے بعد دونوں کاک پٹ کی طرف چلے گئے۔ پولیس والا خاصی دیر کے بعد واپس آیا میں نے پوچھا کوئی خاص بات ہے کہنے لگا کوئی خاص بات تو نہیں۔ ہم حکومت پاکستان کو آگاہ کرنے گئے تھے کہ ہم تمہیں کراچی لا رہے ہیں تاکہ اگر یہاں تمہارے خلاف کوئی کیس ہے تو یہاں کی پولیس تمہیں ہم سے اپنی تحویل میں لے لے۔ جہاز لینڈ کرنے سے پہلے چیف سیکورٹی افسر پھر آیا اور اس نے کہا حکومت پاکستان مسٹر خان کو گرفتار نہیں کر رہی۔

کراچی ائرپورٹ پر قدم رکھتے ہی برطانوی پولیس افسر نے مجھ سے کہا مسٹر خان اب آپ آزاد ہیں۔ اچھی ہم سفری کے لئے ہم آپ کے مشکور ہیں۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ساتھ کھڑی گاڑی میں بیٹھنے کی بجائے دوسری کا انتظار کرتے رہے۔ میں پہلی گاڑی سے لاؤنج کی طرف آ گیا جہاں میرے عزیز محمد سلیم (جو ائرپورٹ سیکورٹی فورس میں افسر ہے) چچا زاد بھائی حاجی صاحب خان اور ڈاکٹر محبوب عالم کھڑے تھے۔ اتنے میں دونوں پولیس افسر بھی وہاں پہنچے۔ میں نے اپنے عزیزوں سے ان کا تعارف کرایا دونوں کچھ پریشان اور جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ شاید ان کو ڈر تھا کہ میرے حامی ائرپورٹ پر ان کی پٹائی نہ کریں۔ بہرحال وہ جلدی میں دوسری طرف چلے گئے۔ میں لاؤنج سے باہر آیا تو کراچی کے اکثر علاقوں میں کرفیو ہونے کے باوجود رات چار بجے کشمیریوں کی ایک بڑی تعداد جن میں اکثریت این ایس ایف، کے ایل ایس او، کے این ایس ایف۔ اسلامی جمعیت طلباء آزاد کشمیر اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے تعلق رکھنے والے

طلباء کی تھی ائر پورٹ پہنچی تھی۔ میرے باہر آتے ہی سارا ائر پورٹ نعروں سے گونج اٹھا۔ میں نے ان سے مختصر سا خطاب کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی کہ ان طلباء میں مسلم کانفرنس کے یوتھ ونگ کے سربراہ زاہد امین کاشف سمیت نظریاتی طور پر ہماری مخالف تنظیموں کے ممبروں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی جو ان لوگوں کی اعلیٰ ظرفی اور حب الوطنی کا بین ثبوت تھا۔ طلباء سے مختصر سے خطاب کے بعد میں ائر پورٹ سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

برطانیہ میں اسیری کے دوران کچھ پولیس افسروں' جیل کے کچھ افسروں اور بھارتی ڈاکٹروں کے غلط رویے۔ دوران اسیری موت کے منہ تک پہنچنے اور آخر میں برطانیہ بدر ہونے کے باوجود پندرہ ماہ دس دن کا یہ عرصہ میں نے انتہائی اطمینان سے گذارا۔ کچھ پولیس افسروں کچھ جیل افسروں لیسٹر جیل کی ڈاکٹر پیشا اور اس کے اکثر ساتھیوں' برکسٹن جیل کی مس کنگیلے اور بہت سے افسروں - میرے وکلاء خاص کر لارڈ جیفورڈ اور مس لوئیس کرسچن - لبریشن فرنٹ میں میرے تمام ساتھیوں 'برطانیہ کے اردو اخبارات اور جرائد خاص کر جنگ ' وطن' اخبار وطن' راوی اور مشرق' دوسری کشمیری تنظیموں' لبریشن لیگ' آزاد مسلم کانفرنس' آزاد کشمیر پیپلز پارٹی' مسلم کانفرنس' آزاد کشمیر جماعت اسلامی' تحریک عمل پارٹی' تحریک کشمیر ' کشمیر انقلابی تحریک' جمعیت علمائے اسلام آزاد کشمیر کے علاوہ گلاسگو کی کشمیر ویلفیئر ایسوی ایشن' کشمیر انڈیپنڈنٹ موومنٹ' کشمیر ڈیفنس کونسل ' بریڈ فورڈ کے سابق لارڈ میئر محمد عجیب' آزاد کشمیر ایکشن گروپ' لیسٹر کے ایم ایچ بٹ' آزاد کشمیر کے چوہدری عبدالمجید' گلاسگو کے بشیر مان اور لندن کے بریگیڈیئر عثمان خالد' بیرسٹر صبغت قادری' رشید احمد صدیقی' ظہور بٹ اور بیرسٹر نقوی' قومی محاذ آزادی یو کے ' پاکستان ورکرز ایسوسی ایشن' پاکستان کشمیر ویلفئر ایسوسی ایشن لیوٹن' اسلامک ایسوسی ایشن لیوٹن' برٹش پاکستان لیبر پارٹی اولڈہم ' پاکستان ایسوسی ایشن گلوسکو' یوکے اسلامک مشن لندن' لیبر ممبران پارلیمینٹ بالخصوص برمنگھم کے ٹیری ڈیوس (Terry Devis) شیڈو ہوم سیکرٹری جیرالڈ کافمین (Gerald Kaufman) برمنگھم کے ڈینس ہاول (Denis Hawell) اولڈ ہم کے جیمز لیمنڈ (James Lemond) بریڈ فورڈ کے میکس میڈن (Max Madden) لندن کے (Eric Dickens) ایمنسٹی انٹرنیشنل (Amnesty International) نیشنل کونسل فار سول لیبرٹیز (NCCL) نیشنل یونین آف جرنلسٹس (NUJ) بی بی سی ریڈیو ' بیڈ فورڈ روزنامہ گارڈین (Guardian) لندن اور بی بی سی اردو سروس سے منسلک افراد کے علاوہ امریکہ' یورپ کے دوسرے ممالک' مشرق وسطیٰ' آزاد کشمیر اور پاکستان میں اپنے ہمدردوں اور بہت سے دوسرے افراد' روزنامہ مسلم اسلام آباد اور آزاد کشمیر کے جرائد خاص کر ولر' انصاف' قائد' کشیر اور دیگر جرائد (جنہوں نے میرے حق میں زور دار اداریئے اور مضامین لکھے) اور میرے ان ساتھیوں جنہوں نے میرے آپریشن اور علالت کے دوران خانۂ کعبہ اور مسجدِ نبویؐ میں میری صحت یابی کے

لئے دعائیں مانگیں' کی طرف سے ملنے والے مکمل تعاون' پرزور حمایت' حوصلہ افزائی اور دعاؤں کے نتیجے میں اور اس خیال سے کہ میں یہ مصائب اور اسیری اپنی زندگی کے واحد مشن یعنی قومی آزادی کے لئے برداشت کر رہا ہوں۔ مجھے پوری اسیری کے دوران مکمل اطمینان قلب اور ذہنی سکون حاصل رہا جس کے لئے میں متذکرہ بالا تمام حضرات ' اداروں اور تنظیموں کا دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں ان تمام حضرات کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے میرے حق میں آواز اٹھائی لیکن مجھے اس کا پتہ نہیں چلا۔ میں لیوٹن کے حاجی منظور صاحب' ملک شفیع صاحب' ملک غلام سرور صاحب' ملک لطیف صاحب ' ظفر خان صاحب' برمنگھم کے چوہدری سلطان محمود صاحب' مولانا محمود احمد صاحب میرپوری مرحوم اور محمود نظامی صاحب' لندن کے ڈاکٹر ایوب ٹھاکر صاحب اولڈھم کے افضل جاتلوی صاحب اور چوہدری نادر حسین صاحب اور ہیلی فکس کے شبیر چوہدری صاحب اور سفارت خانۂ پاکستان لندن کے جہانگیر خان جو میرے برادر نسبتی ڈاکٹر محمد لطیف خان کے برادر نسبتی ہیں اور ان میں سے اکثر کے اہل خانہ کا ازحد مشکور ہوں کہ انہوں نے میری اسیری کے دوران میری فیملی کا خیال رکھا اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ حاجی منظور خان اور بیگم منظور نے تو ان دنوں میرے سگے بھائی اور بھابھی کا کردار ادا کیا۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ اس دوران میری اہلیہ بچی اور دوسری عزیزہ نے بے مثال ہمت اور حوصلے کا مظاہرہ کیا۔

میری ان اسیریوں سے ملنے والے کچھ اہم سبق

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مصائب و آلام کے دوران انسان زندگی کے موثر ترین سبق حاصل کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ عام طور پر لوگ ان مسائل کے خاتمے کے ساتھ ہی یہ سبق بھی بھول جاتے ہیں۔

میں نے اپنی کئی بار کی قید و بند سے بے شمار سبق حاصل کئے ہیں اور ان سے استفادہ کرتا رہا ہوں۔ ان میں سے کچھ سبق ایسے ہیں جو تحریک آزادی یا کسی اور مقدس مشن سے منسلک افراد کے لئے انتہائی کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کچھ کا تذکرہ یہاں بھی کیا جائے تاکہ خواہشمند قارئین بھی ان سے استفادہ کر سکیں۔

1- اگر انسان کسی ارفع مقصد خاص کر حصول آزادی کی جدوجہد کے سلسلے میں قید و بند کے دوران ملنے والی ذہنی اور جسمانی اذیتوں کو اپنے مشن کے حصول کے لئے ضروری قربانیاں اور اپنے فرض کی ادائیگی کا حصہ تصور کرے تو یہ ذہنی اور جسمانی اذیتیں اسے ایک ایسا روح پرور اطمینان قلب اور ذہنی سکون عطا کرتی ہیں جن کا وہ عام زندگی میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہی

نہیں بلکہ یہ اذیتیں اس کے عزم و استقلال کو بھی مضبوط تر کردیتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر انسان ان اذیتوں کو مصیبت اور بے جا ظلم تصور کرے یا کسی شخص کو اس کا ذمہ دار سمجھے تو یہ اذیتیں کئی گنا زیادہ تکلیف کا باعث بن جاتی ہیں اور انسان کے عزم پر بھی منفی اثر ڈالتی ہیں۔

2- اگر انسان چاہئے تو حصول آزادی کے سلسلے میں قید و بند کے دوران فرصت کے لمحات سے مناسب استفادہ کرتے ہوئے ایسے ایسے کام کر سکتا ہے جو وہ آزاد زندگی میں دوسری مصروفیات کی وجہ سے نہیں کر سکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ تاریخی نظریاتی اور ادبی لحاظ سے اعلیٰ ترین معیار کی کتابیں اور مضامین ان کے مصنفین کی اسیری کے دوران ہی لکھے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں انسان اسیری کے دوران اپنے مطالعے کو بھی وسعت دے سکتا ہے۔

3- اعلیٰ مقاصد کے سلسلے میں قید و بند انسان کی نظر کو وسعت اور گہرائی، طبیعت کو صبر اور استقلال، نظریات کو پختگی، عزم کو مزید قوت، کلام کو اثر اور مٹھاس۔ جذبہ ایثار و قربانی کو تقویت اور اس کے علم کو وسعت عطا کرتی ہے بشرطیکہ انسان اس قید وبند کو اپنے مشن کے سلسلے کے اپنے فرائض کی ادائیگی کا حصہ تصور کرے اور اس دوران وقت کا بھی صحیح استعمال کرے۔

4- اعلیٰ مقاصد کے سلسلے کی قید و بند انسان کو اہم مسائل پر ٹھنڈے دل اور دور اندیشی سے غور کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

5- یہ قید و بند انسان کو اس کے اصلی اور نقلی دوستوں کی صحیح پہچان بھی کراتی ہے۔

الغرض اگر انسان چاہے تو وہ اعلیٰ مقاصد کے سلسلے کی اسیری کو بھیس بدلی ہوئی رحمت (Blessing in Disguise) میں تبدیل کر سکتا ہے۔

1979ء میں مسلم تحاریک آزادی کی بین الاقوامی کانفرنس میں کشمیری وفد کی قیادت کرتے ہوئے

لندن میں مسلم تحاریک آزادی کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے (اپریل 1979ء)

اسلامی کانفرنس کے میرے خطاب کے دوران سامعین جن کی اکثریت سفارت کاروں پر مشتمل تھی

بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کی سیاسی کمیٹی کے اجلاس میں صادق المہدی کے ساتھ

اسلامی کانفرنس کے دوران لیبیا کے وفد کے قائد مفتاح مہدی کے ساتھ (1979ء)

ڈنمارک میں پریس کانفرنس سے خطاب
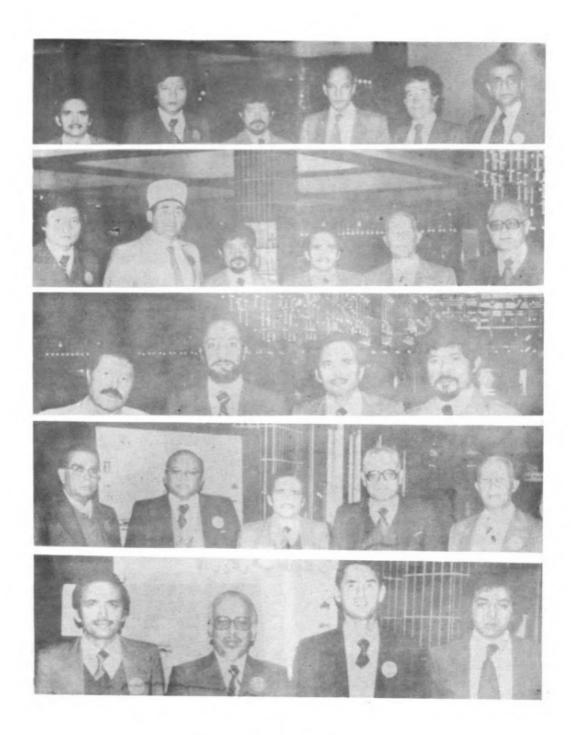
اسلامی کانفرنس کے وفود کے ممبروں کے ساتھ (1979ء)

اقوام متحدہ کے پریس روم میں مشترکہ پریس کانفرنس میں

فارن پریس کلب لندن میں پریس کانفرنس

کویت میں پریس کانفرنس سے خطاب (1985ء)

میرے حریت پسند ساتھی

اورنگزیب شہید

صدیق بھٹی

ریاض ملک

قیوم راجہ

کالا خان مرحوم

برطانیہ کی کشمیری تنظیموں کے رہنما میری برطانیہ بدری کے خلاف پریس کانفرنس سے خطاب ۔ میری وکیل لوئیس کرچین کیس کے قانونی پہلوؤں کی وضاحت کر رہی ہے

بھارتی ہائی کمیشن لندن پر لبریشن فرنٹ کا مظاہرہ

جموں کشمیر لبریشن فرنٹ اور دوسری جماعتوں کے ارکان ہوم آفس کے سامنے امان اللہ خان کی رہائی کے لئے مظاہرہ کر رہے ہیں

برطانیہ کی عدالت میں میرے کیس کے فیصلے کے دوران میرے احباب وکیلوں کے ساتھ

جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے اراکین اور دوسرے کشمیری امان اللہ خان کو عدالت میں پیش کئے جانے کے موقع پر عدالت کے باہر

ٹیری ڈیوس --- جیرالڈ کا فمین

برکسٹن جیل کے ہسپتال میں ملاقات کرتے ہوئے

میرے اس فوٹو کو مغربی اخبارات مجھے دہشت گرد کے طور پر اجاگر کرنے کے لئے استعمال کرتے رہے

برطانیہ بدری کے موقع پر لندن ائر پورٹ پر پولیس گاڑی میں سے اپنے ہموطنوں کو الوداع

حِصّہ چہارم

متفرقات

پہلا باب

میرے ذہن میں نظریۂ خود مختار کشمیر کی پیدائش اور ارتقاء

دور جدید میں کسی شخص کی طرف سے کوئی نظریہ اپنائے جانے کے پس منظر میں یا تو اس کا کوئی ذاتی یا گروہی مفاد ہوتا ہے یا وہ کسی لیڈر، کسی تنظیم یا اس کے منشور سے متاثر ہو کر اس کے نظریئے کو اپناتا ہے یا تیسری صورت میں تاریخی پس منظر کی روشنی میں حالات و واقعات کا مشاہدہ اس کے دل اور ذہن میں آہستہ آہستہ کسی نظریئے کو جنم دیتا ہے اور ان مشاہدات کے یکساں تسلسل کیساتھ اس کے دل و دماغ میں اس نظریئے کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔

پہلی صورت میں انسان کا نظریہ اسکے مفادات کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے اور وہ شخص سیاسی فضا کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سیاسی پینترے بدلتا رہتا ہے یعنی آج ایک نظریئے کا حامل اور ایک پارٹی میں تو کل دوسرے نظریئے کا حامل اور دوسری پارٹی میں۔ ایسے لوگوں کو سیاسی زبان میں لوٹے، سیاسی مسافر، فصلی بٹیرے یا چڑھتے سورج کے پجاری کہا جاتا ہے۔

دوسری صورت کو پہلی صورت کی نسبت دیرپا ہوتی ہے لیکن اس کے مستقل طور پر قائم رہنے کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہوتی جس شخص یا تنظیم سے وہ متاثر ہوتا ہے اس کے منظر سے ہٹنے کے ساتھ ہی عام طور پر اس شخص میں بھی ذہنی اور نظریاتی تبدیلی آ جاتی ہے۔

تیسری طرز سے اپنائے جانے والا نظریہ انسان کی سوچ کا ضروری جز بن جاتا ہے اور کوئی بڑا انقلابی واقعہ یا حالات میں کوئی انقلابی تبدیلی ہی اس نظریئے کو اس کے دل سے نکال سکتی ہے۔

پوری ریاست جموں کشمیر کی مکمل خود مختاری کا نظریہ میرے ذہن میں نہ تو کسی ذاتی یا گروہی مفاد کے نتیجے میں پیدا ہوا نہ ہی کسی شخص یا تنظیم سے متاثر ہو کر بلکہ جوں جوں میں مسئلہ کشمیر سے متعلق حقائق اور حالات و واقعات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتا گیا میرے ذہن میں یہ نظریہ غیر شعوری طور پر پیدا ہو کر مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

جب تک میں مقبوضہ کشمیر میں تھا وہاں کے محدود اور مخصوص ماحول کے نتیجے میں پوری ریاست جموں کشمیر کے پاکستان سے الحاق کو مسئلہ کشمیر کا بہترین حل تصور کرتا تھا۔ اس سلسلے میں

میں نے مقدور بھر کام بھی کیا - پاکستان آ کر پہلے دو سال تو ذاتی مسائل میں الجھا رہا - اس کے بعد 1954-55ء میں کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن کراچی کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے سرگرم ہو گیا اور مسئلہ کشمیر سے متعلق تاریخی حقائق اور حالات و واقعات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتا رہا - 1957ء تک میرے ذہن میں خاصی تبدیلی آئی تھی اور میں خود مختار کشمیر کو مسئلہ کشمیر کے چند حلوں میں سے ایک سمجھنے لگا تھا لیکن 1961ء تک خود مختار کشمیر کا نظریہ میرے ذہن میں پوری طرح جڑیں پکڑ چکا تھا - اس دوران کراچی کے کشمیری سیاسی کارکنوں کے ساتھ تعلقات پیدا ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان میں سے بہت سے اصحاب خاص کر جی ایم لون مرحوم میرے ہم خیال ہیں - چنانچہ ہم نے اپنا ایک گروپ بنایا جو ابتداً" کراچی تک محدود تھا لیکن 1963ء میں اس کو وسعت ملی اور وہ آزاد کشمیر و پاکستان سطح پر کشمیر انڈ یپنڈنس کمیٹی کی شکل میں ' 1965ء میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری کی شکل میں اور 1977ء میں بین الاقوامی سطح پر جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کی شکل میں منظم ہو گیا - اس طرح خود مختار کشمیر کا جو نظریہ میرے ذہن میں 1955ء میں مسئلہ کشمیر کے ایک متبادل حل کی شکل میں داخل ہوا تھا - وہ وقت گزرنے اور میرے مطالعے اور مشاہدے میں وسعت اور گہرائی آنے کے ساتھ ساتھ میرے سیاسی ایمان کا بنیادی ستون اور میری فکر کا جزو لاینفک بن گیا۔

میرا نظریۂ خود مختار کشمیر ناقابل تردید تاریخی ' جغرافیائی ' اقتصادی اور سماجی حقائق اور دوسرے ٹھوس دلائل پر مبنی ہے جن کی تفصیلی وضاحت میں نے اس موضوع پر لکھے ہوئے اپنے دو کتابچوں "نظریۂ خود مختار کشمیر" اور "خود مختار کشمیر کیوں" میں کی ہے۔

جیسا کہ میں نے اپنے کتابچے "خود مختار کشمیر کیوں" میں واضح کیا ہے آزاد خود مختار ریاست جموں کشمیر کوئی خیالی جنت ہو گی اور نہ ہی اس میں دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی - اس کے برعکس اس کے اپنے سیاسی ' اقتصادی ' علاقائی ' دفاعی اور بین الاقوامی مسائل ہوں گے لیکن ان مسائل کے باوجود آزاد خود مختار کشمیر ریاست کے بھارت یا پاکستان کا حصہ بننے کی نسبت قومی زندگی کے ہر میدان میں کہیں زیادہ بہتر پوزیشن میں ہو گا۔

دوسرا باب

میری تصانیف اور تحریریں

میں نے اب تک مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر اردو اور انگریزی میں تقریباً ایک درجن کتابچے اور ایک کتاب لکھی ہے۔ ماہنامہ وائس آف کشمیر کراچی اور وائس آف کشمیر انٹرنیشنل برطانیہ میں ان موضوعات پر سینکڑوں مضامین اور اداریے لکھے ہیں اس کے علاوہ آزاد کشمیر' پاکستان' بھارت' عرب ممالک' یورپی ممالک اور امریکہ کے اخبارات اور رسائل میں میرے سینکڑوں مضامین' انٹرویو' بیانات اور خطوط شائع ہوئے ہیں۔ آیئے میری ان تصانیف اور دوسری تحریروں کے بارے میں ذرا تفصیل میں جائیں۔

کتابچے اور کتاب

1- ہمارے نظریات

یہ کتابچہ میں نے 1968ء میں لکھا۔ اس میں سوال و جواب کی شکل میں جموں کشمیر محاذِ رائے شماری (جس کا میں اس وقت سیکرٹری جنرل تھا) کے نظریات کی وضاحت کی گئی ہے۔

2 ۔ ایف ایل این ۔ الفتح اور کشمیری نوجوان

1969ء میں لکھا گیا میرا یہ کتابچہ انتہائی جذباتی انداز میں الجزائر کی قومی تحریک آزادی میں اہم ترین کردار ادا کرنے والی تنظیم ایف ایل این (قومی محاذ آزادی) اور فلسطین کے حریت پسندوں کی تنظیم الفتح کے بے مثال کارنامے بیان کرتے ہوئے ان کی روشنی میں کشمیری نوجوانوں کو تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے سلسلے میں ان کے فرائض یاد دلاتا ہے۔ 48 صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ کشمیری نوجوانوں میں جذبۂ آزادی پیدا کرنے کے علاوہ مقبوضہ کشمیر کی اسمبلی میں بھی گرماگرم

بحث کا موضوع بن گیا ۔ یہ کتابچہ پڑھ کر ہی پاکستان کی سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس یعقوب علی خان اور پاکستان کی سپریم کورٹ کے موجودہ جج عبدالقادر شیخ نے گنگا ہائی جیکنگ کیس کے فیصلے میں لکھا تھا کہ امان اللہ خان کی تحریریں انتہائی متاثر کن اور جذبات انگیز ہوتی ہیں ۔ میر عبدالقیوم صاحب کی درخواست پر اس کتابچے کی کتابت روزنامہ مشرق کراچی کے کاتبوں اور طباعت روزنامہ جنگ کراچی کے جاوید پریس کے مینیجر منظور خان لون صاحب نے بغیر اُجرت کے کی ۔ اب تک کتابچے کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

3- فری کشمیر (FREE KASHMIR)

1970ء میں انگریزی زبان میں لکھی گئی 224 صفحات پر مشتمل میری یہ کتاب نظریۂ خودمختار کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے اور اس موضوع پر غالباً" یہ پہلی جامع کتاب ہے ۔ اس کی طباعت (پرنٹنگ) کے سلسلے میں مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے اور کتنا مالی خسارہ برداشت کرنا پڑا ۔ یہ ایک طویل' تکلیف دہ اور دلچسپ کہانی ہے ۔ اگر میں یہ کہوں کہ ایف ایل این' الفتح اور کشمیری نوجوان' میرے جذبات اور فری کشمیر میرے نظریات کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں تو بے جا نہ ہو گا۔

4- دستاویزِ غلامی

1972ء میں محاذ رائے شماری کے چیئرمین پبلسٹی بورڈ کی حیثیت سے میری طرف سے شائع ہونے والے اس کتابچے میں آزاد کشمیر ایکٹ 1970ء پر مدلل تنقید کرتے ہوئے اسے دستاویزِ غلامی ثابت کیا گیا ہے۔

5- اقبالِ جرم

یہ کتابچہ دسمبر 1970ء میں گلگت کی عدالت میں پیش کئے گئے طویل تحریری بیان اور پولیٹکل ایجنٹ گلگت کے نام میرے تفصیلی خط پر مشتمل ہے چونکہ میں نے بیان میں اپنے خلاف لگائے جانے والے تمام الزامات کا اقرار کیا تھا ۔ اس لئے کتابچے کا نام ہی اقبالِ جرم رکھا ۔ میرا یہ بیان اور پولیٹکل ایجنٹ کے نام میرا خط گلگت بلتستان کی اس وقت کی سیاسی' اقتصادی اور سماجی صورت حال کی پوری عکاسی کرتے ہیں۔

6- نیا دام لائے ......

یہ کتابچہ 1972ء میں محاذ رائے شماری کی طرف سے شائع کیا گیا۔ اس میں آزاد کشمیر کے لیڈروں خاص کر سردار عبدالقیوم خان کے سیاسی پینتروں کی تفصیلات درج ہیں۔

7- عالمی ضمیر کے نام (TO WORLD CONSCIENCE)

1977ء میں برطانیہ میں انگریزی میں لکھے ہوئے میرے اس کتابچے (بروشر) کا ایک ایڈیشن این ایل ایف کی طرف سے اور دوسرا محاذ رائے شماری کی طرف سے شائع ہوا۔ اس میں مسئلہ کشمیر کے پس منظر' مسئلہ کشمیر کے بارے میں بھارت' پاکستان اور اقوام متحدہ کے کردار' اور مسئلہ کشمیر کی اصل نوعیت کے بارے میں تفصیلات کے علاوہ مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے بارے میں عالمی ضمیر کے اخلاقی فرض سے متعلق معاملات درج ہیں۔ یہ کتابچہ لندن اور اقوام متحدہ میں دنیا بھر کے سفارتخانوں اور بین الاقوامی تنظیموں کے علاوہ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کو بھیجا گیا۔

8- کشمیر کی المناک کہانی

(THE TRAGIC STORY OF KASHMIR)

1979ء میں انگریزی زبان میں میرے لکھے ہوئے اور لبریشن فرنٹ کی طرف سے شائع کئے گئے بیس صفحوں پر مشتمل اس کتابچے میں کشمیر کی سیاسی تاریخ اور جغرافیہ' تحریک آزادی' کشمیر کی تاریخ' مسئلہ کشمیر کے بارے میں بھارت اور پاکستان کے مواقف' مسئلہ کشمیر کی اصل نوعیت' مسئلہ کشمیر اور اقوام متحدہ' مسئلہ کشمیر کو بھارت اور پاکستان کے مابین مذاکرات کے ذریعہ حل کرنے کی کوششوں' مسئلہ کشمیر پر بین الاقوامی تعلقات خاص کر سوپر پاور سیاسیات کے اثرات' مسئلہ کشمیر کے انسانی پہلو اور دیگر معاملات کی تفصیلات درج ہیں۔ اس کتابچے کے تین ایڈیشن شائع ہو کر دنیا بھر میں تقسیم ہو چکے ہیں۔

9- نظریۂ خود مختار کشمیر

1983ء میں اردو زبان میں اور سوال و جواب کی صورت میں میرا لکھا ہوا یہ کتابچہ خود مختار کشمیر کے نظریئے کے بارے میں کئے جانے والے بیس اعتراضات کے مفصل اور مدلل جوابوں پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن لبریشن فرنٹ کی دی ہیگ (ہالینڈ) شاخ کی طرف سے اور دوسرا نیشنل زون (آزاد کشمیر و پاکستان زون) کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اس کتابچے کی اب تک چھ ہزار کاپیاں تقسیم ہو چکی ہیں۔

10- شہید کشمیر مقبول بٹ

یہ کتابچہ میں نے 1985ء کے وسط میں برطانیہ میں لکھا تھا - لیکن اس کی طباعت سے پہلے ہی گرفتار ہو گیا - چنانچہ اس کی طباعت برطانیہ میں میری پندرہ ماہ کی اسیری اور برطانیہ بدری کے بعد ہی ممکن ہو سکی - یہ کتابچہ مقبول بٹ شہید کی شخصیت اور ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلات پر مشتمل ہے۔

11- خود مختار کشمیر کیوں ؟

اردو زبان میں 72 صفحات پر محیط یہ کتابچہ میں نے لیسٹر (برطانیہ) کے ہائی سیکورٹی جیل میں ستمبر اور اکتوبر 1985ء میں بیس دن میں لکھا اور اسے 1986ء میں لبریشن فرنٹ نے ماہنامہ حکایت لاہور کے پریس سے چھپوایا۔ یہ کتابچہ پوری ریاست جموں کشمیر کی مکمل خود مختاری کے حق میں تاریخی' سیاسی' اقتصادی' مذہبی اور دیگر حقائق پر مبنی دلائل پر مشتمل ہے - اس کتابچے کے اب تک دو ایڈیشن شائع ہو کر تقسیم ہو چکے ہیں۔

مضامین اور انٹرویو

گذشتہ تیس سال کے دوران مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر اردو اور انگریزی میں میرے سینکڑوں مضامین ۔ انٹرویو اور خط (معہ کھلے خط) آزاد کشمیر' بھارتی مقبوضہ کشمیر' پاکستان' بھارت' عرب ممالک ' یورپی ممالک (خاص کر برطانیہ) امریکہ اور جاپان کے روزناموں اور رسائل میں شائع ہوئے ہیں ۔ آزاد کشمیر کے جن ہفت روزوں میں میرے بہت سے مضمون

شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سرفہرست ہفت روزے انصاف ۔ ولر ۔ قائد ۔ کشمیر اور بے باک ہیں
پاکستان کے صف اول کے اردو اخبارات جنگ اور نوائے وقت میں اب تک میرے درجنوں مضامین اور انٹرویوز کے علاوہ جنگ فورم اور نوائے وقت کے ایوان وقت میں لئے گئے انٹرویو بھی شائع ہوئے ہیں ۔ ان دو اخبارات کے علاوہ ڈان ' مارننگ نیوز ' جسارت ' پاکستان ٹائمز' حریت' پکار' مسلم' حیدر' ہفت روزہ حرمت میں بھی میرے مضامین اور انٹرویو شائع ہوتے رہے۔ بھارتی اخبارات میں سے السٹریٹڈ ویکلی' ہندوستان ٹائمز' ٹائمز آف انڈیا ' انڈین ایکسپریس ' دی ٹیلیگراف ' دی سن ' بلٹز' اور ریڈینس میں میرے مضامین یا انٹرویو شائع ہوئے ۔ سعودی عرب کے روزنامہ المدینہ اور کویت کے جرائد المجتمع اور البلاغ میں میرے مضامین اور انٹرویو شائع ہوئے
ڈنمارک کے مشہور روزنامے میں میرا طویل انٹرویو شائع ہوا ۔ برطانیہ کے مشہور اخبارات دی ٹائمز' گارڈین اور روزنامہ نیوز لائن کے علاوہ جنگ ۔ وطن ۔ ملت ۔ اخباروطن ۔ مشرق اور راوی میں میرے مضامین اور خطوط شائع ہوتے رہے ۔ امریکی مسلمانوں کے اخبار دی بلالین نیوز میں میرے دو مضامین قسط وار شائع ہوئے ۔ ان مضامین کے علاوہ ماہنامہ وائس آف کشمیر کراچی (1962ء تا 1964ء) اور وائس آف کشمیر انٹرنیشنل برمنگھم (1976ء تا 1984ء) کے اداریے اور ان میں شائع ہونے والے اکثر مضامین اور مزاحیہ کالم میرے ہی لکھے ہوتے تھے ۔ میرے ریڈیو اور ٹی وی انٹرویوز کی تفصیلات لبریشن فرنٹ سے متعلق باب میں درج ہیں۔

درج بالا حقائق کی روشنی میں یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو گا کہ مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر سے متعلق معاملات پر جتنے کتابچے کتابیں اور مضامین میں نے لکھے ہیں اتنے جدوجہد آزادی میں عملاً اور مسلسل مصروف کسی دوسرے کشمیری نے نہیں لکھے۔

میں نے کچھ مضامین دیگر موضوعات پر بھی لکھے ۔ پہلا مضمون " عالم اسلام کے مسائل اور ان کا حل " کے عنوان سے تھا ۔ اس میں میں نے عالم اسلام کے مسائل اور اسلامی دنیا کی موجودہ قابل رحم حالت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے (اقوام متحدہ اور اس سے متعلق عالمی اداروں سے حاصل کئے گئے) اعداد وشمار کی مدد سے ثابت کیا کہ اگر عالم اسلام اپنی افرادی قوت' قدرتی وسائل (زراعت ۔ تیل ۔ معدنیات وغیرہ) دنیا بھر میں بکھرے ہوئے مسلمان سائنسدانوں ۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق فنی ماہرین ' عالمی سطح پر مشہور جنگجو مسلم قومیتوں اور اقوام متحدہ میں ممبر مسلم ممالک کی بھاری تعداد کو منظم طریقے سے استعمال کرے اور مسلم ممالک کے حکمران باہمی اختلافات ختم کرکے متحد ہو جائیں تو عالم اسلام یقیناً مغربی اور مشرقی (کمیونسٹ) بلاکوں کے ہم پلہ دنیا کا تیسرا انتہائی طاقت ور بلاک بن سکتا ہے ۔ میں نے مضمون میں اس عظیم مقصد کے حصول کا ایک قابل عمل طریقۂ کار بھی وضع کیا تھا ۔ بڑے سائز کے اکیس ٹائپ شدہ صفحات پر محیط اس مضمون کی ہزاروں کاپیاں مسلم ممالک کے وزرائے

خارجہ ' لندن اور نیو یارک میں مسلم سفارت خانوں بین الاقوامی مسلم تنظیموں ' مسلمان ملکوں کے اہم اخبارات جرائد کو بھیجنے کے علاوہ لندن میں 1980ء میں پندرھویں صدی ہجری کی ابتداء سے متعلق ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں بھی تقسیم کرائیں ۔ اس مضمون کو بہت سے اخبارات نے قسطوں میں شائع کیا۔ مسلم ممالک کے بہت سے سکالرز کی طرف سے مجھے بہت سے ستائشی خط ملے۔

میرا دوسرا مضمون بھارتی حکومت کی مسلم دشمنی سے متعلق تھا اور میں نے خاصی ریسرچ کرکے اور کچھ چونکا دینے والے حقائق کے ذریعہ ثابت کیا تھا کہ بھارتی حکومت عالم اسلام اور مسلمانوں کی بدترین دشمن ہے۔ اس طویل مضمون کی ہزاروں کاپیاں دنیا بھر میں تقسیم ہوئیں جس پر کچھ بھارتی اخبارات بھی چیخ اٹھے۔

الغرض قدرت نے مجھے جو قلمی صلاحتیں عطا کی ہیں میں انہیں تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور دیگر متعلقہ معاملات پر صرف کرنے کے قومی فرض کی ادائیگی میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں۔ اسکا فیصلہ قارئیں ہی کر سکتے ہیں۔

تیسرا باب

میرے ذہن کی کچھ اہم اختراعات

اس حقیقت کو اتفاق کہا جائے یا کچھ اور، کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن، جموں کشمیر محاذ رائے شماری، کشمیر کمیٹی برائے افریشیائی عوامی اتحاد اور این ایل ایف سے لے کر جموں کشمیر لبریشن فرنٹ تک مجھے ان تنظیموں میں کم از کم لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں تک کہ ان تنظیموں کے آئین خط و کتابت اور لٹریچر زیادہ تر میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ تقریباً یہی حال تنظیمی اور پالیسی سازی سے متعلق معاملات کا بھی رہا ہے۔ چنانچہ اپنی ان سرگرمیوں کے دوران میں نے مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کی ضروریات کے تعلق سے کچھ اصطلاحات اور نعرے خود ایجاد کئے۔ جبکہ بین الاقوامی طور پر استعمال ہونے والی کچھ اصطلاحات کو پہلی بار مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے بارے میں استعمال کیا۔ آیئے ان میں سے چند ایک پر نظر ڈالیں۔

غیر محدود، غیر مشروط رائے شماری

1947ء میں مسئلہ کشمیر کے پیدا ہونے کے تقریباً دو عشرے بعد تک کشمیر میں اقوام متحدہ کی نگرانی میں رائے شماری کے مطالبے کو ہی مسئلہ کشمیر کے بارے میں مرکزی حیثیت حاصل تھی لیکن اس حقیقت کا علم بہت کم لوگوں کو تھا کہ اقوام متحدہ کی جن قراردادوں کے تحت یہ رائے شماری ہونی تھی ان میں سے آخری یعنی 5 جنوری 1949ء کی قرارداد کشمیریوں کے حق کو ریاست کے بھارت یا پاکستان سے الحاق تک ہی محدود کرتی ہے اور جب بھی پاکستان کشمیریوں کے حق خودارادیت کی بات کرتا اس کا مطلب یہی محدود رائے شماری ہوتا تھا۔ حالانکہ قوموں کے حق خودارادیت کی بین الاقوامی طور پر کی جانے والی تشریح کے مطابق کسی قوم کے حق خودارادیت کو نہ تو محدود کیا جا سکتا ہے نہ ہی مشروط اور نہ اس کے گرد کوئی دیوار کھڑی کی جا سکتی ہے۔ ہم پوری ریاست کی مکمل خود مختاری کو بھی مجوزہ رائے شماری میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں

اس کے لئے غیر محدود و غیر مشروط رائے شماری کی اصطلاح استعمال کرتا رہا اور اس اصطلاح کو جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے آئین میں بھی شامل کر کے اسے تنظیم سے منظور کرایا۔ اس اصطلاع کی وسیع تشہیر سے جہاں اقوام متحدہ کی کشمیر سے متعلق قراردادوں کی اصل نوعیت عوام تک پہنچی وہاں پوری ریاست کی مکمل خود مختاری کے نظریئے کی بھی بالواسطہ طور پر تشہیر ہوئی۔

مسلح جدوجہد کا نظریہ

کشمیر میں 1949ء کی جنگ بندی کے بعد تحریکِ آزادیٔ کشمیر سیاسی جلسوں، اجلاسوں، اخباری بیانات، پریس کانفرنسوں اور قراردادوں تک محدود ہو گئی تھی اور مسلح جدوجہد کا نظریہ ہی پس منظر میں چلا گیا تھا۔ ہم نے اس نظریئے کو تحریکِ آزادیٔ کشمیر میں شامل کرنے کے لئے این ایل ایف قائم کیا اور اس کے بانیوں نے 13 اگست 1965ء کو پشاور میں ہونے والے اپنے پہلے ہی اجلاس میں مسلح جدوجہد کے نظریئے کو این ایل ایف کی جدوجہد کی بنیاد قرار دیا۔ این ایل ایف کا یہ منشور جس میں مسلح جدوجہد کوجدوجہدِ آزادی کا بنیادی ستون قرار دیا گیا تھا میں نے ہی ڈرافٹ کیا تھا۔ محاذ رائے شماری نے اس نظریئے کو تیرہ ماہ بعد یعنی اپنے قیام سے تقریباً ڈیڑھ سال بعد 1966ء میں زبردست بحث و تکرار کے بعد اور وہ بھی صرف چند ووٹوں کی اکثریت سے منظور کیا تھا۔ بہر حال این ایل ایف کی طرف سے بھارتی جہاز گنگا کے اغوا کے بعد تو این ایل ایف کا ترانہ

"ایک حل ایک امنگ، گوریلا جنگ گوریلا جنگ"
آزادی کا ایک ہی ڈھنگ گوریلا جنگ گوریلا جنگ"

آزاد کشمیر کے نوجوانوں کامقبول ترین ترانہ بن گیا تھا (یہ ترانہ غالباً نذیر انجم کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے)

جنگ آزادی کے تین محاذ

دنیا کی معروف تحاریک آزادی جنگ آزادی کے تین محاذوں پر مصروف جہد رہتی ہیں۔ یہ تین محاذ سیاسی جدوجہد، سفارتی جدوجہد اور مسلح جدوجہد کے محاذ ہیں۔ کشمیر کی تحریک آزادی 1947ء سے 1949ء تک صرف مسلح جدوجہد اور اس کے بعد صرف سیاسی جدوجہد تک محدود ہوگئی تھی۔ 1976ء میں برطانیہ جانے کے بعد میں نے دنیا بھر کی معروف تحاریک آزادی کے طریقۂ کار کامطالعہ کرنے کے بعد تین محاذوں کے اس نظریئے کو لبریشن فرنٹ کے لئے اپنایا اور

اسے اندرون ریاست بھی متعارف کرایا گو اس نظریئے پر اب تک آزاد کشمیر کی کسی اور تنظیم نے عمل نہیں کیا ہے لیکن ہر تنظیم اس کی اہمیت کو محسوس کرتی ہے۔

میرے کشمیر ذرا جاگ

میرپور آزاد کشمیر کے انقلابی شاعر پروفیسر نذیر انجم کی ایک انقلابی نظم کا ایک شعر ہے۔ "ارض کشمیر ذرا جاگ کہ کچھ جاہ پسند۔ غیر کو تیرے مقدر کا خدا کہتے ہیں۔" میں نے شعر کے پہلے لفظ 'ارض' کشمیر کو 'میرے' کشمیر میں تبدیل کر کے اسے اپنی تحریروں میں اتنا استعمال کیا کہ یہ شعر لبریشن فرنٹ کے نظریات کا ترجمان گردانا جانے لگا بلکہ کچھ لوگ شعر کو مجھ سے ہی منسوب کرنے لگے۔ بہر حال اس شعر نے بھی نظریۂ خود مختار کشمیر کو شرف قبولیت بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔

جبری ناطے توڑ دو کشمیر ہمارا چھوڑ دو

ہر تحریک اور جدوجہد آزادی میں مصروف ہر تنظیم کا ایک نعرہ ہوتا ہے جس میں اس تحریک اور تنظیم کے نظریات اور مطالبات کے سمندر کو کوزے میں بند کیا گیا ہوتا ہے۔ کشمیر میں 1946ء کی "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کے دوران "معاہدہ امرتسر کو توڑ دو۔ کشمیر کو چھوڑ دو" کا نعرہ اور حصول پاکستان کی جدوجہد کے دوران "پاکستان کا مطلب کیا لاالٰہ الا اللہ" کا نعرہ ان تحریکوں کی جان بن گئے۔ میں چاہتا تھا کہ ہماری تحریک اور تنظیم کا بھی کوئی ایسا نعرہ ہو جو ہمارے نظریات' اغراض و مقاصد اور مطالبات کی ترجمانی مختصر ترین الفاظ میں کرتا ہو۔ چنانچہ میں نے کافی سوچ وبچار کے بعد "جبری ناطے توڑ دو کشمیر کو چھوڑ دو" کا نعرہ ایجاد کیا اور اسے کتبوں پر لکھنے کے لئے لبریشن فرنٹ لیوٹن (برطانیہ) شاخ کے ایک نوجوان خوشنویس ملک افتخار کے پاس بھیج دیا۔ افتخار نے "کشمیر کو چھوڑ دو" کے الفاظ کی بجائے (بقول اس کے غلطی سے) "کشمیر ہمارا چھوڑ دو" لکھ دیا۔ کتبہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ نعرے کی اصل خوبصورتی تو اسی لفظ "ہمارا" میں ہے۔ چنانچہ ہم نے (1982ء سے ہی) "جبری ناطے توڑ دو' کشمیر ہمارا چھوڑ دو" کے نعرے کو لبریشن فرنٹ کے نعرے کی حیثیت دی اور اسے خوب استعمال کیا۔ جس کے نتیجے میں یہ نعرہ اندرون ریاست خاص کر نوجوانوں میں بہت مقبول ہو گیا ہے۔

ہمارا پیدائشی ناقابل تنسیخ حق خود ارادیت

محکوم قوموں کی آزادی اور خود مختاری کے حق کے لئے بین الاقوامی سطح پر خاص کر اقوام متحدہ کی خط و کتابت اور قراردادوں میں ان قوموں کے "پیدائشی اور ناقابل تنسیخ حق خود ارادیت" "Inherent and inalienable right of self-determination" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ چونکہ ہمارا یعنی کشمیریوں کا حق خود ارادیت پیدائشی اور ناقابل تنسیخ ہی نہیں بلکہ اسے اقوام متحدہ نے بھی تسلیم کیا ہے اور بھارت اور پاکستان نے اسے تسلیم کرنے کے علاوہ ہمیں ہمارا یہ حق دینے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ اس لئے میں لبریشن فرنٹ کی طرف سے بین الاقوامی تنظیموں اور بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کو بھیجے جانے والے مراسلوں کے علاوہ اپنے مضامین اور اخباری بیانات میں بھی "ہمارا پیدائشی ناقابل تنسیخ' موعود اور بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حق خود ارادیت یعنی "Our inherent, inalienable, pledged and internationally recognised right of self-determination" کی اصطلاح استعمال کرتا ہوں تاکہ دنیا کو پتہ چلے کہ مسئلہ کشمیر بھارت اور پاکستان کے مابین کوئی علاقائی تنازعہ نہیں بلکہ ہماری قومی آزادی و خود مختاری کا مسئلہ ہے۔

ریاست کی تاریخ اور جغرافیہ کے بارے میں اعداد و شمار

میں نے ریاست کی تاریخ اور جغرافیہ کے بارے میں اعداد و شمار اقوام متحدہ کی طرف سے جاری کئے گئے اعداد و شمار اور کشمیر کی تاریخ کا تجزیہ کر کے یہ حقائق اخذ کئے کہ ریاست جموں کشمیر کی آبادی دنیا کے 102 آزاد ممالک کی انفرادی آبادی 31 ممالک کی مجموعی آبادی اور پچیس سے زیادہ آزاد مسلم ممالک کی انفرادی آبادی سے زیادہ ہے۔ ریاست جموں کشمیر کا رقبہ دنیا کے 72 ممالک کے انفرادی رقبے سے زیادہ ہے اور کشمیر اپنی طویل تاریخ کے تین چوتھائی سے زیادہ عرصے کے دوران ایک آزاد و خود مختار ملک رہا ہے۔ میں نے اپنے کتابچوں' پمفلٹس اور مضامین کے ذریعہ ان حقائق کی وسیع تشہیر کی جس سے ریاست کی مکمل خود مختاری کے نظریئے کو بڑی تقویت ملی۔

چوتھا باب

میرا مطالعہ

اچھی کتابوں ' معلوماتی مضامین اور اخبار و رسائل کا مطالعہ انسان کو ماضی اور حال سے باخبر رکھنے کے علاوہ انسان کی نظر میں وسعت اور گہرائی پیدا کرتا ہے چنانچہ مطالعہ انسان کے ذہنی نشوونما کے لئے طاقتور اضافی خوراک کی حیثیت رکھتا ہے لیکن بھاری ذمہ داریوں کے حامل انسانوں کے لئے انکی ذمہ داریوں سے متعلق لٹریچر کا مطالعہ ایک اختیاری معاملے کی بجائے ایک امر لازمی کا درجہ رکھتا ہے۔

مسئلہ کشمیر سے متعلق ایک ٹھوس نظریئے (نظریۂ خودمختار کشمیر) اور اس نظریئے کی تکمیل کے لئے ایک ٹھوس طریقۂ کار کے داعی اور دونوں کی علمبردار تنظیم کے سربراہ کی حیثیت سے میرے لئے لازم اور ضروری تھا کہ میں مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر سے بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر تعلق رکھنے والے جملہ معاملات خاص کر کشمیر اور مسئلہ کشمیر کی تاریخ ' تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے نشیب و فراز ' ریاستی عوام کے طرز فکر و عمل ' مسئلہ کشمیر اور متعلقہ معاملات کے بارے میں بھارت اور پاکستان کی اصل اور ظاہری پالیسیوں اور رجحانات ' مسئلہ کشمیر سے متعلق عالمی رائے عامہ اور دنیا بھر کی حکومتوں کی پالیسیوں ' دنیا کی دوسری تحاریک آزادی کو درپیش مشکلات اور ان سے نپٹنے کے لئے ان کے طریقوں ' دوسری تحاریک آزادی اور تاریخ عالم کی اہم شخصیتوں کی سوانح حیات اور سیاسیات عالم کے نئے رجحانات کے علاوہ انسانی نفسیات سے متعلق اچھی کتابوں اور لٹریچر کا بغور مطالعہ کروں لیکن میں ایسا نہیں کر سکا ہوں اور مجھے اپنی اس کمزوری کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ان موضوعات کے بارے میں میرا مطالعہ میری ضرورت کو پورا نہیں کرتا ۔ گو میں کشمیری ' پاکستانی بھارتی اور بین الاقوامی سطح کے اخبارات اور رسائل کا خاصا مطالعہ کرتا رہا ہوں لیکن متذکرہ بالا موضوعات سے متعلق اچھی کتابوں کے مطالعے کے سلسلے میں میرا سکور ایک سینچری سے زیادہ نہیں جو کہ میری ضرورت سے کہیں کم ہے ۔ کتابوں کے مطالعے کے سلسلے میں میری اس محرومی کی بنیادی وجہ تحریک اور تنظیم سے متعلق دوسرے امور کے سلسلے میں مصروفیت ہے۔ ان کتابوں میں سے بھی زیادہ تر میں

نے جیلوں میں اور سفر کے دوران ' بسوں ' ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں میں پڑھی ہیں۔ مجھے
اپنی اس کمزوری کا شدت سے احساس ہے اور تحریک آزادی سے منسلک اپنے ہم وطنوں خاص کر
اہم ذمہ داریوں کے حامل احباب سے میری گذارش ہے کہ وہ اپنی اس اہم ضرورت کے بارے
میں پوری ذمہ داری کا ثبوت دیں۔

پانچواں باب

میری شاعری

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اچھی موسیقی کی طرح اچھے ، بامقصد اور زندگی کے حقائق اور پندو نصائح پر مبنی اشعار انسان کے لئے بہترین ذہنی اور روحانی غذا کا کام دیتے ہیں - چنانچہ اردو میں اقبال اور فیض اور فارسی میں حافظ ، سعدی ، رومی اور عرفی کے اشعار اور کبھی کبھی دوسروں کے بھی میرے لئے ذہنی اور روحانی غذا کا کام ہی نہیں دیتے بلکہ شدید ذہنی پریشانیوں کے دوران میرے لئے سہارا بھی ثابت ہوتے رہے ہیں - چنانچہ جب بھی مسائل میں گھر جاتا ہوں اکیلے میں ان تفکرات سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھنے والے اشعار گنگناتا رہتا ہوں جس سے میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہونے کے علاوہ کبھی کبھی ان اشعار کی روح کی روشنی میں ذہن پر مسلط مسائل کا حل بھی نکل آتا ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی کتاب یا مضمون میں کوئی اچھا شعر نظر آئے اسے دلچسپی سے پڑھتا ہوں اور ذہنی طور پر لطف اندوز ہوتا ہوں۔ کبھی کبھی اپنے مضامین میں بھی مضمون کے مقصد سے تعلق رکھنے والے اشعار شامل کرتا ہوں -

مئی 1986ء میں میں برکسٹن جیل لندن میں قید تنہائی کاٹ رہا تھا - مجھے اس اسیری کے آخری نو ماہ کے دوران باہر سے اخبارات منگانے کی سہولت میسر رہی چنانچہ میں روزنامہ 'جنگ' لندن ،روز نامہ گارڈین اور بین الاقوامی سطح کے کچھ رسالے منگاتا تھا - ایک دن روزنامہ جنگ لندن میں شائع شدہ کچھ اشعار پر نظر پڑی۔ ان میں سے نوابزادہ نصراللہ خان کی ایک نظم کا پہلا مصرعہ "میرا قصور قوم کی عظمت کی بات کی" مجھے بہت پسند آیا - نوابزادہ صاحب نے اس نظم میں اپنے وہ ' قصور' بیان کئے تھے جنکی پاداش میں انہیں مصائب کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہے۔ اس نظم کی روشنی میں میں نے اپنے آپ پر نظر ڈالی تو اپنا آپ بھی ' قصور وار ' نظر آیا - چنانچہ میں نے قلم اٹھایا اور اپنے 'قصوروں ' اور ' جرائم ' پر مشتمل اور نوابزادہ صاحب کی نظم کی ہم قافیہ ایک نظم لکھ ڈالی اور چند دن بعد ہفت روزہ انصاف راولپنڈی کے ایڈیٹر میر عبدالعزیز کو بھیج دی۔ میر صاحب خود بھی شاعر ہیں چنانچہ انہوں نے انصاف میں اس پر خوب تبصرہ کیا۔اس کے بعد احباب نے یہ نظم جیل ہی میں لکھے گئے میرے کتابچے "خود مختار کشمیر کیوں" کے آخر میں شائع کر دی -

میر صاحب کے تبصرے کی روشنی میں میں نے بعد میں اشعار کے الفاظ میں تھوڑا سا رد و بدل کیا۔ بہر حال یہ نظم میری زندگی کی پہلی اور اغلباً آخری شاعری تھی۔
نظم کا عنوان "اقبال جرم" اور متن مندرجہ ذیل ہے۔

"اقبال جرم"

برکسٹن جیل لندن مورخہ 18 مئی 1986ء

اپنا قصور قوم کی عظمت کی بات کی — آزادیٔ وطن کی، امم کی، نجات کی
اپنا جُرم ہے کہ غیر کے آگے نہ جُھک سکے — اپنی خطا ہے فکرِ وطن کی حیات کی
اپنا قصور طوقِ غلامی نہیں قبول — ملتی رہی ہے ہم کو سزا اس ہی بات کی
اک جرم یہ بھی ہے میرا کشمیر ایک ہو — باقی نہ کوئی راہ ہے اس کے ثبات کی
بڈشاہی دور کی تمنا بھی تو جُرم ہے — پر جستجو تو ہم نے اس کی دن و رات کی
اقوام متحدہ کی صفوں میں جگہ ملے — یہ تو ہمارا حق ہے جبھی ڈٹ کے بات کی
پرچم ہمارا پھر سے بلند دنیا بھر میں ہو — گو جہد اس کی جرم ہے پر دن و رات کی
کرسی پرست درس اہنسا کا دیتے ہیں — بٹ نے تو دار پر بھی عقابوں کی بات کی

یہ قید کیا ہے پھانسی بھی منظور ہے امان
ضامن بنے گر اہل وطن کی نجات کی

پانچواں باب

میرے حریت پسند ساتھی

محکوم قوموں کی آزادی کا دارومدار بنیادی طور پر اس بات پر ہوتا ہے کہ قوم کے کتنے افراد حصول آزادی کے لئے بڑی سے بڑی یہاں تک کہ اپنی جان کی بھی قربانی کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ کشمیریوں کی مسلسل غلامی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قوم کی بھاری اکثریت کا ایک بڑا حصہ تو جذبۂ آزادی سے ہی محروم اپنے ذاتی اور عارضی مفادات کے حصول میں سرگرداں ہے اور دوسرا حصہ جذبۂ آزادی رکھنے کے باوجود اس کے حصول کے لئے اعلیٰ درجے کی قربانیاں دینے کا جذبہ نہیں رکھتا۔ (گو اس صورت حال کی ذمہ داری عوام سے کہیں زیادہ ان مفاد پرست لیڈروں پر عائد ہوتی ہے۔ جو انہیں حصول آزادی کی بجائے اپنے ذاتی مفادات کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں) اس کے باوجود ریاست کے دونوں حصوں میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو حصول آزادی کے لئے اپنی زندگی کو داؤ پر لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے درجنوں ایسے افراد کی رفاقت حاصل رہی ہے جنہوں نے حصول آزادی کے لئے ایک سے زیادہ بار اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگایا اور ان میں سے دو نے تو جام شہادت بھی نوش کیا۔ ان عظیم ساتھیوں کے تذکرے کے بغیر نہ تو میری یہ سوانح عمری مکمل ہو سکتی ہے نہ ہی میرا ضمیر اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ میں کتاب میں ان کے خصوصی تذکرے کے ذریعہ انہیں خراج عقیدت پیش نہ کروں۔ ان تمام کی زندگی ہماری تحریکِ آزادیٔ کی قیمتی متاع اور تاریخ تحریکِ آزادی کا ایک سنہری باب ہے۔ حصول آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے زبانی زبانی بلند بانگ دعوے کرنا اور حلف اٹھانا کچھ اور ہے اور عملاً قربانیاں دینا اور اپنی زندگی کو داؤ پر لگانا کچھ اور۔ اگرچہ میرے بہت سے ساتھیوں نے تحریکِ آزادی کے سلسلے میں طویل جیلیں کاٹیں جن کے دوران شدید ترین ذہنی اور جسمانی اذیتیں بھی برداشت کیں اور کچھ خاص کر میر ہدایت اللہ مرحوم اور غلام الدین عشائی مرحوم نے تحریکِ آزادی کے سلسلے میں اپنی اعلیٰ ملازمتوں کو بھی داؤ پر لگایا۔ لیکن اس باب میں انہی حریت پسندوں کا ذکر ہے جنہوں نے تحریکِ آزادی کے لئے اپنی اپنی زندگیوں کو رضاکارانہ طور پر داؤ پر لگایا اور ان میں سے کئی نے ایک سے زیادہ بار لگایا۔

شہید کشمیر مقبول احمد بٹ

مقبول بٹ شہید بھارتی مقبوضہ کشمیر کے قصبہ ترہگام (ضلع کپوارہ) میں پیدا ہوئے۔ بارہمولہ سے بی اے کرنے کے بعد 1958ء یا 1959ء میں پاکستان آئے اور پشاور میں بحیثیت صحافی ایک روزنامہ سے منسلک ہو گئے۔ 1965ء میں محاذ رائے شماری کے نو منتخب پبلسٹی سیکرٹری کی حیثیت سے انہوں نے مجھ سمیت تنظیم کے دوسرے عہدیداروں کے ساتھ بھارتی مقبوضہ کشمیر کی مٹی ہاتھ میں لیکر اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہوئے حلف اٹھایا کہ وہ مادر وطن کی آزادی پر اپنی جان کو قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اب تک وہ واحد شخص ہیں جس نے اس حلف کو عملی جامہ پہنایا۔ 1965ء میں ہی میں نے اور شہید نے میر عبدالقیوم اور میجر امان اللہ کی مدد سے جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ (این ایل ایف) قائم کیا اور اس کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے بٹ صاحب اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جون 1966ء میں مقبوضہ کشمیر گئے جہاں وہ گرفتار ہو گئے۔ ان پر سری نگر کی ایک عدالت میں "کشمیریوں کو بھارت کے خلاف بغاوت کرنے پر اکسانے، بھارت کے خلاف بغاوت کرنے اور ایک انٹیلی جنس افسر کو قتل کرنے" کے الزام میں مقدمہ چلا اور اگست 1968ء میں انہیں اور ان کے ساتھی میر احمد کو سزائے موت سنائی گئی۔ دسمبر 68ء میں وہ سری نگر جیل سے فرار ہو کر آزاد کشمیر پہنچے جہاں انہیں تین ماہ تک زیر حراست رکھنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔ نومبر 1969ء میں وہ جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے صدر منتخب ہو گئے۔ 1971ء میں این ایل ایف نے بھارتی جہاز گنگا اغواء کروایا۔ جس کے نتیجے میں ابتدائی طور پر اس کارنامے کا خیر مقدم ہونے اور مسئلہ کشمیر کے بین الاقوامی سطح پر پھر سے اجاگر ہونے کے بعد پاکستان کی یحییٰ خانی حکومت نے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے این ایل ایف اور محاذ رائے شماری کی ساری لیڈر شپ سمیت سینکڑوں ممبروں کو گرفتار کیا جن میں سے مقبول بٹ سمیت درجنوں افراد کو شاہی قلعہ لاہور اور دلائی کیمپ مظفر آباد کے علاوہ دوسرے عقوبت خانوں میں انسانیت سوز ذہنی اور جسمانی اذیتیں دی گئیں۔ آخر مقبول بٹ سمیت چھ افراد پر مقدمہ چلا اور ان میں سے بٹ صاحب سمیت پانچ افراد کو بری کر دیا گیا۔ مقدمے سے بری ہونے کے بعد بٹ صاحب نے دوسرے احباب سے مل کر این ایل ایف کو دوبارہ منظم کیا اور 1976ء میں حمید بٹ اور ریاض ڈار کو لیکر پھر مقبوضہ کشمیر گئے جہاں بدقسمتی سے پھر گرفتار ہو گئے۔ جس کے بعد انہیں تہاڑ جیل دہلی منتقل کیا گیا۔ جہاں وہ 11 فروری 1984ء کو تختہ دار کو چوم کر امر ہو گئے۔ شہادت سے پہلے بٹ صاحب نے تیرہ سال جیل میں گزارے تھے۔ دس سال بھارتی جیل میں اور تقریباً تین سال پاکستانی جیلوں میں۔

جیسا کہ بٹ صاحب کی شخصیت پر لکھے گئے اپنے کتابچے میں میں نے تفصیل سے لکھا ہے ' وہ ایک انتہائی اعلیٰ پائے کے حریت پسند تھے - ان سے میری تقریباً پچیس سالہ ذاتی ' ذہنی اور نظریاتی رفاقت میری زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ ہے اور خود انہوں نے 1981ء میں برمنگھم کے محمد عارف کے نام تہاڑ جیل سے لکھے گئے اپنے خطوط میں لکھا تھا کہ امان صاحب کے ساتھ میرے مضبوط قلبی اور ذہنی رشتے کو وقت کی گرد اور دوسرے عوامل کمزور نہیں کر سکتے۔

ہر عظیم انسان کی طرح بٹ صاحب بھی اپنوں اور پرائیوں کے تیروں کا نشانہ بنتے رہے۔ محاذ رائے شماری میں ان کے کچھ ساتھیوں نے 1976ء میں ان کے مقبوضہ کشمیر جانے کے بعد ان سے اور ان کی سرگرمیوں سے لا تعلقی کا اعلان کر کے بھارت کو ان کے خلاف ایک مؤثر ہتھیار فراہم کیا جسے بھارت نے مقبوضہ کشمیر کے عوام میں بٹ صاحب کے امیج کو مسخ کرنے کے لئے کامیابی سے استعمال کیا اور جب بٹ صاحب نے شہید ہو کر عالمی شہرت حاصل کی تو یہی لوگ ان کی شہرت کو اپنا سیاسی قد اونچا کرنے کے لئے استعمال کرنے لگے۔

بہرحال مقبول بٹ جدید کشمیر کے عظیم ترین سپوتوں میں سے ایک تھے۔

اورنگ زیب شہید

اورنگ زیب شہید گلگت کے علاقہ استور میں پیدا ہوئے ان کی والدہ استور کی تھیں - جب کہ والد محمد ایوب خان آفریدی پشاور کے مضافاتی گاؤں پندو سے آ کر استور میں آباد ہوئے تھے۔ اورنگ زیب کی ایک خالہ سری نگر میں تھیں۔ اورنگ زیب بچپن سے ہی انتہائی نڈر تھا۔ 1965ء میں وہ اسلامیہ کالج پشاور کا طالب علم تھا - جہاں ان کی ملاقات میجر امان اللہ اور مقبول بٹ سے ہوئی - این ایل ایف قائم ہو چکا تھا اور بٹ صاحب وغیرہ مقبوضہ کشمیر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ تحریکِ آزادئ کشمیر کا ذکر چھڑا تو اورنگ زیب نے حسب عادت کہا جب تک کشمیر کے لئے خون نہیں بہایا جاتا۔ اس وقت تک آزادی ناممکن ہے - بہرحال کچھ مدت بعد اورنگ زیب این ایل ایف میں شامل ہو گئے اور جون 1966ء میں بٹ صاحب کے ساتھ سری نگر جانے کے لئے مظفر آباد روانہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے آزاد کشمیر ریگولر فورسز کے کمیشن کا امتحان دیا تھا۔ وہ مظفر آباد میں ہی تھے کہ کمیشن کے امتحان میں پاس ہونے کی اطلاع ان کے گھر آ گئی۔ والد نے انہیں اس بارے میں مطلع کیا تو اورنگ زیب والد کو یہ جواب بھیج کر کہ مجھے اے کے آر ایف سے کہیں بڑا کمیشن ملا ہے اور میں اس سلسلے میں اپنے محاذ جنگ پر جا رہا ہوں' مقبوضہ کشمیر روانہ ہو گئے۔

مقبوضہ کشمیر میں وہ تین ماہ تک مقبول بٹ کے ساتھ پوری وادی میں گھومتے اور این

ایل ایف کو منظم کرتے رہے۔ آخر ستمبر میں حسب پروگرام آزاد کشمیر کی طرف واپس آ رہے تھے کہ سو پور کے نزدیک انہیں معلوم ہوا کہ بھارتی انٹیلی جنس سے تعلق رکھنے والے ایک کشمیری پنڈت امرچند کو ان لوگوں کی وادی میں موجودگی کا علم ہوا ہے اور وہ ان کی تلاش میں ہے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ وہ کوئی شرارت کرتا بٹ صاحب وغیرہ نے اسےاس کے گھر سے گرفتار کیا اور اپنے ساتھ لے کر سینئر فائر لائن کی طرف چل دیئے۔ اطلاعات کے مطابق راستے میں امرچند نے پیشاب کرنے کے بہانے بھاگنے کی کوشش کی تو اورنگ زیب سے اس کی جھڑپ ہو گئی۔ جس سے اورنگ زیب کا چاقو اس کے سینے میں اتر گیا اور امرچند وہاں ہی مر گیا۔ کہتے ہیں امرچند 1947ء میں قبائل حملے کے وقت مسلمان ہو گیا تھا اور قبائل کی واپسی پر اس نے بھارتی فوج کو ان تمام مسلمانوں کے نام بتائے۔ جنھوں نے قبائل کی مدد کی تھی یا ڈوگرہ راج سے آزادی کے لئے کام کیا تھا۔ چنانچہ یہ سارے مسلمان گرفتار کر لئے گئے تھے۔ اورنگ زیب کو اس بارے میں بھی علم تھا۔ چنانچہ امرچند سے اسے ویسے بھی شدید نفرت تھی۔ بد قسمتی سے دوسری صبح کو ہی امرچند کی لاش پر کسی کی نظر پڑ گئی اور اس کی اطلاع بھارتی قابض فوج کو ہوئی تو اس نے فوراً ہی ایک سو مربع میل علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لیااور اپنا دائرہ تنگ کرتی رہی۔ ادھر غلام محمد ڈار نامی ایک شخص جو اصل میں بھارت اور پاکستان دونوں کے لئے جاسوسی کا کام کرتا تھا' کسی طرح بٹ صاحب کے گروپ میں شامل ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے بھارتی فوج کووہ جگہ بتائی جہاں بٹ صاحب اور ساتھی روپوش تھے۔ بھارتی فوج نے اس مکان کو گھیرے میں لے لیا۔ بھارتی بٹ صاحب اور ساتھیوں کر گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن اورنگ زیب سے نہ رہا گیا اور اس نے مکان کے اندر سے ہی بھارتی فوج پر گولیاں برسا کر کئی فوجیوں کو ڈھیر کر دیا۔ جب اس کا اسلحہ ختم ہو گیا تو چھرا لے کر باہر نکلا اور اس سے بھی چند ایک پر وار کیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر بھارتی فوج کے ایک افسر نے اورنگ زیب پر برین گن کا ایک پورا برسٹ فائر کیا جس سے اورنگ زیب کا جسم چھلنی ہو گیا اور یہ عظیم حریت پسند وہاں ہی شہید ہو گیا جس کے بعد بٹ صاحب اور میر احمد نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اپنے آپ کو بھارتی فوج کے حوالے کریں۔

اورنگ زیب جیسے عظیم نوجوان تحریکِ آزادیٔ کشمیر کا بہترین سرمایہ ہیں۔

صوبیدار کالا خان

آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد سے کچھ فاصلے پر واقع ایک گاؤں ساریاں کا رہنے والا یہ مجاہد 1947ء میں کشمیر کی جنگِ آزادی کے شمال مغربی محاذ (ٹیٹوال محاذ) پر اپنی جرأت بہادری

اور جنگی مہارت کے کرتب دکھا چکا تھا - اپنے گروپ کے ساتھ کپوارہ تک پہنچا تھا۔ میں ان دنوں ہندواڑہ میں پڑھتا تھا - وہاں کالا خان کا نام زبان زد عام تھا - بھارتی سورماؤں کے لئے کالا خان کا نام عزرائیل کی حیثیت رکھتا تھا - چنانچہ بھارتی فوج اس علاقے کی طرف جانا بھی اپنی موت سمجھتی تھی جہاں کالا خان کی موجودگی کا امکان ہوتا - بدقسمتی سے کالا خان کو کمک اور اسلحہ نہیں ملا۔ اس لئے اسے پیچھے آنا پڑا - اس کے باوجود ضلع مظفر آباد کے شمالی علاقے کی آزادی میں کالا خان اور اس کے ساتھیوں کا اہم کردار تھا - 1966ء میں کالا خان میجر امان اللہ کی وساطت سے این ایل ایف میں شامل ہوا اور مقبول بٹ صاحب کے ساتھ مقبوضہ کشمیر چلا گیا - مقبول بٹ اور میر احمد کی گرفتاری اور اورنگ زیب کی شہادت کے دن وہ ان سے الگ ایک اور مکان میں تھا۔غلام محمد ڈار نے اس کی بھی مخبری کی تو بھارتی فوج نے اس مکان کا بھی محاصرہ کیا۔ چنانچہ کالا خان نے بھارتی فوج پر گولیاں برسائیں کئی بھارتی فوجیوں کو ڈھیر کر دیا اور اسی دوران خود بھی شدید زخمی ہو گیا - جس کے بعد بھارتی فوج نے اسے گرفتار کیا - 1968ء میں اسے سری نگر کی عدالت نے عمر قید کی سزا دی - سری نگر جیل میں تقریباً سات سال کی قید کاٹنے کے بعد انہیں قیدیوں کے تبادلے میں پاکستان لایا گیا - جہاں حکومت پاکستان نے انہیں کچھ دن حراست میں رکھنے کے بعد رہا کیا - 29 نومبر 1982ء کو یہ عظیم مجاہد ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گیا۔

میر احمد عرف یاسین

مقبوضہ کشمیر کے قصبہ بارہمولہ کے نزدیک ایک گاؤں کا یہ نوجوان 1966ء میں مقبول بٹ کی مقبوضہ کشمیر میں موجودگی کے دوران حریت پسندوں کے گروپ میں شامل ہو گیا اور مقامی ہونے کی حیثیت سے اسے حاصل معلومات کے ذریعہ این ایل ایف کے گروپ کی مدد کرتا رہا۔ آخر ستمبر 1966ء میں مقبول بٹ شہید کے ساتھ ہی گرفتار ہو گیا اور سری نگر کی عدالت نے اسے بھی مقبول بٹ کے ساتھ سزائے موت سنائی لیکن اس سزائے موت پر عمل ہونے سے پہلے ہی وہ مقبول بٹ اور لیپہ ضلع مظفر آباد کے چوہدری محمد یاسین (جو 1965ء سے سری نگر جیل میں تھا) کے ساتھ دسمبر 1968ء میں سری نگر جیل سے فرار ہو کر آزاد کشمیر پہنچا - جہاں اسے بھی گرفتار کیا گیا اور مظفر آباد قلعے میں اس پر انسانیت سوز تشدد کیا گیا - رہائی کے بعد کچھ مدت کراچی میں رہا - اس کے بعد میر پور چلا گیا اور آج کل پھر کراچی میں ہے اور محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پال رہا ہے۔ میر احمد غریب ہی سہی لیکن تحریک آزادی کے لئے اس کی سابقہ قربانی اور جذبہ انتہائی قابل قدر ہیں۔

اشرف قریشی ہاشم قریشی

نوہٹہ سری نگر کے ان دو نوجوانوں نے جنوری 1971ء میں بھارتی ہوائی جہاز گنگا کو جب وہ سری نگر سے دہلی کی طرف پرواز کر رہا تھا ہائی جیک کر کے لاہور پہنچایا۔ جس کے نتیجے میں سردخانے میں پڑا ہوا مسئلہ کشمیر آنا" فانا" ایک بار پھر دنیا کے سامنے آگیا - جہاز کو اغواء کرنا کوئی معمولی کام نہیں ایسا کرنے والے اپنی جان کو داؤ پر لگاتے ہیں - گنگا کے اغواء کے بعد دو ماہ تک تو مسئلہ کشمیر برصغیر اور بین الاقوامی اخبارات کی زینت بنا رہا - اس کے بعد حکومت پاکستان نے ہائی جیکروں سمیت این ایل ایف اور محاذ رائے شماری کے سینکڑوں ممبروں کو گرفتار کیا اور دوسرے افراد کے ساتھ ان دونوں پر شاہی قلعہ لاہور میں انسانیت سوز تشدد کیا گیا - اس کے بعد ان کے اور دوسرے افراد کے خلاف ایک خصوصی عدالت میں مقدمہ چلا - جس میں اشرف قریشی کو تو بری کر دیا گیا البتہ ہاشم قریشی کو 14 سال کی سزا دی گئی۔ جس کے خلاف اپیل کی گئی۔ اپیل کی سماعت 9 سال بعد 1980ء میں ہوئی تو سپریم کوٹ نے ہاشم قریشی کی رہائی کا حکم دے دیا۔ 1982ء میں آزاد کشمیر پاکستان میں لبریشن فرنٹ کے قیام کے بعد ہاشم قریشی اس میں شامل ہو گیا اور 1986ء سے ہالینڈ میں مقیم ہے۔ اشرف قریشی نے رہائی کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے کے جیالوجی میں ایم ایس سی کیا اور آجکل پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ کشمیری زبان میں لیکچرر ہیں - دونوں نے پاکستان میں کشمیری خاندانوں میں شادیاں کیں اور اب بچوں والے ہیں۔

حمید بٹ اور ریاض ڈار

شہید کشمیر مقبول بٹ 1976ء میں جن دو نوجوانوں کو اپنے ساتھ مقبوضہ کشمیر لے گئے تھے ان میں سے ایک کا نام عبدالحمید بٹ اور دوسرے کا نام ریاض احمد ڈار ہے یہ دونوں شہید مقبول بٹ کے ساتھ ہی لنگیٹ ہندوارہ میں گرفتار ہوئے اور گذشتہ تقریباً گیارہ سال سے مقبوضہ کشمیر میں پس دیوار زنداں ہیں۔ عبدالحمید بٹ کے والدین 1947ء میں صوبہ جموں سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور اب میرپور آزاد کشمیر میں آباد ہیں۔ این ایل ایف سے منسلک ہونے کے وقت عبدالحمید بٹ آزاد کشمیر میں سرکاری ملازم تھے لیکن حصول آزادی کے لئے وہ ملازمت کو ٹھوکر مار کر قافلۂ حریت میں شامل ہو گئے۔ ریاض احمد ڈار کے والدین مقبوضہ کشمیر کے علاقہ ترہگام (مقبول بٹ شہید کا آبائی قصبہ) سے آکر پشاور میں آباد ہوئے ہیں۔

اگرچہ میں ان دونوں حریت پسندوں سے سرسری طور پر ہی واقف ہوں لیکن ان کا جذبہ حب الوطنی اور جذبہ قربانی قابل تحسین اور قابل تقلید ہے۔

محمد صدیق بھٹی

برمنگھم برطانیہ میں مقیم ڈڈیال میرپور آزاد کشمیر کا محمد صدیق بھٹی ایک عظیم حریت پسند ہے اور آجکل بھارتی سفارت کار راوندرا مہاترے کے اغوا کے سلسلے میں طویل مدت کی قید کاٹ رہا ہے۔ سب سے پہلے جون 1977ء میں لندن میں ہمارے مظاہرے کے دوران انڈیا ہاؤس (بھارتی ہائی کمیشن) پر پتھراؤ کے سلسلے میں گرفتار ہوا تھا - اس سلسلے میں اس کے دو اور ساتھی ناظم اور ریاست بھی گرفتار ہوئے تھے - اس کے بعد جب 1981ء میں دہلی سے خبر آئی کہ مقبول بٹ کو پھانسی دی جا رہی ہے تو صدیق بھٹی نے اپنے چند اور ساتھیوں کے ساتھ ان کی رہائی کے لئے اپنی زندگی کو داؤ پر لگایا۔ مقبول بٹ رہا تو نہ ہو سکے لیکن ان کاروائیوں اور سفارتی سطح پر ہماری کوششوں کے نتیجے میں بٹ صاحب پھانسی سے بچ گئے۔

1984ء میں جب وہ گرفتار ہو گیا تو اس کی وکیل نے مجھے بتایا کہ صدیق اسے بار بار کہتا رہا کہ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں لمبی سزا کاٹنے کے لئے تیار ہوں - البتہ مجھے صرف یہ فکر ہے کہ اس معاملے کی وجہ سے ہماری تحریک اور تنظیم کو کوئی نقصان نہ پہنچے، جب عدالت نے اسے بیس سال اور سات سال کی سزا سنائی تو صدیق (v) وی کا نشان بنا کر مسکراتے ہوئے عدالت کے کمرے سے ساتھ والے حوالات کی طرف چلا گیا - جیل میں میں نے اس سے طویل ملاقات کی تو اس دوران بھی اسی بات پر زور دیتا رہا کہ کم از کم میری فکر نہ کریں میں یہ قید خاموشی سے کاٹ لوں گا۔ البتہ اس بات کا خیال رکھیں کہ تحریکِ آزادی آگے ہی بڑھتی رہے۔ مجھے اپنی برطانیہ بدری کے بعد بھی اس کے خط ملتے رہے ہیں جو اس کے انتہائی بلند حوصلے کے آئینہ دار ہیں۔ صدیق بھٹی سراپا حریت پسند ہے - اپنے خاندان کا واحد کفیل ہونے کے باوجود اس کی یہ قربانیاں یقیناً اس کی عظمت کی آئینہ دار ہیں۔

ریاض ملک

ہمارے ایک انتہائی عظیم ساتھی ملک محمد شفیع آف کرتی کوٹلی آزاد کشمیر حال لیوٹن برطانیہ کے عظیم فرزند محمد ریاض ملک 1984ء تک ایک کھلنڈرے نوجوان تھے - لیسٹر پولی ٹیکنک میں زیرِ تعلیم تھے - سفارت کار کے اغوا کے سلسلے میں فروری 1984ء کے اواخر میں ہونے والی گرفتاریوں کے چند دن بعد ایک دن عدالت میں ہمیں یہ سن کر حیرانگی ہوئی کہ ریاض ملک کو بھی گرفتار کیا گیا ہے اور جب واقعات سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ ریاض پر یہ الزام ہے کہ بھارتی

سفارت کار کے اغوا سے لے کر قتل تک ریاض اس کے پاس رہا ہے - یہاں تک کہ اسے دوائی بھی کھلاتا رہا ہے - اس کی گرفتاری سے لے کر عدالت کے فیصلے تک میں اسے جیل میں ملتا رہا اور ہمیشہ اسے بلند حوصلہ پایا - اسے عدالت نے ایک عمر قید اور بارہ سال کی سزا دی تو مسکراتے ہوئے حوالات کی طرف چل دیا۔ اس کے بعد مجھے اس کے خط ملتے رہے - میری برطانیہ بدری کے بعد بھی مجھے اس کے خط ملتے رہے ہیں - جن سے اس کے بلند حوصلے کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوران اسیری اس نے ایک امتحان بھی پاس کیا ہے - ریاض جیسے نوجوانوں پر قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

راجہ عبدالقیوم

کھوئی رٹہ کوٹلی آزاد کشمیر کا یہ خوش شکل اور جوشیلا نوجوان 1981ء میں لبریشن فرنٹ میں شامل ہوا - ان دنوں وہ سٹٹ گارٹ مغربی جرمنی میں تھا - میری پہلی ملاقات بھی اس سے سٹٹ گارٹ میں ہی ہوئی ۔ اس کے بعد وہ فرانس منتقل ہوا ۔ فرانس میں قیام کے دوران اس نے مقبول بٹ شہید کو رہا کرانے کے لئے اپنی جان کو داؤ پر لگایا لیکن وہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ جنوری 1984ء میں برطانیہ آیا اور میں اس کی خواہش کے مطابق اسے برطانیہ میں مستقل رہائش کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا - اسی دوران بھارتی سفارت کار کے اغوا کا واقعہ ہوا اور مجھے خاصی دیر بعد معلوم ہوا کہ راجہ قیوم بھی اس میں ملوث تھا - ہم نے اسے برطانیہ سے باہر نکالنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ اس کوشش کے دوران ہی (اپنی چھوٹی سی لاپرواہی کی وجہ سے) گرفتار ہو گیا - مہاترے کے اغوا کے سلسلے میں جس کے خلاف پہلا پرچہ کٹا وہ راجہ قیوم ہی تھا - اس کی گرفتاری کے چند دن بعد (مہاترے کے اغوا کے تین ہفتے بعد) دوسرے افراد بھی گرفتار ہو گئے - عدالت نے راجہ قیوم کو عمر قید اور اٹھارہ سال کی سزا دی۔ اپیل پر چار سال کی تخفیف ہوئی - عدالت سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے بھی میری طرف دیکھتے ہوئے (V) وی کا نشان بنایا اور اونچی آواز میں کہا یہ سزا تو کچھ بھی نہیں۔

راجہ قیوم جذباتی ہے ، محب وطن ہے ، حریت پسند ہے ، ساتھ ہی سیمابی طبیعت کا مالک بھی۔ سیمابی طبیعت کے مالک لوگ عموماً شکی مزاج ہوتے ہیں اور بدقسمتی سے راجہ قیوم بھی اس خامی سے مبرا نہیں جس سے کچھ مفاد پرست استفادہ کر کے اس سے میرے خلاف صریحاً" بے بنیاد الزامات لگواتے رہے اس کے باوجود میرے دل میں اس کے لئے اب بھی پیار اور احترام کے سوا کچھ نہیں۔

جہانگیر مرزا اور مجید انصاری

برمنگھم میں مقیم میرپور آزاد کشمیر کے ان دو نوجوانوں کو بھی بھارتی سفارت کار کے اغوا کے سلسلے میں تین سال اور دو سال کی سزا ہوئی تھی اور دونوں اپنی یہ سزا کاٹ کر رہا ہوئے ہیں۔ اگرچہ رہائی کے کچھ عرصے بعد اہل خاندان کی طرف سے دباؤ سمیت کچھ وجوہات کی بنا پر رسمی طور پر لبریشن فرنٹ سے الگ ہو کر تحریک آزادی سے ہی لا تعلق ہو گئے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی قربانیوں اور سابقہ حریت پسندی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

چھٹا باب

عالمی سطح پر میرے واقف کار

تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے سلسلے میں میری سرگرمیوں کے دوران پاکستان میں اور بیرون پاکستان بہت سے زعماء سے میرے سیاسی اور ذاتی تعلقات قائم ہوئے ان اصحاب میں سے اکثر نے تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے سلسلے میں میری خاصی مدد اور حوصلہ افزائی کی جس کے لئے میں ان کا از حد مشکور ہوں - ان میں سے اہم شخصیتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

پاکستان سے باہر کے زعماء

جناب صادق المہدی - وزیراعظم سوڈان

صادق المہدی مشہور سوڈانی حریت پسند مہدی سوڈانی (جنہوں نے کئی بار سوڈان کے انگریز قابضوں کے دانت کھٹے کئے) کے پوتے ہیں اور دو بار سوڈان کے وزیراعظم رہے ہیں - ان سے میری پہلی ملاقات 1979ء میں لندن میں محکوم مسلم ممالک کی آزادی سے متعلق بین الاقوامی کانفرنس میں ہوئی تھی جس میں میں بھی کشمیری وفد کے سربراہ کی حیثیت سے شریک تھا۔ صادق المہدی صاحب کو اس کانفرنس کی سیاسی کمیٹی کا چیئرمین چُنا گیا تھا - جبکہ میرے سمیت ہر وفد کے کچھ ممبر کمیٹی کے ممبر تھے - سیاسی کمیٹی کے پہلے ہی اجلاس میں صادق المہدی صاحب کی تجویز پر مجھے کمیٹی کا سیکرٹری چُنا گیا - چنانچہ کمیٹی کی طرف سے کانفرنس میں پیش ہونے والی قراردادیں میں نے اور صادق المہدی نے رات کو ان کے کمرے میں ڈرافٹ کر کے صبح کمیٹی سے منظور کرائیں - ان سے اس کانفرنس کے بعد بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور انہوں نے ہر جگہ کشمیریوں کے حق خودارادیت کی حمایت کی - صادق المہدی صاحب کا شمار عالم اسلام کے صف اول کے سیاسی مفکرین میں ہوتا ہے۔

سالم عزام - سیکرٹری جنرل اسلامک کونسل

جناب سالم عزام سیکرٹری جنرل اسلامک کونسل لندن ایک عظیم الشان اور بہت اچھے مسلمان ہیں۔ پیدائش مصر کی ہے لیکن اب سعودی عرب کے شہری ہیں - البتہ مستقل قیام لندن میں ہے۔ کچھ مدت تک برطانیہ میں سعودی عرب کے سفیر بھی رہے - عالم اسلام کے مسائل خاص کر محکوم مسلمان قوموں کی آزادی سے انہیں گہری دلچسپی ہے - اپنے قیام برطانیہ کے دوران میرے ان سے بہت قریبی تعلقات رہے - اسلامک کونسل کے زیر اہتمام ہونے والی ہر کانفرنس میں وہ مجھے مدعو کرتے اور ہر کانفرنس کی افتتاحی تقریر میں کشمیریوں کے حق خودارادیت کا ذکر ضرور کرتے اور ہر کانفرنس میں اس کے حق میں قرارداد منظور کراتے تھے - انہوں نے ایک سے زیادہ بار ذاتی حیثیت سے لبریشن فرنٹ کی مالی مدد بھی کی اور مقبول بٹ شہید کو تختۂ دار سے بچانے کے لئے بھی بڑی کوششیں کیں -

ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان

خالصتان کی جلاوطن حکومت کے بانی صدر ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان سے میرے کئی سال تک گہرے مراسم رہے - میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ تحریک خالصتان کے جلسوں اور جلوسوں میں ڈاکٹر صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہمارے جلسوں اور جلوسوں میں شرکت کرتے رہے۔ وہ ایک انتہائی مخلص اور اصول پرست حریت پسند ہیں - سیاسی کے علاوہ ہم دونوں کے مابین گہرے ذاتی تعلقات بھی قیام رہے - میری برطانیہ بدری کے بعد بھی میرا ان سے رابطہ رہا۔

نور مسواری

فلپائنی مسلمانوں کی انقلابی اور سب سے اہم تنظیم مورو نیشنل لبریشن فرنٹ اور فلپائنی مسلمانوں کی باغی حکومت کے سربراہ نور مسواری سے میری پہلی ملاقات 1979ء میں لندن میں ہوئی اور اس کے بعد اسلام آباد میں۔ دونوں بار کئی کئی دن تک ساتھ رہا - نور مسواری ایک نڈر انقلابی ہیں اور تحریکِ آزادئ کشمیر سے بھی انہیں خاصی دلچسپی ہے - ان کی تنظیم کو اسلامی کانفرنس میں مبصر کا درجہ حاصل ہے۔

احمد بن بیلا

الجزائر کی جنگ آزادی کے ہیرو۔ آزاد الجزائر کے پہلے صدر اور اب بین الاقوامی اسلامی کمیشن برائے انسانی حقوق کے چیئرمین جناب احمد بن بیلا سے میری ملاقاتیں لندن میں ہوئیں۔ ایک انقلابی کی حیثیت سے انہیں تحریکِ آزادیٔ کشمیر سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ اسلامی کمیشن کے سربراہ کی حیثیت سے انہوں نے شہید کشمیر مقبول احمد بٹ کو تختہ دار سے بچانے کی بھی بڑی کوشش کی۔

پروفیسر کورکوت اوزل

ترکی کے سابق وزیر داخلہ - وہاں کی اہم ترین اسلامی سیاسی تنظیم کے نائب سربراہ اور مشہور مفکر پروفیسر کورکوت اوزل (ترکی کے موجودہ وزیراعظم ترکوت اوزل ان کے چھوٹے بھائی ہیں) سے میری پہلی ملاقات 1979ء میں ہوئی اور ہم اس کے بعد بھی ملتے رہے پروفیسر اوزل عالم اسلام کے عظیم مفکرین میں سے ہیں اور انہیں تحریکِ آزادیٔ کشمیر سے بھی گہری دلچسپی ہے اکثر عالمی اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کرتے ہیں اور اپنی ہر تقریر میں تحریکِ آزادیٔ کشمیر کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔

پروفیسر اسماعیل فاروقی مرحوم

فلسطینی نژاد امریکی اور عالم اسلام کے عظیم دانشور، مورخ اور مفکر پروفیسر اسماعیل فاروقی مرحوم سے بھی میری پہلی ملاقات 1979ء میں ہوئی جس کے بعد ہمارے مابین ذاتی تعلقات قائم ہوئے۔ دسمبر 1979ء میں لندن میں ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں اس بات پر مذاکرہ بلکہ مناظرہ ہوا کہ یروشلم پر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں میں سے کس کا حق سب سے زیادہ ہے۔ مسلمانوں کی نمائندگی پروفیسر فاروقی کر رہے تھے۔ جبکہ عیسائیوں کے دونوں فرقوں (پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک) اور یہودیوں کے عالمی سطح کے عالم ان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس مذاکرے میں یروشلم کے مسلمانوں کے پاس رہنے کے حق میں پروفیسر فاروقی نے اتنے مدلل اور ٹھوس تاریخی، مذہبی، سیاسی اور عملی جواز پیش کئے کہ تینوں مذہبوں کے پیروکاروں پر مشتمل ہزاروں سامعین نے محسوس کیا کہ یروشلم پر سب سے زیادہ حق مسلمانوں کا ہے۔ مذاکرے کے بعد جب میں نے مسلمانوں کی بہترین نمائندگی کرنے پر پروفیسر صاحب کو مبارکباد دی تو مجھ سے

لپٹ کر انتہائی جذباتی انداز میں کہنے لگے آج کا دن میری زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ پروفیسر صاحب کو فلسطین کی آزادی کے ساتھ ساتھ کشمیر کی آزادی سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ انہیں چند سال قبل صیہونیوں نے ان کی اہلیہ سمیت قتل کرا دیا۔

غازی خانقان

غازی خانقان صاحب عرب نژاد امریکی ہیں۔ ایک عظیم انسان' اچھے مسلمان اور اچھے عرب ہیں۔ نیو یارک کا ایک ریڈیو اسٹیشن ہر جمعہ کو ایک گھنٹے کے لیے کرایہ پر لیکر اس سے وائس آف اسلام کے نام سے پروگرام نشر کرتے ہیں۔ جن میں عالم اسلام کی اہم خبریں اسلامی دنیا کے مسائل پر مذاکرے اور اسلامی دنیا کی اہم شخصیتوں خاص کر وزرائے خارجہ اور مسلم ممالک کی تحاریک آزادی کے سربراہوں کے انٹرویو شامل ہوتے ہیں۔ انہوں نے 1979ء میں میرا تقریباً ایک گھنٹے کا انٹرویو نشر کیا۔ جس میں میں نے مسئلہ کشمیر کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے علاوہ مسئلہ فلسطین پر اپنے مؤقف کی بھی وضاحت کی۔ جس کے خلاف انہیں یہودیوں کے بہت سے احتجاجی خط آئے۔ انہیں امریکی یہودیوں کی طرف سے دھمکیاں مسلسل ملتی رہتی ہیں لیکن وہ اس کی پرواہ کئے بغیر اپنا مشن جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کشمیریوں کی آزادی سے انہیں خصوصی دلچسپی ہے۔ 1979ء میں مجھے ان ہی کی کوششوں سے اقوام متحدہ کے پریس روم میں پریس کانفرنس سے خطاب کرنے کا موقع ملا تھا۔ "وائس آف اسلام" پروگرام کا سارا خرچ خود برداشت کرتے ہیں۔

دوسری شخصیات

درج بالا شخصیات کے علاوہ میری شام کے سابق وزیراعظم دوالبی ، یوگو سلاویہ کے مفتی اعظم احمد یوسف حمدی' مشہور نومسلم سکالر محمد اسد۔ رابطہ عالم اسلامی کے سابق اور موجودہ سیکرٹری جنرل محمد علی الحرکان اور ڈاکٹر نصیف' امریکی مسلمانوں کے مشہور لیڈر ہشام جابر' دنیا کے تقریباً بیس ممالک کے وزرائے خارجہ' اقوام متحدہ ، لندن اور اسلام آباد میں متعین تقریباً ایک سو ممالک کے سفیروں' اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سابق صدر اور تنزانیہ کے وزیر خارجہ سلیم احمد سلیم' اقوام متحدہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل اٹلی کے مسٹر پکو' برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر کالاہان' پی ایل او کے وزیر خارجہ فاروق خدومی' برطانیہ اورڈنمارک کے بہت سے ممبران پارلیمنٹ سے مسئلہ کشمیر پر تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں ہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ممبران ٹیری ڈیوس' ڈینس ہاول اور لارڈ جیفورڈ اور پی ایل او کے سربراہ یاسر عرفات کے مذہبی امور کے مشیر

ابوہشام صاحب سے قریبی مراسم رہے ہیں اور بھارت کے مشہور لیڈر آنجہانی جے پرکاش نارائن سے ایک تفصیلی ملاقات اور خط و کتابت رہی ہے۔

پاکستانی زعماء

پاکستان میں میرے بہت سے سیاستدانوں، صحافیوں، ادیبوں اور شعراء سے قریبی یا رسمی تعلقات رہے ہیں۔ سیاست دانوں میں جن لوگوں سے قریبی ذاتی اور سیاسی تعلقات رہے ہیں۔ ان میں سابق وزیر خارجہ آغا شاہی' پاکستان پیپلز پارٹی کے ملک معراج خالد' (سابق وزیراعلیٰ پنجاب) جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد اور ڈاکٹر خورشید احمد' پاکستان مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل اقبال احمد خان' قومی محاذ آزادی کے سربراہ معراج محمد خان' پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے سربراہ عابد حسن منٹو اور کسان مزدور پارٹی کے سربراہ فتحیاب خان شامل ہیں۔ جن دوسرے سیاسی لیڈروں سے رسمی ملاقات یا خط و کتابت رہی ہے۔ ان میں پاکستان کے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم (ان سے دو انتہائی دلچسپ اور طویل ملاقاتوں کے علاوہ خط و کتابت بھی رہی) خان عبدالولی خان، مولانا مفتی محمود مرحوم' مولانا غلام غوث ہزاروی مرحوم' مولانا شاہ احمد نورانی' خان عبدالقیوم خان مرحوم' عبدالحمید بھاشانی مرحوم' شیخ مجیب الرحمٰن مرحوم' خیر بخش مری اور عطاء اللہ مینگل (یہ سب پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کے سربراہ ہیں یا تھے) شامل ہیں۔ مشہور شیعہ عالم علامہ رشید ترابی مرحوم سے بھی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔

پاکستان کے جن سینئر صحافیوں سے میری ملاقاتیں رہی ان میں جنگ کے میر خلیل الرحمٰن' نوائے وقت کے مجید نظامی، پاکستان ٹائمز کے خواجہ آصف، اردو ڈائجسٹ کے الطاف حسن قریشی' تکبیر کے محمد صلاح الدین' خیبر میل کے عسکری علی شاہ' قومی ڈائجسٹ کے مجیب الرحمٰن شامی اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلٹس کے سربراہ منہاج برنا شامل ہیں۔ مشہور شعراء میں سے فیض احمد فیض' جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری' کالم نگاروں میں سے پروفیسر وارث میر اور ابراہیم جلیس اور ادیبوں میں حمید کاشمیری سے علیک سلیک رہی ہے۔

ساتواں باب

زندگی کے کچھ یادگار اور سبق آموز واقعات

انسان کی زندگی میں پیش آنے والے کچھ واقعات اس کے دل و دماغ پر گہرے نقش مرتب کرتے ہیں ۔ کچھ انتہائی سبق آموز ہوتے ہیں اور کچھ انتہائی متاثر کن ۔ میرے ساتھ بھی ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں ۔ چند ایک کی تفصیلات ملاحظہ ہوں ۔

1 - میں جب 1950ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد سرٹیفکیٹ لینے کے لئے سکول گیا تو واپسی پر میرے ایک محترم استاد سکول گراؤنڈ کے گیٹ تک میرے ساتھ آئے اور راستے میں مجھ سے کچھ یوں مخاطب ہوئے - "امان اللہ ! تم ایک ذہین اور محنتی نوجوان ہو - اس لئے تمہیں سکول سے رخصت کرتے وقت چند نصیحتیں کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں - اسے انسان کی خوش قسمتی سمجھو یا بد قسمتی کہ وہ اس دنیا میں صرف ایک بار آتا ہے جبکہ اس کے سامنے یہ زندگی گذارنے کے لئے بہت سے راستے ہیں یعنی دولت حاصل کرنے کا راستہ عزت و شہرت کا راستہ۔ اقتدار کا راستہ۔ عیاشیوں کا راستہ اور ان سب سے الگ تھلگ ایک اور راستہ یعنی خدمت خلق کا راستہ ۔ اگر انسان دنیا میں ایک سے زیادہ بار آتا تو ہر بار ایک نیا راستہ اختیار کرتا لیکن زندگی صرف ایک ہوتی ہے - اس لئے انسان کو اپنی یہ مختصر سی زندگی کسی ایسے راستے پر صرف کرنی چاہئے جو ان سب میں بہترین ہو۔ میری نظر میں بہترین راستہ خدمت خلق کا ہے اور ہم غلام کشمیریوں کے لئے خدمت خلق کی بہترین صورت حصول آزادی کی جدوجہد ہے - مجھے امید ہے تم اپنی صلاحیتوں کو اسی جدوجہد پر صرف کرو گے"- یہ کہتے ہوئے انہوں نے (مجھے اس نصیحت کی شدت کا بخوبی احساس دلانے کے لئے) میرا کان زور سے کھینچا۔

میرے اُس وقت کے ذاتی حالات ایسے تھے کہ میں اس نصیحت کو اپنے لئے خاصی حد تک ناقابل عمل سمجھتا تھا لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس نصیحت کی اہمیت اور افادیت کا احساس ہوتا گیا - چنانچہ آج تقریباً چالیس سال بعد بھی مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ماسٹر صاحب میرے کان کھینچ رہے ہیں - چنانچہ میں ان کی اس بے بہا نصیحت پر عمل جاری رکھنے کے عزم کا اعادہ کرتا ہوں اور یہ نصیحت مجھے مسائل کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ترغیب دیتی رہی

ہے۔

2) 5 اپریل 1965ء کو سیالکوٹ میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے پہلے کونشن کے اختتام پر فیصلہ ہوا کہ نو منتخب عہدیدار سوچیت گڑھ کے پاس پاک کشمیر سرحد پر حلف وفاداری اٹھائیں گے۔ میں تنظیم کا سیکرٹری جنرل منتخب ہوا تھا - چنانچہ ہم عہدیداروں نے ریاست کے بھارتی مقبوضہ علاقے سے لائی گئی مٹی کو ہاتھ میں لے کر اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر عہد کیا کہ ہم مادر وطن کی آزادی کے لئے جہدِ مسلسل کریں گے اور اس سلسلے میں بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے - حلف وفاداری کا یہ منظر انتہائی جذباتی اور سحر انگیز تھا۔

گذشتہ پچیس سال کے دوران میں سینکڑوں بار ایسے حالت و واقعات سے دو چار ہوا ہوں جن میں سے ہر واقعہ عام حالات میں مجھے یا کسی بھی شخص کو تحریک آزادی سے دور لے جانے کے لئے کافی تھا لیکن ہر بار سوچیت گڑھ میں مادر وطن کی مٹی ہاتھ میں لے کر اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے اٹھایا ہوا حلف۔ ہندواڑہ کے قابل احترام استاد کی گوشمالی - میرا ضمیر اور میری حب الوطنی تحریک آزادی سے میرے فرار کے راستے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے -

3) انگریزی کا ایک مقولہ ہے۔ Noting succeeds like success یعنی کامیابی سے بڑی کوئی کامیابی نہیں - بالفاظ دیگر کامیاب انسان کو ہی دنیا عزت و احترام کی نظر سے دیکھتی ہے - مجھے زندگی میں اس مقولے کی صداقت کے درجنوں ثبوت ملے ہیں جن میں سے ایک پیش خدمت ہے۔

جیسا کہ میں نے متعلقہ باب میں ذکر کیا ہے - کراچی میں اپنے قیام کے ابتدائی دور میں میں مجموعی طور پر مالی حیثیت سے خاصا پریشان رہا - یہاں تک کہ 1954ء میں چھ ماہ تک فٹ پاتھ پر بھی سویا - کئی ماہ تک جونا مارکیٹ میں تلی ہوئی کلیجی بیچنے والے سری نگر کے عبدالاحد (احدو) سے ایک روپیہ روز جیب خرچ اور کھانے کے لئے لیتا اور دوسرے مہینے کے شروع میں سارے پیسے اسے واپس کر دیتا - ماما کشمیری ہوٹل لی مارکیٹ میں ایک وقت کا کھانا چار آنے (پچیس پیسے) میں کھاتا تھا یعنی دو آنے کی روٹی دو آنے کی دال - ایک بار میں نے تین وقت کا کھانا اُدھار کھایا اور جب چوتھی بار بھی اُدھار مانگا تو ماما ہوٹل کے مالک محمد رمضان نے یہی نہیں کہ کھانا دینے سے انکار کیا - بد زبانی بھی کی چنانچہ میں کھانا کھائے بغیر ہی سو گیا - دوسرے دن میں نے قرضے کی ادائیگی کی تو محمد رمضان نے بھی گذشتہ رات کی بد کلامی پر معذرت کی۔

وقت گذرتا گیا اور میں آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ 1962ء میں میں نے اپنا ماہنامہ وائس آف کشمیر جاری کیا - ماہنامے کی رسم افتتاح ایک مقامی ہوٹل میں پاکستان میں الجزائر کی

جلاوطن حکومت کے سفیر جناب محمد کلو نے کرنی تھی - میں نے اس فنکشن کے لئے اپنے بہت سے دوستوں کو مدعو کیا تھا - جن میں ماما کشمیری ہوٹل کے محمد رمضان بھی شامل تھے (جن سے میرے تعلقات بڑھتے ہی گئے تھے بلکہ ہم ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف تھے) میں جب اسے دعوت دینے گیا تو اسے "مذاقاً" کہا کہ فنکشن میں جیب ذرا گرم رکھ کر آنا۔

ایک سفارتی بحران کی وجہ سے محمد کلو صاحب فنکشن میں نہ آسکے - چنانچہ ماہنامے کا افتتاح پاکستان کے مشہور سائنسدان ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی نے کیا - فنکشن کے بعد جب میں ہوٹل کا بل ادا کر کے باہر نکلا تو دروازے پر محمد رمضان میرا انتظار کر رہا تھا - مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا بوٹا تم نے مجھے کہا تھا کہ جیب گرم کر کے آجاؤ (وادی کشمیر والے گلگت بلتستان والوں کو بوٹا کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں) میں نے بھی "مذاقاً" پوچھا کیا تو جیب گرم کر کے آیا ہے - اس پر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو روپے کے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا اور کہنے لگا آج کے اس فنکشن کا بل میں ادا کروں گا - میں نے کہا آپ کی پیشکش کا شکریہ لیکن میں نے بل کی ادائیگی کر دی ہے۔ اس پر اس نے زبردستی سو سو روپے کے کچھ نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیئے۔

یہ وہی رمضان تھا جس نے صرف سات سال پہلے بارہ آنے نہ دینے پر مجھ سے بدکلامی کی تھی اور یہ میری کامیابی ہی تھی جو محمد رمضان میں اتنی بڑی تبدیلی لائی تھی۔

4) متواتر پیش آنے والے واقعات و حالات نے اس حقیقت کو میرے ایمان کا ضروری حصہ بنا دیا ہے کہ انسان کسی اہم اور اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے پر خلوص قربانیاں دے تو ان قربانیوں کا دوسروں کے دلوں پر گہرا اثر پڑتا ہے - ذیل میں اس حقیقت کی تین مثالیں پیش کرتا ہوں۔

1) جنوری 1971ء کو گلگت کے عوام نے مقامی جیل پر حملہ کر کے ہمیں (مجھے اور مقامی وکلاء کو) باہر نکالا اور ہمیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر جلوس کی شکل میں شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ شہر میں پولیٹیکل ایجنٹ نے گلگت سکاؤٹس کو جلوس پر فائرنگ کا حکم دیا لیکن گلگت سکاؤٹس (جو سب مقامی تھی) نے ہوائی فائرنگ پر ہی اکتفا کیا - اس پر پولیٹیکل ایجنٹ (اے - آر صدیقی) نے ایک سپاہی سے رائفل چھین کر خود جلوس پر گولیاں برسانی شروع کیں تو لوگ منتشر ہونے لگے - ایک نوجوان مجھے کاندھے پر اٹھائے ہوئے تھا - وہ بھی ایک گلی کی طرف بھاگنے لگا تو میں نے اسے بھاگنے سے سختی سے منع کیا - اتنے میں ایک گولی میرے سر سے چند انچ کے فاصلے سے گزر کر دیوار پر لگی تو اس نوجوان نے مجھے نیچے گرایا اور خود میرے اوپر بیٹھ گیا تاکہ اگر گولی آئے تو اسے لگے اور میں بچ جاؤں - گولیوں کی برسات ختم ہوئی اور میں نے اٹھ کر اس کا شکریہ ادا کیا تو کہنے لگا امان صاحب شکرئے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے - آپ ہمارے حقوق کے لئے یہ مصیبتیں اٹھا رہے ہیں - میرے لئے آپ کی جان میری اپنی جان سے

کہیں زیادہ قیمتی ہے - میں اس نوجوان کا نام بھی نہ پوچھ سکا اور نہ پتہ چلا کہ وہ کہاں کا رہنے والا تھا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے مجھے کھیت میں متعدد زخمی تڑپتے نظر آئے اور میں ان کی طرف دوڑ پڑا - اس نوجوان کا یہ جذبۂ ایثار و قربانی میرے لئے پندو نصائح کا ایک خزانہ تھا۔

2) اگست 1971ء کے اواخر میں مجھے شاہی قلعہ لاہور سے واپس لا کر جیل کی بجائے گلگت سکاؤٹس کے کوارٹر گارڈ (فوجی حوالات) میں رکھا گیا - جہاں مجھے دو ڈھائی ماہ تک کسی سے ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی - دن بھر اندر کوٹھری میں پڑا رہتا تھا - رفع حاجت کے لئے مجھے گلگت سکاؤٹس کے سپاہی کوارٹر گارڈ سے کوئی دو فرلانگ دور دریا کے کنارےے لے جاتے تھے اور وہ بھی چھ مسلح سپاہیوں کی حفاظت میں۔ جن میں سے دو اپنی بندوقوں پر نیزے چڑھائے میرے آگے دو پیچھے اور ایک ایک دائیں بائیں ہوتے تھے - نومبر میں مجھے ایک ڈیڑھ گھنٹہ روز باہر دھوپ میں بیٹھنے کی اجازت ملی اور بخاری کے لئے کچھ لکڑی بھی ملنے لگی - گلگت کے محلّہ کشروٹ (یا ڈومیال) کا ایک آٹھ دس سالہ لڑکا آ کر میری لکڑی چیرتا اور مزدوری میں اسے لکڑی کے چھوٹے ٹکڑے ملتے - لکڑی چیرتے وقت یہ لڑکا مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا - معلوم ہوتا تھا کہ اسے مجھے اس طرح پابند دیکھ کر دکھ ہو رہا ہے۔

ایک دن میں دھوپ میں بیٹھا تھا اور گارڈ کے سپاہی آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ میں نے ایک سپاہی سے کہا پوڈر دودھ کی چائے پی پی کر تنگ آیا ہوں کیا آپ ناردرن سکاؤٹس کے میس سے کچھ تازہ دودھ لا کر مجھے دودھ کی چائے پلائیں گے - سپاہی چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آ کر اطلاع دی کہ دودھ نہیں ملا۔

دوسرے دن سہ پہر کو میں سپاہیوں کی گارد میں دریا کے کنارے سے واپس آ رہا تھا کہ لکڑی چیرنے والے لڑکے پر نظر پڑی جو ایک لمبا چوغہ پہنے ہوئے ہمارے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ اس کی نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن سپاہیوں کی موجودگی میں مجھ سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی - میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور سیدھا اپنی کوٹھری میں چلا گیا - تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکا بھی دوڑ کر اندر آ گیا - میں اسے وہاں دیکھ کر حیران سا ہو گیا اور ساتھ ہی اسے ڈانٹ بھی دیا کہ وہ میری کوٹھری میں کیوں آیا ہے - اس نے انتہائی معصومیت کے ساتھ چوغے کے اندر سے دودھ کی ایک بڑی بوتل نکالی اور مجھے تھماتے ہوئے کہنے لگا اماں صاحب کل آپ نے دودھ کی چائے پینے کی خواہش کی تھی لیکن دودھ نہیں ملا تھا - میں نے گھر جا کر اس بات کا ذکر اپنی والدہ سے کیا چنانچہ ہم نے اپنی گائے کا دودھ بچایا جو میں آپ کے لئے لایا ہوں - میں سمجھا میرے کسی دوست کا بیٹا ہو گا پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یتیم بچہ ہے اور میرے کسی دوست یا جاننے والے کا رشتہ دار بھی نہیں - اس کے بعد میں نے پوچھا کہ تمہیں اور تمہاری والدہ کو یہ خیال کیوں آیا تو معصومیت بھرے جذباتی انداز میں کہنے لگا اماں

صاحب آپ یہاں کے لوگوں کے لئے اتنی قربانیاں دے رہے ہیں کیا ہم آپ کے لئے اتنا بھی نہ کریں ؟ بچے کا جواب سن کر میرے جسم میں روحانی سکون کی عجیب سی لہر دوڑی۔

ایک دن اسے معلوم ہوا کہ مقامی طور پر بنائی جانے والی خمیر کی روٹی جسے مقامی زبان میں چھوپٹی کہتے ہیں - مجھے بہت پسند ہے تو دوسرے دن گھر سے انتہائی لذیذ چھوپٹی بنا کر لایا۔

اس بچے اور اس کی والدہ کا یہ ایثار بھی میرے لئے ایک اہم سبق تھا۔

3) گلگت سکاؤٹس کے کوارٹر گارڈ میں میری اسیری کے دوران کی ہی بات ہے ایک رات دروازے پر دستک ہوئی - دروازہ کھولا تو گلگت سکاؤٹس کا ایک سپاہی کھڑا تھا - جس نے کہا کہ وہ مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے اور آکر فرش پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا امان صاحب آپ کے ساتھ جو برتاؤ ہو رہا ہے وہ اب ہماری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا ہے اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو یہاں سے نکال کر پاکستان بھیج دیں۔ باہر جیپ کھڑی ہے آپ اس پر بیٹھ کر نکل جائیں - ہماری ڈیوٹی تین گھنٹے کی ہے اور ہم اس میں مزید تین گھنٹے کا اضافہ کرا سکتے ہیں - اس دوران آپ مقامی انتظامیہ کی پہنچ سے باہر نکل چکے ہوں گے۔ میں سمجھا میرے خلاف کوئی جال بچھایا گیا ہے - اس لئے میں نے جوان کو خاصا ڈانٹ دیا۔ اس پر اس کے آنسو نکل آئے کہنے لگا امان صاحب آپ ہمیں بالکل غلط سمجھے ہیں - ہم اتنے بے غیرت نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں - میں نے خاصی دیر سوچنے کے بعد اس سے پوچھا کہ یہ تو ایک بہت بڑا جرم ہے - اس پر اس نے کہا کہ ہم نے اس معاملے کے ہر پہلو پر سوچا ہے اور ہماری اس اسکیم میں ہم اس وقت کے گارد والے ہی نہیں بہت سے اور جوان بھی شامل ہیں - ہمیں اس جرم کی سزا دو سال قید اور ملازمت سے علیحدگی کی شکل میں ملے گی اور ہم سب نے یہ سزا بھگتنے کا فیصلہ کیا ہے۔

جب مجھے یقین آیا کہ جوان واقعی یہ پیشکش خلوص دل سے کر رہا ہے تو میں نے اس سے کہا بھائی صاحب آپ لوگوں کا یہ جذبۂ ایثار و قربانی میرے لئے باعث فخر ہے لیکن میرا اس طرح یہاں سے نکلنا نہ یہاں کے عوام کے مفاد میں ہے نہ اس مقصد کے جس کے لئے میں یہاں ہوں نہ ہی خود میرے مفاد میں ہے اس لئے میں آپ لوگوں کی اس پیشکش کو قبول نہیں کر سکتا - میری طرف سے تمام جوانوں کا شکریہ ادا کریں - جوان خاصی دیر تک بضد رہا - آخر نا امید ہو کر چلا گیا۔

متذکرہ بالا واقعات اور زندگی میں پیش آنے والے ایسے ہی بہت سے اور واقعات نے میرے ذہن پر اتنے گہرے نقش چھوڑے ہیں کہ ان سے ملنے والی رہنمائی اور ان سے حاصل ہونے والے سبق میرے طرز فکر و عمل کا حصہ اور زندگی کے سفر میں میرے لئے مشعل راہ بن گئے ہیں۔

آٹھواں باب

واقعات جنہوں نے میری زندگی کے رُخ موڑ دیئے

انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اس وقت تو کافی تکلیف دہ بلکہ ایک سانحہ دکھائی دیتے ہیں اور ان سے انسان کو بہت دکھ بھی ہوتا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات اس کی زندگی میں ایک بڑی اور مثبت تبدیلی کا باعث بنے ہیں - زندگی میں میرے ساتھ بھی بہت سے ایسے واقعات پیش آئے جن میں سے کچھ تو اس وقت میرے لئے ایک بڑے سانحہ سے کم نہ تھے لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ ان واقعات نے میری زندگی کا رخ ہی مثبت سمت میں موڑ دیا - آیئے ایسے کچھ واقعات پر ایک نظر ڈالیں -

میں 1948ء میں ہائی سکول ہندواڑہ (بھارتی مقبوضہ کشمیر) میں نویں جماعت کا طالب علم تھا اور میرا شمار سکول کے قابل ترین طلباء میں ہوتا تھا - میرے ایک ہم جماعت پنڈت سری کنٹھ کا کوئی رشتہ دار ایک سرکاری عہدے پر تھا - جس نے اس کے لئے دسویں جماعت کا امتحان دینے کی خصوصی اجازت حاصل کر لی کیونکہ سری کنٹھ ذہین ہونے کے علاوہ خاصی عمر کا بھی تھا اور ہنگامی حالات کی وجہ سے یہ اجازت اسے آسانی سے ملی - سری کنٹھ کو یہ اجازت ملنے پر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی یہ اجازت حاصل کر لوں - چنانچہ خاصی تگ و دو کے بعد مجھے بھی یہ اجازت اس شرط پر مل گئی کہ میں دسویں جماعت والوں کے سالانہ امتحان کے لئے فارم بھیجنے سے پہلے ہونے والے امتحان (ٹیسٹ) میں کامیاب ہو جاؤں - میں نے دن رات ایک کر کے محنت کی اور ٹیسٹ میں پاس ہو گیا - چنانچہ مجھے اجازت مل گئی اور میں نے یونیورسٹی کے امتحان تک کے دو ماہ کے دوران بھی سخت محنت کی۔ ایک استاد سے آدھا گھنٹہ انگریزی پڑھنے کے لئے آتے جاتے ایک گز برف میں تقریباً چار کلو میٹر پیدل چلنا پڑتا تھا سکول اور گھر پر بھی تقریباً پندرہ گھنٹے روز پڑھتا رہا۔

میٹرک کا یہ امتحان نئی بنی ہوئی کشمیر یونیورسٹی کا پہلا امتحان تھا - میرا امتحانی سینٹر ایس پی کالج سری نگر تھا - پہلا پرچہ انگریزی کا تھا - میں سوالنامہ ملتے ہی مضمون لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد امتحانی مرکز کے سپرنٹنڈنٹ نے آ کر مجھے کان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور کہنے لگا

میں دس منٹ سے تمہارا رول نمبر پکار رہا ہوں اور تم سنتے ہی نہیں - سوالنامہ اور جوابی پرچہ مجھے دے دو اور ہال سے نکل جاؤ - تمہیں امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں - کیونکہ تمہاری سکول کی حاضریاں مطلوبہ تعداد سے کم ہیں - (دراصل ہندواڑہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر نے میرے امتحانی فارم میں امتحان میں بیٹھنے کے میرے خصوصی اجازت نامے کا ذکر کئے بغیر ہی میری صرف نویں کلاس کی حاضریاں درج کی تھیں - جو نویں دسویں کی مطلوبہ مجموعی تعداد سے بہت کم تھیں اور یونیورسٹی والوں نے بھی غالباً آخری مرحلے پر حاضریوں کی اس کمی کا نوٹس لیا اور امتحانی مرکز کو اطلاع دے دی کہ کم حاضری والے ان امیدواروں کو امتحان دینے کی اجازت نہیں) اپنے خوابوں پر پانی پھرتے دیکھ کر مجھے رونا آیا - بہرحال سپرنٹنڈنٹ نے مجھے ہال سے باہر نکال دیا اور باہر نکلتے ہی غصے میں میں نے اللہ میاں کو بھی برا بھلا کہا کہ میں نے اتنی محنت کی اور اس کا صلہ اس نے مجھے یہ دیا - باہر نکلا تو سری کنٹھ بھی کھڑا رو رہا تھا کچھ اور لڑکے بھی تھے - ہم نے یونیورسٹی کے حکام کے علاوہ کچھ لیڈروں سے بھی ملنے کی کوشش کی لیکن امتحان دینے کی اجازت حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے -

دوسرے سال بھی میں نے خاصی محنت کی اور میٹرک کے امتحان میں پوری یونیورسٹی میں مسلمان طلباء میں اول آیا اور کالج میں داخلہ لے لیا -

اگر مجھے پہلے سال امتحان دینے سے نہ روکا جاتا تو میں زیادہ سے زیادہ سیکنڈ ڈویژن (بی گریڈ) میں پاس ہوتا اور اپنے مخصوص حالات (جو مجھے کالج میں داخلہ لینے کی اجازت کسی صورت میں نہیں دیتے تھے) کے تحت میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میٹرک کرنے کے بعد پٹواری یا سکول ٹیچر کی حیثیت سے سرکاری ملازمت کروں لیکن پہلے سال امتحان دینے کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے میں نے دوسرے سال ایک تو پوری یونیورسٹی میں پوزیشن حاصل کی اور دوسرے اپنے مالی معاملات بھی خاصی حد تک سدھارے چنانچہ میرے لئے آگے بڑھنے کے راستے کھل گئے اور میں آج یہاں ہوں - اگر 1949ء میں امتحان دینے کی اجازت مل جاتی تو آج شاید میں ایک گرداور یا پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہو گیا ہوتا لیکن امتحانی ہال سے نکالے جانے کے سانحہ نے میری زندگی کا رخ ہی بدل ڈالا۔

2) میں 1956ء میں کراچی میں سٹی نائٹ سکول میں پڑھاتا تھا - ایک دن سکول کے وقفے کے دوران میں نے سٹاف روم میں طلباء کے حقوق کے بارے میں سکول کی انتظامیہ کی پالیسی اور طرز عمل پر معمولی سی نکتہ چینی کی تو سکول کے قائم مقام ہیڈ ماسٹر نے (جس سے میرے تعلقات ویسے بھی کچھ کشیدہ تھے) بڑے تحکمانہ انداز میں کہا " تم کل کے لونڈے تم انتظامی معاملات کو کیا جانو " اس طرز تکلم پر مجھے انتہائی غصہ آیا چنانچہ میں یہ کہہ کر سٹاف روم سے باہر نکل آیا کہ یہ لونڈا ثابت کرے گا کہ اس میں انتظامی صلاحیت تم سے کہیں زیادہ ہے - باہر نکل کر میں

سیدھا گھر کی طرف چل دیا۔

اس واقعے کا ذکر کسی استاد نے کلاس میں کردیا - چنانچہ چھٹی ہونے تک یہ بات سارے سکول میں پھیل گئی - میرا معمول تھا کہ میں سکول سے گھر آتے ہوئے راستے میں ایک بلوچ پان والے سے سگریٹ لیتا اور ساتھ ہی ریڈیو پاکستان سے خبریں بھی سنتا تھا۔ اس دن بھی میں خبریں سننے کے لئے وہاں رک گیا - تھوڑی دیر کے بعد سکول کے طلباء بھی وہاں سے گزرے اور مجھے دیکھ کر رک گئے اور میرے ساتھ پیش آنے والے واقعے پر اظہار افسوس کیا - اسی دوران ان میں سے ایک لڑکے نے کہا سر آپ اتنی محنت کرتے ہیں سنا ہے تنخواہ بھی بہت ہی کم ملتی ہے اور آپ کے ساتھ یہ برتاؤ ہوتا ہے اور وہ بھی طلباء کے مفاد کی بات کرنے پر - آپ اپنا سکول کیوں نہیں کھولتے - میں نے کہا میرے پاس نہ جگہ ہے نہ طلباء' سکول کیسے کھولوں - اس پر بلوچ پان والے نے کہا میرے پاس چار کمروں والا ایک مکان خالی ہے آپ اس میں سکول کھول لیں۔ طلباء نے کہا ہم بھی سٹی نائٹ کی بجائے آپ کے سکول میں پڑھیں گے - ان لوگوں کی یہ باتیں سن کر میرے دل میں بھی خیال آیا کہ کیوں نہ ان کی تجویز پر عمل کیا جائے اور رات کو معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے میں نے اپنا سکول قائم کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔ بلوچ پان والے کا مکان تو اس کے بھائی کی مخالفت کی وجہ سے نہیں ملا لیکن میں نے پندرہ دن کے اندر اندر نائٹ اسکول اپنی رہائشی کوٹھری میں کھولا۔ جسے دوسرے سال ایک چار کمروں والی عمارت میں منتقل کر کے وہاں اپنا ڈے سکول بھی کھولا اور ان سکولوں نے میری زندگی کا رخ ہی موڑ دیا۔

اگر میرے ساتھ سٹی نائٹ سکول میں وہ انتہائی تکلیف دہ برتاؤ نہ ہوتا تو مجھے اپنا سکول قائم کرنے کا خیال شاید کبھی نہ آتا۔

3) مقبوضہ کشمیر سے پاکستان آنے کے بعد ابتداء میں میں اپنے بزرگوں خاص کر برادرم محمد اسماعیل خان کے زیر اثر تھا - جن کا پروگرام یہ تھا کہ میں ایف ایس سی پاس کرنے کے بعد گلگت کے محکمہ جنگلات میں رینج آفیسر کی حیثیت سے سرکاری ملازمت کروں یا انجینئر بن جاؤں لیکن ایڈورڈز کالج کے وائس پرنسپل سے جھگڑے کی وجہ سے کالج سے نکالے جانے کے نتیجے میں مجھے کراچی آنا پڑا (کالج سے اخراج کے واقعے کی تفصیل "میرا بچپن اور میری تعلیم" کے باب میں ہے) اور کراچی کے مخصوص سیاسی ماحول - میری خود کفیلی اور کشمیری حلقوں کے ساتھ تعلقات نے مجھے فاریسٹ رینج آفیسر یا انجینئر کی بجائے تحریکِ آزادیٔ کشمیر سے منسلک کر دیا۔

اگر ایڈورڈز کالج پشاور کا سانحہ پیش نہ آتا تو آج میں موجودہ پوزیشن کی بجائے محکمہ جنگلات کا ایک افسر یا انجینئر ہوتا۔

4) آپ نے اس کتاب کے حصہ اول میں میرے تعلیمی ادارے کے باب میں حبیبیہ ایجوکیشنل سوسائٹی والوں سے میرے جھگڑے کی تفصیلات پڑھی ہوں گی اگر سوسائٹی کے سربراہ

اور ان کے ہیڈ ماسٹر مجھے اپنے سکول سے بے دخل کرنے کی کوشش نہ کرتے تو میں اپنے ڈیے سکول سے 1972ء میں ہاتھ دھو بیٹھا ہوتا اور نائٹ اسکول بھی انہی چار کمروں تک محدود رہتا لیکن اس سانحے نے مجھے اپنے سکولوں کے لئے دوسری عمارت حاصل کرنے کے سلسلے میں مسلسل تگ و دو کرنے پر مجبور کیا جس کے نتیجے میں میں دو بڑے اور اعلیٰ معیار کے سکول قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا اور ان سکولوں نے میری کایا ہی پلٹ دی۔

5) میری زندگی کا رخ موڑ دینے والا ایک اہم واقعہ کسی سانحے کے بغیر ہی پیش آیا۔ غالباً 1958ء کی بات ہے میں نے مسئلہ کشمیر پر ایک مضمون لکھا اور اسے لے کر روزنامہ ڈان کراچی (جو اس زمانے میں پاکستان کا اہم ترین انگریزی اخبار تھا) کے ایڈیٹر الطاف حسین مرحوم کے پاس پہنچا۔ مسئلہ کشمیر تازہ تھا - اقوام متحدہ کے نمائندے مسئلہ کشمیر پر بھارت اور پاکستان کی حکومتوں سے مذاکرات میں مصروف تھے - الطاف حسین صاحب بھی اس وقت کچھ فارغ دکھائی دیتے تھے اور انہیں غالباً مسئلہ کشمیر پر کسی کشمیری کے لکھے ہوئے مضمون کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے میری موجودگی میں ہی میرا مضمون پڑھ ڈالا اور جب انہیں میں نے بتایا کہ میں ابھی طالب علم ہوں تو انہوں نے مجھے شاباشی دی اور میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ میں قلمی کاوشیں جاری رکھوں - انہوں نے اس امید کا اظہار بھی کیا کہ اگر میں لکھنا جاری رکھوں تو ایک دن انگریزی زبان کے اعلیٰ پائے کا رائٹر بن جاؤں گا - پاکستان کے صف اول کے صحافی کی طرف سے اس حوصلہ افزائی سے میں پھولا نہیں سمایا اور جب کچھ مدت کے بعد میرا مضمون ڈان کے اداریئے والے صفحے پر شائع ہوا تو وہ دن میری اُس وقت تک کی زندگی کا اہم ترین دن معلوم ہوتا تھا - چنانچہ میں نے لکھنا شروع کردیا اور اس کے بعد میرے قلم سے جو کچھ نکلا اس کی تفصیل کتاب کے متعلقہ باب میں ہے۔

اس طرح الطاف حسین مرحوم کی طرف سے میری یہ حوصلہ افزائی جو بنیادی طور پر متذکرہ بالا چند اتفاقات کا نتیجہ تھی میرے قلم کے لئے اکسیر ثابت ہوئی -

6) برطانیہ میں میری گرفتاری اور پندرہ ماہ کی اسیری کے بعد برطانیہ بدری کے ظاہری سانحے کا دلچسپ روشن پہلو یہ ہے کہ دوران اسیری ہونے والے میرے میڈیکل چیک اپ کے نتیجے میں میرے پھیپھڑوں کے کینسر کی تشخیص ہوئی اور فروری 1986ء میں میرا آپریشن ہوا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اگر یہ آپریشن نہ ہوتا تو میں زیادہ سے زیادہ اگست 1986ء تک زندہ رہ سکتا تھا۔ اس طرح گرفتاری کے ظاہری سانحے نے مجھے نئی زندگی بخشی۔

الغرض انسانی زندگی کے ہر سانحے کا ایک روشن پہلو اور ہر خوشخبری کا ایک تاریک پہلو بھی ہوتا ہے البتہ کچھ لوگوں کو پیش آنے والے اکثر سانحے بالآخر ان کے لئے زندگی میں بڑی کامیابیوں کا باعثِ بنتے ہیں - میں شاید ان ہی خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں۔

نواں باب

.... اور میں موت کے منہ سے واپس آتا رہا

میں اپنی اب تک کی زندگی میں ایک درجن سے زیادہ بار موت کے منہ سے واپس آیا ہوں اور تقریباً ہر بار مجھے کوئی اتفاق ہی موت کے منہ میں جانے سے بچاتا رہا ہے۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ ان واقعات میں سے چند ایک کی تفصیل بیان کی جائے لیکن ان واقعات کی تفصیل میں جانے سے پہلے اس دلچسپ واقعے کا ذکر جب میری فاتحہ بھی پڑھی گئی۔

میں 1947ء کے اواخر میں ہندواڑہ میں تھا اور اس علاقے پر ہندوستانی فوج قابض ہو گئی تھی جبکہ ہائی ہامہ کا علاقہ جہاں میری ہمشیرہ رہتی تھیں پاکستانی قبائل اور مقامی حریت پسندوں کے زیراثر تھا۔ اس سے قبل ہندواڑہ کے قریب کلنگام کے پل پر قبضے کے سلسلے میں ہندوستانی فوج اور قبائل کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی تھی جس میں مقامی آبادی کے کچھ لوگ بھی مارے گئے تھے۔ آخر بھارتی فوج نے ٹینکوں کی مدد سے پل پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس لڑائی کے فوراً بعد ہائی ہامہ میں میری بہن اور بہنوئی کو اطلاع ملی کہ میں اس جنگ کے دوران مارا گیا ہوں بلکہ ایک صاحب نے انہیں بتایا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے گولی لگتے دیکھا۔ چنانچہ میری ہمشیرہ اور بہنوئی نے سرسری طور پر میری فاتحہ بھی پڑھائی کیونکہ بھارتیوں کی پیش قدمی کی وجہ سے وہ لوگ خود بھی افراتفری میں تھے۔ بھارتیوں نے میرے بہنوئی کے داماد (میجر) امان اللہ کے گھر اور مہمان خانے پر بمباری کر کے انہیں ملیا میٹ کر دیا تھا۔ چنانچہ میری ہمشیرہ سمیت گاؤں کی خواتین نے ایک پہاڑی گاؤں بٹہ پورہ کے جنگل میں پناہ لی تھی اور وہاں تک کے سفر کے دوران بھارتی بموں کا ایک گولہ ہمشیرہ وغیرہ سے چند گز کے فاصلے پر گرا تھا لیکن ایک گز سے زیادہ برف میں دھنس کر پھٹا نہیں تھا۔ اسطرح میری ہمشیرہ وغیرہ کی جانیں بھی معجزاتی طور پر بچ گئی تھیں۔ کچھ مدت بعد ہندواڑہ اور ہائی ہامہ کے پورے علاقے پر بھارتیوں کا قبضہ ہو گیا اور دونوں کے درمیان سول آبادی کی کچھ آمدورفت شروع ہوئی تو میں نے رسک لے کر ہائی ہامہ جانے کا فیصلہ کیا تاکہ ہمشیرہ وغیرہ کی خیر خیریت معلوم کروں کیونکہ ہائی ہامہ پر بھارتیوں کی بمباری کے بارے میں انتہائی پریشان کن خبریں آ رہی تھیں۔ میں ہندواڑہ (براری پورہ) سے صبح سویرے پیدل روانہ ہوا اور

بڑی سڑک سے الگ ہو کر چلتا رہا اور ہائی ہامہ شام کو پہنچا۔ بہنوئی کے ہاں پہنچا تو کتا مجھے دیکھ کر بھونکنے لگا چنانچہ میرے بہنوئی کا نوکر باہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی واپس اندر بھاگ گیا۔ دراصل وہ مجھے بھوت سمجھا تھا کیونکہ اس کی اطلاع کے مطابق میں مرچکا تھا اور میری فاتحہ بھی پڑھی گئی تھی۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے زور زور سے آوازیں دیں تو میرے بہنوئی باہر آئے اور خاصی دیر تک دور سے مجھے دیکھتے رہے اور جب میرے بار بار اصرار پر کہ میں امان اللہ ہی ہوں۔ انہیں یقین آیا تو کتے کو دور بھگا کر آکر مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ دوسرے دن جب میں بٹہ پورہ اپنی ہمشیرہ کے پاس پہنچا تو وہاں بھی سب مجھے زندہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔

یہ تھا میری فاتحہ پڑھی جانے کا لطیفہ۔ آیئے اب میرے موت کے منہ سے واپس آنے کے واقعات کی طرف۔

بچپن میں مجھے میرے خاندانی دشمنوں نے زہر کھلا کر ہلاک کرنے کی کوشش کی لیکن میں معجزاتی طور پر بچ گیا۔ ایک بار کراچی میں پاکستان ایئر فورس کے ایک بڑے ٹرک کے نیچے آتے آتے بچ گیا۔ جبکہ ٹرک اس سائیکل کے اوپر سے گزرا جس پر میں سوار تھا۔ ایک بار کراچی کے ساحل منوڑا میں سمندر میں ڈوبتے ڈوبتے بچ گیا۔ ایک بار میں سائیکل رکشے پر سوار تھا کہ رکشہ ایک تیز رفتار ٹرام سے ٹکرایا اور میں ٹرام کے نیچے آنے کی بجائے اچھل کر ٹرام کے اندر جا گرا۔ جنوری 1953ء میں کراچی میں ہونے والے طلباء کے ہنگاموں کے دوران (جس میں آٹھ طالب علم پولیس فائرنگ سے ہلاک ہوئے تھے) ایک گولی میرے سر سے ایک ڈیڑھ انچ کے فاصلے سے گزر کر دیوار پر لگی۔ ایک بار میں بجلی کا مین سوچ آف کر کے اپنے کمرے کی بجلی ٹھیک کرنے کے لئے بجلی کی تار منہ میں ڈال کر دانتوں سے اس کا ربڑ اتار رہا تھا کہ باہر سے کسی نے بےخبری میں سوچ آن کر دیا۔ بجلی کا جھٹکا لگنے سے میں اچھل کر گر گیا اور میرے بدن کا زور تار پر پڑا جس سے تار میرے منہ سے الگ ہو گئی۔ اس کے بعد سے میں خالی تار سے بھی ڈرتا ہوں۔ نیویارک میں ایک بار میں انڈر گراؤنڈ (زیر زمین ریل) میں ہونے والے ایک ہنگامے میں گر گیا اور سینکڑوں افراد مجھے روندتے ہوئے میرے اوپر سے گزرے لیکن میں معجزاتی طور پر بچ گیا۔ ایک بار میں راولپنڈی سے براستہ برار کوٹ مظفر آباد جا رہا تھا۔ برارکوٹ اور لوہار گلی کے درمیانی چڑھائی میں بس کا ٹائر کھل گیا اور بس پیچھے لڑھکنے لگی۔ اتفاق سے سڑک کے کنارے اس جگہ جہاں سے بس نیچے دریا میں گرتی ایک بڑا پتھر تھا اور بس اس سے لگ کر رک گئی اگر وہ پتھر وہاں نہ ہوتا تو بس چند لمحوں میں کئی سو گز نیچے دریا میں گرتی اور میرے سمیت ساری سواریاں لقمہ اجل ہو جاتیں۔

یہ تو تھا آٹھ واقعات کا سرسری سا تذکرہ۔ اس موضوع کے کچھ واقعات ایسے ہیں جن کا تفصیلی تذکرہ مناسب سمجھتا ہوں۔

1) میں چار سال کا تھا ایک دن اپنی بہن جو مجھ سے سات آٹھ سال بڑی تھیں کے ساتھ اپنے مویشی خانے کی چھت پر کھیل رہا تھا - بارش کی وجہ سے چھت پر پھسلن ہوئی تھی چنانچہ میں کھیلتے کھیلتے پھسل کر سر کے بل چھت کے نیچے پڑے ہوئے تراشیدہ پتھروں پر گرا اور سر ایک نوک دار پتھر سے جا لگا - پتھر کی نوک میرے ماتھے میں گھس گئی اور ماتھے سے خون کے فوارے نکلنے لگے۔ میری بہن چیختی ہوئی اندر کو دوڑی - گھر میں صرف خواتین تھیں جو روتی پیٹتی باہر آگئیں عین اسی وقت میرے بہنوئی ماسٹر ہاشم علی (مرحوم) جو ایک ماہر طبیب بھی تھے اور ان کے پاس ادویات کا سٹاک بھی ہوتا تھا غیر متوقعہ طور پر گھر پہنچے اور انہوں نے میرے ماتھے میں گھسا ہوا پتھر نکال دیا اور کوئی دوائی لگا کر تھوڑی دیر میں خون بھی بند کر دیا - اس طرح میں بچ گیا۔ آج پچاس سال بعد بھی اس زخم کا نشان میرے ماتھے پر صاف نظر آ رہا ہے۔

اگر میرے بہنوئی اتفاق سے اور انتہائی غیر متوقعہ طور پر اس وقت گھر نہ پہنچتے تو زیادہ خون بہہ جانے سے میری موت یقینی تھی - لیکن ماسٹر صاحب کی آمد مجھے موت کے منہ سے واپس لے آئی۔

2) متذکرہ بالا واقعے کے کچھ مدت بعد میں اپنے مکان کے سامنے کھیت میں برج پتر کے پائتو باندھ کر کچھ بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا - اس زمانے میں استور کے مقامی لوگ سفر کی تھکاوٹ دور کرنے کے لئے اپنی ٹانگوں کے گرد اون کی بنی ہوئی ایک لمبی پٹی باندھتے تھے - جسے مقامی زبان میں پائتو کہتے ہیں - ہم بچوں نے برج پتر کے کاغذ کی طرح کے چھلکوں کے پائتو بنا کر اپنی ٹانگوں پر باندھے تھے - برج پتر فوراً آگ پکڑتے ہیں - میری ایک ہم عمر بھانجی (ڈاکٹر محبوب عالم کی بہن جو میری رضاعی بہن بھی ہے) نے جلتی ہوئی دیئی میری ٹانگ کے ساتھ لگا دی جس سے فوراً ہی اس کے گرد لپٹے ہوئے برج پتر میں آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلوں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور سارے بچے چیخنے لگے - اتفاق سے میری والدہ وہاں سے گزر رہی تھیں اور انہوں نے مجھے آگ کے شعلوں میں لپٹا اور چیختا دیکھ کر مجھے اٹھایا اور دوڑ کر گھر کے باورچی خانے کے ساتھ رکھی پانی سے بھری ہوئی ایک بہت بڑی دیگ میں پھینک دیا - اس طرح میں بچ گیا گو میری دائیں ٹانگ کی چمڑی جل کر اس کی ہڈی بھی ننگی ہو گئی تھی اور آج پچاس سال بعد بھی میری ٹانگ کی جلی ہوئی چمڑی اس واقعے کی شدت کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔

اگر میری والدہ کی آمد میں صرف چند ہی منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو میں جل کر راکھ ہو گیا ہوتا۔

3) 1959ء کا واقعہ ہے میں اپنے گھر استور سے کراچی آنے کے لئے گلگت آیا اور راولپنڈی جانے کے لئے ہوائی سروس موسم کی خرابی کی وجہ سے بند ہونے کی بناء پر مجھے بارہ دن گلگت میں رکنا پڑا - اس زمانے میں قراقرم ہائی وے نہیں بنی تھی اور بابو سر روڈ بھی بارشوں کی

وجہ سے خراب ہو گیا تھا - میں ہر صبح فلائٹ ہونے کی امید میں ماموں جان اور برادرم محمد اسماعیل خان وغیرہ سے رخصت ہو کر ایئرپورٹ پہنچتا اور عین وقت پر "نو فلائٹ ٹوڈے" کا اعلان سن کر واپس چلا جاتا اور واپس پہنچ کر خاصی خفت اٹھانی پڑتی - آخر تیرھویں دن ایک مال بردار ڈکوٹا جہاز اسکردو سے (جہاں وہ اتنے دن سے رکا ہوا تھا) گلگت آیا اور اس کے پائلٹ نے راولپنڈی جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم کچھ لوگوں نے ایئرپورٹ کے حکام اور پائلٹ کی منت سماجت کر کے انہیں اس بات پر راضی کیا کہ ہمیں بھی اس جہاز میں راولپنڈی جانے دیں اور ہم جہاز میں رکھے ہوئے تھوڑے سے سامان پر بیٹھ گئے -

جہاز چلاس سے آگے ہوا تو موسم اچانک انتہائی بھیانک ہو گیا اور اندھیرا سا چھا گیا اور اس کے ساتھ ہی جہاز ہچکولے کھانے لگا - ہم ہر ہچکولے پر کبھی جہاز کی ایک دیوار سے ٹکرا جاتے کبھی دوسری سے۔ زندگی کی کوئی امید نہیں رہی - چنانچہ کچھ زور زور سے کلمہ پڑھ رہے تھے اور کچھ آیت الکرسی - ہمارے ساتھی خواجہ ثناء اللہ سجدے میں گرے گڑگڑا رہے تھے - اتنے میں جہاز کو ہچکولہ لگا اور وہ سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہو کر دیوار سے جا لگے۔

یہ صورت حال کوئی چالیس منٹ تک قائم رہی - اس دوران ہر لمحہ ہماری زندگی کا آخری لمحہ معلوم ہوتا تھا - بہر حال یہ ایک انتہائی غیر معمولی معجزہ تھا کہ جہاز کا ماہر اور تجربہ کار پائلٹ دنیا کے اس خطرناک ترین ہوائی سفر میں راڈار وغیرہ کی جدید سہولتوں سے محروم اس ڈکوٹا جہاز کو عملاً رات کے سے اندھیرے میں صرف اندازے سے دریائے سندھ کے اوپر اور پہاڑوں کے درمیان سے گذارتا ہوا میدانی علاقے میں پہنچانے میں کامیاب ہو گیا اور جب ہم راولپنڈی میں جہاز سے اترے تو ہمیں اپنے زندہ بچنے کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا - راولپنڈی ایئرپورٹ پر موجود دوسرے پائلٹ بھی حیران تھے کہ یہ معجزہ کیسے ہوا - بہر حال ہم ایک گھنٹے کے انتہائی کرب اور زندگی سے مکمل ناامیدی کے بعد موت کے منہ سے نکل کر راولپنڈی پہنچے تھے۔

4) برطانیہ میں میری اسیری کے دوران 28 فروری 1986ء کی صبح کو گرابی روڈ ہسپتال لیسٹر میں میرا پھیپھڑے کے کینسر کا اپریشن ہوا - چار بجے تک میں پوری طرح ہوش میں آیا تھا - البتہ کبھی کبھی غنودگی سی چھا جاتی تھی - اسی دوران میری اہلیہ ملنے آئی - اہلیہ کے واپس جانے کے دس پندرہ منٹ بعد یعنی تقریباً چھ بجے مجھے محسوس ہونے لگا کہ میری نبض ڈوب رہی ہے۔ پیشاب پہلے سے بند تھا - تھوڑی دیر کے بعد مجھے ہچکیاں لگنے لگیں جیسے مرنے سے تھوڑی دیر پہلے لگتی ہیں اور مجھے پورا یقین ہو گیا کہ میری زندگی کا اختتام ہو رہا ہے - چنانچہ میں اپنی موت کے تحریکِ آزادئ کشمیر، اپنی تنظیم اور اپنی اہلیہ اور بچی پر پڑنے والے ممکنہ اثرات کا سوچ کر آبدیدہ ہو گیا - اسی دوران میں نے اشارے سے انگریز نوجوان لیڈی ڈاکٹر جو ڈیوٹی پر تھی کو بلایا اور اسے اشاروں سے اپنی نبض وغیرہ کے بارے میں بتایا - میری ہچکیاں وہ خود دیکھ اور سن رہی

تھی اور اسکے ساتھ ہی میں بے ہوش ہو گیا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد جب میں پھر ہوش میں آیا تو میرے سرہانے کے پاس کھڑی لیڈی ڈاکٹر نے مجھے یہ کہہ کر مبارک باد دی کہ مسٹر خان تم بڑے خوش قسمت ہو تمہاری زندگی بچ گئی۔ میری اس خوش قسمتی کی تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ جب تم نے اس صورت حال کے بارے میں مجھے بتایا تو میں بہت پریشان ہو گئی - کیونکہ ان معاملات کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا - ڈاکٹر بیلی (بڑے سرجن جنہوں نے میرا آپریشن کیا تھا) بھی جا چکے تھے - اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے ہسپتال کے ریڈیو پر انہیں ڈھونڈنا شروع کیا - اتفاق سے جلدی ہی ان کی کار کے ریڈیو سے میرا رابطہ ہوا وہ شہر سے باہر جا رہے تھے - اگلے دو منٹ تک ان سے رابطہ نہ ہوتا تو وہ ریڈیو کے رینج سے باہر نکل جاتے - تم انتہائی خوش قسمت ہو کہ ان سے رابطہ ان کے ریڈیو رینج سے باہر نکلنے سے پہلے ہی ہوا - چنانچہ انہوں نے فوراً ہی واپس آ کر آپ کو اس خطرناک صورت حال سے نکال لیا - اب آپ خطرے سے باہر ہیں۔

یقیناً صرف دو منٹ کا یہ قلیل وقفہ مجھے موت کے منہ سے واپس لے آیا تھا۔

الغرض مجھے زندگی میں ایک درجن سے زیادہ ایسے واقعات پیش آئے ہیں جب میری موت کے راستے میں کبھی کوئی پتھر کبھی ماہر پائلٹ کبھی چند انچ کے فاصلے اور کبھی چند منٹ کے وقفے حائل ہوتے رہے - قدرت کے یہ کام سمجھنے کے ہیں نہ سمجھانے کے۔

حصّہ پنجم
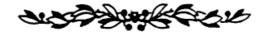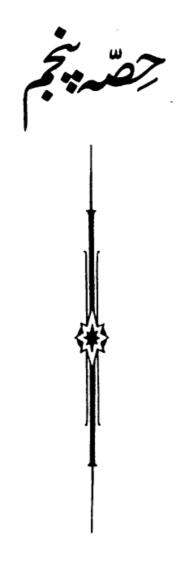
کامیابی کی کسوٹی

کامیابی کی کسوٹی

قارئین کرام ! آپ نے پچھلے صفحوں میں میری زندگی کے ابتدائی 52 سالوں کی سرگرمیوں اور کارکردگی کی تفصیلات پڑھیں۔ میری یہ زندگی کتنی کامیاب یا ناکام رہی ہے اس کا اصل اندازہ اور فیصلہ تو آپ لوگ اور کشمیر کی تاریخ (خاص کر تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی تاریخ) کریں گے۔ البتہ خود میں اپنی زندگی سے مجموعی طور پر خاصا مطمئن ہوں اور یہی اطمینان میری سب سے قیمتی متاع ہے۔

ہر شخص زندگی میں کامیابی یا ناکامی کو اپنی سوچ کے معیار سے تولتا ہے۔ کوئی دولت کو معیار بناتا ہے تو کوئی شہرت کو۔ کوئی اقتدار کو کامیابی گردانتا ہے تو کوئی زندگی کی ذہنی اور جسمانی آسائشوں کو۔ کوئی نیک نامی کو عظمت کی نشانی قرار دیتا ہے تو کوئی زہد و تقویٰ کو۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو انسان کی زندگی کو خدمت خلق کی کسوٹی پر پرکھ کر اسے کامیاب یا ناکام قرار دیتے ہیں اور میں اپنے آپ کو اسی سوچ کے حامل لوگوں میں شمار کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ تاریخ بھی کسی شخص کی کامیابی کو پرکھنے کے لئے یہی کسوٹی استعمال کرتی ہے۔

میری نظر میں کسی انسان کی زندگی کی کامیابی کی بنیادی کسوٹی یہ ہے کہ وہ کتنے لوگوں کو کتنا فائدہ پہنچاتا یا پہنچانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے یعنی جو شخص زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور دیرپا فائدہ پہنچائے یا پہنچانے کی بھرپور، مخلصانہ اور ہر ممکن کوشش کرے اس کی زندگی اسی تناسب سے کامیاب ہے اور اس شخص کی زندگی اور بھی زیادہ کامیاب ہے جو ناسازگار ذاتی حالات کے باوجود اور ان حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور دیرپا فائدہ پہنچائے یا پہنچانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ میں جب اپنی اب تک کی زندگی کو کامیابی کی اس کسوٹی پر پرکھتا ہوں تو وہ مجموعی طور پر کامیاب نظر آتی ہے۔ آیئے اس سلسلے میں ذرا تفصیل میں جائیں۔

ڈھائی سال کی عمر میں یتیم ہو کر اور والد کی شفقت اور رہنمائی سے محروم ہونے کے بعد در در کی ٹھوکریں کھانے والا۔ سکول پہنچنے کے لئے دو سال تک روزانہ 18 کلو میٹر پیدل چلنے پر

مجبور۔ 75 پیسے کے قرض کی ادائیگی نہ کر سکنے پر گالیاں کھانے والا۔ کراچی جیسے شہر میں ابتدائی ایک سال تک صرف تیس روپے ماہوار آمدنی کا حامل اور کراچی ہی میں 1954ء میں چھ ماہ تک فٹ پاتھ پر سونے پر مجبور ہونے والا امان اللہ اگر تین عشروں کی جہدِ مسلسل کے ذریعہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ ریاست جموں کشمیر کے سوا کروڑ انسانوں اور ان کی آئندہ نسلوں کو قومی آزادی کی دولت سے مالامال کرنے کے ضامن ایک انقلابی نظریۓ کی تبلیغ و تشہیر میں اہم ترین کردار ادا کرے اور اس نظریئے کو عملی جامہ پہنانے کی عملی تحریک میں بھی اس کا کردار کلیدی ہو تو اس کی اس زندگی کو غالباً" کامیاب ہی قرار دیا جائے گا۔

میرے مشاہدے اور تجزیئے کے مطابق میری زندگی کی کامیابی کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ (بجز ان حضرات کے جو مخصوص مفادات کے تحت میری کردار کشی کرتے رہے ہیں) جو لوگ مجھے ذاتی طور پر جانتے ہیں یا جنہیں میرے طرز فکر و عمل کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہیں' ان کے دلوں میں میری ذات کے لئے خاصا احترام ہے خواہ وہ نظریاتی طور پر میرے خلاف ہی کیوں نہ ہوں اور ظاہرا اور سیاسی مصلحتوں کے تحت مجھے برا بھلا ہی کیوں نہ کہتے ہوں۔ ممکن ہے میرے مخالفین میرے اس دعوے کو خود ستائی یا خود فریبی قرار دیں لیکن میں اس معاملے کے گہرے۔ غیر جانبدارانہ اور ناقدانہ تجزیۓ کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ چنانچہ میری ذات کے بارے میں یہ عام رائے بھی جو میری ایک اہم متاع ہے' میری زندگی کی کامیابی کا ایک اور ثبوت ہے گو اس کی نوعیت تحریکِ آزادیٔ سے متعلق میری کامیابی کی نوعیت سے خاصی مختلف ہے۔

آج جب میں پیچھے مڑ کر اپنی زندگی پر ایک ناقدانہ نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اطمینان سا ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اگر کچھ مرحلوں پر مجھ سے کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں (جن میں سے اکثر کا میں غیر شعوری طور پر اور باقی کا غلط اندازے کی وجہ سے مرتکب ہوا) سرزد نہ ہوتیں تو میری کامیابیاں یعنی (Achievements) شاید کہیں زیادہ اور نسبتاً بڑی ہوتیں۔

میں جب اپنی زندگی کے اہم واقعات اور ان کے دوران اپنے طرز عمل کی روشنی میں اپنی کامیابوں کی وجوہات کا تجزیہ کرتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ میری ان کامیابیوں میں میرے خلوص' منزل کے تعیّن' جہدِ مسلسل' خود اعتمادی' اخلاقی جرأت' کسر نفسی' ثابت قدمی' ناسازگار حالات سے استفادہ کرنے کی عادت' رسک لینے کی جرأت' یقین محکم' قول و فعل میں ہم آہنگی' بلند نظری' خود احتسابی' دوسروں پر اعتماد کرنے کی عادت' میانہ روی اور میری قسمت کا ہاتھ سب سے زیادہ ہے۔ آیئے ذرا میری زندگی کی کامیابی میں ان عوامل کے انفرادی کردار پر قدرے تفصیلی نظر ڈالیں۔

خلوص۔ اپنے مقصد ' اپنے ذاتی اور سیاسی ساتھیوں اور دیگر متعلقہ لوگوں اور اپنے فرائض سے مخلص رہنا میرے کردار اور خمیر کا حصہ ہے اور شاید میری کامیابی کی سب سے بڑی وجہ بھی۔ کوئی شخص اگر ایک بار میرے کسی ذاتی یا تحریک سے متعلق کسی معاملے میں میری کوئی مدد کرے تو میں اس کے عوض اس کی طرف سے میرے ساتھ ہونے والی بہت سی زیادتیوں کو معاف یا نظر انداز کرتا ہوں۔ دوسروں کے احسانات کو آسانی سے نہیں بھولتا۔ اپنے اخلاقی اور منصبی فرائض کی ادائیگی میں میں کبھی شعوری طور پر کوتاہی نہیں کرتا۔ بداخلاقی کا جواب بداخلاقی یا الزام تراشی کا جواب الزام تراشی سے نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ عام طور پر الزام تراشی کا جواب ہی نہیں دیتا۔ اگرچہ میرے اس طرزِ عمل سے کچھ لوگوں نے انتہائی ناجائز فائدہ بھی اٹھایا جس کے نتیجے میں میری ذات' تنظیم اور تحریک کو نقصان بھی پہنچا چنانچہ میرے کچھ احباب میرے اس طرزِ عمل پر مجھ سے نالاں بھی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انسان کے اس طرزِ عمل کے فائدے اس کے نقصانات سے کہیں زیادہ ہیں چنانچہ میں اپنی ان عادتوں کو اپنی متاعِ بے بہا تصور کرتا ہوں۔

منزل کا تعین۔ زندگی میں کسی مقصد یا منزل کے تعین کے بغیر انسان ایک بے مددگار اندھے انسان کی طرح ہوتا ہے جو اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا ہے۔ انسان کو اپنے قلیل المیعاد مقاصد اور پوری زندگی کے لئے ایک واضح منزل کا تعین کرنا چاہئے۔ اس سے انسان کی زندگی کو ایک واضح سمت ملنے کے علاوہ انسان میں آگے بڑھنے کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ میری کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے اپنی نجی اور سیاسی زندگی میں اپنے لئے ایک واضح منزل کا تعین کیا۔ اس کے حصول کے لئے جدوجہد کی اور جدوجہد کے سلسلے کو ٹوٹنے نہیں دیا۔

مسلسل محنت۔ مسلسل ذہنی اور جسمانی محنت کی عادت میری زندگی کا ایک اہم حصہ ہے اور میری زندگی کی کامیابی کی ایک اہم وجہ بھی۔ کوئی کام نہ ہو تو کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اپنے سکولوں کے قیام اور ان کی ترقی سے لے کر لبریشن فرنٹ اور اس کے نظریات کے پھیلاؤ تک کے پس منظر میں میری ذہنی اور جسمانی محنت کا حصہ نمایاں نظر آتا ہے۔ گو وقت گزرنے کے ساتھ محنت کی نوعیت بھی بدل گئی ہے اور میری سرگرمیوں میں ذہنی محنت کا عنصر جسمانی محنت پر پوری طرح غالب آگیا ہے بہر حال محنت محنت ہے ذہنی ہو یا جسمانی' اور محنت کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔

جھوٹ سے احتراز۔ میں نے زندگی میں جھوٹ بولنے سے حتی الامکان احتراز کیا ہے۔ جھوٹ بولنا اخلاقیات کے منافی ہونے کے علاوہ انسان کے لئے عارضی فائدے کے بعد بڑے مسائل پیدا کرتا ہے کیونکہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے مزید دس جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ علاوہ ازیں جھوٹ سے انسان دھوکہ دہی کا بھی مرتکب ہوتا ہے جو ایک بڑا اخلاقی جرم ہے۔ جھوٹ بولنے سے انسان دوسروں کا اعتماد بھی کھو دیتا ہے جو اسکے لئے عملی زندگی میں بڑی رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ جھوٹے انسان کو معاشرہ بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔

ثابت قدمی۔ اپنی زندگی کے مشن' نظریات اور قلیل المیعاد پروگراموں پر ثابت قدم رہنا میرے کردار کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ نظریۂ خود مختار کشمیر کو ہی لیجئے اس کا حامل اور مبلغ ہونے کی پاداش میں مجھے کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا لیکن انتہائی نامساعد حالات میں بھی میرے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی۔ اپنے نظریات کی مخالف قوتوں کے سامنے جھکنا یا عارضی یا ذاتی مفادات کے عوض بکنا میری لغت سے خارج ہیں۔ میرے طرز عمل کے اس پہلو پر بانیء پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح (جنہیں میں ان کے انتہائی مضبوط ذاتی کردار کی وجہ سے انتہائی احترام کی نظر سے دیکھتاہوں) کے اس قول کی گہری چھاپ ہے کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے سو بار سوچو لیکن فیصلہ کرنے کے بعد اس پر پوری طرح ثابت قدم رہو۔

خود اعتمادی۔ بچپن میں ہی پدرانہ شفقت' رہنمائی اور حوصلہ افزائی سے محرومی کے پیش نظر اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ میں شدید احساس کمتری کا شکار ہو جاؤں گا لیکن قدرت کی عطا کردہ ذہنی صلاحیتوں اور امتحانوں میں مسلسل اور غیر معمولی کامیابیوں نے مجھ میں خود اعتمادی پیدا کر دی جو جدوجہد بھری زندگی میں میری اہم مددگار ثابت ہوئی۔ خود اعتمادی انسان میں جرأت اور ذہنی طاقت پیدا کرتی ہے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے کہ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی یعنی Over Confidence اکثر نقصان دہ ثابت ہونے کے علاوہ انسان کو متکبر اور مغرور بھی بنا دیتی ہے اور معاشرہ اور تاریخ مغرور انسان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

قوت برداشت۔ قدرت نے مجھے مضبوط قوت برداشت سے نوازا ہے' چنانچہ زندگی خاص کر سیاسی زندگی میں میری یہ دولت کام آتی رہی ہے۔ میرے سیاسی مخالفین مجھ پر طرح طرح کے بے بنیاد الزام لگا کر میری بدترین کردار کشی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ تحریک آزادی کے نام پر جمع کی گئی رقوم بھی میری کردار کشی پر مبنی کتابچوں' رسالوں اور اخباری بیان

بازی پر صرف کرتے رہے۔ حکومتیں مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا کے طور پر تختۂ مشق بناتی رہیں۔ لیکن میں صبر سے کام لیتا رہا چنانچہ میرے مخالفین تھک ہار کر خاموش ہوتے رہے۔ میرا یہ یقین ایمان کی حد تک پختہ ہے کہ وقت سب سے بڑا جج ہے۔ وہ دیر سے ہی سہی بالاخر دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیتا ہے اور دوسروں پر بے بنیاد الزام تراشی کرنے والوں کو خاموش ہی نہیں کرتا انہیں مختلف سزائیں بھی دیتا ہے۔

وقت کے فیصلے سے متعلق اس حقیقت سے قطع نظر یہ نفسیاتی حقیقت بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ مسلسل صبر سے انسان پر نفسیاتی اثر پڑتا ہے جس کے نتیجے میں وہ جرات سے محروم ہو کر بزدل بن جاتا ہے یہ بزدلی ایک حد سے آگر بڑھ جائے تو بے غیرتی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور معاشرہ اور تاریخ بزدل اور بے غیرت انسانوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

اخلاقی جرأت۔ میری زندگی کے مقاصد کی پاکیزگی' سازشی نوعیت کے طرز عمل سے مکمل پرہیز اور خود اعتمادی نے مجھ میں اخلاقی جرات پیدا کی ہے اور اخلاقی جرات انسان کے لئے کامیابی کی طرف کے سفر کے دوران قوت بخش زاد راہ ثابت ہوتی ہے۔

کسرِ نفسی۔ کسر نفسی یعنی اپنے آپ کو غیر ضروری طور پر بڑا نہ سمجھنا' میری شخصیت کا ایک جزُ ہے اور زندگی میں میری کامیابیوں میں اس کا بھی خاصا ہاتھ ہے۔ اس بارے میں بچپن میں پڑھے ہوئے اقبال کے اس شعر نے میری رہبری کی کہ "مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے ۔ کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے" میرے کچھ دوست میری منکسر المزاجی اور کسر نفسی پر بھی نالاں ہیں اور انہیں ان کے نفسیاتی اثرات کے پیش نظر دور حاضر کے عملی رجحانات کے منافی قرار دیتے ہوئے مجھے اس طرز عمل کو خیرباد کہنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس طرز عمل کے بھی فائدے اس کے نقصانات سے کہیں زیادہ ہیں۔ البتہ کسر نفسی' احساس کمتری اور معذرت خواہانہ طرز عمل میں فرق کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے کیونکہ ان تین طرز ہائے عمل میں بہت کم فرق ہونے کے باوجود جہاں کسر نفسی انسان کو دوسروں کی نظروں میں اونچا کر دیتی ہے وہاں احساس کمتری اور معذرت خواہانہ طرز عمل انسان کو جی حضوری اور چاپلوس بنا دیتے ہیں اور انسان کی یہ دونوں خامیاں عارضی اور چھوٹی نوعیت کے فوائد کی حامل ہونے کے باوجود انسان کی شخصیت کو مسخ کر دیتی ہیں اور کسی کی شخصیت مسخ ہونا اس کے لئے ایک سانحہ سے کم نہیں۔

مشکلات سے استفادہ۔ ایک مشہور دانشور کا قول ہے کہ انسان چاہے تو بدترین حالات سے بھی بہترین فائدہ اٹھا سکتا ہے چنانچہ میں بھی اس قول پر عمل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ مجھ پر جب بھی کوئی مشکل آن پڑی میں اپنی قسمت یا دوسروں کو کوسنے کی بجائے اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرنے کے علاوہ اس سے استفادہ کرنے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔ میری زندگی کی بہترین تحریر میرے قلم سے 1971ء میں شاہی قلعہ لاہور میں میری پُرعذاب اسیری کے دوران نکلی جس کی تفصیل اس کتاب کے متعلقہ باب (شاہی قلعہ لاہور میں سات ہفتے) میں بیان کی گئی ہے۔ ستمبر 1985ء میں برطانوی حکومت نے بھارتی دباؤ کے تحت اور بے بنیاد الزامات لگا کر مجھے گرفتار کیا اور دہشت گردوں کے لئے مخصوص اور انتہائی اذیت ناک ماحول والے جیل میں قید رکھا۔ لیکن میں نے اپنے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کو اپنے ذہن اور دل پر مسلط ہونے نہیں دیا بلکہ اسے ذہن سے ہی اُتار پھینکا اور اپنی اس بے جواز اسیری کو تحریک آزادی کے لئے اپنی قربانی تصور کر کے اس سے اطمینان قلب حاصل کرتا رہا اور اس طرح ملنے والے ذہنی سکون سے استفادہ کرتے ہوئے میں نے ایک کتاب (خود مختار کشمیر کیوں؟) لکھنے کے علاوہ بہت سی اچھی کتابیں پڑھ ڈالیں جس سے میری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ فرصت کے اوقات میں بی بی سی ریڈیو کے معلوماتی پروگرام سننے سے میری معلومات میں مزید اضافہ ہوا۔ وسیع معلومات انسان میں خود اعتمادی پیدا کرنے اور بحث مباحثوں کے دوران اسے مجلس میں ایک اعلیٰ مقام دلانے کے علاوہ اس کی شخصیت میں بھی نکھار لاتی ہیں۔ برطانیہ میں پندرہ ماہ کی اسیری کے دوران میں نے حالیہ تاریخ عالم کے علاوہ دنیا کی عظیم ہستیوں کی سوانح عمریاں بھی پڑھیں جس سے مجھے ان عظیم ہستیوں کے طرز فکر و عمل کا اندازہ ہوا۔ چنانچہ جب میں کسی مشکل میں پھنس جاتا ہوں تو سوچتا ہوں اگر فلاں عظیم ہستی ایسے حالات سے دوچار ہوجاتی تو اس کا طرز عمل اور رد عمل کیا ہوتا۔ اس طرح مجھے اس مشکل پر قابو پانے میں مدد اور رہنمائی ملتی ہے۔ یہ ہیں مشکلات اور نامساعد حالات سے استفادہ کرنے کے کرشمے۔ اگر میں برطانیہ کی جیلوں اور شاہی قلعہ لاہور میں اپنی اسیری کے دوران اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر ہی کڑھتا رہتا تو یہ اسیریاں میرے لئے عذاب جان بن جاتیں جبکہ ان ناانصافیوں سے استفادہ کرنے کے میرے طرز عمل سے مجھے گوناگوں فائدے ہوئے اور میں ذہنی عذاب سے بھی بچا۔

رسک لینا۔ میں نے زندگی میں بے شمار رسک (Risk) لئے ہیں اور ان میں تقریباً 80 فیصد کامیاب رہا ہوں۔ چنانچہ زندگی میں میری کامیابیوں کی ایک وجہ میری یہ عادت بھی ہے۔ اگرچہ مجھ میں یہ عادت بچپن سے ہی تھی لیکن اسے میرے طرز عمل کا حصہ بنانے میں روزنامہ ڈان کراچی کی پیشانی پر کئی سال تک روزانہ شائع ہونے والے مقولے "Those only

"live who dare" یعنی دنیا میں وہی لوگ (صحیح معنوں میں) زندہ رہتے ہیں جو جرأت سے کام لیتے ہیں" کا بڑا ہاتھ ہے۔

یقین محکم۔ اپنے مقصد، پروگرام اور مشن کی صداقت اور ان کے حصول کے امکان پر انسان کا یقین اس میں خود اعتمادی، مقصد کے حصول کی لگن اور محنت کا جذبہ پیدا کرتا ہے جس سے مقصد کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔ میری زندگی میں کامیابی کافی حد تک میرے اس طرزِ فکر کی بھی مرہون منت ہے۔

قول و فعل میں ہم آہنگی۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ میرے قول و فعل میں ہی نہیں ظاہر و باطن میں بھی مکمل ہم آہنگی رہے۔ انسان کے اس طرز عمل سے دوسروں کے دلوں میں اس کے لئے عزت و احترام ہی نہیں اعتماد بھی پیدا ہو جاتا ہے اور یہ عزت و احترام اور دوسروں کا اعتماد انسان کے لئے ایک قیمتی متاع ثابت ہوتے ہیں۔

بلند نظری۔ 1950ء میں میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی کے بعد بلند نظری میری سوچ اور کردار کا حصہ بن گئی چنانچہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی میں نے بلند نظری کا دامن نہیں چھوڑا چنانچہ کبھی کبھی میری یہ بلند نظری شیخ چلی کے خیالات کی سرحدوں کو چھونے لگتی تھی۔ علاوہ ازیں حالات بھی مجھے اس سمت میں دھکیلتے رہے۔ صرف پندرہ روپے کے سرمائے سے سکول قائم کرنے پر مجبور ظاہراً حالات نے کیا لیکن اس کے پس منظر میں میری بلند نظری کارفرما تھی ورنہ میں سٹی نائٹ سکول کے ہیڈ ماسٹر کے ریمارکس کے رد عمل کے طور پر ایسا قدم اٹھانے کی بجائے خاموشی اختیار کرتا۔ اسی طرح اپنے سکولوں کے منافع بخش ہوتے ہی اپنا بینک بیلنس یا جائیداد بنانے کی بجائے میں نے ایک نظریاتی ماہنامہ (وائس آف کشمیر) جاری کیا حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ نظریاتی رسالے مالی اور ذہنی طور پر انسان کا خون چوستے ہیں۔ سیاسی میدان میں عملی قدم رکھتے ہی میں نے ذاتی منفعت والی سیاست کی بجائے بلند نظری پر مبنی نظریاتی سیاست کا کانٹوں بھرا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ بلند نظری پر مبنی اپنے ان اقدامات کی بدولت میرے لئے کامیابی کے بہت سے راستے کھل گئے۔

بلند نظری کے درج بالا روشن پہلو سے قطع نظر، اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے کہ جہاں انسان کی نظر آسمان پر ہونی چاہئے وہاں پاؤں زمین پر ضرور ہونے چاہئیں (یعنی عملی حقائق کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے) ورنہ انسان ہوا میں لٹک جاتا ہے۔

خود احتسابی۔ جس طرح مملکت کی بقاء کے لئے فوج اور پولیس ایک بنیادی ضرورت ہوتی ہے تاکہ فوج مملکت کو بیرونی خطرات سے محفوظ رکھے اور پولیس اندرونی طور پر امن و امان قائم رکھے اسی طرح انسان کے لئے خود احتسابی (اپنے فکر و عمل کا محاسبہ کرنا) ضروری ہے تاکہ وہ اپنے غلط اقدامات یا غلط سوچ کے نتیجے میں ہونے والے بیرونی حملوں سے بھی محفوظ رہے اور کج روی (غلط کاموں) سے بھی بچا رہے۔ خود احتسابی کی عادت نے مجھے بارہا بڑے بڑے بیرونی اور اندرونی خطروں سے بچایا ہے۔ خود احتسابی کا طریقہ یہ ہے کہ انسان وقفہ وقفہ سے انصاف اور اخلاقی قدروں کی روشنی میں اور اپنے مشن کے مفادات کو مد نظر رکھ کر اپنے طرز فکر و عمل کا تجزیہ کرے اور جہاں کہیں کوئی خامی نظر آئے اسے فوراً دور کرے۔

دوسروں پر اعتماد۔ انسان کو دوسروں سے تعلقات اور برتاؤ کے سلسلے میں پولیس افسر کی بجائے جج کا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ پولیس افسر اس وقت تک کسی ملزم کو بے قصور تسلیم نہیں کرتا جب تک اس پر لگا ہوا الزام غلط ثابت نہ ہو جبکہ جج کسی ملزم کو اس وقت تک مجرم تصور نہیں کرتا جب تک اس پر لگا ہوا الزام سو فیصد صحیح ثابت نہ ہو بلکہ شک کا فائدہ بھی ملزم کو ہی دیتا ہے۔ میں دوسروں سے تعلقات ، ان سے برتاؤ اور ان پر اعتماد کے سلسلے میں جج کے متذکرہ بالا طرز فکر پر کاربند رہا ہوں ۔ گو میرے اس طرز عمل سے میری ذات ، تنظیم اور تحریک کو کئی بار نقصان بھی پہنچا ہے اور میرے اس طرز عمل پر میرے بہت سے احباب بھی مجھ سے نالاں رہے ہیں لیکن جب میں اس طرز عمل کے عارضی نقصانات اور دیرپا فوائد کا موازنہ کرتا ہوں تو فوائد کا پلڑا بہت بھاری نظر آتا ہے۔

میانہ روی۔ انگریزی کا ایک فلسفیانہ مقولہ ہے There is no universal truth except that every truth is half true. یعنی دنیا میں ایسی کوئی سچائی نہیں جسے ہر دور میں ہر جگہ اور ہر طبقے نے سچائی تسلیم کیا ہوا بجز اس سچائی کے کہ ہر سچائی نیم سچائی ہوتی ہے۔ عام زبان میں اس مقولے کو یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرز فکر و عمل ایک جگہ ، ایک دور میں اور ایک طبقے میں معیوب تصور ہوتا ہے جبکہ وہی طرز فکر و عمل دوسری جگہ دوسرے دور میں یا دوسرے طبقے میں قابل تحسین مانا جاتا ہے۔ ماضی میں حقائق پر پردہ ڈالنے ۔ معاملات کے ایک ہی پہلو کو اجاگر کرنے اور قول و فعل اور ظاہر و باطن میں ہم آہنگی کے فقدان کو ایک ناپسندیدہ طرز عمل گردانا جاتا تھا جبکہ آج یہی طرز عمل اچھی حکمت عملی ، کامیاب ڈپلومیسی اور کامیاب سیلز مین شپ (Salesmanship) تصور ہوتا ہے۔ معاشرے کا ایک طبقہ معاشرے کو ماضی کی قدروں کے تابع کرنا چاہتا ہے جبکہ دوسرا طبقہ اسے رجعت پسندی قرار دے کر معاشرے

کو ترقی پسندی اور جدیدیت کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی طرح مغرب والوں کی نظر میں مشرقی قدریں دقیانوسی طرز فکر و عمل کی آئینہ دار ہیں جبکہ مشرق والے یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب انسان کو حیوانیت کی طرف لے جا رہا ہے۔

ماضی اور حال۔ معاشرے کے مختلف طبقوں اور مشرق و مغرب کے مابین اس فکری ٹکراؤ کی پیچیدہ صورت حال کے پیش نظر ارفعہ مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں مصروف ایک مشرقی انسان کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ میانہ روی یعنی درمیانی راستہ اختیار کرے۔ رجعت پسندی اختیار کرنا یا الٹرا ماڈرن (Ultra modern) بننا اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

مناسب معلومات ۔ انگریزی کا ایک مقولہ ہے One must knows some thing about every thing and every thing about some thing یعنی انسان کو ہر چیز کے بارے میں کچھ معلومات رکھنی چاہئیں اور کسی چیز کے بارے میں تمام معلومات ہونی چاہئیں۔ انسان کی معلومات اسکی عملی زندگی میں اسکے بڑے کام آتی ہیں۔ میری خوش قسمتی کہ حالات نے مجھے طالب علمی کے زمانے میں بہت سے اہم مضمون پڑھنے پر مجبور کیا چنانچہ میٹرک تک اردو۔ فارسی۔ تاریخ۔ جغرافیہ اور حساب ' ایف ایس سی میں سائنس' بی اے میں سیاسیات اور عالمی تاریخ۔ ایل ایل بی میں قانون ایم اے میں بین الاقوامی تعلقات اور ایم پی اے معاشیات جیسے اہم مضامین پڑھے۔ ابتدائی اسلامی تعلیم گھر پر ہی پڑھی جبکہ اسلام کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ عملی زندگی میں آنے کے بعد کیا۔ دوسرے مذاہب کا بھی مطالعہ کیا ۔ البتہ عملی زندگی میں میرا اہم ترین موضوع مسئلہ کشمیر رہا ہے جس کے بارے میں میں نے خاصا پڑھا ہی نہیں بلکہ اب تک میں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر ایک کتاب تقریبا ڈیڑھ درجن کتابچے اور سینکڑوں مضامین لکھے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں پڑھے ہوئے سارے مضامین سے مجھے عملی زندگی میں بڑی مدد ملی میں نے انسانی نفسیات سے متعلق کچھ کتابیں بھی پڑھی ہیں چنانچہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کام آنے والے ان مضامین کے سرسری مطالعے اور مسئلہ کشمیر کے تفصیلی مطالعے نے میری نجی اور سیاسی زندگی میں میری بڑی مدد کی ہے۔

قسمت ۔ میں "قسمت" اور "تقدیر" کی اصطلاحوں کے بارے میں کچھ مولوی صاحبان کے اس استدلال یا تشریح سے اتفاق نہیں کرتا کہ انسان کی حیثیت خدا یا قدرت کے ہاتھ میں ایک قیدی یا کٹھ پتلی کی سی ہے اور یہ کہ انسان کی زندگی کا ہر واقعہ پہلے سے ہی مقرر شدہ ہے۔ اس بارے میں میرا نظریہ یہ ہے کہ انسان بڑی حد تک خود مختار ہے اور اپنی زندگی

بنانے اور بگاڑنے اور اس کی سمت کا تعین کرنے میں بڑی حد تک آزاد ہے البتہ یہ بات بھی یقینی ہے کہ انسان کی زندگی پر وہ معاملات بھی خاصی حد تک نظرانداز ہوتے ہیں جن پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ بیرونی عوامل انسان کی زندگی کو مختصر یا طویل کرنے، اسے کامیاب یا ناکام بنانے اور اس کی سمت تعین کرنے میں بھی خاصا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کتاب میں "واقعات جنہوں نے میری زندگی کے رُخ موڑ دیئے" اور "... اور میں موت کے منہ سے واپس آتا رہا" کے عنوانوں کے تحت درج واقعات ایسے ہیں جن میں سے اکثر پر میرا کوئی کنٹرول نہیں تھا لیکن ان میں سے کچھ نے میری جان بچائی اور کچھ نے میری زندگی کے رُخ مثبت سمت میں موڑ دیئے۔ اسی طرح یہ بات میرے بس میں نہیں تھی کہ میں ڈھائی سال کی عمر میں یتیم ہو کر شفیق والد کے سائے سے محروم ہونے سے بچ سکوں۔

اگر آپ ان واقعات اور عوامل کو جو آپ کے کنٹرول میں نہیں ہیں لیکن آپ کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں قسمت یا تقدیر کا نام دیتے ہیں تو قسمت واقعی انسانی زندگی پر خاصی اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ "کسی کا ایک آنسو بھی ثریا کو رلاتا ہے۔ کسی کا عمر بھر رونا یونہی برباد جاتا ہے۔" البتہ اگر انسان اپنے دل ۔ ذہن اور تجربے کا صحیح استعمال کرے تو اپنے آپ پر بیرونی عوامل کے اثر کو کم کر سکتا ہے لیکن ان سے بالکل بچے رہنا انسان کے بس کی بات نہیں۔

الغرض قسمت کی میری درج بالا تشریح کی روشنی میں میرا اپنے آپ کو خاصا خوش قسمت سمجھنا بے جا نہ ہو گا کیونکہ بیرونی عوامل میرے لئے نقصان دہ ثابت ہونے سے کہیں زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتے رہے ہیں ۔ چنانچہ میری اس خوش قسمتی نے بھی میری زندگی کی کامیابی میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔

دیگر عوامل ۔ انسانی زندگی میں اس کی کامیابی کے درج بالا عوامل کے علاوہ اور بھی عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن میں وسعت قلبی، وسیع النظری، فیاضی، انصاف پسندی، ترس، ملنساری، دھوکہ دہی اور بد دیانتی سے احتراز، خود داری اور زندہ دلی وغیرہ شامل ہیں ۔

ایک اہم خدشہ ۔ اگر میانہ روی' کے درج بالا عنوان کے تحت درج فلسفیانہ انگریزی مقولے کو انسانی زندگی کی کامیابی کے عوامل پر لاگو کیا جائے تو اس بات کا احتمال نظر آتا ہے کہ انسانی زندگی کی کامیابی کی یہ چابیاں عارضی ہیں اور ان کی یہ افادیت جلدی ختم ہو جائے گی لیکن اگر ہم مشرقی معاشرے میں قدروں کی تبدیلی کی رفتار، ان چابیوں کی مضبوط نوعیت اور مشرقی معاشرتی فکر کے رجحانات کا گہرا تجزیہ کریں تو پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی کامیابی کی یہ چابیاں کم از کم آئندہ ایک صدی تک اپنا یہ کردار ادا کرتی رہیں گی اور ان میں سے

کچھ تو آئندہ ہزاروں سال تک انسان کے لئے کامیابی کے دروازے کھولتی رہیں گی بشرطیکہ انسانی زندگی کی کامیابی کی کسوٹی وہی ہو جس کی تشریح میں نے اس باب کے شروع میں کی ہے۔ کامیابی کی نوعیت کے دوسرے تصورات کے لئے ان میں سے اکثر عوامل غیر فائدہ مند ہی نہیں نقصان دہ بھی ہیں۔

یہ تھا ان عوامل کا کسی حد تک تفصیلی ذکر اور تجزیہ جو ارفع مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں مصروف انسانوں کے لئے منزل تک پہنچنے کی جملہ ضروریات کا کام دیتے ہیں۔ میرا یہ تجزیہ سنی سنائی بات نہیں بلکہ میرے ذاتی اور عملی تجربے کا نچوڑ ہے۔ میں نے ان عوامل کا ذکر اپنے حوالے سے کر کے خودستائی کے الزام کا خطرہ بھی اسلئے مول لیا ہے کہ یہ عوامل اور میرا یہ تجزیہ دوسروں کے لئے مشعل راہ بن جائے۔ جبکہ ذاتی تجربے کا حوالہ دیئے بغیر کامیابی کے عوامل کا تذکرہ پند و نصائح کا ایک خشک اور غیر دلچسپ سا مضمون بن جاتا۔ مجھے امید ہے قارئین کرام خاص کر نوجوان اس سے مناسب استفادہ کریں گے۔

امان اللہ خان

حصّہ ششم

ریاست سے متعلق کچھ اہم موضوعات

پہلا باب
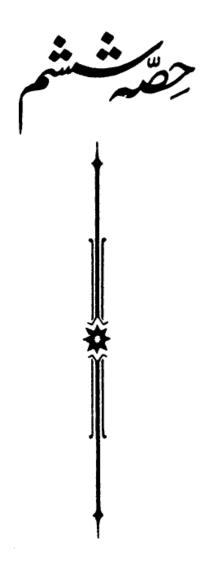
آزاد کشمیر کے پہلے انتخابات

اگرچہ میں 1955ء سے ہی کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے تحریکِ آزادیٔ کشمیر سے وابستہ ہو گیا تھا لیکن میں نے تحریک آزادی اور نظریۂ خود مختار کشمیر میں عملی حصہ لینا 1961ء میں ہونے والے آزاد کشمیر کے پہلے انتخابات سے شروع کیا۔

اکتوبر 1947ء میں آزاد گورنمنٹ کے قیام سے 1961ء تک آزاد کشمیر پر آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے دستانے کے اندر چھپا ہوا وزارت امور کشمیر کا ہاتھ حکومت کرتا رہا۔ مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ عملاً پاکستان کی وزارت امور کشمیر کی طرف سے نامزد کی گئی ہوتی تھی اور وزارت امور کشمیر اپنی بنائی ہوئی اسی مجلس عاملہ سے اپنی پسند کے شخص کو آزاد کشمیر کا صدر نامزد کراتی تھی۔ یہ صورت حال آزاد کشمیر کے جمہوریت پسند حلقوں کے لئے خاصی پریشان کن تھی اور اس کے خلاف اکثر آوازیں اٹھتی رہتی تھیں۔

1961ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے پاکستان میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام نافذ کیا تو مناسب سمجھا گیا کہ آزاد کشمیر میں بھی اسے نافذ کیا جائے اور آزاد کشمیر کی صدارت کو کچھ جمہوری شکل دی جائے۔ چنانچہ 1961ء میں پہلی بار آزاد کشمیر کے صدر کے انتخاب کے لئے مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کی بجائے عوام کی طرف سے منتخب 2400 ممبران بنیادی جمہوریت پر مشتمل الیکٹورل کالج (Electoral College) بنا۔ ان 2400 میں سے بارہ سو آزاد کشمیر، چھ سو مہاجرین صوبہ جموں مقیم پاکستان اور باقی چھ سو مہاجرین صوبہ وادیٔ کشمیر مقیم پاکستان کی طرف سے منتخب ہونے تھے۔ 2400 ممبران جمہوریت کو آزاد کشمیر کے صدر کے علاوہ ایک بارہ رکنی سٹیٹ کونسل بھی منتخب کرنی تھی، جن میں سے چھ آزاد کشمیر سے، تین صوبہ جموں اور تین صوبہ وادیٔ کشمیر کے مہاجرین میں سے منتخب ہونے تھے۔ آزاد کشمیر کی صدارت کے عہدے کے لئے پانچ اصحاب یعنی جناب کے ایچ خورشید (جو اس وقت آزاد کشمیر کے صدر تھے) سردار عبدالقیوم خان، پیر علی جان شاہ، خواجہ غلام نبی گلکار اور مسٹر داؤد امیدوار تھے۔ ان امیدواروں میں سے خواجہ غلام نبی گلکار کے منشور میں پوری ریاست جموں کشمیر کی مکمل خود مختاری نمایاں طور پر شامل تھی۔

1960ء تک کراچی میں کشمیری مہاجرین (ان دنوں کراچی میں آزاد کشمیر کے بہت کم لوگ تھے) کے سیاسی ذہن رکھنے والے اکثر لوگوں سے میرے ذاتی تعلقات قائم ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت سے نظریۂ خود مختار کشمیر کے حامی تھے - چنانچہ ہم نے اپنا ایک الگ گروپ بنایا اور فیصلہ کیا کہ ہم ووٹ خود مختار کشمیر کے منشور والے خواجہ غلام نبی گلکار کو دیں گے۔ گو ہمیں گلکار صاحب کے جیتنے کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی لیکن ہم چاہتے تھے کہ ان کی امیدواری کے ذریعہ نظریۂ خود مختار کشمیر کی پبلسٹی ہو۔ گو ان انتخابات میں میرا ووٹ نہیں تھا لیکن میں انتخابات سے متعلق سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتا رہا - ہم نے ایک اجلاس میں سٹیٹ کونسل کے لئے وادیٔ کشمیر کی سیٹ پر جی ایم لون کا نام تجویز کیا لیکن انہوں نے انتخابات میں حصہ لینے سے انکار کیا چنانچہ خواجہ غلام محی الدین بانکا کو گروپ کا امیدوار کھڑا کیا گیا اور انہیں کاغذات نامزدگی داخل کرنے کے لئے لاہور روانہ کیا گیا۔ لیکن دوسرے دن چند افراد نے جی ایم لون کو کاغذات نامزدگی داخل کرنے لاہور بھیج دیا۔ چنانچہ بانکا صاحب نے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کے بعد اپنا نام واپس لے لیا - اس صورت حال سے مجھے بہت دکھ ہوا - اجلاس میں خود میں نے لون صاحب کا نام پیش کیا تھا - لون صاحب کے انکار پر ہی بانکا صاحب کو امیدوار بنایا گیا تھا۔ لیکن بعد میں کچھ لوگوں نے لون صاحب سے اس فیصلے کی خلاف ورزی کرائی - اس افسوس اور چند دوسری وجوہات کی بنا پر میں نے سٹیٹ کونسل کے انتخاب کے سلسلے میں محمد اسحاق صاحب کی حمایت کی جس سے کچھ دوست مجھ سے ناراض بھی ہو گئے - سٹیٹ کونسل کے انتخابات میں وادیٔ کشمیر کے حلقے سے سب سے زیادہ ووٹ لینے والے تین امیدواروں کو منتخب ہونا تھا - چنانچہ اس حلقے سے کراچی سے تعلق رکھنے والے دونوں امیدوار یعنی جی ایم لون اور محمد اسحاق اور راولپنڈی سے تعلق رکھنے والے منظور الحق ڈار سب سے زیادہ ووٹ لے کر کامیاب ہو گئے۔ خواجہ غلام نبی گلکار کو صرف 29 ووٹ ملے جن میں سے 17 کراچی والوں کے تھے۔ کراچی کی حد تک ان انتخابات کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست کی مکمل خود مختاری کے حامی افراد جی ایم لون غلام محی الدین بانکا' ملک عبدالرشید' غلام محمد پہلوان' غلام احمد بٹ' ڈاکٹر عبدالغنی' عبدالاحد راٹھور' رشید شاہ' حبیب اللہ ریشی' محمد صدیق' عبداللہ خان وغیرہ پر مشتمل ایک مضبوط گروپ وجود میں آیا - میں بھی اس گروپ کا ایک سرگرم رکن بن گیا۔ انتخابات کے دوران میر عبدالقیوم ' خواجہ عطاء اللہ' میر عبدالمنان وغیرہ نے ووٹ کے ایچ خورشید کو دیئے تھے۔ بعد میں یہ لوگ بھی ہمارے گروپ میں شامل ہو گئے اس طرح آزاد کشمیر کے ان انتخابات نے آزاد کشمیر کو جمہوریت کی منزل کی طرف گامزن کرانے کے علاوہ نظریۂ خودمختار کشمیر کے حامی منتشر افراد کو یکجا کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا اور میں بھی تحریک آزادی اور نظریۂ خود مختار کشمیر سے پوری طرح منسلک ہو گیا۔

دوسرا باب

موئے مبارک کی چوری

سری نگر کے قریب درگاہ حضرت بل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی داڑھی کا ایک موئے مبارک محفوظ ہے اور کشمیری مسلمانوں کو سال میں چار پانچ بار اس کی زیارت کرائی جاتی ہے - اس زیارت کے لئے لاکھوں کشمیری وادی کے کونے کونے سے جمع ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت بل کشمیری مسلمانوں کے اتحاد کے لئے ایک اہم مرکز کا بھی کردار ادا کرتا ہے -

26 اور 27 دسمبر 1963ء کی درمیانی رات کو یہ موئے مبارک چوری ہو گیا اور صبح یہ خبر پوری وادی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی - لوگ انتہائی سردی اور برفباری کے باوجود گھروں سے باہر نکل آئے اور سری نگر کی سڑکیں ماتم کرنے والوں سے بھر گئیں اور شمس الدین کٹھ کی حکومت آناً فاناً مفلوج ہو گئی اور عنان حکومت عملاً ماتم کرنے والوں نے سنبھالی اس صورت حال سے بھارتی حکومت کی بنیادیں ہل کر رہ گئیں - موئے مبارک کی چوری کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ یہ حرکت بھارتی حکومت کی تھی جس کا مقصد ریاستی مسلمانوں کو ان کے ایک اہم مرکز سے محروم کر کے منتشر کرنا تھا۔ کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ حرکت بخشی غلام محمد نے کرائی ہے جسے کچھ مدت پہلے ہی بھارت کی مرکزی حکومت نے ریاست کے وزیراعظم کے عہدے سے ہٹایا تھا - بہر حال واضح حقیقت یہ تھی کہ اس کے نتیجے میں ریاستی حکومت اور ریاست میں سرگرم مرکزی ادارے مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔

موئے مبارک کی چوری کے خلاف آزاد کشمیر و پاکستان میں بھی شدید رد عمل ہوا۔ جگہ جگہ مظاہرے ہوئے - کراچی میں ہم نے پہلے دن دفعہ 144 توڑ کر ایک بڑا مظاہرہ کیا - اس مظاہرے کو منظم کرنے میں ہمارا خود مختار کشمیر گروپ پیش پیش تھا - بڑے مظاہرے کے بعد ہم نے 22 دن تک مسلسل مظاہرے کئے دوسرے لوگ تو باری باری مظاہرے میں شامل ہوتے تھے البتہ میں اور میر عبدالقیوم روزانہ اس میں شامل ہوتے رہے۔

موئے مبارک کی گمشدگی کے کئی روز بعد سری نگر سے اعلان ہوا کہ موئے مبارک مل گیا۔ اس پر کچھ لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کیں کہ ملنے والا موئے مبارک نقلی ہے - بہر حال

بعد میں حضرت بل کے متعلقہ لوگوں نے تصدیق کی کہ ملنے والا موئے مبارک نقلی نہیں اصلی ہے۔ البتہ بھارتی اور ریاستی حکومت نے آج تک اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا کہ موئے مبارک کی چوری کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا - چوری کس شخص نے کی تھی اور یہ کہاں سے بازیاب ہوا -

موئے مبارک کی چوری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کے ریاستی سیاست اور اس کے بارے میں بھارت کے اندازوں پر گہرے اثرات پڑے - اولاً" بھارتی حکومت نے پوری طرح محسوس کیا کہ کشمیری مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانا آگ سے کھیلنے کے مترادف ہے - ثانیاً" شمس الدین کٹھ کو وزارت عظمیٰ سے ہٹا کر جی ایم صادق کو ریاست کا وزیراعظم بنایا گیا۔ ادھر مولوی فاروق اپنی کم سنی کے باوجود اچانک کشمیر کے سیاسی افق پر پوری طرح نمودار ہو گئے - مولانا مسعودی کی منصوبہ بندی میں مہارت کو سب نے محسوس کیا اور بھارتی حکومت شیخ محمد عبداللہ کو جو گیارہ سال سے قید تھے غیر مشروط طور پر رہا کرنے پر مجبور ہو گئی - شیخ صاحب کی رہائی کے بعد بھارتی وزیراعظم نے انہیں پاکستان بھیجا تاکہ مسئلہ کشمیر کو حتمی طور پر حل کرنے کے سلسلے میں صدر ایوب خان سے بات کریں - شیخ صاحب اور صدر ایوب کی بات چیت کے نتیجے میں مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے بھارت اور پاکستان کی سربراہی کانفرنس بلانے پر اتفاق رائے ہو گیا لیکن شیخ صاحب کے دورۂ پاکستان کے دوران ہی بھارتی وزیراعظم پنڈت نہرو کا اچانک انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے سربراہی کانفرنس نہ ہو سکی نہ ہی پنڈت نہرو کے جانشینوں نے اس طرف کوئی توجہ دی۔

تیسرا باب

شیخ محمد عبداللہ

کچھ دلچسپ اور حیران کن واقعات و حقائق

بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی کے پہلے عشرے کے دوران ریاست جموں کشمیر میں یکے بعد دیگرے بہت سے ایسے واقعات رونما ہوئے جن کا بعد کے حالات پر گہرا اثر پڑا۔ ان واقعات میں گلینسی کمیشن کا قیام۔ 13 جولائی 1931ء کا واقعہ اور 1932ء میں مسلم کانفرنس اور 1934ء میں ریاست کے لیے قانون ساز اسمبلی کا قیام اور 1939ء میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنا شامل تھے لیکن جس معاملے نے ریاست کی بعد کی تاریخ پر سب سے گہرا اثر ڈالا وہ شیخ محمد عبداللہ کا سیاسیات کشمیر میں اہم ترین حیثیت حاصل کرنا تھا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کشمیریوں خاص کر اہل وادی کو بدترین احساس کمتری سے نکال کر ان میں خاصی خود اعتمادی پیدا کرنے۔ انہیں سیاسی شعور دینے اور انہیں ڈوگرہ شخصی راج اور آمریت کے خلاف سیاسی میدان میں سینہ سپر ہونے کے قابل بنانے میں شیخ صاحب کا کردار انتہائی اہم تھا لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اتنی ہی ناقابل تردید ہے کہ ریاستی عوام گذشتہ چار عشروں سے جن مصائب اور محکومی میں مبتلا ہیں ان کی ذمہ داری بھی سب سے زیادہ شیخ صاحب پر ہی عائد ہوتی ہے۔ کشمیریوں کی جدوجہد آزادی میں شیخ صاحب کے ان دو متضاد کرداروں سے متعلق تفصیلات اس کتاب کا موضوع نہیں البتہ کچھ ایسے واقعات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جن کا میں خود عینی شاہد ہوں اور جو شیخ صاحب کی شخصیت اور ان کے طرز عمل کی عکاسی کرتے ہیں۔

میں 1951ء میں ایس پی کالج سری نگر کا طالب علم تھا اور مجھے ذاتی حالات نے اس نتیجے پر پہنچا دیا تھا کہ مجھے پاکستان منتقل ہو جانا چاہئے۔ اس دوران پاکستان آنے کے لئے ریاستی حکومت کی وزارت داخلہ پاس جاری کرتی تھی۔ بخشی غلام محمد وزیر داخلہ تھے۔ میں بخشی صاحب سے ملا تو انہوں نے پاس جاری کرنے سے صاف انکار کر دیا اس کے بعد اگست 1951ء میں ایک

دن میں شیخ صاحب سے ملنے ان کی رہائش گاہ پر گیا۔ شیخ صاحب وزیراعظم تھے انہوں نے پاکستان منتقل ہونے کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا میں حد متارکہ جنگ کی دوسری طرف کے علاقہ استور گلگت کا رہنے والا ہوں اور یہاں میرے تعلیمی اخراجات برداشت کرنے والا کوئی نہیں انہوں نے کہا میٹرک کس ڈویژن میں پاس کیا ہے میں نے کہا فرسٹ ڈویژن میں۔ اس پر انہوں نے دوسرے دن مارکس شیٹ لاکر انہیں دکھانے کے لئے کہا۔ دوسرے دن میں مارکس شیٹ لے کر شیخ صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہ لان میں بیٹھے تھے اور بہت سے بھارتیوں سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے گیٹ پر کھڑے دیکھ کر بلایا میں نے مارکس شیٹ دکھائی تو کہنے لگے اچھا فرسٹ ڈویژن ہے میں نے کہا جناب میں نے فرسٹ ڈویژن ہی نہیں لی بلکہ یونیورسٹی بھر میں مسلمان طلباء میں اول آیا ہوں انہوں نے پھر کہا فرسٹ ڈویژن لی ہے تو میں نے اپنا جواب پھر دہرایا اس پر شیخ صاحب نے گرج کر کہا۔ شٹ اپ میں یہ بکواس سننا نہیں چاہتا۔ جاؤ پاس کے بارے میں تمہیں کالج میں جواب ملے گا۔ چنانچہ میں وہاں سے چلا آیا۔ چند دن بعد پتہ چلا کہ میرے لئے پاس کی بجائے دو سو روپے کی گرانٹ منظور ہوئی ہے۔

دراصل شیخ صاحب وہاں موجود بھارتیوں کو یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ وہ کٹر قسم کے سیکولرسٹ ہیں اور مذہب کی بنیاد پر پیش کیے جانے والے کسی بھی استدلال کو تسلیم یا برداشت نہیں کرتے۔ اپنے آپ کو سیکولرسٹ ثابت کرنے کے شوق میں شیخ صاحب نے فلم ورد کے گانے "اسلام کی کشتی کو ہم پار لگا دیں گے" تک پر پابندی لگا دی تھی۔

میں کچھ مدت کے لیے کالج ہوسٹل کے مسلم میس کا مینجر بنا اور میس مینجر کے کمرے میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کمرے میں مجھ سے پہلے رہنے والے کسی لڑکے نے کمرے کی الماری کے دروازے پر اندر کی طرف چاقو سے پاکستان زندہ باد کے الفاظ کندہ کئے تھے اور میں نے الفاظ پر چاک پھیر دیا چنانچہ الماری کا دروازہ کھلنے پر پاکستان زندہ باد کے الفاظ دور سے پڑھے جاتے تھے۔ ایک دن میں کمرے میں ہی تھا کہ کالج کی گھنٹی بجی اور میں الماری کا دروازہ کھلا چھوڑ کر اور کمرے کے دروازے کو بھی تالا لگائے بغیر کالج کی طرف بھاگا۔ ہوسٹل کالج سے متصل تھا اسی دوران شیخ صاحب جو وزیر تعلیم بھی تھے اچانک ہوسٹل کے معائنے کے لئے آ گئے۔ ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ پروفیسر محمود (جو پرنس محمود کے نام سے مشہور تھے) ان کے ساتھ تھے شیخ صاحب کمروں کی اندرونی حالت دیکھنا چاہتے تھے میرے کمرے کا دروازہ کھولا گیا اور سامنے الماری کے دروازے پر لکھے پاکستان زندہ باد کے الفاظ دکھائی دیئے تو شیخ صاحب آگ بگولہ ہو گئے فوراً مجھے کالج سے بلایا گیا۔ شیخ صاحب دوسرے کمروں کا معائنہ کرنے میں مصروف تھے۔ مجھے معاملے کے بارے میں پتہ چلا تو بہت گھبرایا۔ شیخ صاحب کا جلال ویسے ہی مشہور تھا۔ انہوں نے پوچھا کیا یہ عبارت تم نے لکھی ہے۔ میں نے سچ سچ بتا دیا تو انہوں نے مجھے خوب ڈانٹا۔ معلوم ہوتا تھا وہ

مجھے ابھی پولیس کے حوالے کریں گے - پھر میری طرف دیکھنے کے بعد پوچھنے لگے کیا تم استور کے رہنے والے وہی لڑکے نہیں ہو جو میرے پاس پاکستان جانے کے لئے پاس لینے آیا تھا - میں نے کہا جی میں وہی ہوں۔ اس پر خاصی نرمی سے کہنے لگے " بچے فی الحال تعلیم پڑھو - اس سے فارغ ہونے کے بعد سیاست کرنا - جاؤ یہ عبارت مٹا دو اپنا ہوم ورک کرو " اور یہ کہہ کر وہ آگے چل دیئے -

شیخ صاحب کا یہ طرز عمل میری سمجھ میں نہیں آیا - ان دنوں کے حالات کے پیش نظر میرے اس جرم کے شیخ صاحب کے نوٹس میں آنے کے بعد مجھے کم از کم دو سال قید کی سزا ہونی چاہئے تھی لیکن شیخ صاحب نے مجھے سزا صرف اس نصیحت کی شکل میں دی۔

گو میں اپنے قیام سری نگر کے دوران ریاست کے پاکستان سے الحاق کا زبردست حامی تھا لیکن شیخ صاحب کی ذات کا بھی بڑا مداح تھا۔ شیخ صاحب سے میری عقیدت کا یہ حال تھا کہ 1953ء میں ایس ایم کالج کراچی میں کالج کے کچھ طلباء کی طرف سے شیخ صاحب کی ذات پر رکیک حملے برداشت نہ کر سکا اور نتیجے کی پرواہ کئے بغیر ان میں سے ایک کو تھپڑ رسید کیا اور اس کے نتیجے میں میری جو مرمت ہوئی اس کا مجھے افسوس نہیں ہوا -

1964ء کے وسط میں شیخ صاحب پاکستان آئے تو میں اپنا ایم اے کا امتحان چھوڑ کر راولپنڈی پہنچ گیا - لیکن بڑی کوششوں کے باوجود ان سے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی۔

شیخ صاحب کے پاکستان سے واپسی کے دو ماہ بعد آزاد کشمیر کے صدر کے ایچ خورشید صاحب کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ ان پر لگائے جانے والے الزامات میں سے ایک الزام یہ بھی تھا کہ شیخ صاحب کے مختصر دورۂ مظفر آباد کے دوران خورشید صاحب نے ان سے کشمیری زبان میں کچھ ایسی باتیں کی تھیں جو پاکستان کے مفاد کے خلاف تھیں - اپنی برطرفی کے کچھ مدت بعد خورشید صاحب کراچی آئے تو کراچی میں لبریشن لیگ کے سرگرم رکن خواجہ غلام حسن پنجابی کے ہاں جی ایم لون ، میر عبدالقیوم ، میر عبدالمنان ، خواجہ عطاء اللہ اور میں خورشید صاحب سے ملے۔ ان دنوں شیخ صاحب یورپ گئے ہوئے تھے ہماری گپ شپ کے دوران کسی نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ہم میں سے کوئی شخص یورپ جا کر شیخ صاحب سے ملے اور تحریک آزادی کے سلسلے میں ایک ٹھوس پروگرام پر ان سے تبادلہ خیال کرے - سب نے تجویز سے اتفاق کیا اور آخر فیصلہ ہوا کہ یورپ خورشید صاحب جائیں اور ان کے اس سفر کے اخراجات لون صاحب برداشت کریں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور خورشید صاحب چپکے سے فرانس پہنچ گئے اور شیخ صاحب سے ملاقات کی لیکن شیخ صاحب نے تجویز کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ خورشید صاحب سے سرد مہری سے پیش آئے چنانچہ خورشید صاحب وہاں سے شیخ صاحب کے بارے میں انتہائی مایوس کُن تاثر لے کر واپس آ گئے۔

یورپ سے واپسی پر شیخ صاحب سعودی عرب گئے اور خاصی مدت تک وہاں ٹھہرے۔ ادھر جی ایم لون صاحب بھی حج کے لئے وہاں پہنچے اور بڑے پاپڑ بیلنے کے بعد شیخ صاحب سے ملے اور ان سے گزارش کی کہ وہ پاکستان اور آزاد کشمیر میں اپنے عقیدت مندوں اور پیروکاروں کو مشورہ دیں کہ وہ تحریک آزادی میں کس طرح کوئی تعمیری کردار ادا کر سکتے ہیں۔ شیخ صاحب نے کوئی ٹھوس بات کرنے کے بجائے انہیں بری طرح ڈانٹ دیا چنانچہ لون صاحب انتہائی مایوس ہو کر وہاں سے نکلے اور یورپ چلے گئے۔ واپس آنے کے بعد ایک دن لون صاحب نے مجھے اکیلے میں کہا امان صاحب آپ چاہیں تو شیخ عبداللہ کو پوجتے رہیں میں تو ان سے انتہائی ناامید ہوا ہوں ہم لوگ شیخ صاحب کو جتنا عظیم اور محب وطن سمجھتے رہے ہیں۔ وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ انہوں نے اپنے استدلال کے حق میں ٹھوس ثبوت بھی دیئے۔

شیخ صاحب کے بارے میں خورشید صاحب اور لون صاحب کے تاثرات سننے کے بعد بھی ان سے میری عقیدت میں کوئی بڑا فرق نہیں آیا۔ غالباً 1968ء کے اوائل کی بات ہے میں پیر مقبول صاحب گیلانی کے ہاں بیٹھا تھا۔ ان دنوں شیخ صاحب جنوبی بھارت کے مقام کو ڈائی کنال میں نظر بند تھے۔ میری اور گیلانی صاحب کی گپ شپ کا موضوع شیخ صاحب ہی تھے۔ باتوں باتوں میں گیلانی صاحب نے کہا کہ شیخ صاحب کو گلگتی چوغہ بہت پسند ہے ان کے پاس ایک چوغہ ہے لیکن اب بہت بوسیدہ ہو چکا ہے۔ شیخ صاحب سے میری عقیدت کا یہ حال تھا کہ میں دوسرے ہی دن ہوائی جہاز سے گلگت پہنچا اور مشہور کنٹریکٹر حبیب اللہ میر صاحب کو دو اعلیٰ قسم کے خوبصورت چوغوں کا آرڈر دیا۔ کچھ مدت کے بعد یہ دو چوغے گیلانی صاحب کی ہی وساطت سے شیخ صاحب کو بھیج دیئے گئے اس کے چند ماہ بعد میری گیلانی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ چوغے شیخ صاحب کو مل گئے ہیں اور انہوں نے میرے نام خط میں چوغے بھیجنے کے لئے آپ کا شکریہ ادا کیا ہے بلکہ خط میں یہ مذاق بھی ہے (میں نے دونوں چوغے شیخ صاحب کے سات فٹ والے قد کے حساب سے بنوائے تھے اور شیخ صاحب سمجھے تھے کہ ایک چوغہ بیگ صاحب کے لئے ہے جو قد میں پانچ سوا پانچ فٹ تھے) کہ چوغے کو بیگ صاحب پہن تو نہیں سکتے اس لئے کہ اس میں غائب ہو جاتے ہیں البتہ اسے خیمے کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ باتیں سن کر میرا تجسس بڑھ گیا اور میں نے گیلانی صاحب سے کہا کہ وہ خط مجھے دکھائیں۔ انہوں نے کہا آپ خط نہیں دیکھ سکتے اس لیے کہ اس میں بڑی راز کی باتیں ہیں۔ میرا تجسس اور بھی بڑھ گیا میں نے کہا مجھے وہی حصہ دکھائیں جس میں میرا ذکر ہے گیلانی صاحب نے مجھے خاصے پس و پیش کے بعد خط کا مجھ سے متعلق پیراگراف دکھاتے ہوئے خط مجھے دے دیا اور پھر تاکید کی کہ میں خط کا اپنے سے متعلق حصہ ہی پڑھوں چنانچہ سارا خط پڑھنے کا میرا تجسس اور بھی بڑھ گیا۔ خط میرے ہاتھ میں آتے ہی میں باہر کی طرف بھاگا اور دوسرے کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

گیلانی صاحب دروازہ پیٹتے رہے اور میں نے اندر سارا خط پڑھ ڈالا۔ یہ طویل خط بیگ صاحب نے شیخ صاحب کی طرف سے گیلانی صاحب کو لکھا تھا اور اس میں "کسی کے آگے نہ خم ہو سکی مری گردن - کسی جگہ میری آواز آج تک نہ دبی" کے اشعار انتہائی ترنم سے پڑھ کر سامعین کے جذبات سے کھیلنے والے شیخ محمد عبداللہ نے اپنی خود داری کے پرخچے اڑاتے ہوئے انتہائی عاجزانہ انداز میں گیلانی صاحب کے ذریعہ پاکستان کے ایک افسر سے استدعا کی تھی وہ حکومت پاکستان سے سفارش کر کے انہیں (شیخ صاحب کو) کچھ مزید مالی امداد دلا دیں۔ خط میں بار بار اپنی مجبوریوں کا رونا رویا گیا تھا۔ خط پڑھ کر لمحے بھر کے لیے تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جن لیڈروں کا ہم پرستش کی حد تک احترام کرتے تھے وہ اس طرح اپنی خود داری اور کشمیریت کا جنازہ بھی نکال سکتے ہیں -

وقت گزرتا گیا اور میرے ذہن میں شیخ صاحب کے سابقہ امیج اور خط کے مندرجات کے مابین ایک جنگ جاری رہی یہاں تک کہ 1976ء میں میں برطانیہ چلا گیا۔ غالباً 1977ء میں مجھے شیخ صاحب اور مسز اندرا گاندھی کے مابین فروری 1975ء میں طے پانے والے دہلی ایکارڈ (Accord Delhi) کا اصل متن پڑھنے کا موقع ملا جس سے شیخ صاحب کے لئے میرے دل و دماغ پر پائی جانے والی باقی ماندہ عقیدت بھی دھڑام سے زمین بوس ہو گئی کیونکہ شیخ صاحب نے اس معاہدے کے پہلے ہی پیراگراف میں پوری ریاست جموں کشمیر کو بھارت کا آئینی حصہ اور اٹوٹ انگ تسلیم کیا تھا اور اس معاہدے کے مندرجات پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس شخص کے خلاف قلم اٹھانا عین جہاد ہے اور میں نے یہ جہاد شروع کر دیا۔

میں نے 1978ء میں شیخ صاحب کو ایک طویل خط لکھا جس میں دہلی ایکارڈ کے کشمیر کش پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان سے پھر گذارش کی کہ وہ کشمیر کی آئندہ نسلوں کے مفاد میں اس معاہدے سے لاتعلق ہو جائیں اور ریاست کی مکمل خود مختاری کی تحریک چلائیں - کچھ مدت کے بعد مجھے ان کا ایک طویل خط ملا جس میں انہوں نے ریاست کی مکمل خودمختاری کے نظریئے کو ناقابل عمل اور بھارت کے ساتھ الحاق کو کشمیر کے لئے بہترین راستہ قرار دیتے ہوئے کشمیریوں کے مصائب و آلام کی ساری ذمہ داری پاکستان پر ڈالی تھی۔

شیخ صاحب کے میرے نام اس خط کے دو ڈھائی سال بعد مرزا افضل بیگ کو شیخ صاحب نے وزارت سے علیحدہ کر دیا تو بیگ صاحب نے اعلانیہ طور شیخ صاحب پر الزام لگایا کہ وہ (شیخ صاحب) کشمیریوں کی تحریک آزادی کے نام پر پاکستان سے کروڑوں روپیہ وصول کر چکے ہیں۔ بیگ صاحب کا یہ بیان اخبارات میں پڑھ کر مجھے شیخ صاحب کے 1968ء میں گیلانی صاحب کے نام اور 1978ء میں میرے نام لکھے گئے خطوط کے مندرجات ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے دکھائی دیئے۔

شیخ صاحب کے بارے میں درج بالا حقائق و واقعات کا مجموعی تجزیہ کیا جائے تو ان کی شخصیت اور ان کے کردار کے تاریک پہلو کی ایک واضح شبیہہ آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے لیکن یاد رکھیئے یہ ان کے کردار کی تاریک پہلو ہی کی شبیہہ ہے ان کی شخصیت کا روشن پہلو اس سے بالکل مختلف ہے۔

شیخ صاحب نے اپنی پچاس سالہ سیاسی زندگی میں مجموعی طور پر پندرہ سال سے زائد مدت کی جیل کاٹی اور بھارت کے فرقہ پرست ہندوؤں کے اور کشمیر کے اقتدار پرست ہم وطنوں کی طرف سے طرح طرح کے الزامات بھی برداشت کیئے۔ ان کی ظاہری جرات اور بے باکی بھی مثالی تھی لیکن ان کی خدمات و خصوصیات پر ان کی درج بالا طرز کی کمزوریوں اور انتہائی نازک اور اہم موقعوں پر ان کی طرف سے سرزد ہونے والی فاش غلطیوں خاص کر 1975ء والی ملت فروشی نے پانی پھیر دیا اور ان غلطیوں کا خمیازہ اہل کشمیر کے علاوہ خود ان کا ذاتی امیج بھی بھگت رہا ہے اگر وہ یہ غلطیاں نہ کرتے تو ایک طرف خود انہیں آئندہ صدیوں کے دوران بڈشاہ ثانی کا درجہ دے کر عزت و احترام کے ساتھ یاد کیا جاتا اور دوسری طرف کشمیری قوم بھی مصائب و آلام میں مبتلا ہونے کی بجائے کب کی آزاد اقوام عالم کی صف میں شامل ہو گئی ہوتی۔ اسی کو کہتے ہیں

لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

1970ء میں لکھی گئی میری کتاب "فری کشمیر" میں شیخ صاحب کے بارے میں میرا وہ تبصرہ صحیح ثابت ہوا جس پر میرے اس وقت کے بہت سے ساتھی سیخ پا ہو گئے تھے۔ تحریک آزادئ کشمیر سے متعلق شیخ صاحب کے کردار کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد میں نے (کتاب کے صفحہ 40 پر) لکھا تھا "ان حقائق سے قطع نظر تاریخ نے برصغیر کی اس بڑی لیکن انتہائی متنازعہ شخصیت کے بارے میں ابھی اپنا حتمی فیصلہ نہیں دیا ہے۔ یہ حتمی فیصلہ شاید مسئلہ کشمیر کی آخری شکل اور شیخ صاحب کی بقیہ زندگی کے دوران ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی روشنی میں دیا جائے گا۔"

چوتھا باب

تحریکِ آزادی میں کشمیری صحافیوں اور دُوسرے قلمکاروں کا کردار

تحریک آزادیٔ کشمیر کو زندہ رکھنے کے لئے جہاں دوسرے حلقوں اور عوامل نے اہم کردار ادا کیا ہے وہاں حد متارکہ جنگ کے اس طرف کے صحافیوں ادیبوں اور شاعروں نے بھی مجموعی طور پر خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔

حد متارکہ جنگ کے اِس طرف کی کشمیری صحافت کو تین حلقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حلقہ تو ان صحافیوں پر مشتمل ہے جو اپنے ہفت روزے یا پندرہ روزے شائع کرتے ہیں۔ دوسرا حلقہ وہ لوگ ہیں جو آزاد کشمیر میں پاکستان کے قومی اخبارات اور رسائل کے نمائندوں کے فرائض انجام دیتے ہیں اور تیسرا حلقہ ان احباب پر مشتمل ہے جو پاکستان میں یا بیرون پاکستان ذرائع ابلاغ سے متعلق اداروں سے منسلک ہیں۔

اپنے ہفت روزے شائع کرنے والے کشمیری صحافیوں کی بھاری اکثریت مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے مہاجروں پر مشتمل ہے اور یہ لوگ زیادہ تر سیالکوٹ، راولپنڈی اور مظفر آباد میں آباد ہیں۔ ان لوگوں نے جبری ہجرت اور غریب الوطنی سے منسلک جانکاہ مسائل کامقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے طرز پر اور مختلف نظریات کے تحت مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کو زندہ رکھنے کے لئے اہم کرادار ادا کیا ہے گو کچھ احباب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیٹ سے سوچنے کے شغل میں بھی مصروف ہو گئے۔ کچھ آزاد خیال اور آزادی پسند صحافیوں نے اپنی آزاد خیالی کی بڑی قیمتیں بھی ادا کیں۔ چنانچہ خود مختار کشمیر کے نظریہ کے حامل خواجہ غلام نبی گلکار مرحوم اور میر عبدالعزیز نے "غیر پسندیدہ نظریات کی پرچار" کرنے کی پاداش میں ایک ایک سال کی جیل کاٹی۔

خواجہ ثناء اللہ بٹ (حال چیف ایڈیٹر روزنامہ آفتاب سری نگر) کو غالباً 1956ء میں سردار عبدالقیوم نے آزاد کشمیر سے جبراً مقبوضہ کشمیر کی طرف دھکیل دیا۔ قائد کے مدیر جی ایم مفتی کو اپنے نظریات کی سزا مدت تک غربت و افلاس کی شکل میں بھگتنی پڑی۔ ولر کے مجید امجد بٹ کا

ڈیکلیریشن مدت تک بند رہا، فری کشمیر، کے میر عبدالرشید کے لئے اور ماہنامہ وائس آف کشمیر کے مدیر کی حیثیت سے میرے لئے ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ ہمیں اپنے جریدوں کی اشاعت ہی بند کرنی پڑی - بہت سے دوسرے صحافی بھی ایسے ہی حالات سے دو چار ہوتے رہے۔ جن میں روزنامہ آزاد کشمیر کے میر عبدالسنان بھی شامل ہیں۔

گو 1947ء کے بعد جاری ہونے والے بہت سے ہفت روزے اب بند ہو چکے ہیں اس کے باوجود اس وقت آزاد کشمیر کی طرف سے جاری کردہ اجازت ناموں کے تحت شائع ہونے والے ہفت روزوں کی تعداد چالیس کے قریب ہے - البتہ ان میں سے نصف درجن بھر ہی باقاعدگی اور مناسب ضخامت کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ہفت روزے خاص کر انصاف' کشیر' قائد اور خاصی حد تک پاک کشمیر، مقبوضہ کشمیر کی خبروں کو خاصی کوریج دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے قارئین اپنے مادر وطن کے بھارتی مقبوضہ حصے کے حالات و واقعات سے خاصی حد تک با خبر رہتے ہیں - میں سمجھتا ہوں تحریک آزادی کے لیے ان احباب کی یہی ایک خدمت قابل ستائش ہے - مہاجر صحافیوں کی اکثریت نے اپنا بچپن مقبوضہ کشمیر میں گذارا ہے ان کے بزرگوں کی آخری آرام گاہیں بھی وہیں ہیں اور وہاں کے حالات سے بھی پوری طرح واقف ہیں اسلئے جو دلچسپی مقبوضہ کشمیر اور اس کی آزادی سے انہیں ہے ان کی اولاد کو (جس کی بھاری اکثریت نے مقبوضہ کشمیر دیکھا تک نہیں) نہیں ہو سکتی - چنانچہ خدشہ ہے کہ وقت گذرنے اور کشمیری صحافیوں کی موجودہ بوڑھی نسل کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کے سلسلے میں کشمیری صحافیوں کی کارکردگی بھی بُری طرح متاثر ہوتی جائے گی۔

آزاد کشمیر میں پاکستان کے قومی اخبارات اور رسائل کے نمائندوں کے فرائض انجام دینے والے احباب کی بھیجی ہوئی خبریں اور ڈسپیچز زیادہ تر آزاد کشمیر کی سیاست سے متعلق امور کے بارے میں ہوتے ہیں - یہ احباب پاکستان کے کثیر الاشاعت اخبارات کے ذریعہ تحریک آزادی کی بڑی خدمت کر سکتے تھے لیکن مجموعی طور پر وہ ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کا یہ طرز عمل ان اخبارات کی طرف سے ملنے والی ہدایات کا نتیجہ ہو اس کے باوجود یہ احباب اہل پاکستان کو تحریک آزادی سے پوری طرح باخبر رکھنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

پاکستان کے کثیر الاشاعت اخبارات اور رسائل کے ذریعہ مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اہل پاکستان کو با خبر رکھنے کے سلسلے میں لاہور کے کلیم اختر صاحب اور راولپنڈی کے میر عبدالعزیز صاحب خاصا اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں - کلیم اختر جن کا تعلق جموں سے ہے پاکستان کے کثیر الاشاعت اردو اخباروں میں مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کے مختلف پہلوؤں پر معلوماتی مضامین باقاعدگی سے لکھتے ہیں جبکہ میر عبدالعزیز پاکستان کے اہم ترین اخباروں اور رسائل کے کالموں کے ذریعے اہل پاکستان اور پاکستان میں دنیا بھر کے سفارت

کاروں کو مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ رکھتے ہیں - میر صاحب ایک رپوٹر کی حیثیت سے بھی اہم شخصیات کی پریس کانفرنسوں کے دوران ان سے مسئلہ کشمیر کے کسی نہ کسی پہلو پر سوال پوچھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں ایک بار انہوں نے پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق سے کشمیر کی خود مختاری کی بالواسطہ حمایت بھی کروائی - صف اول کی بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی رائٹر سے منسلک راجہ محمد اصغر اپنی پیشہ وارانہ مجبوریوں کے باوجود مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور پاکستان پریس انٹرنیشنل کے الطاف حمید راؤ بھی تحریک آزادی کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں اپنے قومی فرائض بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ چمن کوٹ (ضلع باغ آزاد کشمیر) کے نوجوان صحافی سید مزمل حسین جعفری نے سعودی عرب میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں عرب اخبارات اور رسائل میں شائع کرائے گئے اپنے مضامین کے ذریعے مسئلہ کشمیر کے بارے میں عرب دنیا کا حافظہ تازہ کرنے اور تحریک آزادیٔ کشمیر کو اس کی اصل شکل میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی طرح سید بشیر حسین جعفری بھی خاصی مدت تک پاکستانی اخبارات میں لکھتے رہے - دوسرے کچھ صحافی پروفیسر محمد اسحاق سرشار اختر ملک وغیرہ بھی مسئلہ کشمیر پر لکھتے رہتے ہیں - برطانیہ میں مقیم کشمیری صحافی پروفیسر محمود ہاشمی ، علی کیانی ، مولانا محمود احمد میرپوری مرحوم، اسلم لون اور عبدالرحمٰن بنگش بھی اپنے قومی فرائض انجام دیتے رہے -

تحریکِ آزادیٔ کے بارے میں حد متارکہ جنگ کے اِس طرف کے کشمیریوں کی 1947ء کے بعد کی لکھی ہوئی کتابوں کی تعداد انتہائی قلیل ہے - دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ڈاکٹر صوفی کی کتاب ،کشیر، تحریک آزادی سے کہیں زیادہ تاریخ کشمیر سے تعلق رکھتی ہے - پروفیسر محمود ہاشمی کی کتاب کشمیر اداس ہے ، تحریک آزادی کے ایک ہی پہلو کو اجاگر کرتی ہے - سردار محمد ابراہیم خان کی کتاب "کشمیر ساگا" میں تحریک آزادی کے کچھ اہم پہلو شامل ہیں چوہدری غلام عباس مرحوم کی خودنوشت سوانح عمری کشمکش اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود تاریخی طور پر اہم ہے۔ جسٹس محمد یوسف صراف کی دو جلدوں پر مشتمل کتاب "کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کی تاریخ" ایک ریفرنس بک کی حیثیت سے خاصی اہم ہے لیکن صراف صاحب نے تحریک آزادی کے کچھ اہم پہلوؤں کو مناسب اہمیت نہیں دی ہے اور کچھ کے بارے میں خاصی جانبداری برتری ہے - سردار عبدالقیوم خان کی دو کتابیں ، کشمیر بنے گا پاکستان ، اور مقدمہ کشمیر ، ان کی مخصوص سیاسی سوچ کی عکاسی کرتی ہیں - سردار صاحب اپنے نظریئے کو اجاگر کرنے کی کوشش میں کبھی کبھی قابل افسوس حد تک آگے نکل جاتے ہیں یہاں تک کہ نظریۂ خود مختار کشمیر کی مخالفت میں وہ اس حد تک گئے ہیں کہ کشمیریوں کے لئے ریاست کی مکمل خود مختاری کی نسبت بھارتی ہندوؤں کی غلامی کو بہتر قرار دیتے ہیں - راجہ محمد عارف کی کتاب "کشمیر تاریخ کے آئینے میں" (پہلا ایڈیشن) تحریک آزادی کی

حالیہ تاریخ کے طالب علموں اور آزادی پسندوں کے لئے ایک قیمتی تحفہ ہے - راولا کوٹ کے غازی محمد امیر خان کی کتاب کا بیشتر حصہ بقول ہفت روزہ انصاف 48-1947ء کی جنگ آزادی کے دوران اہل پونچھ کی کارکردگی کا ہی احاطہ کرتا ہے - سابق طالب علم رہنما عباس احمد آزاد کی دو کتابیں " آزاد کشمیر کیا سوچتا ہے اور " ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تقدیر کا " (مزید دو کتابیں زیر طبع ہیں) مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں - آزاد صاحب بھی اپنی مخصوص طرز فکر کے زیر اثر آ کر کبھی کبھی بہت دور نکل جاتے ہیں اور ان کی کتابوں میں بھی ان کے اس طرز عمل کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

میری اپنی کتاب فری کشمیر تحریک آزادی سے کہیں زیادہ نظریۂ خود مختار کشمیر کے حق میں دیئے گئے دلائل پر مبنی ہے - تحریک آزادی سے بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر متعلق کچھ اور کتابیں بھی لکھی گئی ہیں لیکن چونکہ میں نے وہ کتابیں نہیں پڑھی ہیں اس لئے ان پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا۔

بھارتی مقبوضہ کشمیر میں گذشتہ ایک عشرے میں لکھی گئی کتابوں میں سے سب سے اہم غالباً شیخ محمد عبداللہ کی سوانح حیات "آتش چنار" خواجہ ثناء اللہ بٹ کی کتاب اور فاروق رحمانی کی کتاب " آزادی کی تلاش " ہیں - شیخ صاحب کی آتش چنار ، خود ان کی ذات کے گرد ہی گھومتی ہے اور اس کے اکثر مندرجات ان کے استقبالوں کی تفصیلات پر مشتمل ہیں - شیخ صاحب کی شخصیت سے تحریک آزادی سے متعلق جس قسم کی تفصیلات کی توقع کی جا سکتی تھی کتاب میں کہیں ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا - میں نے یہ کتاب برطانیہ کے بر کسٹن جیل میں دو دفعہ پڑھی اور اسے پڑھ کر بہت افسوس ہوا - ثناء اللہ بٹ صاحب کی کتاب کے کچھ اقتباسات ہی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے انہوں نے جس ماحول میں یہ کتاب لکھی ہے اس کے پیش نظر اس سے بہتر کی امید نہیں کی جا سکتی تھی - فاروق رحمانی کی " آزادی کی تلاش" پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے - کتاب ان کے زورِ قلم اور جرائت کی عکاسی کرتی ہے لیکن انہوں نے لفظ آزادی کی کوئی واضح تشریح نہیں کی ہے۔

شیخ محمد عبداللہ کے بارے میں لکھتے ہوئے رحمانی صاحب بھی اپنی مخصوص فکر کے زیر اثر ایک سمت میں ضرورت سے زیادہ آگے نکل گئے ہیں - کچھ اور کتابوں خاص کر شبنم قیوم صاحب کی کتاب " یہ کس کا لہو ہے کون مرا " اور رشید تاثیر کی وہ "تاریخ حریت کشمیر" کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن خاصی کوشش کے باوجود یہ کتابیں حاصل نہ کر سکا۔

مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر پر بھارتی ، پاکستانی ، یورپین اور امریکی قلمکاروں کی لکھی ہوئی کتابوں کے علاوہ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کی طرف سے بھی خاص مواد شائع ہوا ہے - بہر حال کشمیریوں کی محکومی ، کسمپرسی اور بے چارگی کی صحیح تصویر پاکستان کے معروف اور

کشمیری نژاد ادیب سعادت حسن منٹو مرحوم کی شہرہ آفاق تحریر "ٹیٹوال کا کتا" سے ہی ابھرتی ہے۔

مسئلہ کشمیر اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر اب تک مختلف کشمیری سیاسی اور طلباء تنظیموں اور افراد کی طرف سے سینکڑوں کتابچے شائع کئے گئے ہیں جن میں خود میرے لکھے گئے درجن بھر کتابچے بھی شامل ہیں - بھارتی ہوائی جہاز گنگا کی ہائی جیکنگ کے کیس کے ملزموں مقبول بٹ شہید، اشرف قریشی، جی ایم لون اور میر عبدالقیوم کے علاوہ عبدالخالق انصاری اور غلام مصطفےٰ صاحب علوی کے عدالتی بیان پر مشتمل کتابچے بھی تحریک آزادی اور مسئلہ کشمیر کے اہم پہلوؤں پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں -

گو کشمیری شاعروں نے تحریک آزادی کے سلسلے میں وہ کردار ادا نہیں کیا جو محکوم قوموں کے محب وطن شاعروں کا خاصہ ہوتا ہے بایں ہمہ کچھ شاعروں نے (حد متارکہ جنگ کے اِس طرف) اپنا قومی فرض خاصی حد تک ادا کیا ہے اور اگر ان گنے چنے شاعروں میں میرپور کے پروفیسر نذیر انجم اور برمنگھم کے محمد عارف کو سر فہرست قرار دیا جائے تو شاید غلط نہ ہو گا۔

الغرض کشمیری صحافیوں اور دوسرے قلمکاروں نے تحریک آزادی کے سلسلے میں مجموعی طور پر خاصا کردار ادا کیا ہے لیکن تحریک آزادی ان سے کہیں زیادہ اور بہتر کارکردگی کا تقاضا کرتی ہے۔

پانچواں باب
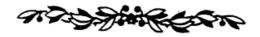
ریاست جموں و کشمیر سے متعلق اہم تاریخی' جغرافیائی حقائق

اہم تاریخی جغرافیائی اور دیگر حقائق

ذیل میں کشمیر کی تاریخ اور جغرافیہ اور مسئلہ کشمیر و تحریک آزادی سے متعلق ایسے حقائق پیش خدمت ہیں جن کا جاننا ہر اس کشمیری کے لیے ضروری ہے۔ جو اپنی قومی تاریخ اور تحریک آزادی میں دلچسپی رکھتا ہو۔

تاریخی حقائق

1- چودھویں صدی عیسوی میں کشمیر کے سیاسی افق پر مسلمانوں کے نمودار ہونے سے پہلے اس پر اکیس (21) خاندانوں نے حکومت کی تھی۔ جن میں سے اٹھارہ مقامی تھے اور ان کے عہد ہائے حکومت میں کشمیر ایک آزاد و خودمختار ملک تھا۔

2- کشمیر کے معروف مورخ محمد دین فوق کے مطابق کشمیر میں ہندو دور حکومت کے اہم ترین حکمران راجہ للتا دتیا (715ء تا 752ء) نے بنگال اور جنوبی ہند سے لیکر سری لنکا کو بھی فتح کیا لیکن کہیں بھی اپنی مستقل حکومت قائم نہیں کی۔

3- مسلمانوں نے کشمیر پر 480 سال (1339ء سے 1819ء تک) حکومت کی جن میں سے 246 سال کے دوران کشمیر ایک آزاد و خودمختار ملک تھا۔

4- اپنے عظیم مقامی حکمران سلطان زین العابدین بڈشاہ (1420ء تا 1470ء) کے دور حکومت میں کشمیر برصغیر کا خوشحال ترین' پرامن ترین اور دفاعی لحاظ سے مضبوط ترین ملک تھا۔ چنانچہ بڈ شاہ کے دور حکومت کو تاریخ کشمیر کا سنہری باب کہا جاتا ہے۔ اس دور میں چینی ترکستان کا علاقہ سنکیانگ - افغانستان- پنجاب اور تبت سلطنت کشمیر میں شامل تھے۔

5- خودمختار کشمیر کے آخری حکمران (چک) خاندان کا آبائی علاقہ دردستان (گلگت بلتستان) تھا۔

6- ہندوستان کے اکبر بادشاہ نے کشمیر کے سنی علماء کی درخواست پر کشمیر پر حملہ کیا۔
7- کشمیریوں نے اکبر بادشاہ کی فوجوں کو دوبار شکست دی لیکن تیسرے حملے میں وہ کشمیر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔
8- کشمیر کی خودمختاری کا خاتمہ 1586ء میں ہوا جب اکبر بادشاہ نے اسے اپنی مغل سلطنت میں ضم کیا۔ جس کے بعد سے کشمیر اب تک غلام چلا آ رہا ہے۔
9- پونچھ پر قبضہ کرنے کے لئے جموں کے ڈوگرہ گلاب سنگھ نے 1832ء میں وہاں کے عوام کا قتل عام کرایا۔ ان کے لیڈروں سردار سبز علی خان اور ملی خان کی زندہ کھالیں اتروائیں۔ سردار شمس خان کا سر قلم کرایا اور ہزاروں خواتین اور بچوں کو اغوا کر کے جموں پہنچایا۔
10- بلتستان اور استور پر ڈوگروں نے 1840ء میں پر قبضہ کیا۔
11- علاقہ یاسین کے حکمران گوہر امان نے 1840ء میں گلگت پر قبضہ کیا۔ گلگت کے راجہ کریم خان بھاگ کر سرینگر پہنچے اور کشمیر میں سکھوں کے گورنر سے گلگت پر حملہ کرایا۔ چنانچہ 1842ء میں گلگت پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا لیکن گوہر امان نے حملہ کر کے 1844ء میں گلگت پر دوبارہ قبضہ کیا۔ ڈوگروں نے (جو اب معاہدۂ امرتسر کی رو سے کشمیر کے حکمران بن گئے تھے) 1846ء میں گلگت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کیا لیکن گوہر امان نے ایک بار پھر گلگت پر حملہ کر کے ڈوگروں کو وہاں سے مار بھگایا۔ اس جنگ میں راجہ کریم خان اور ڈوگرہ فوج کے سربراہ کرنل نتھے شاہ دونوں مارے گئے۔ لیکن گوہر امان کی وفات کے بعد ڈوگروں نے گلگت (خاص) پر مستقلاً قبضہ کر لیا۔
موجودہ علاقہ گلگت اس زمانے میں بہت سے راجواڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ جن میں سے گلگت خاص ہنزہ - نگر اور یاسین کے راجے اہم ترین تھے۔ گلگت (خاص) اور نگر کے حکمران شیعہ تھے۔ یاسین کے سنی اور ہنزہ کے اسماعیلی چنانچہ ان کے مابین ہمیشہ فرقہ وارانہ منافرت رہتی تھی۔ اور اسی منافرت نے غالباً گوہر امان سے گلگت پر حملہ کرایا اور گلگت کے راجہ کریم خان اور اس کے بیٹے کو گوہر امان کے خلاف سکھوں اور ڈوگروں کی مدد حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ جس کے نتیجے میں سارے علاقے پر بالاخر ڈوگروں کا قبضہ ہو گیا۔ بدقسمتی سے یہ منافرت آج بھی موجود ہے۔
12- ڈوگروں نے گلگت پر پہلا حملہ 1846ء میں کیا تھا لیکن انہیں پورے علاقے پر قبضہ کرنے میں 45 سال لگے اور 1891ء میں سارے علاقے پر قابض ہو گئے۔
13- خاصی مدت تک ریاست چترال بھی ریاست جموں کشمیر کی باجگذار رہی ہے۔
14- معاہدہ امرتسر کے تحت موجودہ ضلع ہزارہ اور ضلع کوہستان کے بہت سے علاقے بھی ریاست جموں کشمیر میں شامل ہو گئے تھے جنہیں ڈوگروں نے جموں سے مشرق میں واقع کچھ علاقوں کے عوض انگریزوں کے حوالہ کر دیا۔

15- 1930ء کے عشرے کے اوائل میں قائم ہونے والے گلینسی کمیشن نے کشمیر کے لیے کچھ آئینی - سیاسی - قانونی -اقتصادی اور سماجی اصلاحات کی سفارش کی تھی۔ جس کے (اور عوامی دباؤ کے) نتیجے میں 1934ء میں کشمیر اسمبلی (پرجا سبھا) قائم ہوئی جو کچھ منتخب اور کچھ (مہاراجہ کی طرف سے) نامزد ممبروں پر مشتمل ہوتی تھی اور اس کے انتخابات ہر چار سال کے بعد ہوتے تھے۔

16- 13 جولائی 1931ء کو سرینگر میں ڈوگرہ فوج کی فائرنگ سے 22 کشمیری مسلمان شہید اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔

17- ریاست جموں کشمیر کی پہلی سیاسی پارٹی (آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس) 1932ء میں قائم ہوئی۔ 1939ء میں اسے نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا گیا۔ 1942ء میں چوہدری غلام عباس خان اور ان کے کچھ ساتھیوں نے مسلم کانفرنس کا احیاء کیا۔

18- 29 مارچ 1935ء کو برصغیر کے انگریز حکمرانوں نے گلگت کے دریائے سندھ کے مغرب میں واقع علاقے اور چلاس مہاراجہ کشمیر سے ساٹھ سال کے پٹے پر لئے جو یکم اگست 1947ء کو ریاست کو واپس کر دیئے گئے۔ بارہ سال کے اس عرصے کے دوران بھی پورا علاقہ بلتستان اور استور ریاستی حکومت کے تحت رہے۔ یکم اگست 1947ء کو ریاستی حکومت نے لداخ بلتستان - استور اور گلگت کو ملا کر ریاست کا تیسرا صوبہ قائم کیا۔ گلگت کے انگریزوں کے تحت رہنے کے بارہ سال کے دوران بھی گلگت میں ریاستی پرچم لہرانے کے علاوہ یہاں کی معدنیات وغیرہ سے متعلق حقوق بھی ریاستی حکومت کو ہی حاصل تھے۔

19- 1947ء تک استور اور بلتستان کو کشمیر اسمبلی میں نمائندگی حاصل تھی۔ استور سے کشمیر اسمبلی کے آخری ممبر کاچو سلطان محمد شاہ اور بلتستان سے خپلو کے راجہ تھے۔

20- گذشتہ چھ سو پچاس سال (1340ء میں کشمیر میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے آج تک) کے دوران کشمیر 246 سال (1340ء سے 1586ء تک) آزاد و خودمختار رہا' 166 سال (1586ء سے 1752ء تک) مغلوں کے تحت' 67 سال (1752ء سے 1819ء تک) افغانوں کے تحت' 27 سال (1819ء سے 1846ء تک) سکھوں کے تحت' ایک ہفتہ (9 مارچ 1846ء سے 16 مارچ 1846ء) براہ راست انگریزوں کے تحت جبکہ 101 سال (1846ء سے 1947ء تک) ڈوگروں کے تحت رہا اور گذشتہ چالیس سال سے اس کا بڑا حصہ بھارت کے جبری قبضے میں ہے۔ دوسرے حصے میں نیم خودمختار آزاد کشمیر حکومت قائم ہے اور تیسرا حصہ (گلگت بلتستان) براہ راست حکومت پاکستان کے کنٹرول میں ہے۔

جغرافیائی حقائق

1- ریاست جموں کشمیر کی موجودہ آبادی ایک کروڑ دس لاکھ سے زیادہ ہے۔ جن میں سے ستر (70) لاکھ کے قریب بھارتی مقبوضہ کشمیر میں، پچیس (25) لاکھ کے قریب آزاد کشمیر میں، نو (9) لاکھ کے قریب گلگت بلتستان میں اور تقریباً دس (10) لاکھ پاکستان اور دیگر ممالک میں رہتے ہیں۔

2- ریاست جموں کشمیر کی کل آبادی کا 77 فیصد مسلمان، 20 فیصد ہندو اور 3 فیصد سکھ۔ بودھ اور عیسائی ہیں۔ آزاد کشمیر گلگت بلتستان کی آبادی سو فیصد مسلمان ہے - جبکہ مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً 65 فیصد ہے۔

3- ریاست جموں کشمیر کی یہ آبادی دنیا کے ایک سو اکسٹھ (160) آزاد خودمختار ممالک میں سے ایک سو تین (103) ممالک کی انفرادی آبادی - 31 ممالک کی مجموعی آبادی اور پچیس (25) سے زیادہ آزاد مسلم ممالک کی انفرادی آبادی سے زیادہ ہے۔

4- ریاست جموں کشمیر کا کل رقبہ تقریباً ایک لاکھ نوے ہزار مربع کلومیٹر (تقریباً 85 ہزار مربع میل) جس میں سے تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار مربع کلومیٹر بھارت کے تسلط میں (اس میں تقریباً تیس ہزار مربع کلومیٹر وہ علاقہ یعنی اقصائے چن وغیرہ بھی شامل ہیں جو 1960ء سے چین کے زیر تسلط ہے) تقریباً دس ہزار مربع کلومیٹر آزاد کشمیر اور تقریباً ساٹھ ہزار مربع کلومیٹر گلگت بلتستان ہیں۔

5- ریاست جموں کشمیر رقبے میں دنیا کے 72 ممالک سے بڑی ہے۔ یورپ کے پانچ ممالک (ہالینڈ- بیلجیم- ڈنمارک- البانیہ اور آسٹریا) کا مجموعی رقبہ جموں کشمیر کے رقبے سے کم ہے۔

6- ریاست جموں کشمیر فی کس آمدنی اور خواندگی کے لحاظ سے دنیا کے تقریباً اسی (80) ممالک سے آگے ہے۔

7- ریاست جموں کشمیر کی معیشت کے بنیادی ستون سیاحت، زراعت۔ بیرون ملک برسر روزگار ریاستی باشندوں کا کمایا ہوا زرمبادلہ۔ جنگلات۔ پھل فروٹ۔ دستکاری۔ قالین سازی اور معدنیات ہیں۔

8- وادی کشمیر کو اس کی قدرتی خوبصورتی اور صحت بخش آب و ہوا کی وجہ سے ایشیا کا سوئٹزر لینڈ کہا جاتا ہے۔

9- ریاست جموں کشمیر میں سات مقامی زبانیں (کشمیری- ڈوگری -پہاڑی- گوجری- بلتی- شینا اور بروشکی) بولی جاتی ہیں۔

10- دنیا کی چار بلند ترین چوٹیوں میں سے دو (کے ٹو اور نانگا پربت) ریاست جموں کشمیر کے علاقوں بلتستان اور گلگت (دیامر) میں واقع ہیں۔ برصغیر کے سرد ترین علاقے (سیاچین وغیرہ) اور

خاصے گرم علاقے (جموں میرپور وغیرہ) بھی ریاست جموں کشمیر میں ہیں۔

11- ریاست جموں کشمیر کے مغرب اور جنوب مغرب میں پاکستان' جنوب میں بھارت' مشرق اور شمال میں عوامی جمہوریہ چین اور شمال مغرب میں افغانستان واقع ہیں۔ ریاست کی شمالی سرحد کو روس کی جنوبی سرحد سے چین کے علاقہ سنکیانگ اور افغانستان کے علاقہ وا خان کی تقریباً بیس کلومیٹر چوڑی پٹیاں جدا کرتی ہیں۔ ریاست جموں کشمیر کے ساتھ سب سے لمبی سرحد چین کی دوسرے نمبر پر پاکستان کی اور تیسرے نمبر پر بھارت کی ہے۔

کشمیر سے متعلق

معاہدے' اعلانات' مذاکرات اور واقعات

گذشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران کشمیر سے متعلق بہت سے معاہدے۔ اہم اعلانات اور مختلف فریقین کے مابین مذاکرات ہوئے ہیں۔ جن میں سے اکثر نے مسئلہ کشمیر پر گہرا اثر ڈالا۔ ان میں سے کچھ سے متعلق اہم حقائق ذیل میں مختصراً درج ہیں:

معاہدہ لاہور۔ یہ معاہدہ 9 مارچ 1846ء کو شمالی ہندوستان کے سکھ حکمرانوں (جنہیں انگریزوں نے جنگ میں شکست دی تھی) اور فاتح انگریزوں کے درمیان ہوا اور اس معاہدے کے تحت کشمیر سکھوں کی عملداری سے نکل کر انگریزوں کی تحویل میں چلا گیا۔

معاہدہ امرتسر۔ معاہدہ لاہور کے ایک ہفتہ بعد یعنی 16 مارچ 1846ء کو انگریزوں اور جموں کے ڈوگرہ حکمران راجہ گلاب سنگھ کے درمیان ہوا۔ (ڈوگرے سکھ نہیں ہندو ہوتے ہیں) جس کے تحت انگریزوں نے وادئ کشمیر اور اس کے شمال اور مشرق میں واقع کچھ علاقے 75 لاکھ روپے (نانک شاہی) کے عوض گلاب سنگھ کو فروخت کئے۔

اعلان آزادئ ہند۔

3 جون 1947ء کو برصغیر کی آزادی کے پروگرام کا اعلان ہوا۔ جس کے مطابق 14 اگست 1947ء کو برطانوی ہند (برصغیر کے وہ علاقے جہاں انگریز براہ راست حکمران تھے) کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک نئی مملکت پاکستان قائم ہونی تھی اور 15 اگست 1947ء کو برطانوی ہند کے باقی علاقے آزاد ہندوستان (بھارت) کہلانے تھے۔ ریاست جموں کشمیر سمیت برصغیر کی پانچ سو سے

زیادہ نیم خودمختار شخصی ریاستوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنا تھا۔ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا یہ حق (مسلم لیگ کے مطالبے پر) عوام کی بجائے ریاستوں کے شخصی حکمرانوں کو دیا گیا تھا۔ البتہ ان پر زور دیا گیا تھا کہ وہ یہ فیصلہ کرتے وقت ریاست کے عوام کے مذہبی لحاظ سے تناسب، ریاست کے جغرافیائی محل وقوع اور ریاست کے اقتصادی تقاضوں کو مدنظر رکھیں۔

قائداعظم کا اعلان۔ 17 جون 1947ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ایک اہم پالیسی بیان اخبارات کو جاری کیا (جو 18 جون کے اخبارات میں شائع ہوا) جس میں کہا گیا کہ مسلم لیگ کی نظر میں برصغیر کی شخصی ریاستوں کو حق حاصل ہے کہ وہ بھارت اور پاکستان میں سے کسی ایک سے الحاق کریں یا مکمل خودمختاری کا اعلان کریں۔ انہوں نے 11 جولائی 1947ء کو اپنے اس اعلان کو دہراتے ہوئے ریاست جموں کشمیر کی حکومت سے کہا کہ اگر وہ ریاست کی مکمل خودمختاری کا اعلان کرے تو پاکستان کو اس کے ساتھ باہمی مفادات سے متعلق معاہدہ کرنے میں خوشی ہو گی۔

پونچھ میں بغاوت۔ قیام پاکستان کے ڈیڑھ دو ہفتے بعد پونچھ کے جنگجو لوگوں نے وہاں متعین ڈوگرہ افواج کے مظالم کے رد عمل کے طور پر ڈوگرہ حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

جمہوریہ آزاد کشمیر کا قیام۔ 4 اکتوبر 1947ء کو مسٹر انور (غلام نبی گلکار) کی سربراہی میں ریاست جموں کشمیر کے لئے ایک عارضی خود مختار حکومت کے قیام کا اعلان کیا گیا۔

قبائل کشمیر میں داخل ہو گئے۔ 22 اکتوبر 1947ء کو پاکستان کے قبائلی علاقوں، ریاست سوات اور ضلع ہزارہ کے ہزاروں قبائل مظفر آباد کے راستے وادیٔ کشمیر کی طرف روانہ ہوئے۔

آزاد حکومت کی تنظیم نو۔ 24 اکتوبر 1947ء کو ریاست کی آزاد حکومت کی تنظیم نو کی گئی اور پونچھ کے سردار محمد ابراہیم خان (ممبر کشمیر اسمبلی) اس کے صدر بنے۔

بھارت سے نام نہاد الحاق۔ 26 اکتوبر 1947ء کو مہاراجہ ہری سنگھ (جو سری نگر سے بھاگ کر جموں پہنچا تھا) نے ریاست کے بھارت سے نام نہاد الحاق کی دستاویز پر دستخط کئے

اور 27 اکتوبر کو بھارتی فوجیں سری نگر کے ہوائی اڈے پر اتریں۔

گلگت کے گورنر کی گرفتاری - 31 اکتوبر اور یکم نومبر 1947ء کی رات کو گلگت سکاؤٹس نے (بونجی میں مقیم ریاستی فوج کے مسلمان افسروں کے مشورے اور مدد سے) گلگت کے ڈوگرہ گورنر بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ کی رہائش گاہ کا محاصرہ کیا اور یکم نومبر کی صبح کو اسے گرفتار کیا۔

گلگت میں عارضی حکومت کا قیام - ریاستی فوج کے مسلمان افسروں گلگت سکاؤٹس کے جونیئر کیمشنڈ افسروں اور گلگت کے مقامی زعماء کے باہمی مشورے کے نتیجے میں 2 نومبر 1947ء کو مقامی سطح پر ایک عارضی حکومت قائم کی گئی۔ گلگت خاص کے راجہ شاہ رئیس خان کو اس حکومت کا سربراہ اور کشمیر انفنٹری کے کیپٹن مرزا حسن خان کو اس حکومت کی فوج کا سربراہ بنایا گیا۔ دو ہفتے بعد پاکستان نے ان علاقوں کے لئے سردار محمد عالم خان کو پولیٹیکل ایجنٹ نامزد کر کے وہاں بھیجا۔ جس نے وہاں کا نظم و نسق سنبھالا اور آزاد حکومت کو بغیر کسی اعلان کے ختم کر دیا گیا۔

مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں - یکم جنوری 1948ء کو بھارت مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں لے گیا۔

عنوان میں تبدیلی - یکم جنوری 1948ء سے 20 جنوری 1948ء تک اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر ہونے والی بحث کا عنوان "ریاست جموں کشمیر کی صورت حال پر بحث" (Discussion on Situation in Jammu and Kashmir) تھا۔ 20 جنوری کو پاکستان کے وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خان نے سلامتی کونسل کے صدر کو خط لکھا۔ (سلامتی کونسل نے اس خط کو اپنا نمبر S/655 دیا) جس میں بحث کے اس عنوان کو تبدیل کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ چنانچہ 20 جنوری سے ہی اس بحث کے اس عنوان کو "بھارت اور پاکستان کا مسئلہ" (India-Pakistan Question) میں تبدیل کیا گیا۔ عنوان کی اس تبدیلی کی وجہ سے مسئلہ کشمیر کی نوعیت ہی بدلنے لگی اور یہ مسئلہ بھارت اور پاکستان کے مابین ایک علاقائی تنازعے کی شکل اختیار کرنے لگا۔

بھارت کا اہم اعلان - 15 جنوری 1948ء کو اقوام متحدہ میں بھارتی وفد کے قائد گوپال سوامی آئینگر نے سلامتی کونسل سے اپنے خطاب کے دوران بھارتی حکومت کی طرف سے

اعلان کیا کہ بھارت کشمیریوں کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ ریاست میں حالات معمول پر آنے کے بعد یہ فیصلہ کریں کہ وہ بھارت سے اپنے الحاق کو منسوخ کر کے پاکستان سے الحاق کریں یا خود مختار ہو کر اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کریں۔ انہوں نے اپنے اس اعلان کو سلامتی کونسل میں اپنی 3 فروری 1948ء کی تقریر میں بھی دہرایا۔ بھارتی وفد کے قائد کی 15 جنوری کی تقریر کے متعلقہ حصے کا متن (جو میں نے اقوام متحدہ کے آفیشل ریکارڈ سے لیا ہے) یہ عبارت سلامتی کونسل کی جنوری فروری 1948ء کی کارروائی پر مشتمل فائل کے صفحہ 29 پر درج ہے، مندرجہ ذیل ہے

"........Whether she (Kashmir) should withdraw from her accession to India and either accede to Pakistan or remain independent with a right to claim admission as a member of the United Nations--- all this we have recognised to be a matter of unfettered decision by the people of Kashmir after normal life is restored to them."

اقوام متحدہ کے کمیشن کا قیام - 20 جنوری 1948ء کو سلامتی کونسل نے "اقوام متحدہ کا کمیشن برائے بھارت اور پاکستان" (UNCIP) کے نام سے ایک کمیشن مقرر کیا۔ جسے ہدایت کی گئی کہ وہ جلد از جلد برصغیر پہنچ کر بھارت اور پاکستان کی حکومتوں سے بات چیت کے ذریعے کشمیر میں ہونے والی جنگ کو بند کرادے۔ لیکن بھارت نے ٹال مٹول کے ذریعے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ کمیشن جولائی تک برصغیر نہ آ سکا۔

کمیشن کی پہلی قرار داد - اقوام متحدہ کے کمیشن نے بھارت اور پاکستان کی حکومتوں سے مسلسل مذاکرات کے بعد اپنی پہلی قرار داد (13 اگست 1948ء) پر دونوں حکومتوں کی رضامندی حاصل کی۔ اس قرار داد کے تحت طے پایا کہ کشمیر میں جنگ بندی کرانے کے بعد وہاں اقوام متحدہ کی نگرانی میں رائے شماری کرائی جائے جس کے ذریعے کشمیری عوام اپنی ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔

کشمیر میں جنگ بندی - اقوام متحدہ کے کمیشن کی 13 اگست کی قرار داد کے تحت یکم جنوری 1949ء کو جنگ بندی عمل میں آئی۔

کمیشن کی دوسری قرار داد - 5 جنوری 1949ء کو اقوام متحدہ کے کمیشن نے ایک

کمیشن کی دوسری قرار داد۔ 5 جنوری 1949ء کو اقوام متحدہ کے کمیشن نے ایک اور قرار داد منظور کر کے اس پر دونوں حکومتوں کی رضامندی حاصل کر لی۔ اس قرار داد میں فوجوں کی واپسی وغیرہ کے پروگرام کی تفصیلات تھیں۔ البتہ یہ قرار داد 13 اگست والی قرار داد سے اس لئے مختلف تھی کہ اس میں مجوزہ رائے شماری کے دوران کشمیریوں کے اختیار (Choice) کو (پاکستان کی درخواست پر) ریاست کے بھارت یا پاکستان سے الحاق تک محدود کر دیا گیا تھا۔ جبکہ 13 اگست 1948ء والی قرار داد میں کشمیریوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی۔

گلگت پاکستان کی تحویل میں۔ 28 اپریل 1949ء کو حکومت پاکستان، حکومت آزاد کشمیر اور آزاد کشمیر کی حکمران جماعت (مسلم کانفرنس) کے مابین ہونے والے ایک معاہدے کے تحت ریاست جموں کشمیر سے متعلق حکومت پاکستان اور حکومت آزاد کشمیر کے حقوق، فرائض کا تعین کیا گیا۔ اس معاہدے کے تیسرے حصے کی شق نمبر VIII A کے تحت گلگت (یعنی گلگت بلتستان) کے انتظامی امور عارضی طور پر حکومت پاکستان کی تحویل میں دیئے گئے۔ اس معاہدے پر حکومت پاکستان کی طرف سے اس کے مرکزی وزیر بے محکمہ (انچارج وزارت امور کشمیر) نواب مشتاق احمد گورمانی، نے آزاد کشمیر حکومت کی طرف سے اس کے صدر سردار محمد ابراہیم خان نے اور آزاد کشمیر کی حکمران جماعت آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کی طرف سے اس کے سربراہ چوہدری غلام عباس نے دستخط کئے۔ اس معاہدے کے تحت مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر کشمیریوں کی نمائندگی کا حق بھی حکومت پاکستان کو دیا گیا۔

اقوام متحدہ کے کمیشن کی ناکامی۔ 1950ء میں اقوام متحدہ کے کمیشن برائے بھارت و پاکستان نے سلامتی کونسل کو رپورٹ دی کہ وہ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں سے اپنی 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کی قرار دادوں کی فوجوں کے انخلاء سے متعلق شقوں پر عمل کرانے میں ناکام ہو گیا ہے۔

سرینگر میں آئین ساز اسمبلی کا قیام۔ مقبوضہ کشمیر کی حکومت نے حکمران جماعت نیشنل کانفرنس کے فیصلے کے مطابق 1951ء میں آئین ساز اسمبلی قائم کی۔

ریاست کا اپنا صدر وزیر اعظم اور قومی پرچم۔ 1951ء میں قائم کی گئی آئین ساز اسمبلی نے ریاست کے لئے ایک آئین مرتب کیا جس کے تحت ریاست کا اپنا صدر، اپنا وزیر اعظم، اپنا قومی پرچم، اپنی قومی زبان (اردو) اور اپنے قوانین تھے۔ بھارت کے پاس

ریاست کے دفاع، امور خارجہ، مواصلات اور کرنسی سے متعلق معاملات تھے۔ یہ صورت حال تقریباً پندرہ سال تک قائم رہی۔ جس کے بعد بھارت نے ریاست کو (ریاست کے کٹھ پتلی لیڈروں کی مدد سے) صدر ریاست اور وزیر اعظم کے عہدوں اور ایسے دوسرے معاملات سے محروم کر دیا۔ چنانچہ آج مقبوضہ کشمیر کی آئینی حیثیت بھارت کی ریاستوں سے زیادہ مختلف نہیں۔

اقوام متحدہ کے نمائندوں کا تقرر - 1951ء سے لے کر 1958ء تک سلامتی کونسل کے ایک صدر جنرل میکناٹن (General Mc Naughton) اور سلامتی کونسل کی طرف سے یکے بعد دیگرے مقرر شدہ نمائندوں سراون ڈکسن (Sir Owen Dixon) گنار جیرنگ (Gunar Jarring) اور ڈاکٹر فرینک گراہم (Dr Frank Graham) نے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے بھارت اور پاکستان کی حکومتوں سے مذاکرات کئے لیکن انہیں کشمیر میں رائے شماری کرانے کے جملہ انتظامات پر دونوں حکومتوں کو متفق کرنے میں ناکامی ہوئی۔ جس کی اہم ترین وجہ بھارت کی بے جا ہٹ دھرمی تھی۔

نہرو عبداللہ معاہدہ - 1952ء میں بھارت اور کشمیر کے وزرائے اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو اور شیخ محمد عبداللہ کے مابین دہلی میں ایک معاہدہ ہوا۔ جس میں بھارتی حکومت نے وعدہ کیا کہ وہ ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی۔

شیخ عبداللہ کی برطرفی اور گرفتاری - 9 اگست 1953ء کی صبح کو بھارتی حکومت نے مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کو ان کے عہدے سے معزول کر کے ان کے سینکڑوں ساتھیوں سمیت گرفتار کیا۔ بخشی غلام محمد کو ریاست کا نیا وزیر اعظم بنایا گیا۔ اس بھارتی کارروائی کے خلاف ہونے والے مظاہروں کے دوران بھارتی قابض فوج نے سینکڑوں کشمیریوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔

رائے شماری کا عہد نو - کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے کچھ مدت بعد پاکستان کے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے دہلی میں بھارتی وزیر اعظم سے مذاکرات کئے جن کے آخر میں اعلان کیا گیا کہ کشمیر میں رائے شماری کے لئے ضروری ابتدائی انتظامات (ناظم رائے شماری کا تقرر وغیرہ) اپریل 1954ء تک مکمل کئے جائیں گے۔ لیکن کشمیر میں حالات معمول پر لاتے ہی بھارت پھر اپنے وعدے سے مکر گیا۔

الحاق بھارت کی "توثیق" - 1957ء میں کشمیر اسمبلی نے کشمیر کے بھارت سے نام نہاد الحاق کو "توثیق" کی۔

مسئلہ کشمیر پر روسی ویٹو - روس مسئلہ کشمیر کے بارے میں سلامتی کونسل میں ہونے والی بحث کے ابتدائی دور میں غیر جانبدار رہا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے کشمیر پر بھارتی مؤقف کی حمایت کرنی شروع کی۔ یہاں تک کہ روس کے صدر اور وزیر اعظم نے مقبوضہ کشمیر کا دورہ کر کے ریاست کو بھارت کا آئینی حصہ قرار دیا۔ ادھر روس کی طرف سے ہنگری اور چکوسلوکیا کی عوامی تحریکوں کو فوجی طاقت سے دبانے پر بھارت کی خاموشی کے بدلے روس نے 1957ء اور 1962ء میں سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر پیش ہونے والی قرار دادوں (جن میں بالواسطہ طور پر کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی حمایت کی گئی تھی) کو ویٹو کر دیا۔

مسئلہ کشمیر پر پاک بھارت مذاکرات - 1962ء کی چین بھارت، جنگ کے دوران کئے ہوئے وعدوں کے مطابق امریکہ اور برطانیہ کی حکومتوں نے بھارت کو مجبور کیا کہ وہ مسئلہ کشمیر کا حل ڈھونڈھنے کے لئے پاکستان سے مذاکرات کرے۔ چنانچہ 1963ء کے پہلے نصف تک ان مذاکرات کے چھ راؤنڈ ہوئے۔ بھارتی وفد کی قیادت ایک مرکزی وزیر سردار سورن سنگھ نے اور پاکستانی وفد کی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے کی۔ ان مذاکرات کے دوران کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی بجائے بات چیت مسئلہ کشمیر کو "کچھ لو اور کچھ دو" کے نام نہاد اصول کے مطابق حل کرنے پر ہوئی۔ ایک مرحلے پر وادیٔ کشمیر میں دریائے جہلم کو پاک بھارت سرحد بنانے کی تجویز بھی پیش ہوئی۔ بہر حال یہ مذاکرات بھی مسئلہ کا کوئی حل نکالنے میں ناکام ہو گئے۔

پاک چین سرحدی معاہدہ - مارچ 1963ء میں پاکستان اور چین کے مابین ایک معاہدہ ہوا۔ جس کے تحت گلگت بلتستان اور چین کے مابین سرحد کی حد بندی کی گئی۔ گلگت بلتستان کے ان علاقوں کو متنازعہ ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہونے کی وجہ سے معاہدے کو مشروط قرار دیا گیا، اور اسے مسئلہ کشمیر کے حل ہونے کے بعد وہاں قائم ہونے والی حکومت کی منظوری کے تابع بنا دیا گیا۔

موئے مبارک کی چوری - دسمبر 1963ء کے اواخر میں حضرت بل سری نگر سے نبی کریمؐ کا موئے مبارک چوری ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں پوری وادی سراپا احتجاج بن گئی۔ حکومت مفلوج ہو گئی۔ آخر کئی دن بعد موئے مبارک کی بازیابی کا اعلان ہوا۔

شیخ محمد عبداللہ کا دورۂ پاکستان-- اپریل 1964ء میں جیل سے رہائی کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے بھارتی وزیر اعظم سے مسئلہ کشمیر پر مذاکرات کئے جن کے نتیجے میں انہوں نے پاکستان آ کر پاکستان کے صدر محمد ایوب خان سے بھی مذاکرات کئے اور طے پایا کہ بھارت اور پاکستان کے سربراہان حکومت اور شیخ محمد عبداللہ دہلی میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں مذاکرات کر کے اس کا کوئی حل نکالیں۔ شیخ صاحب ابھی آزاد کشمیر میں ہی تھے کہ پنڈت نہرو کا اچانک انتقال ہو گیا۔ چنانچہ سربراہی مذاکرات کا یہ پروگرام بھی منسوخ ہوا۔

ریاست میں منصبوں کے ناموں میں تبدیلی- 1965ء میں مقبوضہ کشمیر میں صدر ریاست اور وزیر اعظم کے عہدوں کو گورنر اور وزیر اعلیٰ کے عہدوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ تبدیلی جی ایم صادق کے دور حکومت میں ہوئی۔

پاک بھارت جنگ- اگست 1965ء میں پاکستانی کمانڈو مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوئے۔ یکم ستمبر کو آزاد کشمیر فوج اور پاکستان آرمی نے چھمب جوڑیاں کی طرف سے سرحد پار کی اور 6 ستمبر کو بھارت نے پاکستانی علاقوں پر حملہ کیا۔ 22 ستمبر کو جنگ بندی ہوئی۔

مسئلہ کشمیر پر سلامتی کونسل کی آخری قرارداد- پاک بھارت جنگ کے دوران اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اس پر بحث ہوئی۔ آخر 20 ستمبر 1965ء کی سلامتی کونسل کی قرارداد کو بھارت اور پاکستان کی حکومتوں نے تسلیم کر کے جنگ بندی کی - قرارداد میں کشمیر کا نام لئے بغیر ہی بھارت اور پاکستان کی حکومتوں پر زور دیا گیا تھا کہ وہ پاک بھارت جنگ کے پس منظر میں موجود مسئلے کو پر امن طریقے سے حل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں۔

اعلان تاشقند- 10 جنوری 1966ء کو روس کے شہر تاشقند میں صدر پاکستان محمد ایوب خان اور بھارتی وزیراعظم مسٹر شاستری کے مابین ایک معاہدہ ہوا - جسے اعلان تاشقند کا نام دیا گیا - اس اعلان میں مسئلہ کشمیر کا ذکر صرف اس طرح ہے کہ فریقین نے پاک بھارت تعلقات کے پس منظر میں مسئلہ کشمیر پر بھی بات چیت کی -

معاہدہ شملہ- 1971ء کی پاک بھارت جنگ (جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان پاکستان سے الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا) کے چھ ماہ بعد 2 جولائی 1972ء کو شملہ (بھارت) میں پاکستان

کے صدر ذوالفقار علی بھٹو اور بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے دستخطوں سے بھارت اور پاکستان کے مابین ایک معاہدہ ہوا جس میں کشمیر سے متعلق مندرجہ ذیل معاملات طے پائے۔

(i) ریاست جموں کشمیر کے مستقبل کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے کے لئے مناسب موقع پر بھارت اور پاکستان کے حکام کے مابین مذاکرات کے نتیجے میں نکالے جانے والے مسئلہ کشمیر کے حل کی توثیق بھارت اور پاکستان کے سربراہان حکومت کریں گے۔ اس طرح یہ مسئلہ کشمیر کا حتمی حل ہو گا۔ اس معاہدے میں نہ تو کشمیریوں کے حق خود ارادیت کا کوئی ذکر ہے نہ ہی کشمیریوں کو مسئلہ کشمیر کا فریق تسلیم کیا گیا ہے۔

(ii) اس معاہدے کے تحت حدِ متارکہ جنگ (سیز فائر لائن) کا نام تبدیل کر کے لائن آف کنٹرول رکھا گیا۔ یہی نہیں بلکہ بھارت نے 1971ء کی جنگ کے دوران ریاست میں جن 22 اہم فوجی چوکیوں پر قبضہ کیا تھا وہ بھی اسے بخش دی گئیں۔ جس کے نتیجے میں اس نے بعد میں سیاچین گلیشئر پر قبضہ کیا۔

(iii) دونوں حکومتوں نے اعلان کیا کہ وہ ایک دوسرے کی رضامندی حاصل کئے بغیر مسئلہ کشمیر کو کسی بین الاقوامی ادارے میں نہیں اٹھائیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد آج تک پاکستان نے مسئلہ کشمیر کو کسی بین الاقوامی ادارے یا کانفرنس کے ایجنڈے میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ علاوہ ازیں دونوں حکومتوں نے یہ بھی طے کیا کہ وہ اپنے ملک یا کشمیر میں اپنے زیر کنٹرول علاقے میں کسی ایسی تنظیم کو ابھرنے نہیں دیں گے جس کی سرگرمیاں فریق دوم کے خلاف ہوں۔

دہلی ایکارڈ۔ اوائل 1975ء میں بھارت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور کشمیری لیڈر شیخ محمد عبداللہ کے مابین ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس میں شیخ محمد عبداللہ نے ریاست جموں کشمیر کو بھارت کا آئینی حصہ اور اٹوٹ انگ تسلیم کیا اور اس کے عوض اسے مقبوضہ کشمیر کا وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔

جنرل اسمبلی کے اندر تاریخی احتجاج۔ 3 اکتوبر 1980ء کو میرے بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق لبریشن فرنٹ کے چار مجاہدوں جاوید بھٹی، محمود احمد، مشتاق خان اور محمد یاسین نے نیو یارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بھارتی وزیر خارجہ کی تقریر کے دوران پندرہ بیس منٹ تک آزادیٔ کشمیر کے فلک شگاف نعرے لگا کر ہال میں موجود دنیا کے تمام ممالک کے وزرائے خارجہ اور سینئر سفارت کاروں اور دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کو مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر کی اہمیت کا احساس دلایا (تفصیلات کے لئے دیکھئے اقوام متحدہ میں

سرگرمیاں والے باب کا متعلقہ حصہ)

کشمیریوں سے زیادتی کرنے والوں کا حشر

اسے اتفاق کہئے یا مکافاتِ عمل کہ جس کسی نے بھی کشمیریوں کے ساتھ زیادتی کی یا ان کے قومی مفاد کو نقصان پہنچایا یا پہنچانے کی کوشش کی اسے قدرت کی طرف سے عبرت ناک سزا ملی خواہ وہ کشمیری تھا یا باہر کا۔ اس سلسلے کی سینکڑوں مثالوں سے کچھ۔

کشمیر کو کشمیریوں کی مرضی کے خلاف بھارت کے حوالے کرنے والا مہاراجہ ہری سنگھ بمبئی میں گمنامی کی موت مرگیا۔ نام نہاد کشمیر اسمبلی سے ریاست کے بھارت سے نام نہاد الحاق کی توثیق کرانے والے بخشی غلام محمد کو انتہائی تذلیل کے ساتھ اقتدار سے علیحدہ کیا گیااور اس کے مرنے پر عوام نے اس کی تجہیز و تکفین میں حصے لینے سے انکار کیا۔ کشمیری حریت پسندوں کو انسانیت سوز جسمانی اور ذہنی اذیتیں دینے والے پولیس آفیسر قادر گاندربلی کے بدن میں کیڑے پڑ گئے اور وہ اسی حالت میں مرگیا۔ ریاست کی چیف منسٹری کی لنگڑی کرسی کے عوض ریاست کو بھارت کا آئینی حصہ تسلیم کرنے والے شیخ محمد عبداللہ کی قبر پر پہرہ بٹھانا پڑا۔ یہ وہ شیخ محمد عبداللہ ہے جو اگر اس قسم کی غلطیاں نہ کرتا تو صدیوں تک کشمیریوں کے دلوں پر حکومت کرتا۔ جدوجہد آزادی کو سیاسی آوارہ گردی قرار دینے والے مرزا افضل بیگ زندگی کے آخری سالوں میں اپنوں ہی کے ہاتھوں ذلیل ہو گئے۔ مسئلہ کشمیر کو درد سر قرار دینے والا فیلڈ مارشل ایوب خان اپنے دور اقتدار کے آخری مہینوں میں اپنے ہی پروردہ افراد کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوا۔ شملہ میں کشمیریوں کو ان کے پیدائشی حق (حق خودارادیت) سے محروم کرنے کے معاہدے پر دستخط کرنے والا ذوالفقار علی بھٹو اپنے ہی پروردہ کے ہاتھوں سولی چڑھ گیا اور کشمیریوں کو ہمیشہ کے لئے غلام بنانے کے خواب دیکھنے والی مسز اندرا گاندھی کا جسم اپنے ہی محافظوں کی گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔

مکافات عمل کی یہ چند مثالیں مشتے از خروارے ہیں۔ انشاء اللہ کشمیریوں کے ساتھ زیادتی کرنے والوں کا آئندہ بھی یہی حشر ہوتا رہے گا۔

حصہ ہفتم

دستاویزات

حصّہ ہفتم

دستاویزات

ریاستوں کی خود مختاری کے بارے میں قائد اعظم کا بیان

225

Report from Reuter Indian Service

L/P&S/13/1827: ff 8–9

MR JINNAH'S STATEMENT

NEW DELHI, *17 June 1947*

Mr Mohammed Ali Jinnah, Moslem League President, in a statement today on the position of the Indian States after the lapse of paramountcy, said: "Constitutionally and legally the Indian States will be independent sovereign States on the termination of paramountcy and they will be free to decide for themselves any course they like to adopt."

"It is open to the States to join the Hindustan Constituent Assembly or the Pakistan Constituent Assembly or decide to remain independent. In the last case they can either enter into such arrangement or relationship with Hindustan or Pakistan as they may choose," Mr Jinnah said.

Mr Jinnah said if the States wished to remain independent and wished to negotiate or adjust any political or any other relationship such as commercial or economic relations with Pakistan "we shall be glad to discuss with them and come to a settlement which will be in the interests of both".

He added that he was not of the opinion that the States were limited only to the option of joining one or other Constituent Assembly.

"In my opinion they are free to remain independent if they so desire. Neither the British Government nor the British Parliament nor any other power or body can compel them to do anything contrary to their free will and accord, nor have they any power of sanction of any kind to do so", he said.

226

Report of the Madras States Residency for the fortnight ending 15th June 1947 (Extract)

L/P&S/13/1299: f 4

TRIVANDRUM, *17 June 1947*

TRAVANCORE

3. The question of independence of States after the lapse of British paramountcy, with particular reference to Travancore, has been the subject of sharp controversy between Sir C. P. Ramaswami Aiyar on the one side and leaders of the Congress and All-India States' People's Congress parties on the other. Through Press Conferences and Press statements, the Dewan has

29 اپریل 1949ء کے معاہدہ کراچی کا متن جس کے تحت گلگت بلتستان اور مسئلہ کشمیر سے متعلق معاملات کو حکومت پاکستان کی تحویل میں دیا گیا

HEADS OF AGREEMENT WITH HON'BLE MINISTER WITHOUT PORTFOLIO AND THE PRESIDENT ALL J&K MUSLIM CONCERENCE AND THE PRESIDENT AZAD KASHMIR GOVT.

III. Division of functions between the Government of Pakistan and Azad Kashmir Government and the All J&K Muslim Conference.

A. Matters with the purview of the Pakistan Government.

I. Defence (as modified under C.R. No. 149/49).

II. Foreign Policy of Azad Kashmir. III. Negotiations with UNCIP.

IV. Publicity in Foreign countries and in Pakistan V. Coordination of arrangements of relief and Rehabilitation of Refugees. VI. Coordination of publicity in connection with Plebiscite. VII. all activities within Pakistan regarding Kashmir such as procurement of food, civil supplies, transoport, running of refugee camps and medical aid. VIII. All affairs of Gilgit, Ladakh under control of Political Agent.

B. Matters with the purview of AK Government.

1. Policy with regard to administration of AK Territory. II. General supervision of administration in AK Territory III. Publicity with regard to the activities of Azad Kashmir Government and administration. IV. Advise to Hon'ble Minister without Portfolio with regard to the negotiations with UNCIP. V. Development of economic resources of AK Territory.

C. Matters with the purview of Muslim Conference

1. Publicity with regard to Plebiscite within AK Territory II. Field work and publicity in the Indian occupied area of the State III. Organization of Political activities in the AK Territory in Indian occupied area of the State IV. Preliminary arrangements in connection with the Plebiscite. V. Organization of contesting the Plebiscite. VI. Political work and publicity among the Kashmiri refugees in Pakisgan. VII. Advise the Hon'ble Minister without Portfolio with regard to the negotiations with UNCIP.

I agree to this in so far as this
concerns with the part regarding
the Muslim Conference
Sd/- Ghulam Abbas
President,
All J&K Muslim Conference.

Sd/-
(M. A. Gurmani)
Minister without Portfolio
Government of Pakistan
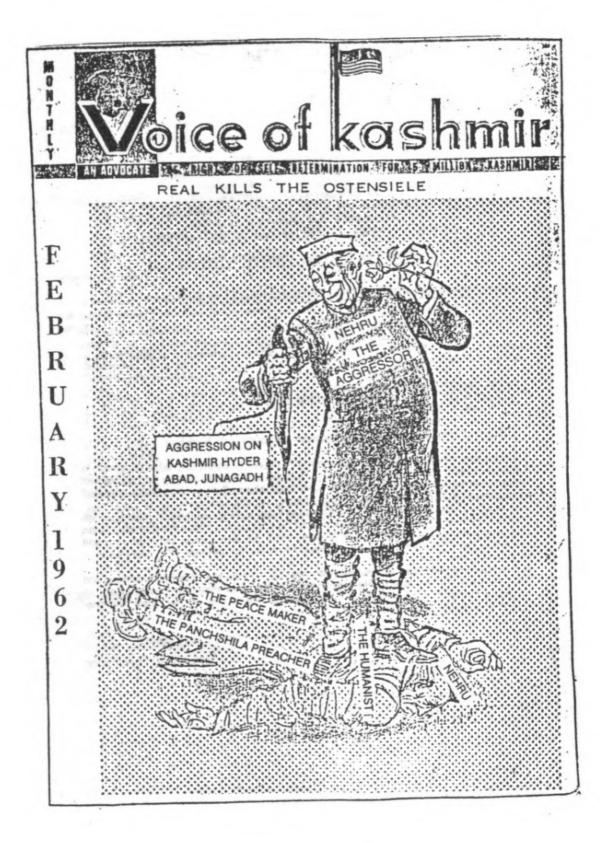
Sd/- Mohd. Ibrahim Khan
President,
Azad Kashmir Government.

حکومت پاکستان کے یہ دو خط جو گنگا ہائی جیکنگ کیس کے دوران عدالت میں پیش کئے گئے
حکومت کی کشمیر پالیسی کا اصل چہرہ دکھاتے ہیں

GOVERNMENT OF PAKISTAN
MINISTRY OF HOME, KASHMIR AFFAIRS
AND STATES AND FRONTIER REGIONS
(KASHMIR AFFAIRS DIVISION)

SUMMARY FOR THE PRESIDENT & C.M.L.A.

Subject:– **UNDER-GROUND ACTIVITIES OF PLEBISCITE FRONT**

The Jammu and Kashmir State Plebiscite Front for Azad Kashmir and Pakistan believe in "Independent Kashmir" ideology and for bringing about the resolution of the Kashmir dispute, its workers speak of resorting to disruptive/sabotage activities in Occupied Kashmir. Its important workers are:–

(1) Mr. Amanullah Khan of Karachi.
(2) Mr. Ghulam Mohammad Loan of Karachi.
(3) Mir Abdul Mannan of Karachi.
(4) Mir Abdul Qayyum of Karachi
(5) Mr. Maqbool Ahmad Butt President of the Front.

2. Mr. Amanullah Khan and others organised an adventure in Indian-held Kashmir in 1966, in which Messrs. Maqbool Ahmad Butt, Yasin and Kala Khan were intercepted and convivted to death. Messrs. Amanullah Khan, Maqbool Ahmad Butt and Kala Khan succeeded in escaping back to Azad Kashmir.
3. After the convention of the J&K Plebiscite Front at Muzaffarabad on November 5th to 6th, they have planned to resort to armed action in Occupied Kashmir and to accomplish their plans, they are reported to be collecting arms and ammunition and explosives and to recruit people to carry these into Occupied Kashmir for sabotage. A cyclostyled copy of their plan is enclosed.
4. It is considered that Amanullah Khan and his workers are undesirable persons and should be told by the intelligence authorities in clear terms that their private efforts at liberating Occupied Kashmir will not be tolerated: and if they do not desist, the ring-leaders should be arrested and detained.

Sd/- (A.M.S. Ahmad)
S. Pk. PSP.,
SECRETARY.

جہد مسلسل

IMMEDIATE

FROM CDR. IZZAT AWAN
DEPUTY SECRETARY

GOVERNMENT OF PAKISTAN
MINISTRY OF HOME & KASHMIR AFFAIRS
(KASHMIR AFFAIRS DIVISION)

D.O. No P-1/21/69 ISLAMABAD THE 24TH DECEMBER 1969.

SUB:- UNDERGROUND ACTIVITIES OF PLEBISCITE FRONT

Dear Mr. President,

I am desired to forward herewith a copy of the summary prepared in this Division on the subject and to convey the following decision taken in this respect by the Government of Pakistan:-

1. "The Government of A.K. is to handle the situation according to merits and their intelligence appreciation. The Government of Pakistan would come in if A.K. Government encounter any difficulty and only on their recommendation."

   "Mr. Amanullah and his workers should be told in clear terms that their private efforts in liberating I.H.K. will not be tolerated. If they do not desist, the ring leaders should be arrested and detained."

2. It is therefore requested that suitable measures may kindly be taken to counteract their mischief.
3. You many have also seen the intellegence report on the annual Convention of the Front held at Muzaffarabad from November 4 to 6, 1969 and the role played by Mr. Amanullah and his other workers. A note each on Mr. Amanullah Khan and Mr. Abdul Mannan Khalifa and the activities of the Jammu and Kashmir Plebiscite Front and Kashmir National Liberation Front is also enclosed for information.

With respecful regards,
Yours sincerely,
Sd/-
(IZZAT AWAN.)

Encl:- Attached.

Mr. Abdul Rehman Khan,
President,
Azad Govt. of the State of J&K
Muzaffarabad (Azad Kashmir)

گنگا ہائی جیکنگ کیس کے فیصلے میں میرے اور نظریۂ خودمختار کشمیر کے بارے میں ریمارکس

AMANULLAH KHAN 271

To understand fully the idealogy of the Plebiscite Front and National Liberation Front, we must advert also to some of the associates of the accused. The foremost of them is Amaaullah Khah.

Amanullah Khan. D.W 40, commonly known as Amanullah Gilgiti belongs to Astore in Gilgit Agency. He left his home village as a child and went to Hi Hams where he stayed with his sister

272

are given free tuition. He is also maintaining a hostel for these boys. By putting in untiring efforts he has got sanctioned by the Government scholarship for the boys of Gilgit-Baltistan. Some Scholarships are given by him personally.

Amanullah Khan writes with great facility and at times very artfully. He projects political views with telling effect and has tremendous capacity for organizational work. He has been in correspondence not only with the leaders of political parties in in Pakistan and Indian Held Kashmir since 1957, but also with the officials of the United Nations Organization the Afro Asian Conference, and a large number of Kashmiri Students carrierist residing in U.S.A. England and other foreign countries. He has also been in constant correspondence with Sheikh Mohammad Abdullah, Mirza Afzal Beg and Maulana Masoodi.

338

on both sides of the cease fire line.

It was conceded by the learned Attorney General that the demand for Independent Kashmir made by the accused was no offence in law and as members of a political party they were entitled to convess for this view. This disposes of the second part of the fifth charge, but we would like to make a few observations before we pass on to the next charge.

The mission undertaken by the accused is two-fold. On the one hand they want to liberate held part of the Kashmir from Indian occupation forces, and on the other to indoctrinate the Kashmiris against accession of the State to Pakistan. While dealing with the antecedants of Amanullah Gilgati who is the main intellectual force behind the Plebiscite Front and National Liberation Front, we have quoted from the letter he had written

CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR

CMS/Aml-18/78.
نمبر:
سری نگر:
۲ اگست ۱۹۷۸ء

مکرمی امان اللہ خان صاحب!

السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۷۸ء موصول ہوا۔ آپ نے اس خط میں کشمیر کی خود مختاری کو آئندہ نسلوں کے لئے ایک روشن مستقبل کی ضمانت کے طور پر پیش کیا ہے۔ لیکن اس تصور کے لئے آپ نے جن جوازیت اور سب سے بڑھ کر جس جذباتیت کا سہارا لیا ہے میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ جذبات کے سہارے کسی ایک فرد واحد کے مقدر کا فیصلہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن کسی قوم کے افراد کی اجتماعی قسمت کا تعین کرتے وقت، جذبات سے زیادہ حقیقت پسندی کا رویہ اپنانا پڑتا ہے۔ آپ نے اپنے دلائل میں حقیقت پسندی کے اس اہم عنصر کو صریحاً نظر انداز کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا خط محض آپ کے ذاتی نقطۂ نظر کا ترجمان بن کر رہ گیا ہے اور اس سے کسی نئی تعمیری یا اجتماعی فکر کا آغاز نہیں ہوتا۔

جہاں تک کشمیر کی خود مختاری کا سوال ہے، میں آپ کی توجہ اُن چند باتوں کی طرف دلانا چاہوں گا جو ناقابلِ تردید تاریخی حقائق میں داخل ہو چکی ہیں اور ہماری تاریخ کا کوئی بھی سنجیدہ طالب علم ان سے چشم پوشی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ ہم نے کشمیر میں شخصی راج کے خلاف تحریک شروع کی تھی۔ ایسا کرتے وقت ہمیں اُن عظیم ساتھیوں کا تعاون اور راہنمائی حاصل رہی جو اُس وقت کے ہندوستان میں انگریزی سامراج کے خلاف آزادی کی جنگ میں مصروف تھے۔ اس طرح ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مختلف الخیال جماعتوں کا دائرہ اثر کشمیر تک پھیلا ہوا تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے فوری بعد ہم تاریخ کے ایک نازک اور اہم ترین موڑ پر آ گئے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پر ہمارے سامنے تین راستے تھے۔

ایک راستہ یہ تھا کہ ہم ہندوستان کے ساتھ الحاق کریں۔ ہمارے عوام کے سیکولر اور نیشنلسٹ کردار کی روشنی میں یہ فیصلہ اہم بھی تھا اور اس سے ہمارے بنیادی آدرشوں کو بھی تقویت پہنچتی تھی۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ ریاستی عوام کے مسلم اکثریتی کردار کے پیش نظر پاکستان میں شامل ہوا جائے۔ تیسرا راستہ خود مختاری یا مکمل آزادی کا تھا جس کے لئے تمام ہمسایہ ممالک کی طرف سے تحفظ کی ضمانت ضروری تھی۔ لیکن ابھی ہم اس بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ

CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR

-2-

پاکستان نے ریاست میں جارحانہ مداخلت کردی۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی جس میں ہندوستان نے ہماری مدد کی اور ہمیں داخلی خود مختاری کے ایک واضح تصور کے تحت خارجی مداخلت کی صورت میں ہر ممکن تحفظ دینے کی ضمانت فراہم کی۔ ہندوستان کی طرف سے دی گئی یہ ضمانت خود ہندوستان کے وفاقی دستور میں موجود ہے اور اس کی روشنی میں ریاستی عوام کے لئے بہتر اور محفوظ مستقبل کا ایک جائز اندازِ فکر ابھرتا ہے۔

اس کے علاوہ بین الاقوامی پس منظر میں بھی آپ بخوبی واقف ہیں کہ آج دنیا کی چھوٹی ریاستیں اور ممالک اپنی سالمیت اور آزادی کے تحفظ کے لئے اپنے ہمسایہ ممالک پر انحصار کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں ان کی آزادی اور سالمیت ہمیشہ خطرے میں رہتی ہے۔ برصغیر کے کچھ چھوٹے ممالک اور براعظم افریقہ کی نئی آزاد مملکتوں میں پیش آنے والے روزمرہ کے واقعات اس امر کے شاہد ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انحصاریت کا رجحان ہم عصر عالمی سیاست کی ایک غالب حقیقت بنتا جارہا ہے اور یہ ہندوستان سے ہماری وابستگی کے بنیادی فیصلے کی استقامت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر اپنی جغرافیائی حدود کے اعتبار سے کئی عظیم ایشیائی ممالک سے گھری ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں خود مختاری کا جو تصور آپ نے پیش کیا ہے وہ ایک مستقل خطرے کے سوا اور کچھ بھی فراہم نہیں کرسکتا۔ اور اسی لئے ہم نے خود کو ہندوستان کی وسیع وفاقی جمہوریت سے وابستہ رکھا تھا۔ یہ قدم ریاست کی سالمیت اور ریاستی عوام کی اجتماعی بہتری کی ضمانت کے طور پر اٹھایا گیا ہے اور آزادی کے بعد برسوں میں، بالخصوص برصغیر میں پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں (جن میں بنگلہ دیش کا قیام بھی شامل ہے) ہمارے اس فیصلے کی سچائی بہت حد تک عیاں ہوگئی ہے۔

آپ نے میری ذاتی قربانیوں کے ساتھ ساتھ قومی تحریک میں میری کچھ خدمات کا ذکر کیا ہے۔ اور مستقبل کا سوال بھی اٹھایا ہے۔ قوموں کی زندگی میں کوئی بھی ایک انسان اتنا بڑا نہیں ہوتا کہ اس کی شخصیت مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کے تسلسل کا رُخ موڑ سکے اور مجھے اس بارے میں اپنی ذات سے متعلق کوئی بھی خوش فہمی نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ ریاستی عوام کے مجموعی مفادات کو اپنی ذات سے بالاتر سمجھا ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں

CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR

(۳)

کہ جب تک مجھے اپنی قوم کی خدمت کا موقعہ ملتا رہے گا، میرا اُٹھایا ہوا ہر قدم ایک با عزت اور خوشحال معاشرے کی تعمیر کے لئے وقف ہوگا۔ یہی میرا مقصد ہے اور اسی سے ریاستی عوام کو اُن کا تاریخی وقار اور عظمت دوبارہ حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اُن کے صدیوں پرانے مسائل کا حل ممکن ہو سکتا ہے۔

نیک خواہشات کے ساتھ،

دعاگو

شیخ محمد عبداللہ

(شیخ محمد عبداللہ)

جناب امان اللہ خان،
۲۳۸، الم راک روڈ،
برمنگھم ۸
(یوکے)
شفقات

اقوام متحدہ کی طرف سے ملنے والے درجنوں خطوط میں سے کچھ

UNITED NATIONS NATIONS UNIES

POSTAL ADDRESS—ADRESSE POSTALE UNITED NATIONS, N.Y. 10017
CABLE ADDRESS—ADRESSE TELEGRAPHIQUE UNATIONS NEWYORK

REFERENCE:

17 August 1978

Dear Mr. Khan,

On behalf of the Secretary-General I acknowledge receipt of your letter of 26 June 1978, in which you make certain suggestions concerning the future of Kashmir and ask the Secretary-General to take specific action in that regard.

As you know, the question of Kashmir has been for a long time the subject of consideration within the United Nations, and a number of resolutions on that subject have been adopted over the years. These resolutions dealt with this problem in the context of relations between India and Pakistan. For example, following the 1965 hostilities in Kashmir, the Security Council on 20 September of that year called upon the two Governments to utilize all peaceful means towards a settlement of the political problem underlying that conflict. You are also no doubt aware that the Simla agreement of 2 July 1972 provides for discussions between the two Governments toward a "final settlement of Jammu and Kashmir". It is our understanding that contacts on the subject are continuing.

In the light of this background, we can see no basis or legislative authority for an initiative by the Secretary-General designed to influence the two Governments directly concerned to adopt a solution of the problem under negotiation between them along the lines favoured by one or another political party in the area. The Secretary-General hopes that an agreed solution of the problem of Kashmir and other outstanding problems will be reached by negotiations, in the interests of permanent peace on the subcontinent.

Sincerely yours,

Brian E. Urquhart
Under-Secretary-General for
Special Political Affairs

Mr. Amanullah Khan
Secretary-General
Jammu Kashmir Liberation Front
438 Alum Rock Road
Birmingham 8, U.K.

UNITED NATIONS NATIONS UNIES

POSTAL ADDRESS—ADRESSE POSTALE UNITED NATIONS, N.Y. 10017
CABLE ADDRESS—ADRESSE TELEGRAPHIQUE UNATIONS NEWYORK

REFERENCE:

13 November 1978

Dear Mr. Khan,

Thank you for your letter of 11 September. Your views have been carefully noted. In this regard I must again draw your attention to Security Council resolution 211, of 20 September 1965, in which the Council decided that, following the cessation of hostilities, it would "consider...what steps could be taken to assist towards a settlement of the political problem underlying the present conflict, and in the meantime call(ed) on the two Governments to utilize all peaceful means, including those listed in Article 33 of the Charter of the United Nations, to this end". As you know, the two Governments on 2 July 1972 concluded the Simla agreement. Any further United Nations action on this matter would be for the Council to decide.

Concerning the request for circulation of your communications, I have to inform you that under UN rules this could only be done at the request of a Member State. However, your letter will be included in a list of such communications that is circulated by the Secretary-General from time to time, and the letter itself will then be available for consultation by members of the Security Council.

Sincerely yours,

Brian E. Urquhart
Under-Secretary-General for
Special Political Affairs

Mr. Amanullah Khan
Secretary-General
Jammu Kashmir Liberation Front
438 Alum Rock Road
Birmingham 8, U.K.

جہدِ مسلسل

PO 210 PI (S/NC) 1980

31 October 1980

Dear Sir,

On behalf of the President of the Security Council, I wish to acknowledge receipt of your letter dated 28 October 1980 concerning the India-Pakistan question and to thank you for having conveyed your views on this problem.

Please be assured that your letter will be dealt with in accordance with established procedures for dealing with communications from private individuals and non-governmental bodies, which ensure that representatives on the Security Council will have an opportunity to acquaint themselves with the contents of your communication.

Yours sincerely,

Director
Security Council and
Political Committees Division

Mr. Amanullah Khan
Secretary-General for
Jammu Kashmir Liberation Front
3021 'I' No. 2 A
Brooklyn, N.Y. 11210

P.S. Kindly refer to Article 35 of the U.N. Charter (copy enclosed) regarding the convening of a Security Council meeting.

جہدِ مسلسل

UNITED NATIONS NATIONS UNIES

POSTAL ADDRESS—ADRESSE POSTALE. UNITED NATIONS, N.Y. 10017
CABLE ADDRESS—ADRESSE TELEGRAPHIQUE· UNATIONS NEWYORK

REFERENCE:

11 November 1980

Dear Mr. Khan,

On behalf of the Secretary-General, I wish to acknowledge receipt of your letter of 30 September 1980. While your remarks concerning the United Nations attitude toward the issue of Jammu and Kashmir have been noted, we cannot accept your contention that the Organization has shown apathy towards Kashmir.

The Kashmir problem was dealt with at length by the Security Council from 1948 to 1951, and again in 1965 and in 1971. The continued stationing in Kashmir of the United Nations Military Observer Group for India and Pakistan (UNMOGIP) symbolizes the concern of this Organization over the situation.

As you are aware, any further action by the United Nations in this matter would have to be decided upon by the Security Council.

As I have had occasion to explain in previous letters, documents are normally circulated at the United Nations upon the request of a Member State. Your letter, however, will be kept on file and will be available for consultation in accordance with established procedure.

Sincerely yours,

Brian Urquhart

Brian Urquhart
Under-Secretary-General
for Special Political Affairs

Mr. A. Khan, Secretary General
Jammu Kashmir Liberation Front
Head Office
438 Alum Rock Road
Birmingham 8
United Kingdom

جہد مسلسل

UNITED NATIONS NATIONS UNIES

POSTAL ADDRESS — ADRESSE POSTALE UNITED NATIONS, N.Y. 10017
CABLE ADDRESS — ADRESSE TELEGRAPHIQUE UNATIONS NEWYORK

REFERENCE: PO 240 PI (S/NC) 1980 — 3 December 1980

Dear Mr. Khan,

On behalf of the Secretary-General, I wish to acknowledge receipt of your letter dated 14 November 1980 concerning the India-Pakistan question and to thank you for having conveyed your views on this problem.

Please be assured that your letter will be dealt with in accordance with established procedures for dealing with communications from private individuals and non-governmental bodies, which ensure that representatives on the Security Council will have an opportunity to acquaint themselves with the contents of your communication.

Yours sincerely,

Director
Security Council and
Political Committees Division

Mr. Amanullah Khan
Secretary General
Jammu Kashmir Liberation Front
3021 Avenue, 'I' No. 2 A
Brooklyn, N.Y. 11210

P.S. In regard to your previous request for the convening of a Security Council meeting, kindly refer to Article 35 of the ..... United Nations Charter (copy enclosed).

جہد مسلسل

UNITED NATIONS NATIONS UNIES

POSTAL ADDRESS—ADRESSE POSTALE: UNITED NATIONS, N.Y. 10017
CABLE ADDRESS—ADRESSE TELEGRAPHIQUE: UNATIONS NEWYORK

REFERENCE:

4 October 1984

Dear Mr. Khan,

On behalf of the Secretary-General, I should like to acknowledge receipt of your letter of 28 September 1984 in which you reiterated your views on the question of the future of Jammu and Kashmir and asked the Secretary-General to take specific action in that regard.

In previous correspondence with you we have had occasion to explain the position of the United Nations concerning the present status of this question. As was again pointed out to you by a member of this office on 28 September, that position remains unchanged. Any further action on this matter would have to be initiated in the Security Council by a Member State of the Organization.

Yours sincerely,

Brian Urquhart
Under-Secretary-General
for Special Political Affairs

Mr. Amanullah Khan
Chairman
Jammu Kashmir Liberation Front
Kashmir House
44 Westbourne Road
Luton LU4 8JD
England

BMS.80/C (4-62)

UNITED NATIONS

TEMPORARY PASS

میرا اقوام متحدہ کا پاس

MR Amanullah KHAN

REPRESENTATIVE OF Voice of Kashmir

Issued 23 Sep 83 Expires 23 Oct 1983

AUTHORIZED SIGNATURE

THIS PASS IS PERSONAL AND MUST BE SHOWN ON DEMAND OF AUTHORIZED PERSON.
KINDLY RETURN TO PASS OFFICE UPON EXPIRATION DATE OR FINAL DEPARTURE.

خالصتان کی جلا وطن حکومت کے صدر کا خط

ੴ ਸਤਿਗੁਰ ਪ੍ਰਸਾਦਿ

ਰਿਪਬਲਿਕ ਆਫ਼ ਖਾਲਿਸਤਾਨ

REPUBLIC OF KHALISTAN

KHALISTAN HOUSE
12 Talbot Road,
London W2 5LH
Tel: 01-221 3859

Dated:26.10.84..

Jammu & Kashmir Liberation Front,
Kashmir House.
44 Westborne Road
Luton LU4 8JD England.

Dear Khan Sahib,
Aslam-e-Alekam.

Thankyou very much for yourkind letter of October 18th,Ref.No:CM/POL/155/84.
I already have issued statements to the facts that Khalistan has got no claim to any territory of Pakistan or Kashmir State.The statements,have already been published twice in all the Islamic press.I also sent a copy of my statement to Pakistan Embassy,(copy sent here-with).
There is a group of professerps in Lahore University,who along with the Indian Intelligence are always trying to publish such news or maps.Our map is published in almost every issue of Khalistan Times and you can assure your party that Khalistan will be a friendly state to Kashmir.

Thanking You.

Yours Sincerely,

JAGJIT SINGH.
President
Republic of Khalistan.

JAMMU KASHMIR LIBERATION FRONT

HEAD OFFICE
438 Alum Rock Road
Birmingham 8, U.K.
Tel: 021-328 2647

Date. Sept. 27, 1983

Their Excellencies,
The Foreign Ministers of the NAM Member States,
Camp New York.

Your Excellencies,

Reminding Your Excellencies of the provisions of the Aims and Objectives of the Non-Aligned Movement and of the UN General Assembly Resolutions 1514 and 2621 (Granting of Independence to Colonial Countries and Peoples) which make it obligatory for all member states to render all necessary moral and material assistance to the freedom movements of the enthrawled peoples, I venture to call upon Your Excellencies to use your good offices to persuade the governments of India and Pakistan to concede to 9 million Kashmiris their inherent, inalienable, pledged and internationally recognised right of self-determination.

In the light of the nature and background of the issue and the lame excuses being made about impracticablity of the plebiscite provided under UNCIP resolutions on the issue, the best, most equitable and practicable way to solve it is to re-unify the forcibly divided Jammu Kashmir State and let it emerge as a free and independent State.

It may be mentioned here that both India and Pakistan stand committed to this solution through their nationally and internationally made declarations. India had declared even at the United Nations that she fully recognised Kashmiri peoples right to complete independence and to claim admission to the United Nations as a member State. (Indian representatives speech in the Security Council on January 15 and February 3, 1948)

I hope Your Excellencies will not ignore your above-mentioned moral and constitutional obligations.

Your Excellencies' faithfully,

(Amanullah Khan)
President,
Jammu Kashmir Liberation Fro

رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے دو خط

المجلس الاسلامي الأوروبي
Islamic Council of Europe

4th June 1979

Mr. Amanullah Khan
Jammu Kashmir Liberation Front
438 Alum Rock Road,
Birmingham 8

Dear Brother Khan

Assalamu Alaikum va Rahmatullah,

We wish to express our heartfelt thanks and gratitude to you for attending the International Islamic Conference on the Liberation of Muslim Lands. Your valuable efforts greatly contributed to the success of the Conference.

You will be pleased to know that in persuance of the resolution passed at the Conference, the International Islamic Secretariat for the Liberation of Muslim Lands have been set up and we hope with your active participation and cooperation, we will, Insha Allah, realise our noble aims.

Please find enclosed the copy of the text of the resolutions passed at the Conference.

May Allah guide and reward you and bring success to all your efforts.

With regards and best wishes.

Yours Sincerely,
Salem Azzam
Salem Azzam
Secretary General

16 Grosvenor Crescent London SW1 7EP Telephone 01-235 9832 Cables ISLAMIAH

جہدِ مسلسل

بسم الله الرحمن الرحيم

واعتصموا بحبل الله جميعاً ولا تفرقوا

رابطة العالم الإسلامي
الأمانة العامة
إدارة أعمال المجلس التأسيسي والمؤتمرات

١٦٨٧

الرقم ٥/١/٤٢/١/٨)

التاريخ ١٢/١٠/١٤٠٠هـ

المرفقات ـــــ

الموضوع : قضية المسلمين في الهند وكشمير

سعادة السيد / امان الله خان المحترم

امين عام جبهة تحرير جامو وكشمير / برمنجهام / انجلترا

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته ؛

اشارة الى خطابكم المؤرخ في ٢٢ / ٨ / ١٩٨٠م المرفق به تقريرعما تقترفه القوات المسلحة الهندية ضد المسلمين في الهند .

يهم الامانة العامة للرابطة ان تحيطكم علما بان هذه القضية من القضايا الاسلامية التي تعتني بها الرابطة وقد اوصى المجلس التأسيسي للرابطة في دورته الاخيرة قادة مختلف الدول الاسلامية بكل القوة الممكنة بان ينتبهوا لمخطط الهند وان يتخذوا من الاجراءات العملية على المستوى الدبلوماسي والسياسي والاقتصادي ما يجبر حكومة الهند على ايقاف مخططها قبل ان تذهب الى ابعد مما ذهبت اليه وحتى لا تستفحل المحنة التي يتعرض لها اخواننا المسلمين في الهند .

كما بعثت الامانة العامة بمذكرة طالبت فيها الحكومة الهندية باحترام الحقوق الانسانية التي كفلها دستور الامم المتحدة وصادق عليها وتضمنها دستور الهند .

شاكرين لكم اهتمامكم والمولى الكريم نسأله ان يعلي كلمته وينصر عباده انه نعم المولى ونعم النصير .

والله يحفظكم ،،،

الامين العام

محمد علي الحركان

ع/ع

٩ / ٢.

19 دسمبر 1982ء کو ہم نے بیک وقت یورپ کے پانچ دارالحکومتوں میں مظاہرے کئے

National Freedom – Our Birthright

JAMMU KASHMIR LIBERATION FRONT

HEAD OFFICE
438 Alum Rock Road,
Birmingham 8, U.K.
Tel: 021-328 2647
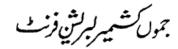
Date... 19-12-1982

KASHMIRIS' PROTEST DEMONSTRATIONS IN
LONDON, PARIS, WEST BERLIN, THE HAGUE AND COPENHAGEN.

Hundreds of Kashmiris today marched through the streets of London, West Berlin, Paris, the Hague and Copenhagen shouting ' Foreign Occupants Quit Our Kashmir',' No, No, No to Permanent Division of Kashmir',' Voice of Kashmir Free Kashmir' and 'Independence the Only Solution of Kashmir'.They also delivered protest notes at Indian and Pakistani embassies and consulates in these cities.These letters called the reported ventures by Indian and Pakistani governments to solve the 35 year old Kashmir issue by dividing Kashmir permanently between themselves as heinous, nasty and brute .The letters said that the only just, equitable and honourable solution of the issue was to re-unify the divided Jammu Kashmir and let it emerge as an independent state.

These demonstrations were arranged by Jammu Kashmir Liberation Front four days before the foreign secretaries of India and Pakistan are to meet in New Delhi to discuss ways and means to bring about amity between the two countries. Kashmiri people apprehend that there will be a deal on Kashmir.

In London about 400 Kashmiris assembled at Hyde Park where a rally was addressed by Front leaders including Mr Amanullah Khan, its President.Mr Khan said that the governments of India and Pakistan had no right to decide the future of 9 million Kashmiris against their will and added that Kashmiris future was not subject to the whims and waggories of the people at the helm of affairs in New Delhi and Islamabad. Demanding re-unification and complete independence of the whole state of Jammu Kashmir Mr Khan said,' Both India and Pakistan stand committed to it nationally and internationally.We will not allow our inherent, inalienable, pledged and internationally recognised right of self-determination to be sacrificed at the altar of Indo-Pakistan amity. In number we are more than the individual populations of about one hundred free and independent nations of the world and we can manage our own affairs in a far better way than India and Pakistan do.'

(Zafar Khan)
Deputy Secretary General

National Freedom – Our Birthright

JAMMU KASHMIR LIBERATION FRONT

جموں کشمیر لبریشن فرنٹ

HEAD OFFICE
438 Alum Rock Road,
Birmingham 8, U.K.
Tel: 021-328 2647

Date. 8/9/83

'بھارت کے اپوزیشن لیڈروں کے نام کھلا خط'

اخبارات اطلاعات کے مطابق بھارت کی نو ریاستوں کی حکومتوں کے سربراہوں سمیت جہاں غیر کانگریسی حکومتیں قائم ہیں بھارتی اپوزیشن لیڈروں کا ایک اجتماع سرینگر میں ہو رہا ہے۔ یہ کھلا خط ان ہی لیڈروں کے نام ہے۔ اس سے قبل بھی 'بھارتی عوام کے نام' انگریزی میں ایک کھلا خط ان لیڈروں اور بھارت کے روزناموں اور جرائد کو بھیجا تھا لیکن اس خط کا کوئی حوصلہ افزا نتیجہ نہیں نکلا نہ ہی کسی لیڈر نے اس کا کوئی حقیقت پسندانہ جواب دیا۔ بہر حال میں ایک بار پھر ان اصحاب کی خدمت میں چند گزارشات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ گزارشات اس لئے بھی اہم ہیں کہ ان لیڈروں کا یہ اجلاس کشمیر میں ہو رہا ہے۔

اپنا اصل مقصد بیان کرنے سے پہلے میں اس بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ میری یا ہماری تنظیم جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کی بھارتی عوام سے کوئی دشمنی نہیں بلکہ ہم بھارتی عوام کے لئے ایک خوشحال اور پرامن مستقبل کے خواہاں ہیں۔ ہمارا اختلاف اور ہماری دشمنی بھارت کے ان حکمرانوں سے ہے جو مسئلہ کشمیر کے بارے میں ایک انتہائی غیر حقیقت پسندانہ۔ نوآبادیاتی اور جبر کی عکاسی کرنے والی شہنشاہی کے نظریئے پر مبنی اور عوامی امنگوں کے خلاف پالیسی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ البتہ ہمیں بھارتی عوام خاص کر انسانیت دوستی۔ جمہوریت پسندی اور قومی اور بین الاقوامی سطح پر کئے گئے وعدوں کی پاسداری کے دعویدار بھارتی لیڈروں سے گلہ ہے کہ آج تک (بجز گنے چنے چند لیڈروں کے) کسی نے کشمیر کے بارے میں حق و انصاف کا ساتھ نہیں دیا نہ ہی غلط اور نوآبادیاتی رویہ اختیار کرنے پر اپنی حکومتوں کا محاسبہ کیا۔

لیڈران کرام! اگر مسئلہ کشمیر کو بھارت اور پاکستان کے طویل المیعاد قومی مفادات۔ کشمیریوں سے کئے گئے وعدوں۔ پاک ہند تعلقات۔ کشمیریوں کے حقوق اور مسئلہ کشمیر کے عملی پہلوؤں کی روشنی میں پرکھا جائے تو اس مسئلہ کا ایک ایسا واضح حل نظر آتا ہے جو بھارت پاکستان اور کشمیریوں کے طویل المیعاد قومی مفادات کا تحفظ کرتا ہے، آسانی سے قابل عمل ہے اور پاک بھارت دوستانہ تعلقات (جن کی دونوں کو اشد ضرورت ہے) کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ کو دور کرتا ہے یہی ہے وہ حل جو بھارت اور پاکستان کے قومی مفاد پر کوئی ضرب آنے دیئے بغیر جموں کشمیر کو بھارت اور پاکستان کے مابین کشیدہ تعلقات اور جنگوں کی بجائے ان دونوں کے درمیان دوستی کا پل کی حیثیت دے سکتا ہے۔

[illegible]

ان تمام زمینیاتی و قومیتی خصوصیات کا حامل یہ حل پوری ریاست جموں کشمیر کی مکمل خود مختاری ہے۔

پوری ریاست کی مکمل خود مختاری کا یہ نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں بلکہ بھارت اور پاکستان کی حکومتیں بھی ایک سے زائد بار اس نظریے کو تسلیم کر چکی ہیں۔ بھارت کے نمائندے نے ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو اور اس کے بعد کئی بار اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں بھارتی حکومت کی طرف سے اعلان کیا تھا کہ بھارت کشمیریوں کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے وطن کو ایک آزاد و خود مختار ملک بنا کر اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کر لیں۔ خود آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو نے ۹ دسمبر ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں پیش کی گئی رپورٹ میں کشمیر اور اس کے علیحدہ قومی تشخص کو تسلیم کیا تھا۔
لیڈران

لیڈران کرام! اگر آپ کو واقعی کشمیر اور کشمیریوں سے کوئی ہمدردی ہے، اگر آپ مسئلہ کشمیر کا منصفانہ حل چاہتے ہیں، اگر آپ بھارت اور پاکستان کے مابین دوستانہ تعلقات پیدا کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ قومی وسائل اور غیر ملکی قرضوں اور امداد کو بلا ضرورت جنگی تیاریوں کی بجائے عوام کی خوشحالی پر صرف ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں، اگر آپ بھارت کو بین الاقوامی سطح پر رسوا ہونے سے بچانا چاہتے ہیں، اگر آپ کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر کئے گئے قومی وعدوں کا کوئی پاس ہے، اگر آپ بنیادی انسانی حقوق پر یقین رکھتے ہیں اور اگر آپ حق خود ارادیت کی بالادستی کی علمبرداری کے دعویدار رہ چکے ہیں تو آپ سب پر فرض عائد ہوتا ہے کہ آپ مسئلہ کشمیر کو پوری ریاست جموں کشمیر (جس میں پاکستان کے تحت ریاستی علاقہ بھی شامل ہے) کی مکمل خود مختاری کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کریں اور اس کوشش کی ابتداء اسی سرینگر کانفرنس سے ہو۔

میں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ کشمیر جلد یا بدیر ضرور آزاد ہو گا۔ اگر آپ کا اندازہ اس کے برعکس ہے تو آپ ایک انتہائی خطرناک غلط فہمی بلکہ خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ اگر ہماری آزادی کے حصول میں بھارت کے جمہوریت پسند اور آزادی پسند لیڈروں کی حمایت شامل رہی تو مستقبل کا خود مختار کشمیر بھارت کو ہمدرد دوست اور محسن تصور کرے گا اور یہ بات خود بھارت کے مفاد میں ہو گی اور اگر بھارتی لیڈروں نے اپنی سابقہ اور موجودہ روش برقرار رکھی تو مستقبل کی صورت حال بالکل مختلف ہو گی اور بھارت کے سر پر ایک دشمن کشمیر کی تلوار ہمیشہ لٹکتی رہے گی۔

محترم حضرات! دور حاضر کے رجحانات کے پیش نظر ہر ذی شعور انسان اس بات کا اندازہ آسانی سے لگا سکتا ہے کہ مستقبل نوآبادیاتی اور استحصالی نظام کے کھنڈرات کا نہیں بلکہ ان کھنڈرات پر تعمیر ہونے والی قومی آزادی کی تحریک کا ہے۔ مجھے امید ہے آپ سب حضرات اس تلخ حقیقت کی روشنی میں میری گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔

(امان اللہ خان)
صدر جموں کشمیر لبریشن فرنٹ

اب جناب امان اللہ خان کے خط کا متن ملاحظہ فرمائیے

لندن ۸۴-۱-۲۳

جناب ارشاد احمد حقانی صاحب

السلام علیکم - امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ "جنگ" لندن میں آپ کے فکر انگیز سنجیدہ جامع اور انتہائی گہری سوچ پر مبنی مضامین میرے مطالعے کا اہم حصہ ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ہماری تنظیم کی سرگرمیوں کی مختصر رپورٹ اور اپنے کتابچہ "نظریہ خود مختار کشمیر" کی ایک ایک کاپی بھیج رہا ہوں۔ کچھ وقت نکال کر پہلے رپورٹ پڑھیں پھر کتابچہ۔ اگرچہ کتابچے کا عنوان ہی ہمارے اکثر پاکستانی بھائیوں کی طرف سے انتہائی جارحانہ غصے کے اظہار کی دعوت دیتا ہے اس کے باوجود پاکستان کے سنجیدہ صحافیوں اور دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے اہم موضوعات پر قلم اٹھائیں۔ یہ موضوع اس لئے اہم ہے کہ یہ اب تیزی سے ریاست کے دونوں حصوں کے نوجوانوں کے سیاسی ایمان کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں ہم مانیں یا نہ مانیں پوری ریاست کا پاکستان سے الحاق اب ناممکنات میں سے ہے اور اس صورت حال کی ذمہ داری بھارتی استعماریت کے علاوہ پاکستان کی حکومتوں کی اپنی حماقتوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ گو اہل پاکستان کے لئے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا خاصا مشکل ہے لیکن اس حقیقت کے خلاف کوئی دلیل یا ثبوت نظر نہیں آتا کہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کے سامنے اب صرف دو راستے ہیں نمبر ۱ کہ وہ آزاد کشمیر پر اپنے حق ملکیت کو دوام بخشنے کے لئے بھارتی مقبوضہ کشمیر ہمیشہ کے لئے بھارت کو بخش دے یا بالفاظ دیگر مقبوضہ کشمیر کے پچاس لاکھ مسلمانوں سمیت ستر لاکھ آبادی کو بھارت کی ابدی غلامی میں دے۔ نمبر ۲ جمہوری ریاست کی مکمل خود مختاری کی تحریک کی حمایت کرے جس کے لئے اسے آزاد کشمیر کی قیمت ادا کرنی ہوگی لیکن ریاست کا دو تہائی حصہ بھی بھارتی چنگل سے آزاد ہو جائے گا۔ ہمارا اندازہ ہے کہ مسئلہ کشمیر بالآخر پوری ریاست کی مکمل خود مختاری کی صورت میں ہی حل ہو گا البتہ پاکستان خاص کر اہل پاکستان کی حمایت یا کم از کم عدم مخالفت کے ذریعہ قائم ہونے والا خود مختار کشمیر پاکستان سے ٹکراؤ کے نتیجے میں قائم ہونے والے سے بالکل مختلف اور پاکستان کے مفادات کے حق میں ہو گا جب کہ مؤخر الذکر پاکستان کے مفادات کے منافی ہو گا۔

میں ذاتی طور پر کشمیر کی اس نسل سے تعلق رکھتا ہوں جس نے سن بلوغت کے بعد کئی سال بھارتی مقبوضہ کشمیر میں گزارے اور اس کے بعد پاکستان آیا۔ آج بھی میرا سری نگر پاکستان اور آزاد کشمیر سے گہرا اور قریبی رابطہ ہے۔ دونوں طرف کے اخبارات کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہوں اس کے برعکس آزاد کشمیر کی نوجوان نسل کی نظروں سے کشمیر میں بھارت کا گھناؤنا کردار اوجھل ہے اور انہیں ذاتی طور پر بھارتی مظالم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا چنانچہ پاکستان کی طرف سے ہونے والی چھوٹی سی زیادتی بھی ان کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے کیونکہ جس شخص نے جہنم دیکھا ہو ذہن پر جنت کا تصور ہو اور اسے اعراف کی طرف دھکیلا جائے تو اسے اعراف بھی جہنم نظر آئے گا۔ آزاد کشمیر کا پڑھا لکھا نوجوان جب مقبوضہ کشمیر میں ہونے والے سات انتخابات اور کشمیریوں کے ہاتھوں بھارتی وزیر اعظم کی بدترین شکست کی حقیقت کی روشنی میں اس حقیقت پر نظر ڈالتا ہے کہ گزشتہ ۳۶ سال میں آزاد کشمیر میں صرف تین انتخابات ہوئے اور تینوں بار پاکستان کے حکمرانوں (کے ایچ خورشید کے سلسلے میں اپنے پاکستانی ماتحت) سے معمولی اختلاف کی بنا پر آزاد کشمیر کے منتخب صدروں کو اپنی مدت پوری کرنے سے پہلے ہی کان پکڑ کر مظفر آباد کے قصر صدارت سے باہر کر دیا گیا اور آزاد کشمیر میں بحالی جمہوریت کے بارے میں گزشتہ سات سال سے ہونے والے پر زور عوامی مطالبات مسلسل نظر انداز ہو رہے ہیں تو اس کے دل سے پاکستان کی محبت کا نکل جانا کوئی غیر فطری بات نہیں۔ چنانچہ میرے کتابچے کے سوال نمبر ۱۹ کا جواب نوجوان نسل کے لئے قابل قبول نہیں۔ خاص کر اب جبکہ پاکستان اقوام متحدہ کی قراردادوں کو ترک کر کے مسئلہ کشمیر کو معاہدہ شملہ کے تحت حل کرنے پر زور دے رہا ہے (معاہدہ شملہ کے تحت کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق کشمیر کے مالکوں یعنی کشمیری عوام کو نہیں بلکہ بھارت اور پاکستان کے حکام کو حاصل ہے) اب کے پاکستان کے وزیر خارجہ نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ میں خود وہاں موجود تھا اور میرے پاس تقریر کا متن بھی ہے۔ ان حالات میں مجھ جیسے لوگوں کے لئے نوجوان نسل کو بھارت اور پاکستان کے مابین فرق ذہن نشین کرانے میں بڑی دقت محسوس ہوتی ہے اور اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھے ہربار حسین شہید سہروردی مرحوم یاد آتے ہیں۔ ایک بار مغربی پاکستان کے ایک لیڈر کراچی میں سہروردی مرحوم کی عیادت کو گئے۔ شیخ مجیب الرحمن بھی سہروردی صاحب کے پاس تھے گویا ان کی چاپی کر رہے تھے۔ دوران گفتگو سہروردی صاحب نے مغربی پاکستانی لیڈر سے کہا "میری طرف سے پاکستان کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ میں نے اس نوجوان (شیخ مجیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کو کانٹے دار لگام لگا کر قابو میں رکھا ہے۔ اگر میں جلدی مر گیا اور آپ لوگوں نے اس کے جائز مطالبات رد کرنے نظر انداز کرنے اور انہیں اس کی پاکستان دشمنی سے تعبیر کرنے کا سلسلہ جاری رکھا تو شاید پاکستان موجودہ شکل میں برقرار نہ رہ سکے" اس کے بعد انتخابات کے ذریعہ مشرقی پاکستان کے غیر متنازعہ لیڈر ثابت ہونے اور سارے پاکستان کے اکثریتی ووٹ حاصل کرنے والے کو اس کے اور پاکستان کی ۵۶ فیصد آبادی پر مشتمل اس کے پیروکاروں کو ان کے جائز حق سے محروم رکھا گیا تو نتیجہ اس سے بھی کہیں زیادہ گھمبیر نکلا جس کی سہروردی مرحوم نے پیشگوئی کی تھی یعنی اسلام کے نام پر بننے والی مملکت کے ماتھے پر تاریخ اسلام کی سب سے بڑی شکست کا سیاہ دھبہ۔ سہروردی مرحوم تو شاید صرف علیحدگی کی طرف اشارہ کر رہے تھے خدا نہ کرے کشمیر بھی ایسی کوئی مثال پیش کرے۔

خود مختار کشمیر پاکستان کے لئے ریاست کی موجودہ پوزیشن کی نسبت (سیاسی، فوجی، اقتصادی اور سفارتی لحاظ سے) کہیں زیادہ فائدہ مند ہو گا۔ بہرحال پاکستان کے ایک سنجیدہ صحافی کی حیثیت سے غالباً آپ کا فرض ہے کہ آپ اس موضوع پر اہل پاکستان کو دعوت فکر دیں۔ ضروری نہیں کہ آپ ہمارے طرز فکر سے اتفاق کریں۔ اختلاف کی صورت میں آپ کے دلائل پر ہم سنجیدگی سے غور کریں گے آپ اس موضوع پر جو کچھ لکھیں مجھے میرے ذاتی ایڈریس پر جو کتابچے کے صفحہ ۲ پر ہے تراشہ بھیجتے ہوئے گا کیونکہ آپ کے بعض مضمون جنگ لندن میں شائع نہیں ہوتے۔ والسلام

(امان اللہ خان)

جیسا کہ جناب امان اللہ خان کو خود اندازہ ہے پاکستان میں بہت سے لوگ ان کے نقطہ نظر سے اختلاف کریں گے لیکن اس سے آگاہ رہنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ کوئی صاحب اگر اس موضوع پر کچھ کہنا چاہیں تو ان کے خیالات "جنگ" کے صفحات میں شائع ہو سکتے ہیں۔

ہماری طرف سے ہر سال سفیروں کو بھیجے جانے والے سال نو مبارک کارڈوں میں سے ایک

Wishing Your Excellency and the people of Your Excellencys country a happy, peaceful and prosperous

NEW YEAR

8 million people of Jammu Kashmir State, more in number than the individual populations of as many as 92 independent nations of the world, who remain denied of their inherent, inalienable, pledged and internationally recognised right of self-determination and whose beautiful homeland remains forcibly divided, defaced and trampled,

REMIND

Your Excellency and Your Excellencys Government who are signatories to UN Charter and UN General Assembly Resolutions 1514 and 2621 (Declaration on Decolonization and its Implementation), of their

MORAL RESPONSIBILITY

towards Kashmiri people's fully deserved right to self-determination.

For JAMMU KASHMIR LIBERATION FRONT

438 Alum Rock Road,
Birmingham B8 3HT
United Kingdom.
tel: 021 328 2647

(Amanullah Khan)
Secretary General

ایمنسٹی انٹرنیشنل کی طرف سے ملنے والے خطوط میں سے دو

International Secretariat, 10 Southampton Street, London WC2E 7HF, England

Amnesty International opposes by all appropriate means the imposition and infliction of death penalties and torture or other cruel, inhuman or degrading treatment or punishment of prisoners or other detained or restricted persons whether or not they have used or advocated violence.
(Amnesty International Statute, Article 1(c))

EXTERNAL (for general distribution) | AI Index: ASA 20/02/81 | Distr: UA

FOR ACTION ONLY BY THE FOLLOWING NATIONAL SECTIONS: AUSTRALIA, JAPAN, NETHERLANDS, NEW ZEALAND, SWEDEN, USA

UA 194/81 | Death Penalty | 12 August 1981

INDIA: Maqbool Ahmed BUTT

Maqbool Ahmed Butt, a journalist and former President of the Jammu and Kashmir National Liberation Front, was convicted of the murder of an Indian intelligence officer in 1968. He was sentenced to death in 1976, under the provisions of Section 3 of the 1948 Enemy Agents Ordinance, which do not allow for appeal as provided under ordinary criminal law. It is believed that his petition to the President for clemency has been turned down. He is detained in Tihar Jail, Delhi, and has recently been transferred to the "death cell".

The Himalayan state of Jammu and Kashmir has been a politically sensitive area since 1947 when the partition of the Indian sub-continent split the state of Jammu and Kashmir between India and Pakistan. Many Kashmirs in both India and Pakistan have been demanding the right to self-determination, and the Jammu and Kashmir National Liberation Front is one of the organizations which has been asserting this right.

During the past 30 years there have been several legislative moves to abolish the death penalty in India. More recently on 9 October 1979 the Supreme Court stayed the executions of more than 100 people under sentence of death for a period of seven months while the constitutionality of the death penalty was considered. On 9 May 1980 the Supreme Court ruled that the death penalty was constitutional but that it should be inflicted only in the "rarest of rare circumstances". Since this ruling, Amnesty International has learned of one execution and is concerned about the fate of several others who have exhausted all possibilities for appeals for clemency. Both the President and the governor of a State have the power to grant clemency.

Amnesty International is opposed to the death penalty in all cases without reservation on the grounds that it is a violation of the right to life and the right not to be subjected to cruel, inhuman or degrading punishment.

RECOMMENDED ACTION: FOR ACTION ONLY BY THE FOLLOWING NATIONAL SECTIONS: AUSTRALIA, JAPAN, NETHERLANDS, NEW ZEALAND, SWEDEN, USA

A limited number of appeals is requested; please organize up to 10 appeals only.

Telegrams/airmail letters respectfully urging the President to commute on humanitarian grounds the death sentence passed on Maqbool Ahmed Butt.

.../...

جہد مسلسل

INTERNATIONAL SECRETARIAT
1 Easton Street London WC1X 8DJ
United Kingdom

Our reference: ASA/YT/ET

Direct line:

Mr Amanullah Khan
Jammu Kashmir Liberation Front
438 Alum Rock Road
Birmingham 8

5 October 1983

Dear Mr Khan

We have now written to the Chief Minister of Jammu and Kashmir about the arrests of party workers in the State in August/September.

Kindly keep us informed of any further details of names of arrested persons, or of releases of the seven men whose names were given. I would also appreciate receiving precise details of the "mental and physical torture" to which you state those arrested are subjected. For that purpose, I enclose a data questionnaire which lists the sort of details we would like to have.

Looking forward to hearing from you,

Yours sincerely

Yvonne Terlingen

Yvonne Terlingen
Asia Research Department

Enc.

میری ملک بدری کے بارے میں برطانوی وزیر داخلہ کا حکمنامہ جس پر اس نے عدالتی فیصلے سے پہلے ہی دستخط کئے تھے

IMMIGRATION ACT 1971

AUTHORITY FOR DETENTION

Whereas I have decided to make a deportation order under section 5(1) of the Immigration Act 1971 against

AMANULLAH KHAN

a Pakistani national and he is neither detained in pursuance of the sentence or order of any court nor for the time being released on bail by any court having power so to release him:

I hereby, in pursuance of paragraph 2(2) of Schedule 3 to that Act, authorise any constable at any time after notice of the decision has been given to the said

AMANULLAH KHAN

in accordance with the Immigration Appeals (Notices) Regulations 1972, to cause him to be detained until the deportation order is made.

Douglas Hurd.

One of Her Majesty's Principal Secretaries of State

19th September 1986. 4.23 pm

Home Office
Queen Anne's Gate

برطانوی وزارت داخلہ کی طرف سے میری برطانیہ بدری کی وجوہات کی وضاحت

Served on 19/9/86

HOME OFFICE
Lunar House Wellesley Road Croydon CR9 2BY

Telephone (Immigration) 01-686 0688 } Calls answered in turn
(Nationality) 01-686 3441 } please wait for a reply

Mr Amanullah Khan

Please reply to The Under Secretary of State
Your reference
Our reference
Date 19th September 1986.

Sir,

In view of your activities whilst resident in the United Kingdom, which the Secretary of State has reason to believe have been carried out on behalf of the Jammu Kashmir Liberation Front, the Secretary of State has decided that your presence in the United Kingdom is not conducive to the public good for reasons of national security. Accordingly, he has decided to make a deportation order against you by virtue of Section 3(5)(b) of the Immigration Act 1971 requiring you to leave the United Kingdom and prohibiting you from returning while the order remains in force.

By virtue of S15(3) of the Act, you are not entitled to appeal against the decision to make the deportation order but, if you wish, you may make representations to an independent advisory panel. You will be allowed to appear before the panel if you wish to do so but may not be represented. To such an extent as the advisers may sanction, you may be assisted by a friend and arrange for third parties to testify on your behalf. You should inform the officer who hands this letter to you whether or not you wish to make representations to the panel of advisers.

If the Secretary of State makes the deportation order you will, by virtue of Section 17(1) of the Act, have a right of appeal against removal to the country specified in the removal directions on the grounds that you ought to be removed to a different country specified by you.

Yours faithfully

A. Underhill

برطانیہ کے وزیر داخلہ ڈگلس ہرڈ کے شیڈو وزیر داخلہ جیرالڈ کافمین کے نام میری برطانیہ بدری سے متعلق خط کا متعلقہ حصہ

QUEEN ANNE'S GATE LONDON SW1H 9AT

15 October 1986

Dear Gerald,

Thank you for your letter of 24 September enclosing this correspondence about Mr Amanullah Khan. Your representations cover a number of different issues which I shall deal with separately, but it may be helpful if I first of all set out the background to this case.

IMMIGRATION HISTORY

Mr Khan was born in Gilgit on 24 August 1934 and is a citizen of Pakistan. He was originally admitted to the United Kingdom on 20 June 1976 from Pakistan for a visit of four months. During that time he sought a work permit to enable him to take employment as the editor of the "Voice of Kashmir International". This publication was financed and organised by members of the Jammu Kashmir Plebiscite Front, which became the Jammu Kashmir Liberation Front (JKLF) in 1977. Mr Khan had been sent to the United Kingdom to organise the United Kingdom branch of JKLF. After initially refusing the application, the Department of Employment granted a permit in January 1978 and his wife and child were granted entry clearance to join him in August 1978. Further extensions of stay were given until 6 April 1982 when indefinite leave to remain was granted.

Mr Khan applied for naturalisation in September 1982. When interviewed he said that he was full-time President of JKLF and that he wanted to obtain British citizenship to enable him to travel more freely. The application was refused on 15 February 1985.

On 5 September 1985 Mr Khan was arrested and charged with:-

(1) Possessing explosive substances with intent to endanger life; and

(2) Possessing explosive substances under suspicious circumstances.

Mr Khan was remanded in custody and on 17 July 1986 appeared at St Albans Crown Court. The trial was concluded on 23 July 1986 when the jury returned a verdict of "Not Guilty" on count (1), and were unable to reach a majority verdict on count (2). A re-trial was ordered and Mr Khan was remanded in custody to appear at St Albans Crown Court on 15 September 1986. The second trial was concluded on 19 September, when a verdict of "Not Guilty" was returned.

At the conclusion of the criminal proceedings, on my instructions Mr Khan was served with a notice of intention to deport on grounds of national security under Section 3(5)(b) of the Immigration Act 1971 and he was served with a detention order under paragraph 2(2) of Schedule 3 to the Immigration Act 1971. An application for an order of habeas corpus was dismissed in the High Court on 3 October. Mr Khan is detained in Brixton prison pending the outcome of his representations to an independent advisory panel.

The Rt Hon Gerald Kaufman, M.P.

/over.....

DECISION TO MAKE A DEPORTATION ORDERS

The "Voice of Kashmir" published an article in 1976 in an edition edited by Mr Khan giving the origins of JKLF. It said that in 1965 Mr Khan agreed with others to form the Jammu Kashmir National Liberation Front to establish a guerilla movement to liberate Kashmir. Mr Khan was appointed head of the group's political wing. The group was to recruit, train and equip guerillas for operations against India. The political wing was to educate public opinion in favour of the armed struggle. The organisation's aim was to strive to acquire by all possible ways, including armed struggle, a position for the people of Jammu Kashmir in which they were able to determine their future as sole masters of their homeland.

The JKLF, by their own admission, were involved in a number of illegal activities in India in the period 1966-1977 leading to the deaths of at least two people. An Indian aircraft was hijacked by supporters of the group in 1971. In 1984 members of the group kidnapped and murdered the Indian Assistant Commissioner in Birmingham.

Given that Mr Khan was a founder and leading member of an organisation advocating and using violence against the Government of India and in the light of other information of a confidential nature put before me, I decided that Mr Khan's presence in the United Kingdom was not conducive to the public good for reasons of national security. I accordingly decided that Mr Khan should be served with a notice of intention to deport on grounds of national security under Section 3(5)(b) of the Immigration Act 1971 and detained if he were acquitted of the current charges against him or given a non-custodial sentence. I must stress that this decision was taken on evidence which was not relied upon by the Crown Court at St Albans. As is usual where issues of national security are concerned details are not made public for obvious reasons, and by virtue of Section 15(3) of the Immigration Act 1971 Mr Khan is not entitled to appeal against the decision to make a deportation order against him. He has been informed, however, that he may make representations to an independent advisory panel; that he may appear before the panel and to such extent as the advisers may sanction, may be assisted by a friend (but not a legal representative) and arrange for a third party to testify on his behalf.

Yours,

Douglas.

میری برطانیہ بدری کے بارے میں گارڈین لندن اور المجتمع کویت کے اداریے

Hurd's bloomer over Mr Khan

Exactly ten years ago, a Labour Home Secretary, Mr Merlyn Rees, deported Messrs Agee and Hosenball on national security grounds. The decisions raised a memorable protest and Mr Rees confessed that it had been a politically traumatic affair for him. Since then, this rare power has not been invoked. Until now. Ten years on, Mr Douglas Hurd is invoking national security to allow him to get rid of Mr Ammanullah Khan, a Kashmiri nationalist. The evidence suggests that he is prepared to ignore a string of principles of justice to do so.

Mr Khan is an elderly man, who has spent most of the last few years travelling the world to put the case for Kashmiri self-determination. Once upon a time Britain was not unsympathetic to that cause — but no longer. For ten years, along with many thousands of Kashmiris, Mr Khan has lived in this country. The young members of his family know no other home. Inevitably, he is active here in political causes which bring distress and outrage to the governments of Pakistan and, in particular, India. Earlier this year, Mr Khan was acquitted unanimously at St Albans Crown Court on explosives charges. Immediately afterwards he was rearrested by police officers who filled in details on a blank cheque deportation order which already bore Mr Hurd's signature. He is currently in Brixton prison, where he has been for 15 months. He is suffering from lung cancer and a hernia.

On the face of it, therefore, Mr Khan doesn't sound like, say, a Hindawi or a Patrick Magee. But the Home Secretary says his presence in this country is not conducive to the public good on grounds of national security. And, as happens in such cases, this assertion immediately stacks all the cards in Mr Hurd's hands. This month, Mr Khan presented his case to the three advisers who are appointed to consider his representations. It was a procedural farce, just as it was with Agee and Hosenball. No lawyers allowed. No cross examination of witnesses. The Home Office even reneged on a commitment not to reintroduce evidence that had been discredited in the Crown Court trial. A few days ago predictably, Mr Hurd upheld his own original decision.

The power to deport on national security grounds is a lawless power. On the rare but celebrated occasions when it has been invoked (Rudi Dutschke, Franco Caprino, Agee and Hosenball), the decisions have been deeply suspect, not to say downright wrong. Just such a suspicion hangs over the Khan case today. But at least those earlier cases roused parts of the public conscience. There were parliamentary debates. There was public protest. Where are those voices now that Mr Khan needs them? Unless they are raised — and raised fast — Mr Hurd is going to get away with his dubious and unscrutinised expulsion.

THE GUARDIAN 1-12-1986

■ بريطانيا تبعد أمان الله خان

على الرغم من ان المحكمة البريطانية الكبرى برأت السيد امان الله خان رئيس جبهة تحرير جامو وكشمير من كل التهم المنسوبة اليه وفي مقدمتها تهمة محاولة امان الله خان قتل راجيف غاندي رئيس وزراء الهند اثناء زيارته لبريطانيا في اكتوبر ١٩٨٥ وعلى الرغم من النداءات والاحتجاجات الصادرة عن الكشميريين والباكستانيين والهيئات الاسلامية داخل بريطانيا وخارجها الا ان الحكومة البريطانية اصرت على ابعاده يوم ١١ ديسمبر الماضي واعطت زوجته وابنته مهلة ثلاثة اشهر اخرى لمغادرة بريطانيا. اكثر المراقبين والمحللين السياسيين يربطون بين قرار الابعاد وبين صفقة الاسلحة المعقودة بين الحكومتين البريطانية والهندية والتي اصرت الهند قبل توقيعها على ابعاد امان الله خان من بريطانيا وهذا يؤكد حجم المؤامرة ضده وزيف كل التهم المنسوبة اليه.

ان المطلوب اليوم من كافة الحكومات والهيئات والمؤسسات الاسلامية مساندة الشعب الكشميري المسلم في كفاحه العادل من اجل التخلص من ربقة الاحتلال الهندوسي البغيض الذي يحاول تعويق ثورة الشعب الكشميري بشتى الوسائل والمؤامرات والمكائد.

برطانیہ میں میری اسیری کے دوران اخبارات کی سرخیوں میں سے کچھ

New fears for the safety of JKLF leader

HIGH COURT BID TO FREE LEADER FAILS

Kashmiri group in pledge to step up battle
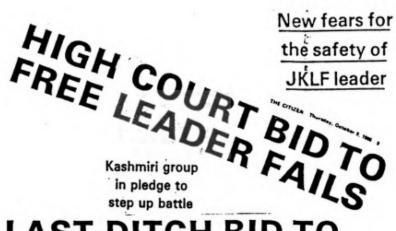
LAST-DITCH BID TO STOP DEPORTATION

Herald Thursday, September 25, 1986

KLF man cleared of chemical charge

Judge refuses to free cleared Kashmiri

Hurd 'signed blank expulsion order'

New fears for the safety of JKLF leader

Cleared Kashmir dissident to fight expulsion

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے برطانوی حکومت سے امان اللہ خان کو زیر حراست رکھنے اور ملک بدری کے احکامات کی وضاحت طلب کر لی

THE DAILY JANG LONDON
ESTABLISHED 1971
THURSDAY, NOVEMBER 27, 1986

روزنامہ جنگ لندن

امان اللہ خان کی برطانیہ بدری کا حتمی حکم دے دیا گیا

THE DAILY JANG LONDON, WEDNESDAY SEPTEMBER 24, 1986.

امان اللہ کی گرفتاری اور ملک بدری کے احکامات

بھارت کشمیر سے نکل جائے، جنرل اسمبلی میں کشمیریوں کے نعرے

امان اللہ خان سمیت لبریشن فرنٹ کے ۶ رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا

THE DAILY JANG LONDON, FRIDAY OCTOBER 10, 1986.

امان اللہ خان کی ملک بدری کے مسئلہ کو ہاؤس آف کامنز میں اٹھانے کی مہم

امان اللہ خان کو بری ہونے کے فوراً بعد دوبارہ گرفتار کر لیا گیا

جیوری نے اکثریتی فیصلے سے کشمیری رہنما کو بے گناہ قرار دیا۔ امان اللہ خان کی سرگرمیاں برطانیہ کی سلامتی کے منافی ہیں: ہوم آفس

ہوم آفس نے امان اللہ خان کو ملک بدری کی وجوہات سے آگاہ کر دیا

امان اللہ خان ۔ ضمیر کے قیدی

انہیں سیاسی نظریات کی پاداش میں قید کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑ رہی ہیں

امان اللہ خان نے برطانیہ یا کسی دوسرے ملک میں سیاسی پناہ کی پیشکش مسترد کر دی

امان اللہ خان کی ضمانت کی درخواست کی سماعت ڈویژنل بنچ کریگا

امان اللہ خان کی گرفتاری اور ملک بدری کے احکام کو کل عدالت میں چیلنج کیا جائیگا

امان اللہ خان کے بارے میں مشاورتی پینل کی رپورٹ ہوم سیکرٹری کو پیش کر دی گئی

کے کچھ اداریوں اور مضامین کی سرخیاں

کشمیری نوجوانوں سے

تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم

کشمیریوں کی قومی غیرت کہاں گئی

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

پاکستان کا المیہ

۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے شہدائے کشمیر کی خدمت میں

مرتضیٰ بھٹو! کشمیر تمہاری جاگیر نہیں

PEACE? NO! FREEDOM.

کشمیریوں کے منہ پر دو زوردار تھپڑ

Imposture At Its Worst

دنیا کی تحاریکِ آزادی اور کشمیر

میں ننگی ہوں

پاکستان پائندہ باد

موجودہ صورتحال اور کشمیریوں کے فرائض

گلگت بلتستان کے ساتھ یہ ظلم کیوں

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے